زیر نظر: استاد محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

۱۴

ترجمہ: سید صفدر حسین نجفی

از نگارش
اہل قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

مدینۃ العلم دار العلوم ...
محمد آباد فتح گڑھ سیالکوٹ

زیرِ نظر: اُستادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

۱۴

ترجمہ
سیّد صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	تفسیر نمونہ جلد ۱۴
زیر نظر	استاد محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی
مترجم	سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعہ المنتظر۔ لاہور
تصحیح و تجدید نظر	ثاقب نقوی
کتابت	دار الکتابت۔ حضرت کیلیانوالہ
ناشر	مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ اگنگارام مینشن شاہراہ قائد اعظم۔ لاہور
مطبع	زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور
تاریخ اشاعت	شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ
ایڈیشن	اوّل
ہدیہ	۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ، اُردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئینِ محترم !

سلام و رحمت !

"تفسیر نمونہ" کی چودھویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس جلد کی اشاعت کے ساتھ ہی ہم تفسیر نمونہ کے اُردو ترجمے کی اشاعت کے دوسرے نصف مرحلے میں داخل ہوگئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس تفسیر کی کُل ستائیں جلدیں ہیں ہمیں توقع ہے کہ انشاءاللہ یہ مرحلہ پہلے مرحلے کی نسبت جلد پایۂ تکمیل کو جائے گا۔ ہمیں یہاں اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ کے حُسنِ قبول اور حُسنِ تعاون سے ہی ہم نے گزشتہ سفر کامیابی سے طے کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس کارِ خیر میں ہم آہنگی کا یہ اسلوب آئندہ بھی بہتر سے بہتر طور پر جاری رہے گا۔

آپ کے لیے یہ خبر یقیناً خوش آئند ہوگی کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اپنے دیگر پروگراموں کے ساتھ ساتھ **"ماہنامہ مصباح القرآن"** کا ڈیکلریشن بھی حاصل کرلیا ہے۔ یہ انشاءاللہ ایک علمی جریدہ ہوگا اور اس کا زیادہ تر حصہ قرآنیات پر مبنی ہوگا۔ اس کے لیے تحقیقی، علمی، معلوماتی اور مفید تحریروں کو ہم شکریے کے ساتھ خوش آمدید کہیں گے۔

اس جلد کی اشاعت میں ہم سے الحاج شیخ محمد طفیل ہیرا صاحب نے اپنے مرحومین کے ایصالِ ثواب کی غرض سے تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بطفیلِ اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام ان کے مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور الحاج شیخ محمد طفیل صاحب کے اس تعاون کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے۔

آپ کی طرف سے آراء و تجاویز کے لیے ہم ہمیشہ منتظر بھی رہتے ہیں اور شکر گزار بھی۔

بارگاہِ ربُ العزت میں نصرت و توفیق کی استدعا اور آپ کی دُعاؤں کی آرزو کے ساتھ

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ   والسّلام

اراکین : مصباح القرآن ٹرسٹ

Marfat.com

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے
اس نفیس تالیف کو
ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی

◎ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

◎

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر بُرہان	از	مرحوم سیّد ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سیّد قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفیٰ مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِنظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پَرتَو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی تیرہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی چودہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں ازحد شکرگزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی [1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی [2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)
[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

Marfat.com

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر
سورۂ حج	۲۷
سورۂ حج کے مضامین اور مطالب	۲۹
۱۔ قیامت کا بیان	۲۹
۲۔ شرک اور مشرکین کا بیان	۲۹
۳۔ عذابِ الٰہی کا بیان	۲۹
۴۔ حج کا بیان	۲۹
۵۔ ظالموں کے خلاف قیام کا بیان	۳۰
۶۔ فروعِ دین کا بیان	۳۰
اس سورت کی تلاوت کے فضائل	۳۰
آیت ۱ ــ ۲	۳۱
قیامت کا وحشت ناک زلزلہ	۳۲
چند اہم نکات	۳۳
۱۔ دنیا میں قیامت کے مظاہر	۳۳
۲۔ یہ آیات کس موقع کے بارے میں ہیں	۳۳
۳۔ "مرضعة" کے مفہوم کا ایک خاص پہلو	۳۳
۴۔ "تری الناس سکٰرٰی" کا مفہوم	۳۳
۵۔ ایک اہم واقعہ	۳۴
آیت ۳ ــ ۴	۳۵
شیطان کے پیروکار	۳۵
چند اہم نکات	۳۶
۱۔ مجادلہ ہر دو حوالے سے	۳۶
۲۔ باطل مجادلہ شیطانی طریقے سے	۳۷
۳۔ ہر شیطان کی پیروی کیوں	۳۷
۴۔ "کتب علیہ" کا مفہوم	۳۷
آیت ۵ تا ۷	
نباتات اور انسان کی پیدائش میں قیامت کے دلائل	۴۰
چند اہم نکات	۴۳
۱۔ انسانی زندگی سات مراحل پر مشتمل ہے	۴۳
۲۔ معادِ جسمانی	۴۵
۳۔ ارذل العمر	۴۵
آیت ۸ تا ۱۰	۴۶
کج بحثی کرنے والوں کے بارے میں	۴۶
آیت ۱۱ تا ۱۴	۴۹
کفر کے گڑھے کے کنارے کھڑے لوگ	۵۰
آیت ۱۵ تا ۱۷	۵۴
شان نزول	۵۵
قیامت ــ تمام اختلافات کے خاتمے کا دن	۵۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
چند اہم نکات	۵۲
۱۔ آیتوں کا ایک دوسرے سے تعلق	۵۶
۲۔ مجوسی کون ہیں؟	۵۶
۳۔ صابئین کون ہیں؟	۵۸
۴۔ توحید سے انحراف کرنے والے گروہوں کی ترتیب	۵۹
آیت ۱۸	۶۰
عالم کی تمام موجودات اس کی بارگاہ میں سجود ہیں	۶۰
چند نکات	۶۱
۱۔ یہ سب چیزیں سجدہ کس طرح کرتی ہیں؟	۶۱
۲۔ کیا فرشتوں کا سجدہ "تشریعی" ہے؟	۶۲
۳۔ چند سوالات اور ان کے جوابات	۶۲
آیت ۱۹ تا ۲۴	۶۳
شانِ نزول	۶۴
دو مدِمقابل گروہ	۶۵
آیت ۲۵	۶۸
خدا کے گھر سے روکنے والے	۶۸
چند اہم نکات	۶۹
۱۔ دو مختلف صیغے	۶۹
۲۔ "صد عن سبیل اللہ" کیا ہے	۶۹
۳۔ اس منبع فیض میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں "سواء العاکف والباد"	۶۹
۴۔ اس آیت میں مسجد حرام سے کیا مراد ہے؟	۷۰
۵۔ ظلم کے ساتھ "الحاد" کا کیا مفہوم ہے	۷۱

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۲۶ تا ۲۸	۷۲
حج کے لیے دعوتِ عام	۷۳
چند اہم نکات	۷۷
۱۔ ایامِ معلومات	۷۷
۲۔ منیٰ میں ذکرِ خدا	۷۸
۳۔ حج کا فلسفہ اور اس کے مضمرات	۷۸
(i) حج کا اخلاقی پہلو	۷۸
(ii) حج کا سیاسی پہلو	۷۹
(iii) حج کا ثقافتی پہلو	۷۹
(iv) حج کا اقتصادی پہلو	۸۱
۴۔ اس زمانے میں قربانی کے گوشت سے متعلق ذمہ داریاں	۸۲
آیت ۲۹ و ۳۰	۸۴
مناسک حج کا ایک اور اہم حصہ	۸۵
نکتہ	۸۹
"قول الزور" کیا ہے؟	۸۹
آیت ۳۱ تا ۳۳	۹۰
شعائر اللہ کی تعظیم علامت تقویٰ ہے	۹۱
آیت ۳۴ و ۳۵	۹۷
بردبار لوگوں کے لیے بشارت	۹۸
آیت ۳۶ تا ۳۸	۱۰۱
قربانی کیوں کی جاتی ہے؟	۱۰۲
آیت ۳۹ تا ۴۱	۱۰۴
جہاد کا پہلا حکم	۱۰۸
چند اہم نکات	۱۱۲

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۱۔ حکمِ جہاد کا فلسفہ	۱۱۲
(i) ظالم اور جابر کے خلاف مظلوم کا جہاد	۱۱۲
(ii) طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد	۱۱۲
۲۔ اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔	۱۱۳
۳۔ "محسنین" "مخبتین" اور اللہ کے انصار	۱۱۴
آیت ۴۲ تا ۴۵	۱۱۵
لاوارث کنویں اور فلک بوس محل	۱۱۶
ایک نکتہ	۱۱۷
آیت ۴۶ تا ۴۸	۱۱۹
سیر و سیاحت اور دلوں کی بیداری	۱۲۰
آیت ۴۹ تا ۵۱	۱۲۵
رزقِ کریم	۱۲۵
آیت ۵۲ تا ۵۴	۱۲۸
انبیاء کے خلاف شیطانی وسوسے	۱۲۹
چند اہم نکات	۱۳۰
۱۔ شیطانی شکوک و شبہات کیا ہیں	۱۳۰
۲۔ "غرانیق" کا من گھڑت فسانہ	۱۳۱
آیت ۵۵ تا ۵۹	۱۳۵
رزقِ حسن	۱۳۶
آیت ۶۰ تا ۶۲	۱۴۰
شانِ نزول	۱۴۱
کامران کون ہے؟	۱۴۱
آیت ۶۳ تا ۶۶	۱۴۴
کائنات میں اللہ کی نشانیاں	۱۴۵

مضمون	صفحہ نمبر
چند اہم نکات	۱۴۸
۱۔ پروردگارِ عالم کی خاص صفات	۱۴۰
۲۔ ان آیتوں کا استدلالی پہلو	۱۴۰
۳۔ کائنات کا انسان کے لیے مسخر ہونا	۱۴۸
آیت ۶۷ تا ۷۰	۱۵۰
ہر امت کے لیے ایک عبادت مقرر ہے	۱۵۱
آیت ۷۱ تا ۷۴	۱۵۲
مکھی سے بھی کمزور معبود	۱۵۵
چند اہم نکات	۱۵۸
۱۔ بتوں کی ناتوانی کی ایک واضح مثال	۱۵۸
۲۔ ایک سوال کا جواب	۱۵۹
آیت ۷۵ تا ۷۸	۱۶۰
شانِ نزول	۱۶۱
پانچ اہم اور تعمیری کام	۱۶۲
سورۂ مومنون	۱۶۹
سورۂ مؤمنون کی فضیلت	۱۷۱
سورۂ مؤمنون کے مندرجات	۱۷۲
آیت ۱ تا ۱۱	۱۷۵
مؤمنین کے نمایاں اوصاف	۱۷۶
چند اہم نکات	۱۸۲
۱۔ "افلح" کا مفہوم	۱۸۲
۲۔ دائمی اور کم مدتی شریکِ حیات	۱۸۳
۳۔ خضوع و خشوع، روحِ نماز ہے	۱۸۳
آیت ۱۲ تا ۱۶	۱۸۵
رحمِ مادر میں "جنین" کے ارتقائی مراحل	۱۸۶

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
چند اہم نکات	۱۸۹
۱۔ مبدا اور معاد کا اثبات ایک دلیل سے	۱۸۹
۲۔ رحم مادر میں انسان کی ارتقاء کا آخری مرحلہ	۱۸۹
۳۔ ہڈیوں پر گوشت کا غلاف	۱۹۰
۴۔ ہڈیوں کا پائیدار اور محافظ غلاف	۱۹۰
آیت ۱۷ تا ۲۲	۱۹۲
توحید کی نشانیوں کا ایک بار پھر تذکرہ	۱۹۳
آیت ۲۳ تا ۲۵	۱۹۹
کور دل مغروروں کی منطق	۲۰۰
آیت ۲۶ تا ۳۰	۲۰۳
ایک باغی قوم کا انجام	۲۰۴
آیت ۳۱ تا ۴۱	۲۰۷
قوم ثمود کا عبرت ناک انجام	۲۰۹
چند اہم نکات	۲۱۲
۱۔ پر تعیش زندگی اور اس کے منحوس نتائج	۲۱۲
۲۔ "تراب" اور "عظام" کا مفہوم	۲۱۳
۳۔ "غثاء" سے کیا مراد ہے	۲۱۳
۴۔ ایک عمومی انجام	۲۱۳
آیت ۴۲ تا ۴۴	۲۱۵
سرکش اقوام کی یکے بعد دیگرے ہلاکت	۲۱۶
آیت ۴۵ تا ۴۹	۲۱۸
حضرت موسیٰؑ کا قیام اور فرعونیوں کی تباہی	۲۱۹
آیت ۵۰	۲۲۲
اللہ کی ایک اور نشانی	۲۲۲
آیت ۵۱ تا ۵۴	۲۲۴

مضمون	صفحہ نمبر
سب ایک امت ہیں	۲۲۵
آیت ۵۵ تا ۶۱	۲۳۰
بھلائیوں میں سبقت کرنے والے	۲۳۱
آیت ۶۲ تا ۶۷	۲۳۴
جہالت میں ڈوبے ہوئے دل	۱۳۵
آیت ۶۸ تا ۷۴	۲۳۹
منکرین کی بہانہ سازیاں	۲۴۰
چند اہم نکات	۲۴۳
۱۔ حق پرستی اور خواہشات پرستی	۲۴۳
۲۔ رہبر کی صفات	۲۴۴
۳۔ اکثریت حق کی طرف نہیں ہوتی	۲۴۵
آیت ۷۵ تا ۸۰	۲۴۸
خدا مختلف طریقوں سے بیدار کرتا ہے	۲۴۹
آیت ۸۱ تا ۹۰	۲۵۴
فیصلہ تمہارا ضمیر کرے	۲۵۶
چند اہم نکات	۲۵۸
۱۔ کچھ الفاظ کے معانی	۲۵۸
۲۔ معاد پر ایمان - قدرت خدا کے حوالے سے	۲۵۸
۳۔ آیات کے آخری حصے کا فرق	۲۵۹
آیت ۹۱ تا ۹۲	۲۶۰
شرک دنیا کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے	۲۶۰
آیت ۹۳ تا ۹۸	۲۶۴
شیطانی وسوسوں سے پناہ بخدا	۲۶۵
چند اہم نکات	۲۶۷

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۱۔ "ھمزات الشیاطین" کیا ہے	۲۶۷
۲۔ بُرائی کا جواب بھلائی سے	۲۶۷
آیت ۹۹ و ۱۰۰	۲۶۹
ناممکن تقاضا	۲۷۰
چند اہم نکات	۲۷۱
۱۔ "ربّ ارجعون" میں مخاطب کون ہے؟	۲۷۱
۲۔ "فیما ترکت" کا مفہوم	۲۷۲
۳۔ "کلّا" یہاں کس چیز کی نفی کرتا ہے	۲۷۲
۴۔ عالم برزخ کیا ہے؟	۲۷۳
برزخ اور عالم ارواح سے اتباط	۲۷۸
عالم برزخ کا ایک خاکہ	۲۷۹
آیت ۱۰۱ تا ۱۰۴	۲۸۲
بدکرداروں کی سزا کا ایک گوشہ	۲۸۳
چند اہم نکات	۲۸۶
۱۔ جس روز سب رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی	۲۸۶
۲۔ "اصمعی" کی ہلا دینے والی داستان	۲۸۷
۳۔ سزا اور گناہ میں مناسبت	۲۹۰
آیت ۱۰۵ تا ۱۱۱	۲۹۲
مجھ سے بات کرو	۲۹۳
آیت ۱۱۲ تا ۱۱۶	۲۹۶
اس دُنیا کی عمر تھوڑی ہے	۲۹۷
موت زندگی کا خاتمہ نہیں	۳۰۰
آیت ۱۱۷ و ۱۱۸	۳۰۲
کامیاب اور ناکام	۳۰۲

مضمون	صفحہ نمبر
سورۂ نور	۳۰۵
سورۂ نور کی فضیلت	۳۰۷
سورۂ نور کے مضامین	۳۰۷
آیت ۱ تا ۳	۳۰۹
زانی مرد اور زانی عورت کی سزا	۳۱۰
چند اہم نکات	
۱۔ وہ مواقع جہاں زانی کی سزا موت ہے	۳۱۴
۲۔ زانی عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟	۳۱۵
۳۔ سزا لوگوں کی موجودگی میں کیوں؟	۳۱۵
۴۔ اس سے پہلے زانی کے لیے کیا سزا تھی؟	۳۱۵
۵۔ اجرائے حد میں کمی بیشی ممنوع ہے۔	۳۱۶
۶۔ زانی کے ساتھ شادی بیاہ کی حرمت کی شرائط	۳۱۶
۷۔ حرمتِ زنا کا فلسفہ	۳۱۷
آیت ۴ و ۵	۳۱۸
تہمت کی سزا	۳۱۸
چند اہم نکات	۳۲۰
۱۔ آیت میں "رمی" کا کیا معنیٰ ہے؟	۳۲۰
۲۔ چار گواہ کیوں؟	۳۲۱
۳۔ قبولیت توبہ کی اہم شرط	۳۲۱
۴۔ احکام قذف	۳۲۲
آیت ۶ تا ۱۰	۳۲۴
شان نزول	۳۲۵
بیوی پر تہمت لگانے کی سزا	۳۲۶
چند اہم نکات	۳۲۸

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۱۔ حکم قذف صرف بیوی اور شوہر کے لیے کیوں مخصوص ہے	۲۲۸
۲۔ "لعان" ایک مخصوص عمل	۲۲۸
۳۔ آیت میں جُملہ شرطیہ کی جزائے محذوف	۲۲۹
آیت ۱۱ تا ۱۶	۲۳۰
شانِ نزول	۲۳۱
شانِ نزول کے بارے میں تحقیق	۲۳۵
ایک بہت بڑی تہمت	۲۳۶
آیت ۱۷ تا ۲۰	۲۴۱
برائیوں کی اشاعت ممنوع ہے	۲۴۱
چند اہم نکات	۲۴۴
۱۔ "فحشاء" کی اشاعت سے کیا مراد ہے	۲۴۱
۲۔ غلط پراپیگنڈا ـــ ایک بلا	۲۴۵
۳۔ گناہ کو معمولی سمجھنا	۲۴۶
آیت ۲۱ تا ۲۵	۲۴۷
جزا و سزا حساب استحقاق کے مطابق ہوگی	۲۴۸
آیت ۲۶	۲۵۵
"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"	۲۵۵
چند اہم نکات	۲۵۶
۱۔ "خبیثات" اور "خبیثون" کون ہیں؟	۲۵۶
۲۔ یہ حکم تکوینی ہے یا تشریعی؟	۲۵۷
۳۔ ایک سوال کا جواب	۲۵۷
آیت ۲۷ تا ۲۹	۲۵۹
بغیر اجازت لوگوں کے گھروں میں نہ جاؤ	۲۶۰
چند اہم نکات	۲۶۱
۱۔ گھر کی چار دیواری کا تحفظ اور آزادی	۲۶۱
۲۔ غیر رہائشی گھروں سے کیا مراد ہے؟	۲۶۳
۳۔ بغیر اجازت لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کی سزا	۲۶۴
آیت ۳۰ و ۳۱	۲۶۵
شانِ نزول	۲۶۶
بے پردگی اور بے حیائی کے خلاف اقدام	۲۶۷
چند اہم نکات	۲۷۱
۱۔ پردے کا فلسفہ	۲۷۱
۲۔ چہرے اور ہاتھوں کا استثناء	۲۷۵
۳۔ "نسائهن" سے کون مراد ہیں؟	۲۷۶
۴۔ "او ما ملکت ایمانهن" کی تفسیر	۲۷۷
۵۔ "اولی الاربة من الرجال" کی تفسیر	۲۷۷
۶۔ کون سے بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں	۲۷۸
۷۔ چچا اور ماموں کو محارم میں کیوں شمار نہیں کیا گیا؟	۲۷۸
۸۔ جنسی جذبات کو تحریک دینے والے تمام عوامل ممنوع ہیں	۲۷۹
آیت ۳۲ تا ۳۴	۲۸۰
آسان شادی بیاہ کی ترغیب	۲۸۱
چند اہم نکات	۲۸۶
۱۔ شادی خدائی حکم ہے	۲۸۶
۲۔ "والصالحین من عبادکم وامائکم" کی تفسیر	۲۸۸

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۲- عقائد مکاتبہ	۳۸۹
آیت ۳۵ تا ۳۸	۳۹۰
آیتِ نور	۳۹۱
چند روایات	۴۰۱
آیت ۳۹ و ۴۰	۴۰۵
سراب کی طرح کے اعمال	۴۰۵
آیت ۴۱ و ۴۲	۴۰۹
سب اس کی تسبیح کرتے ہیں	۴۰۹
چند اہم نکات	۴۱۰
۱- "اَلَمْ تَرَ" کا مفہوم	۴۱۰
۲- موجوداتِ عالم کی تسبیح	۴۱۰
۳- پرندوں کی مخصوص تسبیح	۴۱۱
۴- "کل قد علم صلواته وتسبیحه" کی تفسیر	۴۱۲
۵- "صلوٰۃ" سے کیا مراد ہے؟	۴۱۲
آیت ۴۳ تا ۴۵	۴۱۴
کچھ اور عجائباتِ خلقت	۴۱۵
ایک سوال کا جواب	۴۱۷
چند اہم نکات	۴۱۹
۱- آیت میں "ماء" سے کیا مراد ہے	۴۱۹
۲- ایک سوال کا جواب	۴۲۰
۳- زندگی مختلف صورتوں میں	۴۲۱
آیت ۴۶ تا ۵۰	۴۲۳
شانِ نزول	۴۲۴

مضمون	صفحہ نمبر
ایمان اور خدا کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم	۴۲۵
چند اہم نکات	۴۲۷
۱- نفاق کی بیماری	۴۲۷
۲- عادلانہ فیصلہ صرف خدا کا ہوتا ہے	۴۲۸
آیت ۵۱ تا ۵۴	۴۳۰
حق پر ایمان اور تسلیم کامل	۴۳۱
آیت ۵۵	۴۳۵
شان نزول	۴۳۵
مستضعفین کی عالمی حکومت	۴۳۶
چند اہم نکات	۴۳۷
۱- "کما استخلف الذین من قبلھم" کی تفسیر	۴۳۷
۲- اللہ کا یہ وعدہ کن سے ہے؟	۴۳۸
۳- اصلی ہدف شرک سے پاک عبادت	۴۳۹
آیت ۵۶ و ۵۷	۴۴۱
عذابِ الٰہی سے فرار ممکن نہیں	۴۴۱
آیت ۵۸ تا ۶۰	۴۴۳
والدین کے کمرے میں آنے کے آداب	۴۴۴
چند اہم نکات	۴۴۸
۱- اجازت لینے کا فلسفہ	۴۴۸
۲- سن رسیدہ عورتوں کے لیے پردے کا حکم	۴۴۹

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ٦١	٤٥١
جن گھروں میں جا کر کھانا کھانا جائز ہے۔	٤٥٢
چند اہم نکات	
١۔ کیا کسی کے ہاں سے کھانا کھانے کے لیے اجازت شرط ہے؟	٤٥٥
٢۔ اس حکم اسلامی کا فلسفہ	٤٥٦
٣۔ "صدیق" سے کون مراد ہے؟	٤٥٧
٤۔ "ما ملکتم مفاتحہ" کی تفسیر	٤٥٨
٥۔ سلام و تحیت	٤٥٨
آیت ٦٢ تا ٦٤	٤٦٠
شان نزول	٤٦١
رسول اللہ کو تنہا نہ چھوڑو	٤٦٢

Marfat.com

سورۂ حج

مدینہ میں نازل ہوئی

اس کی ۷۸ آیات ہیں

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۂ حج کے مضامین اور مطالب

اس سورت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں حج کے بارے میں کچھ آیات ہیں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے، جن کے مکی یا مدنی ہونے میں مفسرین اور مورخین قرآن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اس سورت کو ماسوائے چند آیات کے مکی سمجھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اس کے برعکس خیال رکھتے ہیں۔

اگر ہم مکی اور مدنی سورتوں کے مطالب ومفاہیم، دونوں جگہوں کے ماحول مسلمانوں کی ضروریات اور اسی لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ کی تعلیمات کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو فوراً واضح ہو جاتا ہے کہ اس سورت کی بعض آیات مدنی سورتوں میں پائی جانے والی آیات سے مشابہ ہیں۔ جیسے حج اور جہاد کے احکامات اور تفصیلات جن کا تعلق مسلمانوں کی مدنی زندگی اور ضروریات سے ہے اور بعض آیات مکی سورتوں میں پائی جانے والی آیات جیسی ہیں۔ مثلاً ابتدائے خلقت اور قیامت کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

"تاریخ القرآن" کا موئف فہرست ابن ندیم اور نظم الدار، دو تاریخی کتب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سورۂ حج ماسوائے چند آیات کے مدینہ میں نازل ہوئی اور وہ چند آیات بھی مکہ ومدینہ کے درمیان نازل ہوئیں۔ ترتیب نزولی میں اس سورت کا نمبر ایک سو چھ ہے یہ سورت سورۂ نور کے بعد اور سورۂ منافقین سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر اس سورہ کا مدنی ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مطالب اور مضامین کے اعتبار سے اس سورت کی مندرجہ ذیل تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱۔ قیامت کا بیان بہت سی آیات اس مضمون کی حامل ہیں، ان میں قیامت کا منطقی استدلال اور غافل لوگوں کو جوابدہی کی وعید موجود ہے۔ غرضیکہ ابتدائی آیات اس بارے میں ہیں۔

۲۔ شرک اور مشرکین کا بیان آیات کا دوسرا حصہ شرک اور مشرکین کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے سے متعلق ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے حوالے سے انسان کی توجہ خالق کی عظمت کی طرف دلائی گئی ہے۔

۳۔ عذاب الٰہی کا بیان آیات کا ایک حصہ گزشتہ اقوام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید عذاب اور ان کے عبرتناک انجام کے مطالعے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان اقوام میں سے خاص طور پر قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم شعیب اور قوم موسیٰ کا انجام یاد دلایا گیا ہے۔

۴۔ حج کا بیان آیات کا چوتھا حصہ حج کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں حج کا تاریخی پس منظر، حضرت ابراہیمؑ سے لے کر طلوع اسلام

Marfat.com

یک حج کی تاریخ مسئلہ قربانی اور طواف کے احکامات واضح طور پر بیان گئے ہیں۔

۵۔ ظالموں کے خلاف قیام کا بیان آیات کا ایک اور حصہ جابروں اور ظالموں کے خلاف اٹھنے اور دشمنوں کی جارحیت سے نپٹنے کے بارے میں ہے۔

۶۔ فروعِ دین کا بیان آیات کا آخری حصہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق وعظ و نصیحت پر مشتمل ہے، اس میں نماز اور زکوٰۃ کی ترغیب دی گئی ہے، بھلائی کی تلقین، برائی پر تنبیہ اور توکل علی اللہ کی طرف رغبت دلائی گئی ہے

اس سورت کی تلاوت کے فضائل

اسلام کے گرامی قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک کچھ حدیث مروی ہے۔

من قرء سورة الحج اعطى من الاجر كحجة حجها و عمرة اعتمرها بعدد من حج واعتمر فيما مضى وفيما بقى۔

جو بھی سورۂ حج کی تلاوت کرے اللہ اسے ان تمام لوگوں کی تعداد کے برابر اجر و ثواب عطا کرے گا جو گذشتہ زمانے میں حج و عمرہ بجالائے اور جو آئندہ بجالائیں گے۔[1]

اس میں شک نہیں کہ یہ کثیر ثواب اور عظیم درجہ صرف لفظی تلاوت سے حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ فکر ساز تلاوت سے حاصل ہوگا۔ ایسی فکر جو عمل پرور ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اس سورت میں مندرج مبدا و معاد کے نظریات کو دل کی گہرائیوں سے مانے، اخلاقیات، عبادات کو جان و دل سے اپنائے اور متکبر و ظالم طاقتوں کے خلاف جہاد سے متعلق آیات کو اپنی عملی زندگی کا جزو بنائے۔ اس کا روحانی رشتہ تمام گذشتہ و آئندہ مومنین کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسا رشتہ کہ جس سے یہ ان کے اعمال میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کے اعمال میں شریک ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ان کے ثواب میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ ایک حلقہ اتصال بن جاتا ہے۔ جس میں ہر دور کے اہل ایمان شامل ہیں۔ اس تناظر میں مذکورہ بالا حدیث کا مضمون ہرگز عجیب معلوم نہیں ہوتا۔

---

[1] مجمع البیان سورۂ حج کی تفسیر کے آغاز میں۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ‌ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَىۡءٌ عَظِيۡمٌ‏ ○

۲۔ يَوۡمَ تَرَوۡنَهَا تَذۡهَلُ كُلُّ مُرۡضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمۡ بِسُكٰرٰى وَلٰـكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيۡدٌ‏ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ اے لوگو! اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرو، اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے۔

۲۔ جس دن یہ رُونما ہو گا تم دیکھو گے کہ (وحشت وخوف کا یہ عالم ہو گا کہ) شیرخوار بچوں کی ماؤں کو بچّوں کا ہوش نہیں رہے گا اور ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا۔ اور تجھے یوں لگے گا گویا لوگ مدہوش ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ بلکہ اللہ کے عذاب کی شدت ہی کچھ ایسی ہو گی

Marfat.com

تفسیر

قیامت کا وحشت ناک زلزلہ

اس سُورت کا آغاز ایسی دو آیتوں سے ہو رہا ہے، جن میں جھنجھوڑنے اور ہلا کر رکھ دینے والے واقعات کا ذکر ہے ایک قیامت دوسرا "مقدمہ قیامت" یہ آیتیں انسان کو بے ساختہ اس فانی دُنیا کے اس ہولناک مستقبل کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ جو اس کے انتظار میں ہے۔ وہ مستقبل کہ اگر آج اس کے بارے میں سوچا نہ گیا اور عملی طور پر تیاری نہ کی گئی تو واقعی خوفناک ہوگا۔ اور اگر تیاری کر لی گئی تو پُرکشش اور خوشگوار ہوگا۔

پہلی آیت میں بلا استثناء سب لوگوں سے کہا گیا ہے: اے لوگو! پروردگار کے عذاب سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو، کیونکہ قیامت کا زلزلہ بہت شدید اور اہم واقعہ ہے۔ (یا ایہا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیءٌ عظیم)۔

"یا ایہا الناس" کا خطاب واضح کر رہا ہے کہ یہاں رنگ، نسل، زبان، مکان، زمان، جغرافیائی حدود اور قوم قبیلہ میں ترجیح اور فرق روا نہیں رکھا گیا۔ مومن، کافر، چھوٹا، بڑا، بوڑھا، جوان، مرد، عورت، ماضی، حال اور مستقبل غرضیکہ کوئی بھی اس خطاب سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

"اتقوا ربکم" یہ جملہ تمام تعمیری پروگراموں اور کاموں پر محیط ہے کیونکہ ربکم کہہ کر توحید کو بیان کر دیا گیا ہے، اور پھر تقویٰ کا ذکر ہے، گویا اس میں عقاید اور اعمال دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔

"اِنَّ زلزلۃ الساعۃ شیءٌ عظیم" یہ جملہ اجمالاً اس امر واقعہ کا ذکر کر رہا ہے، جو دیگر قرآنی آیات میں جا بجا آیا ہے اس سے مراد قیامت ہے اور جب قیامت آئے گی تو عالم کائنات بُری طرح دگرگوں اور زیروزبر ہو جائے گا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، دریا ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جائیں گے۔ زمین و آسمان درہم برہم ہو جائیں گے اور ایک نیا عالم، نئی زندگی کے ساتھ شروع ہوگا، عالم قیامت میں لوگ شدید دہشت اور سراسیمگی کی حالت میں ہوں گے۔

اس کے بعد والی آیت میں اس کیفیت کے چند نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ "یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت"

"خوف اور بوکھلاہٹ کا یہ حال ہوگا کہ مائیں اپنے شیرخوار بچوں تک سے غافل ہو جائیں گی"۔

۲۔ "وتضع کل ذات حمل حملھا"

"گھبراہٹ کی وجہ سے ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا"۔

۳۔ "وتری الناس سکٰری وما ھم بسکٰری"

"لوگ مدہوشی کی سی کیفیت میں دکھائی دیں گے۔ حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے"۔

۴۔ "ولکن عذاب اللہ شدید"

Marfat.com

"لیکن اللہ کا عذاب اتنا دلدوز ہو گا کہ ڈر کے مارے لوگوں کو اپنا ہوش نہیں رہے گا"

چند اہم نکات

۱۔ دُنیا میں قیامت کے مظاہر

یہاں قیامت کے جن مظاہر کا ذکر ہے ، جزوی طور پر ایسے مظاہر کبھی کبھی اس دنیا میں بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ ایسے ایسے زلزلے اور وحشت ناک حوادث پیدا ہوتے ہیں کہ ماؤں کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ہوش نہیں رہتا ۔ حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں ، لیکن سب لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ۔ جبکہ قیامت کا زلزلہ ہمہ گیر ہو گا ۔ اور اس کے نتیجے میں سب لوگ ان حالات سے دوچار ہوں گے

۲۔ یہ آیات کس موقع کے بارے میں ہیں

ممکن ہے یہ آیات اس عالم کے اختتام کے بارے میں ہوں کہ جو قیامت کی تمہید ہے ۔ اس صورت میں حاملہ عورتوں اور شیر خوار بچوں کا مفہوم حقیقی ہو گا ۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے ، کہ یہاں روز قیامت کے زلزلے کی طرف اشارہ ہو " ولکن عذاب اللہ شدید " اس کے لیے قرینہ ہے) اس صورت میں مذکورہ بالا آیات کی حیثیت مثال کی سی ہو گی ۔ یعنی قیامت کا منظر اس قدر وحشت ناک ہو گا ، کہ اگر حاملہ عورتیں موجود ہوں تو ان سب کے حمل ساقط ہو جائیں گے ۔ اور ماؤں کے ساتھ شیر خوار بچے ہوں تو انہیں ان کا ہوش نہ رہے ۔

۳۔ "مرضعة" کے مفہوم کا ایک خاص پہلو

ہم جانتے ہیں کہ عربی ادب میں دودھ پلانے والی عورت کو عام طور پر "مرضع" کہتے ہیں[1] لیکن جیسا کہ بعض مفسرین اور کچھ اہل لغت نے لکھا ہے کہ جب یہ لفظ " مرضعہ " یعنی مؤنث کی صورت میں استعمال ہوتا ہے تو یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جب عورت دودھ پلا رہی ہو ۔ بہ الفاظ دیگر " مرضع " اس عورت کو کہتے ہیں جو بچے کو دودھ پلا سکے ۔ لیکن " مرضعة " کا مفہوم عورت کی اس حالت کے لیے مخصوص ہے کہ جب وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو ۔ لہٰذا زیر نظر آیت میں اس لفظ میں ایک خاص نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ قیامت کے زلزلے کی شدت اور وحشت اس قدر ہو گی کہ یہاں تک کہ ماں اگر بچے کو دودھ پلا رہی ہو گی تو وحشت کے مارے بے اختیار ہو کر پستان بچے کے منہ سے نکال لے گی اور اسے بچے کا ہوش نہیں رہے گا ۔

۴۔ "تری الناس سکٰری" کا مفہوم

اس کا معنیٰ ہے کہ " تو لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ مدہوشی کے عالم میں ہوں گے " یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کہ جو اس جملے کے مخاطب ہیں (اور احتمالاً بہت قوی ایمان والے مومنین بھی کہ جو آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چلتے ہیں) اس عظیم وحشت سے مامون ہوں گے ۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ تو لوگوں کی یہ حالت دیکھے گا ، یعنی خود تیری یہ حالت نہ ہو گی ۔

---

[1] کیونکہ تانیث کی علامت اس صورت میں استعمال ہوتی ہے ، جب کسی چیز کے مذکر اور مؤنث دونوں موجود ہوں ، جبکہ حاملہ ہونے اور دودھ دینے کا مسئلہ صرف عورتوں سے مخصوص ہے اور مردوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا تا ر تانیث وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے ۔

Marfat.com

۵ - ایک اہم واقعہ

بہت سے مفسرین اور راویان حدیث نے زیر بحث آیات کے ذیل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس کا ذکر یہاں مناسب رہے گا۔ روایت یہ ہے کہ اس سورہ کی دو ابتدائی آیات غزوہ بنی المصطلق[1] کی ایک رات نازل ہوئیں۔ جب لوگ میدان جنگ کی طرف جا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو بلایا، وہ رک گئے۔ سب نے آپ کے گرد حلقہ باندھ لیا، اس وقت آپ نے یہ آیات ان کے سامنے تلاوت کیں۔ لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس شب مسلمانوں نے بہت گریہ کیا۔ صبح ہوئی تو ان کی یہ حالت تھی کہ انھیں نہ یہ دُنیا بھلی لگتی تھی نہ یہ زندگی، حتیٰ کہ انھوں نے اپنی سواریوں پہ زینیں بھی نہ ڈالیں اور نہ ہی خیمے لگائے۔ ان میں سے کچھ گریہ وزاری کر رہے تھے۔ اور کچھ فکر میں غلطاں تھے۔

ایسے میں رسول اللہؐ نے فرمایا

کیا تم جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے ؟

وہ کہنے لگے

خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔

فرمایا۔

یہ وہ دن ہے جب ہزار میں سے ۹۹۹ افراد جہنم کی طرف روانہ ہوں گے اور صرف ایک شخص جنت کی طرف جائے گا۔

یہ بات مسلمانوں کے لیے بڑی گراں تھی، وہ بہت روئے اور عرض کی:

"یا رسول اللہؐ! پھر کون نجات پائے گا"

فرمایا۔

گناہگاروں کی اکثریت کا تعلق تم سے نہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ کم از کم اہل بہشت کا ایک چوتھائی ہوگے۔

یہ سُنا تو مسلمانوں نے تکبیر بلند کی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

مجھے توقع ہے کہ تم اہل بہشت کا ایک تہائی ہُوئے۔

مسلمانوں نے پھر تکبیر بلند کی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا

مجھے امید ہے کہ تم اہل بہشت کا دو تہائی ہوگے کیونکہ اہل جنت کی ۱۲۰ صفیں ہیں اور ان میں سے ۸۰ صفیں میری امت کی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔[2]

---

[1] یہ جنگ چھٹی ہجری کے ماہ شعبان میں وقوع پذیر ہوئی۔

[2] مجمع البیان، نور الثقلین اور دیگر تفاسیر (کچھ اختصار کے ساتھ)

Marfat.com

۳۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝

۴۔ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

ترجمہ

۳۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو بغیر کسی علم و دانش کے خدا کے بارے میں مجادلہ کرنے لگتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

۴۔ اس کے لیے لکھا جا چکا ہے کہ جو شخص بھی اس کی ولایت و سرپرستی میں جاتا ہے وہ اسے یقیناً گمراہ کر دیتا ہے اور جلا ڈالنے والی آگ کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے

تفسیر

شیطان کے پیروکار

گزشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ جس وقت قیامت کا زلزلہ آئے گا دہشت و اضطراب کے مارے لوگوں کی عمومی حالت کیا ہوگی۔ زیرِ بحث آیات میں جاہل لوگوں کے ایک گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ آنے والے ایسے عظیم حادثے سے غافل ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو کسی علم و دانش کے بغیر خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ (ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم)۔

یہ لوگ کبھی توحید، حق تعالیٰ کی یکتائی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ اور کبھی یہ لوگ مُردوں کی حیاتِ نو اور حشر و نشر کے لیے قدرتِ خدا کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں، جبکہ ان کے پاس اپنی باتوں کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

Marfat.com

کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بہت ہٹ دھرم، متعصب، مکار، اور فریبی مشرکین میں سے تھے اس کے ضد تھی کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں یہ کہتا تھا کہ قرآن تو گذشتہ لوگوں کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ حیات بعد از موت کا بھی منکر تھا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بیان تمام مشرکین کے بارے میں ہے۔ کہ جو توحید اور قدرتِ خدا کے مسئلے میں جھگڑتے تھے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ شانِ نزول کبھی بھی آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتی، ان دونوں اقوال کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اور اسکے مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کہ اندھی تقلید، تعصب، خرافات یا پیروی نفس کی بناء پر حق کے مقابلے میں نزاع و جدل کرنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ کہ جو کسی منطق و دانش کے تابع نہیں وہ سرکش و مردود شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ (ویتبع کل شیطان مرید)

صرف ایک شیطان کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ ہر شیطان کے پیچھے چلنے لگتے ہیں، چاہے وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے، کیونکہ ان میں سے ہر شیطان کا اپنا منصوبہ، اپنا جال اور مکر و فریب کے لیے اپنا حیلہ ہوتا ہے۔

لفظ "مرید" دراصل "مرد" (بروزن "سرد") کے مادہ سے ایسی بلند زمین کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی گھاس پھونس نہ ہو، اور پتوں سے خالی درخت کو "امرد" کہتے ہیں۔ اسی بناء پر جس نوجوان کی داڑھی کے بال نہ اُگے ہوں اسے بھی "امرد" کہتے ہیں۔

یہاں "مرید" سے مراد وہ شخص ہے جو ہر قسم کی خیر و سعادت اور صلاحیت سے عاری ہو۔ ایسا شخص طبعاً سرکش، ظالم، عاصی اور نافرمان ہوگا۔

واضح ہے کہ جس شیطان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اس کی پیروی سے انسان کا انجام کیا ہوگا، لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے اس کے لیے یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس کی اطاعت اختیار کرے گا اور اس کی سرپرستی کا طوق اپنی گردن میں ڈالے گا۔ اسے وہ یقیناً گمراہ کر دے گا اور جلا ڈالنے والی آگ کی طرف اس کی راہنمائی کرے گا (کتب علیہ انہ من تولاہ فانہ یضلہ ویھدیہ الی عذاب السعیر)۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ مجادلہ ہر دو حوالے سے

لفظ "مجادلہ" عرف عام میں بے بنیاد اور غیر منطقی بحث و تمحیص کو کہتے ہیں۔ لیکن اصل لغت کے لحاظ سے اس کا یہ مفہوم نہیں ہے، بلکہ لغت کے اعتبار سے ہر قسم کی بحث و گفتگو کے معنی میں ہے۔ یہ بحث حق بھی ہو سکتی ہے ناحق بھی۔ لہٰذا قرآن پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیتا ہے۔

---

[1] "سعیر" "سعر" (بروزن "قعر") کے مادہ سے آگ بھڑک اُٹھنے کے معنی میں ہے یہاں مراد جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ جو ہر آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔

Marfat.com

وجادلهم بالتي هي احسن

اسپنے مخالفین کے ساتھ احسن طریقے سے مجادلہ کرو (نحل - ۱۲۵)

۲۔ باطل مجادلہ شیطانی طریقہ ہے

بعض بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے۔ "یجادل فی اللہ بغیر علم" مشرکین کی بے بنیاد بحث و تکرار کی طرف اشارہ ہے اور "ویتبع کل شیطان مرید" ان غلط کاموں کی طرف اشارہ ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ پہلا جملہ ان کے فاسد اور خرافاتی عقائد کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسرا غلط اور ان کے غلط اور انحرافی کاموں کی۔

لیکن ؟ ۔ قبل کی اور بعد کی آیات چونکہ بنیادی اعتقادات اور اصول وعقاید کے بارے میں ہیں۔ لہٰذا ابعید نہیں کہ دونوں جملے ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں طرفین ایک ہی موضوع کا نفی و اثبات ہے۔ پہلے جملے میں کہا گیا ہے کہ وہ کسی علم و دانش کے بغیر صرف تقلید، تعصب اور ہوا پرستی کی بنا پر خدا اور اس کی قدرت کے بارے میں جھگڑنے لگتے ہیں، اور دوسرے جملے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص علم و دانش کی اتباع نہیں کرتا، فطری امر ہے کہ وہ ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے۔

۳۔ ہر شیطان کی پیروی ۔ کیوں ؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ایسا شخص شیطان کی پیروی کرتا ہے، بلکہ کہتا ہے کہ ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے ؟

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام شیطانوں کا پروگرام اور مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ ہر ایک نے ایک خاص راستہ اور جال منتخب کر رکھا ہے، ان کے جال طرح طرح کے اور قسم قسم کے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان انہیں پہچاننے میں کھو کر رہ جاتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان اور توکل علی اللہ کی وجہ سے حمایت الٰہی کے زیر سایہ آجاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (حجر - ۴۰)

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ظلم و سرکشی کا ہونا اور خیر و برکت سے تہی ہونا لفظ "شیطان" کے مفہوم میں پوشیدہ ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ لفظ "مرید" (یعنی - ہر قسم کے خیر و سعادت سے تہی) کا استعمال تاکید کے طور پر ہے تاکہ اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بالکل واضح ہو جائے۔

۴۔ "کتب علیہ" کا مفہوم

ہم جانتے ہیں کہ یہ تعبیر مقرر کرنے اور لازمی طور پر واقع ہونے کے معنی میں ہے۔ چاہے ایسا عالم تکوین میں ہو یا عالم تشریع میں ہو۔

تاہم یہ توہم نہیں ہونا چاہیئے کہ اس جملے میں جبر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ شیاطین مجبور ہیں کہ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کریں اور دارالبوار کی طرف بھیجیں، بلکہ یہ اس طرز عمل کا حتمی نتیجہ ہے، جو انھوں نے برضا و رغبت اختیار کیا ہے۔ مثلاً سردار شیاطین ابلیس نے فرمان الٰہی کی مخالفت اور سرکشی اپنے ارادہ و اختیار سے کی، بلکہ اس نے تو خدا کی ذات پاک پر اعتراض بھی کیا، لہٰذا ایسے افراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسرے کو گمراہ کرنے والے بھی ہیں۔ انسانوں اور جنوں میں سے موجود دوسرے

Marfat.com

شیطانوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔

یہ بالکل ایسی بات ہے کہ ہم کہیں کہ جو شخص منشیات کا عادی ہو جاتا ہے ۔ بدبختی اور سیاہ انجام اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے ظاہر ہے یہ بات جبر کی دلیل تو نہیں ہے[1]

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ "علیہ" کی ضمیر شیطان کی طرف لوٹتی ہے۔ جبکہ بعض نے کہا کہ یہ شیطان کے پیروکاروں کے بارے میں ہے کہ جن کا ذکر (ومن الناس من یجادل .....) میں کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ اس ضمیر کا تعلق شیطان سے ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے نزدیک کی ضمیر (من تولاہ ۔ کی ضمیر) بھی شیطان کی طرف لوٹ رہی ہے۔

Marfat.com

۵۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا
خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ‌ؕ
وَنُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ
طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ‌ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ
مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ
عِلْمٍ شَيْـئًا‌ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا
الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝
۶۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْىِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ
عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝
۷۔ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى
الْقُبُوْرِ ۝

ترجمہ

۵۔ اے لوگو! تمھیں قیامت کے آنے میں کوئی شک ہے (تو اس نکتے پر ذرا غور کر لو کہ) ہم نے تمھیں مٹی سے، نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر مضغہ (گوشت کے لوتھڑے) جو کبھی تو کسی شکل و صورت کا حامل ہوتا اور کبھی نہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم جان لو، (کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) پھر جنین کی صورت میں رحم مادر میں رکھا اور کبھی کسی

Marfat.com

کو ساقط کر دیا) اس کے بعد بچے کی صورت میں تمھیں پیدا کیا تاکہ پختگی اور بلوغت و کمال تک پہنچ سکو۔ اس دوران میں کئی ایک مر جاتے ہیں اور دوسرے اس قدر عمر پاتے ہیں کہ بڑھاپے کے انتہائی بُرے مرحلے تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی تمام تر معلومات اور تجربہ کھو بیٹھتے ہیں اور (دوسری طرف) تو دیکھے گا کہ زمین خشک اور مردہ ہوتی ہے، ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور نوع بہ نوع ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے۔

۶۔ یہ اس لیے کہ تمھیں پتہ چل جائے کہ اللہ برحق ہے، مردوں کو زندہ کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

۷۔ اور یہ کہ قیامت بہرحال آئے گی جس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں اور قبروں میں جتنے لوگ ہوں گے اللہ ان کو زندہ کرے گا

تفسیر

نباتات اور انسان کی پیدائش میں قیامت کے دلائل

گذشتہ آیات میں مبداء و معاد کے بارے میں مخالفین کے شکوک و شبہات سے متعلق گفتگو کی جا رہی تھی۔ زیر بحث آیتوں میں جسمانی معاد کو ثابت کرنے کے لیے دو بڑی مضبوط عقلی دلیلیں دی گئی ہیں۔ ایک دلیل جنین (اور شکم مادر کے دور) سے متعلق ہے۔ دوسری زمین کی حالت میں تبدیلی یعنی مٹی سے ہریالی اور پھر نباتات میں نمو و بالیدگی سے متعلق ہے) دراصل قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ قیامت کے وہ مناظر جن کا مشاہدہ عام طور پر انسان اس دنیا میں کرتا رہتا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کھول کر پیش کرے تاکہ انسان خوب سمجھ لے کہ موت کے بعد نہ صرف یہ کہ زندگی ناممکن نہیں ہے بلکہ وہ زندگی اس قدر فطری ہے کہ اس کی کئی مثالیں ہر روز اس کے سامنے آتی رہتی ہیں۔

سب سے پہلے تمام انسانوں سے یوں خطاب کیا گیا ہے: "اے لوگو! اگر تمھیں روز قیامت زندہ ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات ہیں تو اس دنیوی زندگی پر ہی نظر ڈال لو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے نطفہ بنایا۔ نطفے سے جمے ہوئے خون میں بدلا

Marfat.com

جمے ہوئے خون سے چبائے ہوئے گوشت میں ڈھالا جن میں سے بعض کسی شکل وصورت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ (یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغیر مخلقة)[1] یہ سب اس لیے ہے کہ تم پر کھل کر واضح ہو جائے کہ ہم ہر کام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں: (لنبین لکم) اور پھر ان جنین میں سے جن کو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی خلقت کی مدت مکمل کریں۔ ان کو ماؤں کے رحم میں ایک خاص مدت تک رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسروں کو درمیانی مدت ہی میں ساقط کر دیتے ہیں (ونقر فی الارحام ما نشآء الی اجل مسمی) پھر ایک انقلابی دور کا آغاز ہوتا ہے اور ہم تمھیں بچے کی صورت میں پیدا کر دیتے ہیں (ثم نخرجکم طفلا) اس طرح تمھاری زندگی کا محدود اور انحصاری دور شکمِ مادر میں پورا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تم ایک ایسے ماحول میں قدم رکھتے ہو، جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ وسائل، مواقع اور روشنی رکھتا ہے۔ یہاں تمھاری ترقی و تکامل تک وہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سرعت کے ساتھ اس کو جاری رکھتے ہو۔ "مقصد یہ ہے کہ تم جسمانی اور عقلی اعتبار سے کمال تک جا پہنچو۔" ثم لتبلغوا اشدکم) اس منزل پر تمھاری نادانی، دانائی، کمزوری طاقت اور محتاجی خود اختیاری میں بدل جاتی ہے۔ لیکن یہ کمال منزل آخر نہیں۔ بلکہ مزید مراحل بھی ہوتے ہیں۔ البتہ بعض افراد انتقال کر جاتے ہیں اور بعض مذکورہ کمال کے بعد تنزل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ دنیوی زندگی کے بدترین دور یعنی انتہائی بڑھاپے میں پہنچ جاتے ہیں۔ (ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الی ارذل العمر) اس مرحلے میں آدمی کی معلومات اور تجربات میں سے کچھ بھی اس کے دماغ میں نہیں رہتا، نسیان اور بھول چوک کے پردے اس کی عقل پر پڑ جاتے ہیں اور واقعی اس کی ایک بچے کی سی کیفیت ہو جاتی ہے (لکیلا یعلم من بعد علم شیئا)

یہ کمزوری، ضعف اور پژمردگی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی ایک نئے انتقالی مرحلے کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پھل بالکل پک جاتا ہے تو درخت سے اس کا رشتہ ٹوٹنے کا وقت یقینی ہوتا ہے۔

یہ عجیب وغریب تغیر و تبدل پروردگار عالمین کے بے پناہ اختیارات کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے کہ مُردوں کو زندہ کرنے کے سمیت اللہ تعالےٰ کے لیے ہر کام آسان کام ہے

دوسری دلیل روئیدگی اور نباتات کی پیداوار سے متعلق بیان کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ انسان سے یوں مخاطب ہے "موسم خزاں میں زمین کو تو بنجر اور چٹیل دیکھتا ہے، مگر جونہی ہم اس پر حیات بخش بارش برساتے ہیں، بہار آجاتی ہے، زمین میں حرکت، نمو اور بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف طرح طرح کے پودے اور گھاس لہلہاتے لگتے ہیں۔ (وتری الارض هامدة فاذا انزلنا علیها الماء اهتزت وربت وانبتت من کل زوج بهیج)[2]

---

[1] مضغه "مضغ" سے مشتق ہے جس کے معنی چبانے کے ہیں۔ یہ لفظ گوشت کی اس تھوڑی سی مقدار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کو انسان ایک ہی لقمہ میں چبا جائے۔

[2] "هامدة" بجھی ہوئی آگ کو "هامدة" کہا جاتا ہے اور یہ لفظ زمین کے اس حصے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جس پر گھاس پھونس زرد، خشک اور مردہ ہو گئی ہو۔ (مفردات راغب)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

Marfat.com

بعد والی دو آیتوں میں پروردگار عالم مذکورہ بالا دو دلیلوں سے مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے، پانچ نکات میں ان کا مقصد بیان کرتا ہے۔

۱۔ انسان اور نباتات کی زندگی کے مختلف مراحل کو اس لیے بیان کیا گیا تاکہ تم سمجھ لو کہ اللہ حق ہے (ذالک بان اللہ ھو الحق) چونکہ وہ خود حق ہے۔ لہٰذا اس کا پیدا کردہ نظام بھی برحق ہے اور قطعاً بے مقصد نہیں ہو سکتا، یہی نکتہ قرآن مجید میں ایک اور جگہ یوں بیان ہوا ہے۔

"وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما باطلا ذالک ظن الذین کفروا"

ہم نے آسمان، زمین اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے، اسے بے کار پیدا نہیں کیا یہ تو کفارہ کا وہم وگمان ہے۔ (ص۔ ۲۷)

چونکہ یہ کائنات بے مقصد نہیں، دوسری طرف زندگی کا اصلی مقصد اس کائنات تک محدود نہیں۔ لہٰذا لازمی طور پر معاد اور قیامت کا وجود ہے۔

۲۔ اس عالم حیات و ممات پر حکمران نظام ہم پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ: وہی ہے جو مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ (وانہ یحی الموتٰی) وہی ہے جو مٹی کے بدن کو زندگی کے لباس سے آراستہ کرتا ہے اور حقیر نطفے کو انسان کامل کا شرف بخشتا ہے۔ مردہ زمینوں میں جان ڈالتا ہے۔ اس دُنیا میں اس ذات کی طرف سے مسلسل حیات آفریں پروگرام مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کیا قیامت کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ کیا جا سکتا ہے [1]

۳۔ پروردگار عالمین ہر چیز پر قادر ہے، کوئی کام بھی اس کے لیے ناممکن نہیں ہے (وانہ علی کل شیء قدیر)۔ کیا وہ ذات جو بے جان مٹی کو نطفے میں تبدیل کرتی ہے۔ پھر اس حقیر نطفے کو مرحلہ وار نمو دیتے ہوئے ہر روز ایک نئی زندگی دیتی ہے، خشک بنجر اور جامد زمین کو اس طرح ہمہ گیر زندگی دیتی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں سرسبز و شاداب کھیتیاں ہر

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

تفسیر فی ظلال کے مطابق موت و حیات کی درمیانی حالت کو "ھامدۃ" کہا جاتا ہے۔ "اھتزت" "ھز" کے مادہ سے شدت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ "ربت" "ربو" بروزن "غلو" زیادتی افزائش اور نمو کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے ربا (یعنی سُود) یہیں سے لیا گیا ہے۔ "بھیج" خوبصورت دلکش اور پرکشش کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

[1] (انہ یحی الموتٰی) بعض مفسرین نے اس جملے کو قیامت کے دن انسان کی زندگی کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (وان اللہ یبعث من فی القبور) اس جملے کا معنیٰ بھی کم و بیش وہی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ پہلا جملہ اصل حیات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا مُردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت کی طرف لیکن ایک اور تفسیر کے مطابق (وانہ یحی الموتٰی) کا جملہ اس دنیا میں خدائی مسلسل حیات آفرینی کی طرف اشارہ ہے اور ہم نے بھی اسی تفسیر کو بنیاد بنایا ہے تاکہ قیامت کے بارے میں دلیل قائم کی جا سکے۔

Marfat.com

طرف لہلہاتی نظر آئیں، اس بات پر قادر نہیں ہوسکتی کہ موت کے بعد انسان کو پھر سے زندہ کرے ؟

۴۔ یہ بھی سمجھ لو کہ اس جہان کے خاتمے اور دوسرے جہاں کی ابتداء کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا (وان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیھا)

۵۔ یہ زندگی دنیا کا تمام کاروبار دراصل کسی نتیجے اور انجام کا مقدمہ ہے اور اس نتیجے کے دن اللہ سبحانہٗ ان سب کو جو قبروں میں پڑے ہوں گے زندہ کرے گا۔ (وان اللہ یبعث من فی القبور)۔

مذکورہ بالا پانچ نتائج کہ جن میں سے بعض تمہید ہیں، بعض اصل مضمون بعض امکانی کیفیت لیے ہوئے۔ جبکہ بعض واقع ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے ایک نقطے پر جا ملتے ہیں۔ وہ یہ کہ قیامت یعنی مُردوں کا حشر نشر نہ صرف یہ کہ امکان پذیر ہے، بلکہ واقع ہوگا۔ وہ لوگ جو حیات بعد ممات میں شک کرتے ہیں وہ شب و روز اس دنیا میں نباتات، حیوانات اور انسان کی زندگی اور موت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ وہ خدائی قدرت پر شک کریں۔ کیا انسان ابتداء میں مٹی سے نہیں بنا ؛ تو پھر تعجب کی کیا بات ہے کہ ایک دفعہ مرنے اور مٹی میں دفن ہونے کے بعد پھر اُٹھا لیا جائے۔ کیا ہر سال ہماری آنکھوں کے سامنے اس مٹی سے تروتازہ کھیتیاں نہیں نکلتیں تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر کئی سالوں بعد مُردہ انسان جاندار ہو کر مٹی سے اُٹھ کھڑا ہو۔

اگر دوسری زندگی کے بارے میں ان کو شک ہے تو ان کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جو نظام آفرینش اس دنیا میں جاری و ساری ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ زندگی دُنیا کا کوئی مقصد ہے، اگر نہیں تو یہ تمام کا تمام کاروبار دنیا بے ہودہ اور عبث ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ چند روزہ زندگی جو سینکڑوں مشکلات، پریشانیوں اور تکالیف سے عبارت ہے قطعاً کسی قسم کی قدروقیمت اور حیثیت نہیں رکھتی کہ اس حیرت انگیز کائنات کا وجود نصب العین اور مقصد اصل قرار پائے۔ اس بناء پر ماننا پڑے گا کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا جہان ضرور وجود رکھتا ہے۔ جو اس دُنیا کے مقابلے میں کہیں وسیع و عریض دائمی اور ابدی ہے اور اس زندگی کی اصل منزل بننے کے لائق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ انسانی زندگی سات مراحل پر مشتمل ہے

مذکورہ بالا آیتوں میں حقیقتِ قیامت کی تشریح کے ذیل میں سیر تکامل انسانی کے سات مراحل گنوائے گئے ہیں :

پہلا مرحلہ جب انسان محض مٹی ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے مٹی سے مراد وہ مٹی ہو، جس سے حضرت آدم بنائے گئے تھے۔ یہ امکان بھی ہے کہ اس مٹی سے قطع نظر ہر انسان مٹی سے بنتا ہے۔ کیونکہ نُطفے کے اجزاء انسانی خوراک سے بنتے ہیں اور خوراک مٹی کے اجزاء سے مرکب ہوتی ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ انسانی جسم کا ایک اہم حصہ پانی آکسیجن اور کاربن پر مشتمل ہوتا ہے کہ جو مٹی سے نہیں لیا گیا۔ لیکن بدن کے تمام بنیادی اعضاء چونکہ مٹی سے بنتے ہیں۔ لہٰذا یہ تعبیر سو فی صد صحیح ہے کہ انسان مٹی سے ہے۔

دوسرا مرحلہ نُطفے کا ہے۔ بے حس بے جان پاؤں میں روندی جانے والی مٹی نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ نطفہ جس میں نہایت چھوٹے چھوٹے ذی رُوح اجزاء ہوتے ہیں جو صرف خوردبین ہی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مرد کے نطفے کے اجزاء کو " اسپرم " اور عورت کے

Marfat.com

اجزاء کو "اَ دول" کہتے ہیں۔ یہ جاندار اجزاء اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک مرد کے نطفے میں شاید کئی لاکھ "اسپرم" موجود ہوں۔

زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ پیدائش کے بعد انسان آہستہ آہستہ اور تدریجاً نشوونما پاتا ہے اور یہ نشوونما زیادہ تر کمیت کے حساب سے ہوتی ہے۔ جبکہ رحم مادر میں نشوونما تیز تبدیلیوں اور حرکت کے ساتھ کیفیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

رحم مادر میں جنین کی کیفیت حیرت انگیز طریقے سے مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے۔ جیسے ایک معمولی سی بن چند ماہ میں ایک ہوائی جہاز کی شکل اختیار کر جائے۔ موجودہ زمانے میں "جنین" پر بڑی تحقیق کی جا چکی ہے۔ ماہرین کو موقع ملا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل کا مطالعہ کریں اور خدا کی عجیب وغریب قدرت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

تیسرا مرحلہ علقہ کا ہے۔ یہ نطفے کی تبدیل شدہ صورت ہے جب نطفہ شہتوت کے دانے کی طرح ایک جمے ہوئے خون کے ٹکڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسے سائنسی اصطلاح میں "مورولا" کہا جاتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جنین کے چاروں طرف ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ جنین کے اطرف کی تقسیم کی ابتدا کا مرحلہ ہے اور اس کیفیت کو "لاستولا" کہتے ہیں۔

چوتھے مرحلے میں یہی ٹکڑا چبائے ہوئے گوشت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اعضاء کی کوئی شکل وصورت واضح ہو۔ اچانک "جنین" کی پتلی سی کھال میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، اعضاء بدن ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں اور ہر عضو اپنے مخصوص کام کے لحاظ سے متشکل ہو جاتا ہے۔ بعض جنین جو اس تبدیلی سے قاصر رہتے ہوئے اپنی سابقہ حالت ہی میں باقی رہ جائیں یا ناقص رہ جائیں وہ ساقط ہو کر خارج ہو جاتے ہیں (مخلقة وغیر مخلقة) ہو سکتا ہے۔ یہ اشارہ مکمل خلقت و غیر مکمل خلقت" کی طرف ایک اشارہ ہو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا چار مراحل کے ذکر کے بعد قرآن مجید "لنبین لکم" کا جملہ ارشاد فرمایا ہے۔ گویا تھوڑی سی مدت میں یہ عجیب وغریب تبدیلیاں جو ایک معمولی سے قطرے کو مکمل انسان میں ڈھال دیتی ہیں۔ اس حقیقت کی واضح دلیل ہیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اس کے بعد "جنین" کے پانچویں، چھٹے اور ساتویں مراحل کا ذکر ہے جو ولادت کے بعد سے متعلق ہیں یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا[1]

یاد رہے کہ بچے کا ایک زندہ موجود کی صورت میں پیدا ہونا بذاتِ خود ایک زبردست تغیّر و تحرک ہے جو جنین ہی کے پے درپے تغیرات میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح بچپن، بلوغ اور بڑھاپا بھی "جنین" ہی کے ارتقائی مراحل ہیں۔ مذکورہ بالا آیہ مجیدہ میں "قیامت" کو "بعث" یعنی اُٹھانا یا زندہ کرنا" سے تعبیر کرنا بھی جنین کے ارتقائی مراحل کی آخری کڑی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی خاص توجہ کرنی چاہیئے کہ جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا اور اس مقدس کتاب نے "جنین کے مراحل" ایسی علمی وسائنسی گفتگو کی اس وقت نہ کوئی "جنین کو جانتا تھا اور نہ کوئی ایسا علم معرض وجود میں آیا تھا جو اس کی تفصیلات بیان کرے

---

[1] قابل توجہ یہ بات ہے کہ "ثم نخرجکم طفلا" کے جملے میں لفظ "طفلا" مفرد استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ ظاہراً "اطفالا" چاہیئے تھا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہو کہ "طفل" مصدری معنیٰ رکھتا ہے اور اس میں مفرد وجمع یکساں ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ مقصد "جنین" کے بارے میں ہے کہ بچوں کے بارے میں جو اس موقع پر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور بعد میں انہیں ظہور کرنا ہوتا ہے۔

Marfat.com

لہٰذا اپنی جگہ پر یہ خود ایک معجزے سے کم نہیں اور اس حقیقت کا بیّن ثبوت بھی ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔

۲۔ معادِ جسمانی

قرآن مجید نے جہاں بھی انسان کی بازگشت کا ذکر کیا ہے۔ بے شک وہاں انسان کی رُوح اور جسم دونوں ہی مراد ہیں۔ جنہوں نے معاد کو صرف روحانی ہونے تک محدود سمجھا اور صرف ارواح کی بقا کے قائل ہیں۔ انھوں نے قرآنی آیتوں کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ حالانکہ بہت سی آیتیں مذکورہ بالا آیتوں کی طرح بڑی وضاحتوں کے ساتھ معاد جسمانی کو بیان کرتی ہیں ورنہ جنین کے ارتقائی مراحل اور مردہ زمینوں کی شادابی معاد روحانی سے کسی طرح بھی کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ خصوصاً زیرِ بحث آیتوں کا آخری جملہ جو اس کاروبار ہستی کے انجام کو بیان کرتے ہوئے بڑی صراحت سے واضح کرتا ہے (وان اللہ یبعث من فی القبور) یعنی جو بھی قبروں میں ہوگا۔ اللہ سبحانہٗ اس کو اُٹھائے گا، کیونکہ قبر تو جسم کی جگہ ہے۔ نہ کہ رُوح کا مسکن، اصولی طور پر مشرکین کی ساری حیرت اور تعجب بھی معاد جسمانی پر تھا۔ یعنی ان کے پلّے یہ بات نہیں پڑتی تھی کہ مٹی میں خلط ملط ہو جانے والا آدمی دوبارہ کیسے اُٹھ کھڑا ہو گا۔ رُوح کی بقاء کا مسئلہ نہ صرف یہ کہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں تھی بلکہ ان کو منظور بھی تھا (غور فرمایئے)

۳۔ ارذل العمر

"ارذل" "رذل" کے مادہ سے مشتق ہے۔ یعنی گھٹیا اور ناپسندیدہ چیز، "ارذل العمر" یعنی انسان کی عُمر کا ناپسندیدہ زمانہ، جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے کمالات کو اس حد تک کھو بیٹھتا ہے کہ بقول قرآن مجید، اپنی معلومات اور تجربات تک کو بھول جاتا ہے اور بالکل ایک ناخواندہ اور ناسمجھ بچے کی مانند ہوجاتا ہے۔ بچوں کی طرح معمولی معمولی باتوں پر پریشان ہوجاتا ہے۔ پل میں خوش اور پل میں خفا ہو جاتا ہے۔ صبر و تحمل کا دامن بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ بچے سے اس بات کی توقع نہیں کی جاتی جو ایک بوڑھے آدمی کی جاتی ہے اور بچوں کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ رُوح اور جسم میں رشد و نمو کے ساتھ ساتھ یہ حالات بدل جائیں گے۔ جبکہ بوڑھے اس امید کے قابل نہیں ہوتے اور یہ کہ بچے کی یہ حالت کسی کمال کے زوال سے نہیں ہوئی جبکہ بوڑھا اپنا تمام مال و متاع کمال کھو کر اس حالت کو پہنچا ہے۔ ان جہات کے پیشِ نظر بوڑھوں کی حالت بچوں کی نسبت زیادہ ناگوار اور افسوسناک ہے۔ بعض روایات میں "ارذل العمر" سے سو سال سے زیادہ عُمر مراد لی گئی ہے۔[1]

یہ عمومی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے، لیکن ہو سکتا ہے کوئی شخص سو سال سے پہلے ہی ایسی حالت کو پہنچ جائے اور کوئی سو سال کے بعد بھی نہ پہنچے۔ ہر لحاظ سے چاک و چوبند رہے، خصوصاً عظیم اور اجل علماء و افاضل جو عموماً تحصیل و ترویج علوم میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہو۔ بہرحال عُمر کے اس حصّے میں خدا سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

ضمنی طور پر عرض ہے کہ ان حقائق سے آگاہی ہمیں غرور اور تکبر سے نکالنے کے لیے کافی ہے کہ ہم پہلے کیا تھے۔ اب کیا ہیں اور آئندہ کیسے ہونے والے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۴۷

Marfat.com

۸۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ

۹۔ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝

۱۰۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ۧ

ترجمہ

۸۔ اور کچھ لوگ بغیر کسی علم و دانش کے اور بغیر کسی ہدایت اور واضح کتاب کے جھگڑنے لگتے ہیں

۹۔ وہ تکبّر اور (احکامات خدا سے) بے اعتنائی کر کے چاہتے ہیں، کہ لوگوں کو خدا کے راستے سے گمراہ کردیں۔ دنیا میں ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے اور قیامت میں ہم ان کو بھسم کر دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

۱۰۔ (اور ان میں سے ہر کسی سے کہیں گے) یہ سب کچھ خود تیرا ہی کیا دھرا ہے اور اللہ تو اپنے بندوں پر کبھی زیادتی نہیں کرتا۔

تفسیر

کج بحثی کرنے والوں کے بارے میں

ان آیتوں میں بھی ان لوگوں کی کج بحثی کا تذکرہ ہے جو مبدا و معاد سے متعلق بے سروپا باتیں کرتے ہیں۔

Marfat.com

پہلے بیان کیا جارہا ہے، کہ لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو کسی قسم کے علم، ہدایت اور کتاب کے بغیر ہی خدا کے بارے میں کج بحثی کرنے لگتا ہے (ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولاھدی ولاکتاب منیر)۔

(ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم) کا جملہ پہلے کی چند آیتوں میں گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی وہی تعبیر ہے جو وہاں تھی۔ جملے کا تکرار ظاہر کرتا ہے کہ وہاں اس جملے سے اور لوگ مراد تھے اور یہاں کوئی اور۔

تفسیر "المیزان" اور "کبیر" میں مذکورہ بالا دونوں گروہوں میں یہ فرق بیان کیا گیا ہے، کہ پہلے کی آیتوں میں اس جملے سے مراد گمراہ اور بے خبر عوام الناس ہیں جبکہ اس آیت میں خواص اور سربرآوردہ افراد ہیں (لیضل عن سبیل اللہ) کا جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس گروہ کا کام دوسروں کو راہ راست سے بھٹکانا ہے۔ یہی مذکورہ بالا فرق کا واضح قرینہ ہے۔ جیسے گذشتہ آیتوں میں (یتبع کل شیطان مرید) کا جملہ جو شیطانوں کی پیروی کے بارے میں تھا، اس معنے کو زیادہ واضح کرتا ہے۔

اس بارے میں کہ "علم" "ھدی" اور "کتاب منیر" میں کیا فرق ہے، مفسرین کے درمیان اس میں بھی اختلاف ہے۔ ہماری نظر میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ "علم" سے عقلی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔ "ھدی" سے اللہ سبحانہ کی طرف سے انبیاءؑ، ائمہؑ اور صلحاء کی رہنمائی کی طرف اور "کتاب منیر" سے آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جملے میں کتاب، سنت اور دلیل عقلی تینوں مشہور دلائل اور "اجماع" (اس معنیٰ میں کہ علماء کے مطابق دراصل اس سے مراد بھی سنت ہی ہے) ساری ادلہ شرعیہ اربعہ بیان کر دی گئی ہیں۔

بعض مفسرین کے مطابق "ھدی" سے مراد وہ معنوی رہنمائی ہے، جو انسان کو ذاتی اصلاح پرہیز گاری اور تہذیب نفس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے (البتہ یہ مفہوم ہمارے مذکورہ بالا مفہوم کے ہم آہنگ ہے) دراصل علمی بحث وتمحیص اس صورت میں مفید ونتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے۔ جب یہ کتاب، سنت اور دلائل عقلی پر مبنی ہو۔

اس کے بعد ان گمراہی کے رہبروں کی روگردانی کی ایک وجہ ایک مختصر مگر معنی خیز جملے میں بیان کی جارہی ہے۔ وہ تکبر اور خدا کی باتوں اور واضح عقلی دلائل سے بے اعتنائی کرتے ہوئے چلتے ہیں کہ لوگوں کو راہ خدا سے ہٹائیں۔ (ثانی عطفہ لیضل عن سبیل اللہ)۔

"ثانی" "ثنی" کے مادہ سے پلٹنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور "عطف" پہلو کے معنیٰ میں۔ پہلو لپیٹنا کسی چیز سے پہلوتہی اور بے اعتنائی کا ایک لطیف کنایہ ہے۔

"لیضل" کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اُن لوگوں کی پہلوتہی اور روگردانی کا مقصد ہو، یعنی وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی خاطر خدائی آیتوں اور ہدایت سے بے اعتنائی کرتے ہیں اور انھیں کچھ نہیں سمجھتے، دوسرا یہ کہ ان کی پہلوتہی کا نتیجہ ہو۔ یعنی ان کی بے اعتنائی کا ثمر یہ ہے کہ لوگوں کو راہِ حق سے پھیر دیتے ہیں۔

اس کے بعد دنیا وآخرت میں ان کا انجام بیان کیا گیا ہے، کہ اس دُنیا میں ذلت، رسوائی اور بدنصیبی ان کا مقدر ہے اور آخرت میں ہم انہیں جلا دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے (لہ فی الدنیا خزی ونذیقہ یوم القیامۃ عذاب الحریق)۔

Marfat.com

اور ان میں سے ہر ایک سے کہا جائے گا: "یہ تیرا ہی کیا دھرا ہے، یہ وہ ہے جو تو نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے (ذٰلک بما قدمت یداک) اور اللہ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا (وان اللہ لیس بظلام للعبید) نہ کسی کو بلاوجہ سزا دیتا ہے اور نہ ہی سزا میں بلاوجہ اضافہ کرتا ہے۔ اس کا کام تو صرف عدل و انصاف کرنا ہے۔ [1]

یہ آیۂ مجیدہ ان آیتوں میں سے ہے جو جبر کے قائل فرقے کے نظریات کی نفی کرتی ہے اور افعالِ خدا میں عدالت کو ثابت کرتی ہے (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد سورہ آلِ عمران آیت نمبر ۱۸۲ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)

---

[1] "ظلام" مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "بہت زیادہ ظلم کرنے والا" خدائے تعالیٰ جو مطلقاً ظلم نہیں کرتا، اس لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بلاوجہ سزا دینا یا سزا میں اضافہ کرنا خدا کے نزدیک ایسا ہی ہے، جیسے ہمیشہ کے لیے بہت زیادہ ظلم کیا جاتا۔

Marfat.com

۱۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ
خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ
عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○

۱۲۔ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ
ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ○

۱۳۔ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى
وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ○

۱۴۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ
مَا يُرِيْدُ ○

ترجمہ

۱۱۔ بعض لوگ صرف زبانی کلامی اللہ کی پرستش کرتے ہیں (ان کا دلی ایمان بہت ہی کمزور ہے) یہی وجہ ہے کہ جب دنیوی منفعت حاصل کرتے ہیں تو مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر جونہی آزمائش مُصیبت آتی ہے۔ رو گردانی کرتے ہوئے کُفر کا رُخ کرتے ہیں۔ اس طرح دُنیا و آخرت کھو بیٹھتے ہیں

Marfat.com

اور یہی کھلا ہوا گھاٹا ہے۔

۱۲۔ وہ خدا کو چھوڑ کر اس کو پکارتے ہیں، جو کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا اور یہی گہری گمراہی ہے۔

۱۳۔ وہ اس کو پکارتے ہیں جس کی طرف سے نفع کی نسبت نقصان کا کہیں زیادہ اندیشہ ہے۔ کیسا ہی بُرا سرپرست اور کیسا بُرا ساتھی ہے۔

۱۴۔ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کیے اللہ ان کو ایسے باغات میں لے جائے گا، جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور (بے شک) اللہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے۔ اسے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

کفر کے گڑھے کے کنارے کھڑے لوگ

گزشتہ آیتوں میں دو گروہوں کا تذکرہ ہو رہا تھا ایک گمراہ کرنے والے لیڈروں کا، دوسرا گمراہ ہونے والے پیروکاروں کا لیکن زیر بحث آیتوں میں ایک تیسرے گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ لوگ کمزور ایمان والے ہیں۔

قرآن مجید اس گروہ کی تعریف یوں کر رہا ہے۔ بعض لوگ صرف زبان سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں، جب کہ ان کا دلی ایمان بالکل سطحی اور کمزور درجے کا ہے۔

(ومن الناس من یعبد اللہ علی حرفٍ)۔ "علی حرف" سے ہو سکتا ہے یہ مراد ہو کہ ان کا ایمان زبانی کلامی ہے اور دل میں صرف ایمان کی ایک معمولی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ یا اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ وہ دائرہ ایمان کے مرکز پر نہیں بلکہ ایک طرف کنارے پر کھڑے ہیں۔ کیونکہ "حرف" کا ایک معنیٰ کسی پہاڑی یا گھاٹی کا کنارہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جو کوئی کسی کنارے پر کھڑا ہو، مضبوط نہیں ہوگا۔ بلکہ معمولی سی حرکت سے لڑھک جائے گا۔ اور راستے سے ہٹ کر گر جائے گا۔ یہی حال کمزور ایمان والوں کا ہے کہ کسی معمولی سی چیز کے لیے ایمان برباد کر دیتے ہیں۔

ان کے ایمانی تزلزل کی تشریح قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے کہ "اگر دنیاوی منفعت میسر آجائے تو مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں اور اسے اسلام کی حقانیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی نقصان، کسی نعمت کے چھن جانے یا پریشانی کے ذریعے آزمائش اور

Marfat.com

امتحان میں مبتلاء ہو جائیں تو شدید بے قراری اور اضطراب کا شکار ہو کر کفر اختیار کر لیتے ہیں۔

(فان اصابه خير اطمان به وان اصابته فتنة انقلب علىٰ وجهه)[1]۔ گویا انہوں نے دین و ایمان کو مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر قبول کیا تھا کہ اگر ان کا مقصد پورا ہوا تو دین برحق ورنہ باطل و بے بنیاد۔

ابن عباس اور دوسرے متقدمین مفسرین نے اس آیۂ مجیدہ کی شانِ نزول اس طرح بیان فرمائی ہے کہ بعض اوقات بدؤں کا کوئی گروہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتا اور اس کی دلی مرادیں برآتیں۔ یعنی ان کے مویشی اچھے بچے دیتے ان کے اولاد نرینہ ہوتی اور ان کی مال و دولت میں اضافہ ہوتا تو وہ خوش ہو کر اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے حلقۂ بگوش عقیدت ہو جاتے، لیکن اگر اس کے برعکس ان کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوتیں، کوئی فرد بیمار پڑ جاتا یا مال مویشی میں کوئی نقصان ہو جاتا تو شیطانی وسوسے ان کے دلوں میں گھر کر لیتے اور کہتے کہ ان تمام مصیبتوں کا ذمہ دار یہ دین ہے، جسے تم نے قبول کیا ہے۔ نتیجۃً وہ اس دین سے پھر جاتے[2]۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید ان کے مادی مفادات کو "خیر" سے تعبیر کرتا ہے اور ان مفادات کے حاصل نہ ہونے کو فتنہ (آزمائش کا ذریعہ) سے "شر" سے نہیں، گویا کہ قرآن مجید یہ تصریح فرما رہا ہے کہ دُنیاوی ناخوشگوار حادثات شر اور بُرائی نہیں ہیں۔ بلکہ آزمائش و امتحان کا ذریعہ ہیں۔

آیۂ مجیدہ کے آخر میں یہ فرمایا جا رہا ہے "اس طرح سے وہ دُنیا و آخرت دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں"۔ (خسر الدنيا والأخرة) یہی تو واضح گھاٹا اور نقصان ہے کہ دُنیا و آخرت دونوں ہی برباد ہو جائیں۔ (ذٰلك هو الخسران المبين)۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے لوگ دین کو مادی مفادات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور مادی مفادات کے حصول کو دین کی حقانیت کی دلیل خیال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ، جو آج کل بھی بافراط موجود ہیں اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔ دراصل ایمان کو شرک اور بُت پرستی سے آلودہ کر لیتے ہیں۔ البتہ ان کا بُت بیوی، مال مویشی یا دیگر مفادات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا ایمان مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیۂ مجیدہ سے منافقین مُراد لیے ہیں۔ ہماری نظر میں اس آیۂ مجیدہ کے ذیل میں وہ منافقین جن کے دل میں ایمان بالکل نہ ہو، شمار نہیں کیے جا سکتے ورنہ یہ مفہوم آیۂ مجیدہ کے ظاہری معنیٰ کے خلاف ہو جائے گا۔ کیونکہ "يعبد الله" "اطمان به" اور "انقلب على وجهه" کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ جن لوگوں کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے۔ ان کے دل میں کمزور سا ایمان ہے۔ چنانچہ اگر کمزور ایمان والے منافقین مراد لیے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے اس کے بعد اس گروہ کے آلودہ ایمان خصوصاً توحید و ایمان باللہ سے روگردانی کے بعد کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہی ہے "وہ خدا کو چھوڑ کر اس کو پکارتے ہیں جو انہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

---

[1] "انقلب علی وجہہ" اگر اس جملے میں "انقلب" سے بازگشت مراد لیں تو اس جملے کا یہ معنیٰ ہو سکتا ہے کہ ایمان کی بالکل مخالف سمت کی طرف مُنہ کر لیتا ہے۔ گویا ہمیشہ ہی سے ایمان سے لاتعلق تھا۔

[2] تفسیر خوارزمی ج ۲۳ ص ۱۳ اور تفسیر قرطبی ج ۶ ص ۴۴۰۹۔

Marfat.com

(یدعوا من دون اللہ ما لا یضرہ وما لا ینفعہ) اگر وہ واقعی مفادات مادی کے خواہاں اور نقصان سے گریزاں ہیں اور ان کی نگاہ میں کسی دین کی حقانیت کا یہی معیار ہے تو پھر بتوں کی پرستش کی طرف کیوں مائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بت تو نہ کسی کو کچھ دے سکتے ہیں۔ اور نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ کسی بھی صلاحیت سے عاری بت انسان کی زندگی کو کسی طور پر متاثر نہیں کر سکتے بے شک یہ بڑی گہری گمراہی ہے۔"

(ذٰلک ھو الضلال البعید) ان کی گمراہی کا فاصلہ "راہِ راست" سے اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ دوبارہ ہدایت کی امید بہت کم ہو گئی ہے۔

اس کے بعد اس کی بدتر کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "وہ اس کو پکارتے ہیں، جس سے فائدے کی نسبت نقصان کی اُمید زیادہ ہے (یدعوا لمن ضرہٗ اقرب من نفعہ) کیونکہ یہ مصنوعی معبود دُنیا میں ان لوگوں کی فکری سطح کو بہت پست کر کے خرافات کی طرف لے جاتے ہیں اور آخرت میں جلانے والی آگ کا تحفہ دیتے ہیں۔ بلکہ سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۹۸ کے مصداق۔

"اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ اَنْتُمْ لَھَا وَارِدُوْنَ"

بے شک تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو جو دوزخ کا ایندھن ہیں اور تم ہی اس میں جانے والے ہو۔

آیۂ مجیدہ کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے "کیا ہی بُرے سرپرست اور مونس ہیں" لَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ بت نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ مگر بعد کی آیت میں یہ بیان ہُوا ہے کہ ان کا نقصان نفع سے زیادہ قریب ہے تو کیا یہ دونوں آیتیں متضاد ہیں؟ اس کا جواب ہم روز مرہ کی گفتگو میں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو ہر قسم کے خواص سے عاری جانتے ہیں اور پھر اس کی اسی حیثیت کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے۔ اس کو ضرر و نقصان کا منبع کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص سے راہ و رسم نہ بڑھاؤ کیونکہ وہ نہ دُنیا میں تمہارے کام آسکتا ہے نہ آخرت میں اور پھر اس کی مذموم صفات کو اور بڑھا کر ظاہر کرنے کے لیے یوں کہتے ہیں۔ بلکہ وہ تمہاری بدبختی اور ذلت کا سبب ہے۔ مزید برآں یہ جو ان کی طرف کسی کو نقصان نہ پہنچانے کی نسبت دی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے، کہ وہ اپنے مخالفین کا کچھ بگاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن جس نقصان کا ذکر ہے وہ ایک فطری اور لازمی نقصان ہے۔ جو ان کی پوجا کرنے والوں کو ہوتا ہے۔

افعل تفضیل کا صیغہ جیسا کہ "اقرب" اس کے بارے میں پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں کہ جن دو چیزوں کے درمیان موازنہ اور مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ ان دونوں میں وہ چیز ہو۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیادہ کمزور طرف زیرِ بحث صفت سے بالکل ہی عاری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ ترکِ گناہ پر تھوڑی دیر صبر و تحمل کرنا دوزخ کی آگ سے بہتر ہے۔ تو اس سے ہماری مُراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ دوزخ کی آگ میں کوئی اچھائی پائی جاتی ہے۔ جس کے مقابلے میں صبر کرنا زیادہ اچھا ہے۔ بلکہ یہاں یہ معنی ہے کہ دوزخ کی آگ ہر طرح کی اچھائی سے عاری ہے۔

Marfat.com

اس آیۂ مجیدہ کی مندرجہ بالا تفسیر جناب شیخ طوسی نے "تبیان" اور جناب طبرسی نے "مجمع البیان" میں بیان فرمائی ہے۔
البتہ بعض مفسرین مثلاً جناب فخر الدین نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زیر بحث دونوں آیتوں میں الگ الگ بُت مراد لیے گئے ہیں۔ پہلی آیت میں پتھر، لکڑی اور دیگر جمادات کے بے جان اور بے حس بتوں کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں انسان نما طاغوتی بتوں کا ذکر ہے اوّل الذکر بُت کسی قسم کا نقصان یا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ جب کہ موخر الذکر "ائمہ ضالّ" ہونے کے ناتے نقصان تو پہنچا سکتے ہیں۔ مگر فائدہ نہیں اور اگر بالفرض کوئی چھوٹی موٹی خوبی ان میں ہو بھی تو نقصان کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ انہوں نے اپنے خیال کے ثبوت کے طور پر (لبئس المولیٰ ولبئس العشیر) کا جملہ پیش کیا ہے، لہٰذا کوئی تضاد باقی نہیں رہتا[1]

قرآن مجید کا اسلوب بیان یہ ہے کہ اچھے اور بُرے کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لہٰذا زیر بحث آخری آیت میں ارشاد ہو رہا ہے: "وہ لوگ جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک کام کیے۔ اللہ ان کو ایسے باغات سے نوازتا ہے، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔ (ان اللہ یدخل الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جنّٰتٍ تجری من تحتها الانھٰر)۔ ان کا طرزِ عمل نہایت واضح، ان کے نظریات وافکار اور عملی خطوط متعین ہیں۔ ان کا سرپرست خود اللہ ہے اور ان کے ہمدم و مونس انبیاءؑ، شہداء، صالحین اور فرشتے ہیں۔ "بے شک اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے" (ان اللہ یفعل ما یرید)۔ اتنی اعلیٰ اور بڑھیا جزا اور بدلہ دینا اس کے لیے اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا ضدی اور ہٹ دھرم مشرکین اور ان کے گمراہ سربراہوں کو عبرتناک سزائیں دینا۔

مندرجہ بالا موازنے میں وہ لوگ جو صرف زبانی کلامی ایمان لاتے ہیں۔ دراصل دین کے ایک کنارے پر کھڑے ہیں اور معمولی سے وہم اور وسوسے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کا کوئی نیک عمل بھی نہیں۔ لیکن صالحین اور مومنین دائرہ اسلام کے مرکز میں واقع ہیں اور کڑی سے کڑی آزمائش بھی ان کو متزلزل نہیں کر سکتی، ان کے ایمانی درخت کی مضبوط جڑیں ہیں اور ان کے اعمال صالح اس کے میٹھے پھلوں کی طرح شاخوں پر عیاں ہیں۔ زیر بحث آیتوں کے مفہوم کا ایک رُخ یہ ہے اور دوسرا یہ کہ گمراہ گروہ کے معبود کسی قسم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، بلکہ مہلک و ضرر رساں ہیں۔ جبکہ مومنین کا سرپرست صاحبِ قدرت ہے اور ان کے لیے طرح طرح کا در قسم قسم کی نعمتیں مہیا کرتا ہے۔

[1] البتہ "المیزان" کے فاضل مؤلف نے "مید عوا" سے یقول مراد لیا ہے۔ جو آیت کے ظاہری معنی سے بعید ہے

Marfat.com

۱۵۔ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ
هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝
۱۶۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ
يُّرِيْدُ ۝
۱۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى
وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

ترجمہ

۱۵۔ جس شخص کو یہ گمان ہے کہ اللہ دُنیا و آخرت میں اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کریگا (وہ اسی وجہ سے پیچ و تاب کھا رہا ہے، پس جو کر سکتا ہے کر لے) وہ اپنے گھر کی چھت سے رسی باندھ کر اس سے لٹک جائے اور خودکشی کرلے (اور موت کے گڑھے تک جا پہنچے) اور دیکھ لے کہ آیا یہ کام اس کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر سکتا ہے؟

۱۶۔ اسی طرح ہم نے قرآن کو واضح آیتوں کی صورت میں اُتارا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

۱۷۔ صاحبانِ ایمان اور یہودیوں، صابئین، عیسائیوں، مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان

Marfat.com

اللہ روز قیامت فیصلہ چکا دے گا، حق کو باطل سے جدا کر کے دکھائے گا، اللہ ہر چیز پر گواہ ہے (اور ہر چیز سے آگاہ ہے)

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شان نزول بعض مفسرین نے یوں بیان کی ہے: "بنی اسد" اور بنی غطفان کہ جن کے ساتھ رسول اللہؐ کا ایک معاہدہ تھا۔ ان کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں خدا، محمد کی مدد بند نہ کردے۔ اس صورت میں ہم اپنے حلیف یہودیوں سے کٹ جائیں گے۔ اور ان سے کھانے پینے کی اشیا نہیں لے سکیں گے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو تنبیہ کی گئی اور ان کی شدید مذمت کی گئی۔

بعض دوسرے مفسرین نے شانِ نزول کے ضمن میں یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کا گروہ جو کفار پر شدت غضب کی بنا پر کسی اقدام کے لیے بے قرار اور بے تاب تھا۔ یہ کہتا تھا کہ پیغمبرِ اکرمؐ کی مدد کے سلسلے میں اللہ کا وعدہ کیوں پورا نہیں ہو رہا؟ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی جلد بازی پر ان کی سرزنش کی گئی۔[۱]

تفسیر

قیامت ــــ تمام اختلافات کے خاتمے کا دن

گذشتہ آیتوں میں کمزور ایمان والے لوگوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ زیرِ بحث آیتوں میں بھی ایک اور رُخ سے انہی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے۔ جو شخص اس وہم میں مبتلا ہے کہ اللہ دُنیا و آخرت میں اپنے پیغمبرؐ کی مدد نہیں کرے گا اور غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اس سے جو بن پڑے کر گزرے چاہے اپنے گھر کی چھت سے رسہ باندھ کر اس سے لٹک جائے۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرے اور موت کی وادی میں جا پہنچے اور دیکھے۔ کیا اس طرح اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ (من کان یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ) اس تفسیر کو عظیم مفسرین نے ایک قابلِ توجہ احتمال کے طور پر پیش کیا ہے۔[۲]

اس تفسیر کے مطابق "لن ینصرہ اللہ" کی ضمیر پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف پلٹتی ہے۔ اور "سماء" سے مراد گھر کی چھت ہے،

---

[۱] ابو الفتوح رازی اور فخر الدین رازی کی تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] تفاسیر مجمع البیان، تبیان، فخر الدین رازی، ابو الفتوح، صافی، قرطبی اور المیزان ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

(کیونکہ "سماء" کا لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اُوپر کی طرف ہو) "لیقطع" دم گھٹنے، سانس بند ہونے اور موت کی حالت تک پہنچ جانے کے معنیٰ میں ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور احتمالات بھی ہیں۔ مگر ان سب کا ذکر ضروری نہیں، صرف دو قابلِ ملاحظہ ہیں۔

۱۔ (سماء) سے مراد آسمان ہے۔ وہ لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کی مدد نہیں کرے گا۔ وہ آسمان کی طرف جائیں۔ یعنی آسمان پر چڑھ جائیں۔ اس میں ایک رسی لٹکائیں اور اس کا پھندا بنا کر زمین و آسمان کے درمیان پھانسی پالیں تاکہ ان کا دم گھٹ جائے (یا لٹک کر خود رسی کو کاٹ لیں تاکہ دھڑام زمین پر آرہیں) پھر دیکھو ان کو کچھ سکون میسر آتا ہے؟

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ مذکورہ ضمیر پیغمبرِ اکرمؐ کی بجائے خود ان اشخاص کی طرف پلٹتی ہے۔ یعنی ان کی طرف جو اس بدگمانی کا شکار ہیں اس طرح زیرِ بحث آیت کا معنیٰ یہ ہوگا۔ کہ "وہ افراد جن کا یہ خیال ہے کہ خدا ان کی مدد نہیں کرتا اور ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی روزی بند ہو جاتی ہے۔ جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے کریں۔ آسمان کی طرف چلے آئیں اور اپنے آپ کو ایک رسی سے لٹکائیں پھر اسی رسی کو کاٹ کر گریں تو کیا یوں ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گا" قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تمام مفسرین نے کم حوصلہ، زود رنج اور کمزور ایمان والے اشخاص کے بارے میں نفسیاتی لحاظ سے روشنی ڈالی ہے کہ جس وقت ان کی حالت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کو آگے راہ نہ ملے تو وہ گھبرا کر جنونی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی دیواروں پر مکّے برساتے ہیں، تو کبھی یہ چاہتے ہیں کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں، آخرکار اپنے قہر و غضب کو ختم کرنے کے لیے خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ان میں سے کوئی بھی حرکت ان کی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اگر وہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں، خود اعتمادی پیدا کریں اور مسائل کا مقابلہ استقامت سے کریں تو مسائل کا حل یقیناً ممکن ہے اس کے بعد کی آیت گزشتہ تمام آیتوں کا مفہوم سمیٹتے ہوئے بیان کرتی ہے، اس طرح ہم نے قرآن کو کھلی نشانیوں کی صورت میں نازل کیا ہے (وکذٰلک انزلناه اٰیات بینات) معاد اور قیامت کے وجود کے ضمن میں دلائل دیتے ہوئے۔ انسان کا جنینی دور نباتات کی نمو، بالیدگی اور مردہ زمینوں کی سرسبزی و شادابی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بتوں کی نااہلی کے دلائل ہیں اور آخر میں ان لوگوں کے بارے میں بیان ہے، جو دین کو مادی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد آیت آخر میں بیان کرتی ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود صرف واضح اور کھلی نشانیاں ہی کافی نہیں ہیں۔ بلکہ قبولِ حق کے لیے ذہنی آمادگی کی بھی ضرورت ہے۔

"اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (و ان اللہ یہدی من یرید)

ہم نے اکثر کہا ہے کہ اللہ کا ارادہ اور خواہش بغیر کسی وجہ کے نہیں ہُوا کرتی۔ وہ حکیم و مدبر ہے اور اس کے تمام اقدامات کسی خاص قانون کے تحت ہوتے ہیں۔ جو شخص اس کی راہ میں جہاد کے لیے اُٹھ کھڑا ہو اور دل سے ہدایت کا خواہاں ہو تو وہ اس کی واضح راہنمائی کرتا ہے۔ [1]

زیرِ بحث آخری آیت چھ مختلف مذاہب کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جن میں ایک مسلمان اور مومن ہیں: صاحبانِ ایمان اور یہودی

---

[1] "اِن اللہ یہدی من یرید" اس جملے کے بارے میں مشہور یہی ہے کہ اس میں مبتداء محذوف ہے اور دراصل یہ جملہ یوں ہے۔ "الامر ان اللہ یہدی من یرید" دوسرا احتمال یہ ہے کہ انّ (الف پر زبر اور زیر دونوں) کے معنیٰ میں ہو اور درمیان میں کوئی لفظ محذوف نہ ہو۔

Marfat.com

صابئیوں، عیسائیوں مجوسیوں اور مشرکوں کے درمیان، قیامت کے دن، اللہ فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل سے الگ کر کے دکھائے گا۔
(اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِیْنَ وَالنَّصٰرٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ")۔

قیامت کے جتنے نام آئے ہیں ان میں" یوم الفصل" یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے کا دن" یوم البروز" چھپے ہوئے حقائق سے آشکار ہو جانے کا دن اور اختلافات مکمل طور پر ختم ہو جانے کا دن بھی ہیں۔ ضرور بالضرور اس دن اللہ تمام اختلافات کو مٹا دے گا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے (ان اللہ علیٰ کُلِّ شیءٍ شھید)۔

چند اہم نکات

۱۔ آیتوں کا ایک دوسرے سے تعلق اس آیۂ مجیدہ کا تعلق پچھلی آیت سے اس طرح ہے کہ پچھلی آیۂ میں ہدایت چاہنے والوں کی ہدایت، کا ذکر تھا، چونکہ ہر دل ہدایت پسند نہیں ہوا کرتا اور تعصب ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید ہدایت حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ یہ دھڑے بندیاں اور اختلافات قیامت تک باقی رہیں گے۔ صرف اس دن تمام چھپے ہوئے حقائق واضح ہوں گے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں پہلی آیتوں میں تین قسم کے لوگوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ ایک وہ جو بلا کسی دلیل و ثبوت کے خدا اور قیامت پر بحث کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں اور تیسرے کمزور ایمان والے جو ہوا کے رُخ پر اُڑنے والے ہیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں صاحبانِ ایمان کے مقابلے میں آنے والے گروہوں میں سے بعض نمونے کے طور پر بیان کئے گئے ہیں اس سے قطع نظر گذشتہ آیتوں میں قیامت کے اغراض و مقاصد کے بارے میں گفت گو تھی۔ جبکہ یہ آیۂ کہتی ہے کہ قیامت کا ایک مقصد اختلافات کو مکمل ختم کر کے یگانگت کو معرضِ وجود میں لانا ہے۔

۲۔ مجوسی کون ہیں؟ سارے قرآن مجید میں صرف اس آیۂ میں لفظ" مجوس" آیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ مجوسیوں کو مشرکین کے مقابلے میں آسمانی ادیان کے پیرؤوں کی صف میں شامل کیا گیا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ مجوسی بھی کسی نبی کی اُمّت اور کسی دین کے پیرو تھے۔ البتہ آج کل زرتشت کی تاریخ میں مجوسیوں کا کوئی ذکر نہیں اور مورخین نے زرتشت کو حضرت عیسیٰؑ کے گیارہ یا چھ سات صدیاں پہلے لکھا ہے (اعلام القرآن ص۵۵) اس حیران کن اختلاف سے صاف ظاہر ہے کہ زرتشتی تاریخ کس قدر مبہم ہے مشہور یہ ہے۔ کہ زرتشت " اوستا" نامی کتاب رکھتا تھا۔ جو ایران پر سکندرِ اعظم کے قبضے کے وقت ناپید ہوگئی اور ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں دوبارہ لکھی گئی[1] زرتشتیوں کے نظریات کے بارے میں بھی خاص معلومات نہیں ملتیں البتہ ان کا دو مبداء (خیر و شر یا نور و ظلمت) کا عقیدہ مشہور ہے، بھلائی اور نور کے خدا کو" اہورا مزدا " اور برائی اور ظلمت کے خدا کو " اہرمن " کہتے ہیں۔ ہوا، پانی، مٹی اور آگ چار عناصر کا احترام کرتے ہیں۔ آگ سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں بھی ہوں، چھوٹا موٹا آتشدان ضرور بنا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کو آتش پرست

---

[1] تفسیر المیزان ج ۱۴، ص ۳۹۲

Marfat.com

بھی کہتے ہیں

بعض لفظ "مجوس" کو جو اس مذہب کے علماء اور پیشواؤں کے لیے بولا جاتا ہے "مغ" سے مشتق سمجھتے ہیں اور لفظ "مؤبد" جو آج کل ان کے علماء کے لیے مستعمل ہے۔ دراصل "مغود" سے ہی ہے۔ اسلامی روایات میں انہیں کسی نبیؑ کی اُمت قرار دیا گیا ہے۔ بعد میں یہ لوگ بھٹک کر شرک آمیز نظریات اپنا بیٹھے۔ ایک روایت ہے کہ مکہ کے بعض مشرکین نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ جزیہ لیکر انھیں بت پرستی کی اجازت دے دیں۔ آپؐ نے فرمایا میں اہل کتاب کے علاوہ کسی سے جزیہ نہیں لیتا، انھوں نے اعتراض کیا کہ آپ تو "ھجر" کے باسی مجوسیوں سے بھی جزیہ لیتے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا

"اِنَّ المجوس کان لھم نبی فقتلوہ وکتاب احرقوہ"

مجوسی ایک نبی کی اُمت تھے جسے انھوں نے قتل کر دیا اور ایک کتاب رکھتے تھے جسے انھوں نے جلا ڈالا۔[۱]

"اصبغ بن نباتہ" سے ایک اور روایت ہے کہ حضرت امیرؑ نے ایک دفعہ برسرِ منبر فرمایا۔

"سلونی قبل ان تفقدونی"

"اپنے درمیان مجھے نہ پانے سے پہلے پہلے مجھ سے جو چاہو پوچھ لو"

مشہور زمانہ منافق اشعث بن قیس کھڑا ہوا اور پوچھا۔

یا امیرالمومنین! مجوسیوں سے جزیہ کس طرح لیا جاسکتا ہے، جبکہ نہ وہ کسی نبی کی اُمت ہیں، نہ کسی کتاب کے پیرو؟

آپؑ نے فرمایا

قد انزل اللہ الیھم کتابًا وبعث الیھم نبیًّا۔

"اللہ نے ان پر ایک کتاب نازل کی تھی اور ایک نبی ان کی طرف بھیجا تھا"[۲]

امام سجاد، علی بن الحسین علیہما السلام نے پیغمبرِ اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپ کے فرمایا

"سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب یعنی المجوس۔

"مجوسیوں سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیا کرو"[۳]

یاد رہے کہ مجوسی کی جمع مجوس ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صابئین بھی کسی آسمانی دین کے پیرو تھے خصوصاً

۲۔ صابئین کون ہیں؟ جب کہ ان کا ذکر یہود و نصاریٰ کے درمیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین انھیں حضرت یحییٰ بن زکریاؑ جنہیں عیسائی یحییٰ تعمید دھندہ کہتے ہیں کے پیرو سمجھتے ہیں۔ دوسرے مفسرین کے مطابق صابئین وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریات کو مخلوط کر کے ایک نیا مذہب بنا لیا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ دونوں کے درمیان واسطہ سمجھے جاتے ہیں۔

"صابئین بہتے پانی سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر آبادیاں بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے

---

[۱] [۲] [۳] وسائل الشیعہ جلد ۱۱۔ ابواب جہاد العدو باب ۴۹ ص ۹۶

Marfat.com

واقع ہیں۔ بعض مفسرین نے ان پر ستارہ پرست ہونے کا الزام بھی لگایا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیۂ مجیدہ اس پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ ان کا ذکر مشرکین کی صف میں نہیں کیا گیا (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ کی تشریح سے رجوع کیجیے)۔

۴۔ توحید سے انحراف کرنے والے گروہوں کی ترتیب

مذکورہ بالا آیت میں تحریف شدہ پانچ مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ترتیب غالباً توحید سے درجۂ انحراف کے مطابق ہے۔ مسلمانوں کے بعد سب سے پہلے یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ توحید سے ان کا انحراف کچھ کم درجے کا ہے۔ اس کے بعد صائبین کا ذکر ہے جو عقاید کے اعتبار سے یہودیوں اور نصاریٰ کے درمیان ہیں اس لیے دوسرے نمبر پر ہیں تیسرے نمبر پر تثلیث کے قائل نصاریٰ کا ذکر ہے، ان کے بعد سارے عالم کو خیر و شر کے دو حصوں میں تقسیم کرنے والے اور ہر شعبے کے لیے دو مبدا کے قائل مجوسی ہیں۔ آخر میں بت پرست اور مشرکین جو توحید کے بالکل برعکس ہیں کا ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

۱۸۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡهِ الۡعَذَابُ ؕ وَ مَنۡ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ۞

ترجمہ

۱۸۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں رہنے والے سب ہی اللہ کیلیے سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چلنے والے جاندار اور بہت سے انسان اسی کے لیے سربسجود ہیں، جب کہ بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں اور ان کے لیے عذاب کا فرمان حتمی ہے اور جس کو اللہ رسوا کرے اسے کون باعزت بنا سکتا ہے۔ بے شک اللہ جس کام کو چاہتا ہے اور (صحیح سمجھتا ہے) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

عالم کی تمام موجودات اس کی بارگاہ میں سربسجود ہیں

گزشتہ آیتیں مبداء و معاد کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیت اسی مضمون کی تکمیل کرتے ہوئے مسئلہ توحید اور خدا شناسی کو پیش کرتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرکے کہا جا رہا ہے: "کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمانوں پر رہنے والے اور وہ جو روئے زمین پر ہیں، سب کے سب اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہیں۔ اور سورج چاند ستارے پہاڑ، درخت اور چلنے پھرنے والے

Marfat.com

جانور بھی (الم تران اللہ یسجد لہ من فی السماوات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب)۔

اور بہت سے لوگ بھی سجدہ کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے بہت سے انکار کرتے ہیں اور مستوجب عذاب ٹھہرتے ہیں۔" (و کثیر من الناس وکثیر حق علیہ العذاب)۔ اس کے بعد کہا جا رہا ہے۔

"یہ لوگ خدا کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور جو خدا کے حضور بے وقعت ہو، اس کی کوئی توقیر نہیں کرتا اور وہ سعادت و ثواب سے بہرور نہیں ہوتا (ومن یھن اللہ فمالہ من مکرم)۔ "بے شک خدا جس کام کو قرین مصلحت سمجھتا ہے انجام دیتا ہے" صاحبان ایمان کو عزت و احترام اور منکرین کو ذلیل و خوار کرتا ہے (ان اللہ یفعل ما یشاء)

چند نکات

۱۔ یہ سب چیزیں سجدہ کس طرح کرتی ہیں؟ قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں تمام موجودات کے سجدہ کرنے، تسبیح و تقدیس کرنے، حمد بیان کرنے اور نماز پڑھنے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا چار عبادتیں صرف انسانوں ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ جمادات تک اس میں شریک ہیں۔ اگرچہ سورہ رعد (دسویں جلد) اور سورہ اسرار (بارہویں جلد) میں علی الترتیب آیت نمبر ۱۵ اور ۴۴ کی تشریح کرتے ہوئے ہم نے اس موضوع پر کسی قدر بحث کی ہے لیکن یہاں بھی اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اشارے کرنا چاہتے ہیں۔ زیر بحث آیت میں جس سجدے کا ذکر ہے اس کی دو قسمیں ہیں یعنی عالم موجودات کی تمام چیزیں یا سجدۂ تکوینی کرتی ہیں یا سجدۂ تشریعی فطرت اور عالم اسباب کے قوانین کے تحت ہر ایک شے کا بغیر کسی شرط کے کمال خضوع و خشوع کے ساتھ تسلیم حق رہتے ہوئے اپنے کام میں سجدۂ تکوینی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حتیٰ کہ بڑے بڑے نافرمانوں نمرود اور فرعون کے دماغوں کے خلیے اور ان کے جسموں کے تمام ذرات بھی یہ سجدہ کرتے رہے ہیں۔

محققین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ کائنات کے تمام ذرات ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے زبان حال سے اللہ کی حمد و تسبیح بجالاتے ہیں۔ اور یہی ان کا سجدہ اور نماز ہے (اسی مفہوم کو ہم نے سورۂ اسرار کی آیۃ نمبر ۴۴ کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا ہے) اور اگر ذرات کا شعور تسلیم نہ کیا جائے تو ذرات کا عالم ہستی کے خاص نظام کے تحت محو کار رہنا کسی طور قابل انکار نہیں ہے۔ البتہ سجدۂ تشریعی، ذوالعقول کی طرف سے معرفت و شعور کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز ہونے کو کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان بھی اسی کائنات میں سے ہے اور جب مذکورہ بالا آیت میں تمام کائنات کے سجدے کا ذکر ہوا تو انسان بھی اس میں آگیا، پھر انسان کا ذکر الگ سے کیوں کیا گیا؟

تھوڑی سی توجہ کرنے سے جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس آیت میں لفظ "سجدہ"، "تشریعی و تکوینی" دونوں قسم کے سجدوں کو دامن میں لیئے ہوئے ہے۔ چنانچہ سورج، چاند ستارے، پہاڑ درخت اور جانوروں کے لیے تکوینی، لیکن انسان کے لیے تشریعی مراد لیا گیا ہے، جسے بہت سے لوگ بجالاتے ہیں۔ جب کہ بعض لوگ روگردانی بھی کرتے ہیں۔ اور "کثیر

Marfat.com

حق علیہ العذاب" کا مصداق بنتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک لفظ کا جامع اور وسیع مفہوم میں استعمال، اس کے کئی ایک مصادیق کے ہوتے ہُوئے بھی کسی خلل کا سبب نہیں ہوتا۔ یہ اصول تو انھوں نے بھی مانا ہے جو کسی مشترک لفظ کا متعدد معانی میں استعمال صحیح نہیں سمجھتے چہ جائیکہ جو صحیح سمجھتے ہوں (غور کیجیے گا)

۲۔ **کیا فرشتوں کا سجدہ "تشریعی" ہے؟** بے شک (یسجد لہ من فی السمٰوٰت ...) کے جملے میں فرشتے بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کا سجدہ کونسا ہے "تکوینی" یا "تشریعی"؟ اگر فرشتوں کی عقل و شعور اور صاحب ارادہ ہونے کو مدِ نظر رکھا جائے تو ان کا سجدہ "تشریعی" نظر آتا ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے ساتھ باخضوع وخضوع بطور عبادت انجام پاتا ہے۔ سورۂ تحریم آیۃ ۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔

لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون

اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے، بجالاتے ہیں۔

۳۔ **چند سوالات اور ان کے جوابات** "من فی الارض" کے جُملے کو ذہن میں رکھتے ہُوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کے بعد "کثیر من الناس" کیوں آیا ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ "کثیر من الناس" کا جملہ "من فی الارض" کے جُملے کی وضاحت کے لیے آیا ہے۔ یعنی زمین پر رہنے والے دو گروہ ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکنے والا مومنین کا گروہ، دوسرا باغی کافروں کا گروہ۔ بعض مفسرین نے ایک اور خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ کہ "من فی الارض" کا جُملہ جو عمومی حیثیت رکھتا ہے "سجود تکوینی" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس میں تمام انسان حتیٰ کہ کافروں کے وجود کا ایک ایک جز بھی شامل ہے۔ جب کہ "کثیر من الناس" کا جُملہ صرف "سجود تشریعی" کی طرف اشارہ ہے، جس کے لحاظ سے ان کا عمل مختلف ہے۔

ایک احتمال اور بھی ہے کہ "من فی الارض" دراصل زمین پر رہنے والے فرشتوں کے لیے آیا ہے، جس طرح "من فی السمآء" آسمان پر رہنے والے فرشتوں کے لیے ہے اور "کثیر من الناس" زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے آیا ہے۔

(ii) زیرِ بحث آیت میں آسمان وزمین پر بسنے والوں کا ذکر ہے۔ خود آسمان وزمین کا کیوں نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "نجوم" کے ذکر سے خود آسمان کا ذکر دیا گیا ہے اور "جبال" جو زمین کا ایک اہم حصہ ہیں، کے ذکر سے زمین کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

(iii) آخری سوال یہ ہے کہ آیت کے شروع میں "الم تر" (کیا تو دیکھتا نہیں) کیوں فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ موجودات عالم کا تکوینی سجدہ آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں "رؤیت" "علم" کے معنیٰ میں بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بہت ہی واضح حقائق کو مشاہدے کے ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ فلاں شخص زیادہ حاسد اور بخیل ہے یا فلاں شخص عالم اور عادل ہے۔ حالانکہ حسد، بخل، علم اور عدل ایسی صفات نہیں ہیں کہ جو دیکھی جا سکیں دراصل یہاں ان الفاظ سے مراد علم الیقین کا ادراک ہے۔

Marfat.com

۱۹۔ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا
قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ
الْحَمِیْمُ ۚ
۲۰۔ یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ؕ
۲۱۔ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ
۲۲۔ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا
وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۠
۲۳۔ اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ
اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ
۲۴۔ وَهُدُوْۤا اِلَى الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَهُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ
الْحَمِیْدِ

ترجمہ

۱۹۔ یہ دو مخالف گروہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا۔ پس جو منکر رہے۔ ان کے لیے آگ کے کپڑے تیار کیے جائیں گے اور ان کے سروں پر کھولتا ہوا مائع انڈیلا جائے گا۔

۲۰۔ جو ان کے جسموں کے اندر اور باہر کے حصول کو پگھلا کے رکھ دے گا۔

Marfat.com

۲۱۔ ان کے لیے آہنی گرز ہیں۔

۲۲۔ جب وہ دوزخ کی عقوبتوں سے نکلنا چاہیں گے۔ انہیں اس میں پھر لوٹا دیا جائے گا کہ جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو

۲۳۔ ایمان لانے اور اعمالِ صالح کرنے والوں کو اللہ فردوس بریں کے باغات میں بھیج دے گا۔ جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا، اور وہاں انھیں ریشمی پوشاک عطا کی جائے گی۔

۲۴۔ اور انھیں پاکیزہ باتوں کی ہدایت دی جائے گی اور ان کی راہنمائی اللہ کے اس راستے کی طرف کی جائے گی جو قابلِ ستائش ہے۔

شانِ نزول

شیعہ اور سُنی مفسرین میں سے بعض نے مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شان نزول یوں نقل کی ہے۔
جنگِ بدر میں مسلمانوں کی طرف سے جناب امیر حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب میدان کارزار میں نکلے اور ولید بن عتبہ، عتبہ بن ربیع اور شیبہ بن ربیعہ کو قتل کیا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اور مجاہدین کا یہ واقعہ بیان کیا۔ ابوذر غفاری قسم کھایا کرتے تھے کہ یہ آیت ان جوانمردوں کی شان میں نازل ہوئی ہے
لیکن متعدد بار اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ کسی آیت کا کسی ذات کے ساتھ مخصوص ہونا اس کے عمومی مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

لہ طبری نے مجمع البیان، فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر، آلوسی نے روح المعانی، سیوطی نے اسباب النزول اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

دو مدّمقابل گروہ

گزشتہ آیتوں میں مومنین سے ایک گروہ اور کفار کے مختلف گروہوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ مومنین اور غیر مومنین اپنے پروردگار کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہیں۔

(ھذان خصمان اختصموا فی ربھم)[1]

کفار کے پانچ گروہ ایک طرف اور مومنین کا ایک گروہ دوسری طرف اگر بغور سوچیں تو معلوم ہوگا کہ تمام ادیان میں اختلاف کی بنیاد پروردگار عالم کی ذات و صفات پر ہی ہے نتیجتاً اختلافات نبوت اور معاد و قیامت تک بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم یہاں لفظ "دین" کو مقدر مانیں اور کہیں کہ ان کا جھگڑا اپنے پروردگار کے دین کے بارے میں ہے۔ داقعہ یہ ہے کہ تمام تر اختلاف کی جڑ اور بنیاد توحید میں اختلاف ہے اور اصل میں تمام مسخ شدہ اور تحریف شدہ باطل ادیان کسی نہ کسی طرح کے "شرک" میں مبتلا ہیں، جس کے آثار ان کے تمام تر عقائد سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد کی آیت میں کفار کے لیے چھ قسم کی سزاؤں کا ذکر ہے۔ وہ کفار جو جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ حق کا انکار کرتے ہیں سب سے پہلے ان کے کپڑوں اور لباس کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کے کپڑے آگ سے تیار کیے جائیں گے۔ (فالذین کفروا قطعت لھم ثیاب من النار)۔ ہوسکتا ہے اس سے مراد یہ ہو کہ واقعی آگ کے ٹکڑے الگ کرکے لباس کی طرح سیئے جائیں گے یا اس سے یہ مراد ہو کہ آگ ان کو چاروں طرف سے لباس کی طرح گھیرے گی۔

اس کے بعد "حمیم" کا ذکر ہے۔ یعنی دوزخ کا کھولتا ہوا مائع ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا۔

(یصب من فوق رءوسھم الحمیم)۔[2]

یہ حمیم ان کے بدن کے ظاہر و باطن کو اس طرح متاثر کرے گا کہ یہ ان کے اندر کو بھی پگھلا دے گا اور باہر کو بھی۔

(یصھر بہ ما فی بطونھم والجلود)۔[3]

تیسرا یہ کہ جلانے والے آہنی تازیانے یا گرز ان کے لیے تیار ہیں۔

---

[1] خصمان میں تثنیہ ہے مگر اختصموا جو خصمان کا فعل ہے۔ جمع ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ مخالف دو اشخاص نہیں بلکہ دو گروہ ہیں۔ مزید برآں کہ یہ دو مخالف گروہ صرف دو معنوں میں نہیں ہیں۔ بلکہ چند معنوں میں ہیں۔ ہر گروہ باقیوں سے پیکار کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔

[2] "حمیم" یعنی گرم اور جلا دینے والا پانی۔

[3] یصھر "صھر" (بروزن قہر) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی چربی پگھلانے کے ہیں البتہ "صھر" بروزن "فکر" داماد کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

ولھم مقامع من حدید)۔[۱]

چوتھی سزا ان کی یہ ہوگی، کہ جب کبھی وہ تکالیف سے تنگ آکر دوزخ سے نکلنے کی کوشش کریں گے، فوراً ان کو وہیں لوٹا دیا جائے گا اور یوں مخاطب کیا جائے گا کہ جلا دینے والا عذاب چکھو (کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا وذوقوا عذاب الحریق)۔

اس کے بعد والی آیت میں موازنہ کرتے ہوئے صالحین اور مومنین کی خوشحالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ دونوں گروہوں کی کیفیت کی تشخیص میں آسانی ہو سکے، مومنین کی جزا کے بھی پانچ درجات بیان کیے گئے ہیں۔

(i) پہلے ارشاد ہوا ہے: "اللہ صاحبان ایمان اور اعمال صالح کرنے والوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہیں (ان اللہ یدخل الذین امنوا وعملوا الصالحات جنت تجری من تحتھا الانھار) گویا کفار کو آگ میں جلائے جانے کے مقابلے میں مومنین نہروں والے باغوں میں آرام و سکون میں ہوں گے۔

(ii) مومنین کے لباس اور زیب و زینت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے کہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے جڑے ہوں گے اور ریشمی پوشاکیں زیب تن کیے ہوں گے (یحلون فیھا من اساور من ذھب ولؤلؤا ولباسھم فیھا حریر[۲])۔

(iii) اس طرح مومنین جنت میں بہترین لباس زیب تن کیے ہوئے ہوں گے اور ان کے ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن ہوں گے۔ جس سے اس دنیا میں ممانعت تھی، کیونکہ دنیا میں ایسے لباس اور آرائش غرور و غفلت کا باعث بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر عوام کی محرومیت کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن جنت میں تو یہ مسائل ہی نہیں۔ لہٰذا پابندیاں اٹھا دی جائیں گی اور دنیا میں ممانعت کی تلافی کر دی جائے گی۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس جہان کی ماہیت و کیفیت اس دنیا سے بالکل الگ ہے، لہٰذا جس کیفیت کو ہم نے مروجہ الفاظ سے بیان کیا ہے اور دنیوی الفاظ استعمال کرکے جو معانی ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں وہاں اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ حقائق و مصادیق موجود ہوں گے۔

(iv)(v) مومن کی چوتھی اور پانچویں جزا اور نعمتیں خالصتاً معنوی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، انہیں پاکیزہ باتوں کی طرف رہنمائی کی جائے گی (وھدوا الی الطیب من القول)۔ یعنی ایسی روح پرور اور نشاط آفرین جو صاف ستھرے الفاظ اور پر مغز معنی پر مشتمل ہو اور روح کو مدارج کمال کی طرف بڑھائے اور انسان کو فرحت بخشے اور اس کی روحانی نشوونما کا باعث ہو۔ اور لائق حمد و ثنا اللہ کی راہ کی طرف ان کی ہدایت کی جائے گی۔ (وھدوا الی صراط الحمید)[۳] یعنی خدا

---

[۱] "مقامع" "مقمع" بر وزن منبر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے آہنی گرز اور کوڑا، جو کسی کو روکنے یا سزا دینے کے لیے مارا جاتا ہے۔

[۲] "اساور" "اسورہ" (بر وزن مشورہ) کی جمع ہے اور یہ بھی "سوار" (بر وزن "کتاب") کی جمع ہے۔ اس کا معنی دست بند یا کنگن کے ہیں۔ "سوار" فارسی کے لفظ "دستوار" سے عربی زبان میں منتقل ہوا ہے اور عربی میں اس کی یہ صورت ہو گئی ہے۔

[۳]۔ لفظ "حمید" "محمود" کے معنی میں اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو قابل ستائش ہو۔ یہاں اللہ مراد ہے۔ اس بنا پر "صراط الحمید" یعنی وہ راہ جو اللہ تعالیٰ کے قرب اور خوشنودی کے مقام کو جاتی ہو۔ البتہ آلوسی نے "روح المعانی" میں بیان کیا ہے کہ یہاں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

شناسی کی راہ، قرب پروردگارِ عالم کی راہ اور عشق وعرفاں کی راہ۔ بے شک اللہ مومنین کو ان مفاہیم کی طرف ہدایت کرکے روحانی لذت کے آخری درجہ تک لے جاتا ہے۔

ایک مشہور مفسر علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ "طیب من القول" سے مراد توحید اور اخلاص ہے اور "صراط الحمید" سے مراد ولایت اور اللہ کے مقرر کردہ رہبروں کی قیادت کو قبول کرنا ہے، ہماری نظر میں یہ حدیث زیرِ بحث آیت کا بہترین مصداق ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں کی شانِ نزول اور مختلف تفاسیر و تعبیرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ یہ تکلیف دہ اور اذیت ناک شدید عذاب کفار کے اس گروہ کے لیے ہے۔ جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، کفار کے ان سرغنوں اور سرداروں میں سے کچھ ان لوگوں کی طرح ہیں جو میدانِ بدر میں جناب امیرؑ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ بن حارث کے مقابلے میں نکلے تھے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) بیاں "حمید" "صراط" کی صفت بیانیہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ قابلِ تعریف راستے کی طرف راہنمائی کی جائے گی۔ لیکن ہماری نظر میں پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے۔

Marfat.com

۲۵۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ ؕ وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾

ترجمہ

۲۵۔ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مومنین کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں، جس کو ہم نے مقامی لوگوں اور دوسروں کے لیے یکساں قرار دیا ہے۔
(دردناک عذاب کے مستحق ہیں) اور وہ جو اس سرزمین پر حق سے روگرداں ہو جائے اور ظلم کرے، اسے ہم اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے

تفسیر

خدا کے گھر سے روکنے والے

گزشتہ آیتوں میں مطلق طور پر کفار کے بارے میں بات ہو رہی تھی، جبکہ اس آیت کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ جبکہ اس آیت میں ان میں سے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جو نافرمانیوں اور سنگین گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے علی الخصوص مسجد حرام اور حج کے عظیم الشان اجتماعات کے سلسلے میں رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے، جو لوگ کافر ہو گئے اور وہ راہِ حق سے دوسروں کو روکتے ہیں (اِنَّ الَّذین کفروا ویصدون عن سبیل اللّٰہ)۔ اس طرح وہ مومنین کو توحید کے مرکز مسجد حرام سے روکتے ہیں۔

وہ مرکز جسے ہم نے ہر ایک کے لیے یکساں قرار دیا ہے، چاہے وہیں کا باسی ہو یا کسی اور جگہ سے آیا ہو۔ (والمسجد الحرام الذی جعلناہ للناس سواء ن العاکف فیہ والباد) چنانچہ جو بھی اس جگہ حق سے روگرداں ہوگا اور ظلم وستم سے اپنے ہاتھ آلودہ کرے گا، ہم اسے اذیت ناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (ومن یرد فیہ بالحاد

Marfat.com

بظلم نذقه من عذاب الیم)۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کا یہ گروہ انکارِ حق کے علاوہ تین بڑے گناہوں کا مرتکب ہوا ہے۔

i راہِ خدا، ایمان اور اللہ کی اطاعت میں رکاوٹ ڈالنا۔

ii زائرین کو اور عبادت کرنے والوں کو حرم خدا تک نہ پہنچنے دینا اور حرمِ خدا پر اپنا حق فائق قرار دینا۔

iii اس مقدس سرزمین پر ظلم و الحاد اور گناہ کا بازار گرم کرنا۔ چنانچہ دردناک عذاب کے مستحق اس گروہ کو اللہ سزا دے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ دو مختلف صیغے اس آیت میں مذکورہ گروہ کے بارے میں کفر کا ذکر ماضی کے صیغے کے ساتھ ہے۔ جبکہ "راہِ حق میں رکاوٹ بننے" کا ذکر مضارع کے صیغے کے ساتھ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کفر قدیمی ہے۔ مگر لوگوں کو راہِ حق سے ہٹانے کی ان کی کوششیں مسلسل اور دائمی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "کفر" کا تعلق چونکہ عقائد کے ساتھ ہے اور یہ ایک ثابت شئے ہے۔ للہٰذا فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے جبکہ "صد عن سبیل اللّٰہ" عملی کیفیت ہے۔ لہٰذا فعل مضارع کے ساتھ آیا ہے۔

۲۔ (صد عن سبیل اللّٰہ) کیا ہے؟ اس سے مراد ایمان اور اعمال صالح کی راہ میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ ڈالنا ہے۔ چاہے صرف نشر و اشاعت اور پراپیگنڈے کی حد تک ہو یا عملی اقدامات کی صورت میں ہو۔ اس میں سب شامل ہیں

۳۔ اس منبعِ فیض میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں "سواء العاکف فیه والباد" اس جملے کے مفہوم کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس مرکز توحید میں استحقاق عبادت سب کو یکساں طور پر حاصل ہے اور مناسکِ حج یا دیگر عبادات کی بجا آوری کے لحاظ سے کسی کے خانہ خدا کے نزدیک کسی کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ بعض نے اس مفہوم کی حدود عبادات سے بڑھا کر تمام حقوق تک بیان کی ہیں۔ یعنی مکہ اور اس کے گرد و نواح میں رہن سہن کا بھی سب کو یکساں طور پر حق ہے۔ اسی بنا پر بعض فقہا کا فتویٰ ہے کہ مکہ میں گھروں کی خرید و فروخت اور کرایہ داری حرام ہے۔ اور انہوں نے استدلال کے طور پر اسی آیت کو پیش کیا ہے

بعض روایات میں بھی حرم خدا کے زائرین کو مکہ کے مکانات میں قیام سے روکنے سے منع کیا گیا۔ البتہ بعض میں ممانعت حرمت کے اعتبار سے ہے، اور بعض میں کراہت کے لحاظ سے۔

نہج البلاغہ کے خطوط میں خط نمبر ۶۷ میں جناب امیر علیہ السلام اپنے دور کے مکہ کے گورنر جناب قثم بن عباس کو خط تحریر فرمایا ہے وہ یوں ہے۔

ومر اهل مكه ان لا یأخذوا من ساكن اجراً، فان الله سبحانه یقول "سواء العاكف فيه والباد" فالعاكف المقيم به، والبادی

Marfat.com

الـذی یحج الیـہ من غیر اهـلـہ

"اہلِ مکہ کو حکم دو کہ جو لوگ شہر میں سکونت اختیار کریں، ان سے کوئی کرایہ نہ لیا جائے، کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ مقامی اور مسافر حقوق رکھتے ہیں۔۔۔ اور "عاکف" سے مراد مقامی لوگ ہیں اور " بادی" مختلف علاقوں سے حج کے لیے آنے والے کو کہتے ہیں۔

امام صادقؑ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

کانت مکہ لیست علی شیء منها باب، وکان اول من علق علی بابہ المصراعین، معاویۃ بن ابی سفیان ولیس ینبغی لاحد ان یمنع الحاج شیئًا من الدور ومنازلها۔

صدرِ اسلام میں مکہ میں گھروں کے دروازے نہیں ہوتے تھے۔ پہلا شخص جس نے اپنے گھر کا دروازہ لگایا، معاویہ تھا اور مناسب نہیں کہ کوئی شخص حاجیوں کو مکہ کے گھروں میں داخل ہونے سے روکے۔

اس طرح کی بعض اور روایتوں سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ خانۂ خدا کے زائرین کا یہ حق ہے کہ مناسک حج کے اختتام تک گھروں کے صحنوں سے استفادہ کریں۔

البتہ یہ حکم بعد والی بحث سے متعلق ہے کہ آیۂ مجیدہ میں "مسجد الحرام" سے مراد، صرف حدودِ مسجد ہے یا مکہ کا تمام شہر۔ اگر صرف مسجد حرام مراد ہو تو پھر یہ حکم مکہ کے مکانات پر نافذ نہیں ہوگا۔ اور اگر ہم مکہ کے سارے شہر کو آیت کے مفہوم میں شامل سمجھیں تو مکانات کی خرید و فروخت یا کرایہ لینے دینے کا سوال پیدا ہوگا۔ لیکن ہماری نظر میں چونکہ فقہی منابع اور تفسیر کے لحاظ سے یہ مطلب پوری طرح ثابت نہیں لہٰذا تمام شہر کے مکانات پر حرمت کا حکم لگانا مشکل ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اہلِ مکہ کو چاہیئے کہ بیت اللہ کے زائرین کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کریں اور گھروں کے معاملے میں اپنی مولویت نہ جتائیں۔ نہج البلاغہ کے خط اور دیگر روایات کا بھی ظاہراً اس مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور شیعہ و سُنی فقہا کے نزدیک حرمت والا قول زیادہ معتبر نہیں ہے (مزید وضاحت کے لیے جواہر الاسلام ج ۲۰ ص ۴۸ سے رجوع کریں۔

البتہ یہ مفہوم بھی مسلّم ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ بیت اللہ کے متولی یا منتظم ہونے کا بہانہ بنا کر زائرین کے لیے کوئی چھوٹی سی بھی رکاوٹ پیدا کرے یا اسلام کے اس مرکز کو اپنے پراپیگنڈے کے لیے استعمال کرے۔

۴۔ اس آیت میں مسجد حرام سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ مسجد حرام سے مراد حدودِ مسجد ہی ہیں، جبکہ بعض نے اس سے مراد "مکہ" کا پورا شہر لیا ہے اور ثبوت کے طور پر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جو پیغمبر اکرمؐ کی معراج کے بارے میں نازل ہوئی ہے کو پیش کیا ہے۔

تفسیر کنز العرفان ج ۱ ص ۳۳۵ کے مطابق آیۂ معراج میں یہ تصریح موجود ہے کہ معراج کی ابتدا مسجد حرام سے ہوئی۔ جب کہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ جناب خدیجۃ الکبریٰ کے گھر یا شعب ابی طالب یا جناب امِ ہانی کے گھر سے ہوئی اس بنا پر مسجد حرام سے شہر مکہ مراد ہے۔ لیکن ہماری نظر میں چونکہ آیت میں "مسجد حرام" کا لفظ صریحاً موجود ہے۔ لہٰذا آیت کی موجودگی میں تاریخ کو معتبر نہیں سمجھا جا سکتا اور

Marfat.com

پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس کی بنا پر ظاہرًا آیت کا مفہوم بدلا جاسکے اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ معراج کی ابتدا خود مسجد حرام ہی سے ہوئی ہے۔ البتہ مذکورہ بالا چند روایات سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ زیرِ بحث حکم مکہ کے تمام مکانات پر نافذ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہرًا یہ حکم استحبابی ہے اور کسی بھی مستحب حکم کے دائرے کو مختلف مناسبتوں کی بناء پر وسعت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں (غور کیجیئے گا)

۵۔ ظلم کے ساتھ "الحاد" کا کیا مفہوم ہے

لغت میں "الحاد" حدِ اعتدال سے ادھر اُدھر ہوجانے کو کہتے ہیں۔ اسی لحاظ سے قبر کو "لحد" کہا جاتا ہے کہ وہ قبر کھودنے کی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ کر نیچے گڑھے کی صورت میں کھودی جاتی ہے۔ لہٰذا آیت میں "الحاد" کا مفہوم یہ ہے کہ کفار ظلم کے ذریعے میانہ روی سے تجاوز کرتے ہیں اور اس مقدس سرزمین پر نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ البتہ بعض مفسرین نے یہاں ظلم کو صرف "شرک" سے تعبیر کیا ہے، بعض نے شرک کے ساتھ حرام کو حلال کرنے کو بھی شامل کرلیا ہے، جبکہ بعض نے ہر فعل حرام کو "ظلم" میں شامل کیا ہے، حتیٰ کہ بدکلامی گالی گلوچ اور ماتحتوں کی برائی کرنے تک کو بھی "ظلم" کے وسیع مفہوم کے ذیل میں سمجھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مقدس و محترم مقام پر چھوٹے سے چھوٹے گناہ کی سزا اور عذاب بھی بہت سخت ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا۔

كل ظلم يظلم الرجل نفسه بمكة من سرقة او ظلم احد او شيء من الظلم فاني اراه الحادا. ولذلك كان ينهى ان يسكن الحرم.

ہر ظلم جو مکہ میں کوئی شخص اپنے اوپر کرے، چاہے چوری ہو یا کسی سے زیادتی ہو یا تشدد ہو، میں ان سب کو "الحاد" سمجھتا ہوں

اسی وجہ سے امام لوگوں کو مکہ میں زیادہ دیر تک قیام سے منع فرمایا کرتے تھے۔

"کیونکہ اس جگہ پر گناہ کی سزا زیادہ اور سخت ہے[1]"

کئی اور روایات بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں اور یہی مفہوم مطلق طور پر ظاہر آیت کے بھی ہم آہنگ ہے۔ اسی بناء پر بعض فقہا نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص حرمِ خدا میں ایسا گناہ کر بیٹھے، جس کی حد معین ہے، اس پر حد کے علاوہ تعزیر بھی جاری کی جائے اور اس فتویٰ کی دلیل انھوں نے اس آیہ مجیدہ کے اس جملے کو قرار دیا ہے "نذقه من عذاب اليم" [2]

اس گفتگو کے مطابق جن مفسرین نے ظلم سے مراد صرف ذخیرہ اندوزی یا حدودِ حرم میں بغیر احرام باندھے داخلے کی ممانعت لیا ہے، ان کی مراد آیہ مجیدہ کا واضح مصداق بیان کرنا ہے ورنہ آیت کے وسیع تر مفہوم کو محدود کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۴۸۲

[2] کنز العرفان جلد ۱ ص ۳۳۵

Marfat.com

۲۶- وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا
تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ
وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝
۲۷- وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا
وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ
عَمِیْقٍۙ۝
۲۸- لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ یَذْكُرُوا اسْمَ
اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ
بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا
الْبَآىٕسَ الْفَقِیْرَ۝

ترجمہ

۲۶- یاد کیجئے جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ تجویز کی (تاکہ وہ اس پر عمارت بنائیں، ہم نے اس سے کہا) کسی چیز کو بھی میرا شریک نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے (بتوں اور دوسری آلودگیوں سے) سے پاک کرو۔
۲۷- لوگوں کو حج کی دعوتِ عام دو تاکہ دور دراز سے پیدل اور کمزور سواریوں پر سوار

Marfat.com

ہو کر (خانہ خدا کی طرف) چلے آئیں۔

۲۸۔ تاکہ (اس حیات بخش پروگرام) میں اپنے مفادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور ان مخصوص ایام میں، چوپایوں کی صورت میں انھیں جو روزی دی ہے (قربانی کرتے ہوئے) اس پر اللہ کا نام لیں۔ پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ، اور تنگدست و محتاج کو بھی کھلاؤ۔

تفسیر

حج کے لیے دعوتِ عام

گذشتہ آیت جس میں مسجد الحرام اور خانۂ خدا کے زائرین کے بارے میں بحث کی گئی ہے کی نسبت سے زیر بحث آیت میں پہلے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر کی مختصر تاریخ بیان کی جارہی ہے، پھر حج کے وجوب اس کے فلسفے اور اس عظیم عبادت کے بعض احکام کا بیان ہے، دوسرے لفظوں میں اس آیت کے مختلف گوشوں کو واضح کرنے کے لیے گزشتہ آیت مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آیت کے شروع میں، خانہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے: اس لمحے کو یاد کیجیے، جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کی جگہ کو نمایاں کیا۔ تاکہ وہ اسی جگہ پر نئے سرے سے عمارت کھڑی کریں۔ (واذ بوّأنا لابراھیم مکان البیت)۔

"بوأ" "بواء" کے مادہ سے ہے، یعنی کسی عمارت کے برابر کسی جگہ کا مساوی یا مسطح ہونا۔ بعد ازاں یہ لفظ کسی جگہ کا کسی عمارت کی تعمیر کے لیے تیار کرنے کے لیے بولا جانے لگا۔ مفسرین کی روایات کے مطابق اس آیت میں "بوأ" سے یہ مراد ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو خانہ کعبہ کی وہ بنیادیں یا دیواریں دکھلا دیں جو حضرت آدم نے تعمیر کی تھیں اور طوفانِ حضرت نوحؑ کے سبب گر گئی تھیں، ان بوسیدہ دیواروں کو کیسے دکھایا؟ اس کے جواب میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ تیز آندھی چلی، جس سے مٹی ایک طرف کو ہٹ گئی اور بنیادیں ظاہر ہو گئیں یا یہ کہ بادل کا ٹکڑا نمودار ہوا اس نے عین اسی جگہ سایہ کیا جہاں دیوریں تھیں۔ یا کسی اور طریقے سے وہ جگہ معین کی تو انھوں نے اپنے نورِ نظر اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر نئی عمارت کھڑی کر دی۔[۱]

---

[۱] خانہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں ہم اس تفسیر کی پہلی اور تیسری جلد علی الترتیب سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۲۷ اور سورۂ آل عمران آیت ۹۶ کے ذیل میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جب عمارت بن گئی تو ہم ابراہیم سے یوں گویا ہوئے کہ "اس گھر کو توحید کا مضبوط مرکز بناؤ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہراؤ اور میرا گھر طواف کرنے والوں، قیام و رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو" (ان لا تشرك بی شیئا وطهر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود) ؎۱

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم مامور تھے کہ خانہ کعبہ اور اس کے گرد و نواح کو ظاہری و باطنی گندگی اور آلودگی سے محفوظ رکھیں بتوں اور شرک کے دوسرے مظاہر سے اس کو خالی رکھیں تاکہ اللہ کے بندے اس پاک مکان میں اللہ کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ اور ایسے منزہ ماحول میں طواف، نماز جو اس سرزمین کی اہم ترین عبادت ہے۔ بجالایا کریں۔

زیر بحث آیت میں ارکان نماز میں سے تین اہم ارکان قیام رکوع اور سجود کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ باقی افعال ان ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ مفسرین میں سے بعض نے "قائمین" سے مراد مکہ کے باسی لیے ہیں۔ لیکن چونکہ "قائمین" کا لفظ "طائفین" اور "رکع السجود" کے درمیان آیا ہے، اس لیے ہماری نظر میں یہاں "قائمین" سے مراد نماز میں "رکن قیام" کے ادا کرنے والے ہیں اور اسی مطلب کو اکثر شیعہ اور سنی مفسرین نے بیان کیا ہے ؎۲

ضمناً یہ بھی واضح ہو جائے کہ "الرکع السجود" کے درمیان واؤ عاطفہ کیوں نہیں ہے۔ اگرچہ یہ دونوں اسماء صفت ہیں۔ (رکع جمع راکع یعنی رکوع کرنے والا اور "سجود" جمع ساجد یعنی سجدہ کرنے والا) یہ اس لیے ہے کہ عبادت کے دونوں انداز یکے بعد دیگرے اور ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

خانہ کعبہ کے عبادت گزاروں کی عبادت کے لیے تیار ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا جاتا ہے کہ "لوگوں کو حج کی دعوت عام دیجیئے تاکہ لوگ پیدل اور کمزور سواریوں پر دور دراز سے بیت اللہ کی طرف عازم حج ہوں" (واذن فی الناس بالحج یأتوك رجالا و علی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق) "اذن"، اذان کے مادہ یعنی اعلان اور بلاوے کے معنی میں ہے۔ "رجال" جمع "راجل" یعنی پیدل چلنے والا کے معنی میں ہے، "ضامر" یعنی لاغر اور کمزور جانور "فج" پہاڑی درّے کو کہتے ہیں۔ اور کھلی سڑک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "عمیق" کا بیان مفہوم ہے "دور" علی بن ابراہیم والی روایت میں ہے کہ اس حکم کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ تعالیٰ میں عرض کیا کہ بار الہا میری آواز تمام لوگوں تک نہیں پہنچتی تو فوراً ارشاد ہوا۔

"علیك الاذان وعلی البلاغ"

"تم اعلان کرو لوگوں تک پہنچا میں دوں گا"

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اس جگہ پر تشریف لائے، جسے مقام ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ کان میں انگلی ٹھونس مشرق و مغرب کی طرف رخ کیا اور پکار کر کہا۔

؎۱ بعض مفسرین کے بقول اس آیت میں ان الفاظ سے پہلے "اوحینا" کا لفظ مقدر ہے۔

؎۲ تفسیر المیزان، تفسیر فی ظلال القرآن، تفسیر التبیان، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

ایها الناس کتب علیکم الحج الی البیت العتیق فاجیبوا ربکم

لوگو! خانہ کعبہ کا حج تم پر فرض کر دیا گیا ہے، اپنے پروردگار کا بلاوا قبول کرو۔

چنانچہ اللہ نے ان کی آواز سب کے کانوں تک پہنچا دی۔ حتیٰ کہ صلبِ پدر اور رحمِ مادر میں موجود افراد نے بھی سن لیا اور جواب میں (لبیک اللّٰھم لبیک ....) بھی کہا۔ اس دن سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ مراسم حج میں شریک ہوتے ہیں یا ہوں گے۔ وہی ہیں جنہوں نے اس دن حضرت ابراہیمؑ کی آواز کا جواب دیا تھا۔ [1]

آیۂ حمیدہ میں سواری سے حج پر جانے والوں سے قبل پیدل جانے والوں کا ذکر ہے۔ یہ اس لیے کہ اول الذکر کا رتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ ہے، کیوں کہ وہ زیادہ تکلیف اُٹھاتے ہیں، چنانچہ پیغمبر اکرم سے روایت ہے کہ پیدل حج پر جانے والے کے لیے ہر قدم پر سات سو نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے، جبکہ سوار کے لیے صرف ستر نیکیوں کا۔ [2]

یہ بھی ممکن ہے کہ خانۂ خدا کی زیارت کی اہمیت کے پیش نظر یہ کہا گیا ہو کہ جو وسیلہ بھی میسر ہو حج کے لیے نکل پڑنا چاہیے۔ اور ہمیشہ سواری کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیے۔

"ضامر" (یعنی کمزور جانور) یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قاری یہ جان لے کہ سفرِ حج اس قدر کٹھن ہے کہ چلچلاتے صحراؤں اور بے آب و گیاہ بیابانوں سے گزرتے ہوئے جانور کمزور پڑ جاتے ہیں، لہٰذا ان دشوار گزار راستوں کو طے کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ اس لفظ سے ایک اور اشارہ بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ ایسے جانور منتخب کیے جائیں، جن کے جسم مشقت کی برابر مشق سے کمزور پڑ گئے ہوں۔ البتہ اعضاء اور پٹھے مضبوط ہوں، کیونکہ موٹے تازے جانور ایسے سفر میں کام نہیں آتے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ ناز و نعمت سے پلے جانور تو کیا یہ سفر ایسے انسانوں کا بھی کام نہیں۔

"من کلّ فجّ عمیق" کا مفہوم یہ ہے کہ نہ صرف لوگ مکہ کے گرد و نواح اور قرب و جوار سے حج کے لیے آئیں گے۔ بلکہ دور دراز سے بھی آئیں گے، اس جملے میں لفظ "کل" احاطہ کے معنیٰ میں نہیں بلکہ کثرت کے معنے میں ہے۔

مشہور مفسر ابوالفتوح رازی اس آیہ کی تفسیر کرتے ہوئے "ابوالقاسم بشر بن محمد نامی ایک شخص سے ایک عجیب واقعہ نقل کرتا ہے، بقول اس کے:

ایک دفعہ میں نے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ایک ضعیف آدمی کو دیکھا جس کے چہرے پر لمبے سفر کی تھکن اور بے آرامی صاف پڑھی جا سکتی تھی اور عصا کے سہارے بڑے کرب کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا بڑے میاں، کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کہنے لگا "اتنی دُور سے آیا ہوں کہ سفر ہی میں پانچ سال بیت گئے اور رنج و تعب سفر سے مضمحل اور بوڑھا ہو گیا ہوں میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، بے شک آپ نے حق تعالیٰ کی سچی محبت اور پرخلوص اطاعت میں بڑی زحمت

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص۴۸۶ کے مطابق تفسیر علی بن ابراہیم کا خلاصہ، آلوسی نے رُوح المعانی میں اور رازی نے تفسیر کبیر میں بھی اس مضمون کو کم و بیش تحریر کیا ہے۔

[2] تفسیر رُوح المعانی، مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی۔

Marfat.com

گوارا کی! یہ سن کر وہ فرطِ مسرت سے مسکرایا۔ اور اس نے یہ اشعار پڑھے۔

زر من هويت وان شطت بك الدار وحال من دونه حجب واستار

لا يمنعنك بعد من زيارته ان المحب لمن يهواه زوار!

اپنے محبوب سے ملنے ضرور جائیو! اگرچہ تیرے گھر سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو اور راستے میں کیسی ہی رکاوٹیں، اور مزاحمتیں تیرا راستہ کیوں نہ روکیں۔ فاصلے کی طوالت اس سے ملنے میں ہرگز حائل نہ ہونے دیجیو، کیونکہ عاشق کو بہر حال محبُوب کی زیارت کے لیے جانا ہی چاہیئے۔

بے شک خانہ خدا میں انتہائی کشش اور جاذبیت ہے، جس کے سبب سے ایمان سے سرشار دل دور و نزدیک سے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ہر نسل ہر قبیلے کے لوگ چھوٹے ہوں یا بڑے "لبیک" کہتے ہوئے دیوانہ وار اس کی طرف آتے ہیں تاکہ اللہ کی ذات پاک کے جلوے اس مقدس سرزمین پر دل کی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی ہمہ گیر رحمت کو رُوح کی گہرائیوں میں محسوس کریں۔ [1]

بعد والی آیت میں ایک مختصر مگر معنی خیز جملے میں حج کے فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہُوئے ارشاد ہوتا ہے، لوگ اس سرزمین مقدس پر آئیں "تاکہ اپنے مفاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں" (ليشهدوا منافع لهم) مفسرین قرآن نے لفظ "منافع" کے ذیل میں بہت کچھ ذکر کیا ہے، البتہ بالکل واضح ہے۔ کہ اس لفظ کو غیر مشروط و لامحدود طور پر استعمال کیا گیا ہے، یعنی مادی، معنوی، انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور تعلیمی مفاد سب ہی اس میں شامل ہیں۔

بے شک مسلمانوں کو دنیا کے ہر ایک علاقے سے اور ہر قسم کے لوگوں کو یہاں آنا چاہیئے اور اپنے مفاد کا ناظر اور شاہد بننا چاہیئے۔ یعنی اپنے اپنے وطن میں جو کچھ سنتے رہے ہیں، یہاں آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیں۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۴۸۹ پر کافی کے حوالے سے امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ربیع بن خثیم نے امامؑ سے اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

"یہ لفظ دُنیا و آخرت کے جُملہ "مفاد" اپنے اندر لیے ہُوئے ہے۔"

انشاء اللہ آیت کے نکات کے ذیل میں ہم اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: حجاج آئیں اور قربانی کریں، روزی کے سلسلے میں دیئے جانے والے جانوروں کو مخصوص ایام میں اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ (ويذكروا اسم الله في ايام معلومات على ما رزقهم من بهيمة الانعام)۔

---

[1] فاضل دانشور شعرانی مرحوم کہتے ہیں۔

اگر گزشتہ زمانے کے ذرائع آمد و رفت اور رستوں کو ذہن میں رکھ کر اس وقت کے اندلس، مراکش یا چین و بخارا سے آنے والوں کا تصور کریں جو خشکی کے یا سمندری راستوں سے مکہ آتے تھے، خصوصاً راستوں کا رہزنوں سے غیر محفوظ ہونا پیش نظر ہے تو واقعی یہ بڑا عظیم کام نظر آتا ہے، کئی دفعہ ان عاشقان خدا کا زاد راہ لوٹ لیا جاتا اور ان کو بے سر و سامانی کے عالم میں سفر جاری رکھنے کے لیے مدتوں کہیں قیام کرنے اور محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

Marfat.com

مناسک حج میں وہ امور یا افعال مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے اللہ سے تعلق پیدا ہو اور اس طرح اس عبارت کی عظمت کی عکاسی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں قربانی کرتے ہوئے صرف اللہ کا نام لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو شرائط ذبح میں سے ہے یہ اس لیے ہے، تاکہ قربانی کرنے والے کی پوری توجہ اللہ اور اس کے قبول کرنے پر ہے اور قربانی کے گوشت یا دیگر دنیوی مفاد اس کے ذیل میں رہیں۔ دراصل جانوروں کی قربانی، انسانوں کے ذہن میں راہ خدا میں قربان ہونے کے لیے آمادگی کا ایک ذریعہ ہے، جس طرح واقعاتِ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل میں آیا ہے کہ انھوں نے یہ عمل بجا لاکر گویا یہ اعلان فرمایا کہ ہم اللہ کی راہ میں ہر قربانی دے سکتے ہیں، حتیٰ کہ جان تک بھی قربان کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے بُت پرستوں کے مشرکانہ طریقہ کار کی نفی بھی کردی جو قربانی کرتے وقت بتوں کے نام پکارتے تھے اور اس طرح توحیدی مناسک کو شرک سے آلودہ کرلیتے تھے، چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: قربانی کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور غریبوں کو بھی کھلاؤ۔ (فکلوامنھا واطعموا البائس الفقیر)۔

اس آیت کی تفسیر یوں بھی کی جاسکتی ہے "ایام معلومات" میں اللہ کا نام لینے سے مراد اللہ کی بے حدوحساب نعمتوں کی وجہ علی الخصوص جانور جو انسان کی خوراک بھی ہیں، کی وجہ سے مخصوص ایام میں، اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس کی جائے۔ [1]

چند اہم نکات

۱۔ **ایام معلومات** زیر بحث آیت میں حکم ہورہا ہے "ایام معلومات" میں یعنی مخصوص دنوں میں، اللہ کو یاد کرو۔ سورۂ بقرۂ آیہ ۲۰۳ میں بھی یہ حکم یوں آیا ہے)

"واذکروا اللہ فی ایام معدودات"

اللہ کو معدود دنوں میں یاد کرو

آیا "ایام معلومات" اور "ایام معدودات" ایک ہی ہیں یا جدا جدا، اس مسئلے میں اختلاف پایا جاتا ہے، روایات بھی مختلف وارد ہوتی ہیں۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "ایام معلومات" سے مراد ماہ ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں اور "ایام معدودات سے گیارہ بارہ اور تیرہ ماہ ذوالحجہ "ایام التشریق" مراد ہیں یعنی نورانی اور دلوں کی روشنی بخشنے والے دن۔

بعض مفسرین چند روایات کی بنیاد پر دونوں ہی سے "ایام التشریق" مراد لیتے ہیں۔ "ایام التشریق" کے مصداق میں بھی اختلاف ہے: کبھی اس سے ماہ ذوالحجہ کی گیارہ بارہ اور تیرہ تاریخ مراد لی جاتی ہے اور کبھی دسویں کے دن یعنی عید قربان کے دن کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔

فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ۔

---

[1] اول الذکر تفسیر کے مطابق، قربانی کرتے وقت اللہ کا نام لینا "علی" بمعنی استعلاء ہے اور ان مخصوص دنوں میں تسبیح و تقدیس کا معنیٰ کیا جائے وہاں "علی" بمعنی "برائے" ہے، اس فرق کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

Marfat.com

یعنی جو شخص مناسکِ حج کے دو دنوں میں عبادت کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

یہ سورۂ بقرہ کی آیت ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایام التشریق تین دن سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ "یومین" کے قرینے سے یہ قیاس واضح ہے کہ اگر حاجی ذرا جلدی سے کام لیتے ہوئے ایک دن کم کرے تو دو دن بن جاتے ہیں۔ البتہ اگر ہم اس نکتے پر غور کریں کہ زیرِ بحث آیت میں "ایام معلومات" کے بعد قربانی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ قربانی عام طور پر دسویں تاریخ کو کی جاتی ہے، تو اس سے یہ بات قرینِ تصدیق ہو جاتی ہے کہ "ایام معلومات" سے مراد ماہ ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں جو قربانی کے دن یعنی دسویں تاریخ کو ختم ہو جاتے ہیں، لہٰذا جو تفسیر "ایام معلومات" اور "ایام معدودات" کو الگ الگ کرتی ہے۔ وہ صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن دونوں آیتوں میں جو مشترک مطلب بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ذہن میں یہی آتا ہے کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ یعنی مخصوص دنوں میں ذکرِ خدا کرنا اور اسی کی طرف متوجہ رہنا جو دسویں سے شروع ہو کر تیرہویں تک جاری رہتا ہے۔ البتہ اللہ کے نام کے تذکرے کا ایک مرحلہ قربانی بھی ہے۔ [1]

۲۔ منیٰ میں ذکرِ خدا متعدد روایات کے مطابق اس ذکر سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو عیدِ قربان کے دن نمازِ ظہر کے بعد سے برابر پندرہ نمازوں تک پڑھنا مستحب ہیں، یعنی تیرھویں ذوالحجہ کی نمازِ فجر تک۔ بحار الانوار ج ۹۹، ص ۳۰۴ پر امام موسیٰ کاظمؑ کے حوالے سے وہ تکبیریں یہ ہیں:

اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد، اللہ اکبر علی ما ھدانا، واللہ اکبر علی ما رزقنا من بھیمۃ الانعام۔

اسی کتاب میں ص ۳۰۰ پر درج بعض دوسری روایات کے ذریعے تصریح ہوئی ہے کہ پندرہ نمازوں کے بعد پڑھنا اس شخص کے لیے ہے جو میدانِ منیٰ میں ہو، باقی حضرات کے لیے دس نمازوں تک پڑھنا کافی ہے، یعنی بارھویں ذوالحجہ کی نمازِ فجر تک، یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے تکبیرات والی روایات اس حقیقت کی دوسرا گواہ ہیں کہ زیرِ بحث آیت میں جس "ذکر" کا تذکرہ ہوا ہے وہ قربانی کرتے ہوئے ذکر سے مخصوص نہیں، بلکہ مجموعی ذکر مراد ہے۔ اگرچہ اس میں وقتِ ذبح ذکر بھی شامل ہے۔ (قابلِ غور)

۳۔ حج کا فلسفہ اور اس کے مضمرات حج کے عظیم الشان مراسم دوسری عبادات کی طرح فیوض و برکات کا سرچشمہ ہیں اور انفرادی اور اسلامی معاشرے کے بہت سے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر مناسکِ حج صحیح طریقے سے ادا کیے جائیں۔ ہر ایک رکن ٹھیک اسلامی تقاضے کے مطابق ادا ہو تو ہر سال مسلمانوں کا یہ مہتم بالشان اجتماع اسلامی معاشروں میں نئے انقلاب کی داغ بیل ڈال سکتا ہے، حج کے عظیم الشان مناسک کے چار پہلو ہیں۔ جن میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ بنیادی گہرا اور مفید دکھائی دیتا ہے۔

أ۔ حج کا اخلاقی پہلو حج کا اہم ترین فلسفہ اخلاقی ہے، یعنی حج انسان میں زبردست اخلاقی انقلاب پیدا کرتا ہے۔ "احرام" کی پابندی انسان کو مکمل طور پر مادی تعیش، ظاہری امتیازات مختلف لباس اور رنگ و روپ و زیب و زینت سے بےنیاز

---

[1] "ویذکروا اسم اللہ" کی تفسیر کے ذیل میں جو اختلاف تھا ایک قربانی کے وقت نامِ خدا لینا دوسرا مطلقاً خدا کا ذکر کرنا، ختم جاتا ہے اور یوں پہلا قول دوسرے کا مصداق بن جاتا ہے اور دوسرا ایک وسیع و عمومی مفہوم بن جاتا ہے۔

Marfat.com

کر دیتی ہے۔ مختلف مادی لذات سے پرہیز انسان کو ضبط نفس، اصلاح اور شخصیت سازی کی طرف مائل کرتا ہے مادی دنیا سے نکال کر فضائے روحانیت و صدق وصفا کی سیر کراتا ہے اور وہ لوگ جو عام حالات میں مزعوم امتیازات، مراتب اور فخر و ناز کے سنگین بوجھ تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اچانک اپنے آپ کو ہلکا پر سکون اور آسودہ خاطر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد حج کے دیگر مناسک انسان کے روحانی تعلقات بڑھاتے ہیں، انسان کا اللہ کے ساتھ تعلق لحہ بہ لحہ مستحکم تر کر دیتے ہیں اور اسے اس کے نزدیک تر لے جاتے ہیں۔ انسان کو آلودہ اور تاریک ماضی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر چکا چوند مستقبل کی پُر نُور چوٹیوں پر لاکھڑا کرتے ہیں۔

قابل توجہ یہ ہے کہ مناسک حج علی الخصوص قدم قدم پر بت شکن ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کے نظریات، کردار اور راہ خدا میں قربانیوں کو حجاج کے اذہان پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مکہ معظمہ عموماً اور خانہ کعبہ، مسجد حرام اور مطاف وغیرہ خصوصاً رسول اکرمؐ اور صدر اسلام کے مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جس سے اخلاقی انقلاب حجاج کے اذہان پر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر حاجی سرزمین مکہ اور مسجد الحرام میں گویا حضرت رسول اکرمؐ، حضرت امیرالمومنینؑ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے، ان کی رجز خوانی اور قتال کرتے ہوئے تلواروں کی جھنکار سُنتا ہے۔ بے شک تمام مناسکِ حج اس طرح سے آپس میں مسلسل اور منظم ہیں کہ مائل ذہن کے دلوں کو مکمل طور پر اخلاقی لحاظ سے اس طرح منقلب کرتے ہیں۔ کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی حاجی کی کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بحار الانوار کی جلد نمبر ۹۹ صفحہ نمبر ۲۶ پر جو روایت درج ہے، کس قدر قرین حقیقت ہے۔

يخرج من ذنوبه كهيئته يوم ولدته امه!

حاجی حج کے بعد اپنے گناہوں سے یوں بری ہو جاتا ہے، گویا وہ نومولود معصوم بچہ ہے۔

واقعی حج انسان کے لیے "تولدِ ثانی" ہے، ایسی پیدائش جو ایک نئی زندگی لیے ہوئے ہو۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا فیوض و برکات اور وہ جو بعد میں ذکر ہوں گے، ان افراد کے لیے نہیں ہیں جو مناسک حج کے ظواہر تک محدود رہتے ہیں اور اس کے گوہرِ نایاب کو گنوا بیٹھتے ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو حج کو سیاحت اور تفریح یا مادی وسائل کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ان کے حصے میں وہی کچھ آتا ہے جو کچھ وہ پاتے ہیں۔

۱۱۔ حج کا سیاسی پہلو ایک عظیم فقیہ کے بقول باوجود اس کے کہ مناسک حج خالص اور عمیق ترین عبادات کا مجموعہ ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے سیاسی مقاصد کے حصول اور پیش رفت کا موثر ذریعہ بھی ہیں۔ اللہ کی طرف توجہ کے لحاظ سے عبادت اور مخلوق خدا کے حقوق کے تحفظ کے لحاظ سے سیاست مناسکِ حج میں یہ دونوں پہلو آپس میں اس طرح سے مربوط و منسلک ہیں، گویا ایک کپڑے کا تانا بانا ہوں، حج مسلمانوں کی منتشر صفوں کو منظم کرنے کا مسلمانوں میں نسلی امتیاز، علاقائی عصبیت اور قومی تفاخر کے خاتمے کا بہترین عامل ہونے کے ساتھ ساتھ دشمنوں سے مقابلے کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔ حج، اظہارِ خیال پر سفر استبدادی نظام اور گھٹن خوف اور دباؤ کے خاتمے کا بھی بڑا موثر ذریعہ ہے، مسلمان ممالک کے صحیح حالات ایک دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ہے۔ غرضیکہ حج استحصال طاقتوں کی چیرہ دستیوں سے آزادی اور استعماری زنجیروں کو توڑنے کا بہترین عامل ہے۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس جیسے ڈکٹیٹروں کے زمانے میں عوام کے بعض طبقات کے میل جول پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ تاکہ آزادی کی تحریکوں کو کچلا جا سکے، اس وقت ان کے ملاپ، سیاسی روابط اور صلاح مشورے کا واحد ذریعہ حج تھا۔ نہج البلاغہ "کلمات حضار" نمبر ۲۵۲ میں جناب امیرؑ نے حج کو

الحج تقویۃ للدین

" مناسک حج، دین مقدس اسلام کی تقویت و استحکام کا سبب ہیں"۔ قرار دیا ہے۔

ایک غیر مسلم سیاستدان نے یونہی نہیں کہا:

" افسوس کہ مسلمانوں نے حج کے فلسفے کو نہ سمجھا، لیکن ان کے دشمن سمجھ گئے"۔

روایات میں حج کو ضعیف اور کمزور مسلمانوں کا جہاد قرار دیا گیا ہے۔ ایسا جہاد کہ ساری دنیا کے ضعیف، کمزور اور عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر امت مسلمہ کی عظمت و سطوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ خانہ خدا کے چاروں طرف نماز کی صفیں باندھ کر ایک آواز ہو کر جب نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں تو دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

iii۔ حج کا ثقافتی پہلو

حج کے دنوں کو مختلف علاقوں کے لیے ثقافتی افکار و افعال کے تبادلے کا بہترین موقع قرار دیا جا سکتا ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ حج کا عظیم الشان اجتماع دنیا بھر کے مسلمانوں کے مختلف طبقات کا حقیقی اجتماع ہے ہے۔ کیونکہ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے آنے والے افراد کے انتخاب میں کوئی انسان ساختہ طریقہ کار فرما نہیں ہے۔ بلکہ صرف حکم خدا کے تحت مختلف علاقوں، خاندانوں، زبانوں اور ملکوں کے لوگ ایک جگہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ حج رسول اللہ کے فرمودات اور آثار کے دنیائے اسلام میں نشر و اشاعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ وسائل الشیعہ ج ۸ صفحہ ۹ پر ایک روایت ہے کہ امام صادقؑ کے خاص صحابی جو بہت صاحب علم بھی تھے اور جن کا نام ہشام بن حاکم ہے، نے ایک دن امامؑ سے حج کے فلسفے کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا۔

ان اللہ خلق الخلق .... وامرھم بما یکون من امر الطاعۃ فی الدین و مصلحتھم من امر دنیاھم فجعل فیہ الاجتماع من الشرق والغرب ولیتعارفوا ولینزع کل قوم من التجارات من بلد الی بلد ....، ولتعرف آثار رسول اللہ (ص) وتعرف اخبارہ ویذکر ولاینسی۔

اللہ نے بندوں کو پیدا کیا .... آپ نے ان کے دینی اور دنیوی مفاد میں احکام جاری فرمائے۔ منجملہ ان احکام کے مشرق و مغرب کے لوگوں پر مشتمل ایک اجتماع (مناسک حج) کا بھی حکم دیا، تاکہ لوگ ایک دوسرے سے شناسا ہوں، تجارتی، ساز و سامان ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کیا جا سکے۔ نیز اس طرح آپ کی تعلیمات کی بھی اشاعت ہو، لوگ ان تعلیمات کو اپنے دلوں میں جگہ دیں اور انھیں کبھی فراموش نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ جابروں اور آمروں کے عہد حکومت میں جبکہ احکامات قرآن و سنت کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں ہوا کرتی تھی۔ مسلمان عوام حج کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آئمہ طاہرینؑ اور بزرگ علماء کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے مسائل کا حل حاصل کیا

Marfat.com

کرتے تھے۔

نیز حج کے اجتماع کو مسلمانوں کے عظیم ثقافتی سیمینار میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔عالم اسلام کے تمام علماء جو مکہ میں موجود ہوں ایک دوسرے کے سامنے اپنے خیالات تجربات اور تجاویز پیش کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی یہ کہ مسلمانوں کی جغرافیائی سرحدیں ان کو ثقافتی طور پر محدود کردیتی ہیں اور ہر ملک کے مسلمان صرف اپنے ہی بارے میں سوچ بچار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں وسیع تر اسلامی معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر تقریباً ناپید ہوجاتا ہے۔اس صورت میں حج بے شک اس بدنصیبی کی تاریک رات میں خوش نصیبی کا مہر درخشاں ہے، مذکورہ بالا روایت کے اگلے حصّے میں امام صادقؑ نے کیا عمدہ بات فرمائی ہے

ولوكان كل قوم انما يتكلمون على بلادهم وما فيها هلكوا، وخربت البلاد، وسقطت الجلب والارباح وعميت الاخبار۔

اگر ہر قوم اپنے ہی ملک اور شہر کی بات کرے اور صرف اپنے مسائل پر سوچ بچار کرے تو سب کے سب برباد ہوجائیں گے۔ان کے ملک تباہ و برباد ہوں گے۔ان کے مفادات تباہ ہوں گے اور حقائق پس پردہ چلے جائیں گے۔

۱۷۔ حج کا اقتصادی پہلو حقیقت، لوگوں کے خیال کے بالکل برعکس ہے۔یعنی یہ کہ حج کے اجتماع کو اسلامی ممالک کی اقتصادی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کرنا نہ صرف حج کی روح کے منافی نہیں ہے۔بلکہ روایات کی روشنی میں فلسفۂ حج کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

اگر تمام مسلمان اس کثیر اجتماع میں اسلامی ممالک کی مشترکہ تجارتی منڈی کی بنیاد رکھیں، ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کریں۔نہ منافع دشمنوں کی جیب میں جائے اور نہ اقتصادیات کو دشمنوں کا طفیلی بنائیں تو یہ دنیا پرستی نہیں ہے۔بلکہ عین خدا پرستی ہے اور اس کی راہ میں جہاد ہے۔چنانچہ مندرجہ بالا روایت میں امام صادقؑ، فلسفۂ حج کے ضمن میں ہشامؓ سے کھول کر بیان فرمارہے ہیں۔کہ حج کے مقاصد میں سے ایک مقصد مسلمانوں کی باہمی تجارت کو فروغ دینا اور اقتصادی روابط کو آسان بنانا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۸۔

ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلًا من ربكم

کی تفسیر کے ذیل میں امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تبتغوا فضلا سے مراد کسب معاش ہے، فرمایا

فاذا احل الرجل من احرامه وقضى فليشتر وليبع في الموسم۔

جب حاجی احرام اتار دے، مناسک حج کا وقت ختم ہوجائے تو خرید و فروخت کرے[۱]

(یہ کام نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے، بلکہ ثواب کا بھی حامل ہے)۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے بھی اس طرح کی ایک روایت مروی ہے، جس کے آخر میں آپ فرماتے ہیں۔

ليشهدوا منافع لهم

---

[۱] تفسیر عباسی بمطابق المیزان ج نمبر ۲ صفحہ ۶۰۔

Marfat.com

تا کہ اپنا نفع حاصل کریں۔

لفظ "منافع" بہت بلیغ اشارہ کر رہا ہے اور مادی ومعنوی مفادات پر محیط ہے۔[1]

مختصر یہ کہ اگر یہ عبادت صحیح اور مکمل طور پر بجالائی جائے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، خانۂ خدا کے زائرین مقدس سرزمین میں قیام کے دوران حج کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوں اور پوری طرح سرگرم بھی رہیں، اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے سیاسی ثقافتی اور اقتصادی مسائل پر باہمی صلاح مشورے کریں تو مناسک حج پر مسئلے کا حل پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور شاید اسی نکتے کو امام صادقؑ نے اسی طرح فرمایا ہے۔

لا یزال الدین قائما ما قامت الکعبة

یعنی جب تک کعبہ رہے گا دین رہے گا۔[2]

جناب امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ فی بیت ربکم لا تخلوہ ما بقیتم فانہ ان ترک لم تناظروا۔

خدارا اپنے رب کے گھر کے بارے میں اس کے احکامات کی تعمیل کرو اور اسے ہرگز خالی نہ چھوڑنا ورنہ اللہ کی طرف سے بالکل مہلت نہ دی جائے گی۔[3]

۴۔ اس زمانے میں قربانی کے گوشت سے متعلق ذمہ داریاں

زیر بحث آیت سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے، کہ قربانی کے معنوی اور روحانی پہلوؤں اور حصول تقرب بارگاہِ الٰہی کے علاوہ اور مقاصد بھی ہیں، وہ یہ کہ اس گوشت کا مناسب مصرف کیا جائے، قربانی دینے والا خود بھی کھائے، مساکین وغربا و مستحقین تک بھی پہنچائے، اسراف فضول خرچی کی بھی اسلام میں بڑی واضح ممانعت ہے۔ یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت اور فہم عامہ سے یہ بات ثابت ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی قطعاً اجازت نہیں ہے کہ قربانی کے کثیر گوشت کو "منیٰ" میں اُدھر پھینک کر فضا کو مکدر بنائیں یا "منیٰ" میں دفن کر دیں، مناسکِ حج میں قربانی کا واجب ہونا صرف ان دو کاموں کے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ اگر ضرورتمند افراد وہاں موجود نہیں ہیں تو ضروری ہے کہ دُنیا کے دوسرے حصوں میں جہاں بھی ضرورت مند ہوں اس گوشت کو ان تک پہنچایا جائے۔ (قابل غور ہے)

مگر افسوس آج مسلمان قربانی دینے کے حکم کی تعمیل تو کرتے ہیں مگر گوشت کی تقسیم کو بھلائے ہوئے ہیں۔ ہر سال لاکھوں جانوروں کا گوشت جو ضرورت مندوں کی کثیر تعداد کی ایک طویل مُدت تک ضرورت پوری کر سکتا ہے، اس مقدس سرزمین پر بہت ناپسندیدہ، اور

---

[1] بحارالانوار ج نمبر ۹۹ ص ۳۲

[2] وسائل الشیعہ ج نمبر ۸ ص ۱۴

[3] نہج البلاغہ، جناب امیرؑ کے خطوط، وصیت نمبر ۴۷۔

Marfat.com

مکروہ حالت میں تلف ہوجاتا ہے، مسلمانوں کے بہت سے علماء دانش مندوں اور منکروں نے سعودی حکومت سے اس ضمن میں بارہا گفتگو کی ہے۔ یہاں تک کہ رضا کارانہ طور پر گوشت کے حمل ونقل کے اخراجات برداشت کرنے کی پیش کش بھی کرچکے ہیں۔ مگر ایک طرف وہابی علماء کا جمود اور بے حسی اور دوسری طرف سعودی حکومت کے کارپردازوں کی لاپرواہی اور بے اعتنائی اس کارِخیر کی راہ میں سنگِ گراں بنی ہوئی ہے۔

اسراف وفضول خرچی کی حرمت اور کفرانِ نعمت جو ایک مسلمہ مسئلہ ہے سے قطع نظر عید قربان کے دن منیٰ میں قربانگاہ کی کیفیت وماحول اس قدر مکدر وغیر مطلوب ہوتا ہے کہ کمزور ایمان کے مسلمان اس رکن کے وجوب کے بارے میں ہی شک کرنے لگتے ہیں۔ مزید برآں دشمنوں کو مخالفت کے لیئے ایک مؤثر حربہ ہاتھ لگتا ہے۔ وہ اس کیفیت کو وہاں کے علماء اور منتظمین کی کوتاہ فکری سمجھنے کی بجائے اسلام میں مین میخ نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا دُنیا کے تمام تر مسلمان ممالک کے عوام پر لازم ہے کہ عظمت اسلام کے تحفظ اور مناسکِ حج کی صحیح تصویر کو نمایاں کرنے کے لیے سعودی حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ ذلت آمیز ماحول کو ختم کرکے احکاماتِ اسلام کا نفاذ کریں۔ البتہ بعض روایات جن کے مطابق قربانی کا گوشت منیٰ یا حرمِ مکہ سے باہر لے جانا ممنوع ہے، ان کا تعلق اس زمانے اور حالات سے ہے، جب اس گوشت کے ضرورت منداس علاقے میں موجود ہوتے تھے اور گوشت کی مقدار انہی کے لیے کافی تھی، چنانچہ معتبر ذرائع سے حاصل ہونے والی یہ روایت اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالتی ہے۔ امام صادقؑ کے ایک صحابی نے قربانی کے گوشت کو منیٰ سے باہر لے جانے کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

كُنّا نقول لا يخرج منها بشيء لحاجة الناس اليه، فاما اليوم فقد كثر الناس فلا بأس باخراجه

کبھی ہم کہا کرتے تھے کہ اس میں سے کچھ بھی باہر نہ لے جائیں، کیونکہ لوگ ضرورت مند تھے۔ اب جبکہ حجاج کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ قربانی کے گوشت کی مقدار بھی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اسے باہر لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۱۵۰ (ابواب الذبح باب ۴۲ حدیث نمبر ۵)

Marfat.com

۲۹۔ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ
وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝
۳۰۔ ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا
مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ
مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝

ترجمہ

۲۹۔ اس کے بعد اپنی میل کچیل کو دور کریں۔ منتیں اتاریں اور قابل احترام خانہ کعبہ کا طواف کریں۔

۳۰۔ حج کے مناسک یہی ہیں اور جو اللہ کے قوانین کا احترام کرے اللہ کے ہاں اس کی بہتر جزا ہے اور تمھارے لیے چوپائے حلال کیے گئے ہیں۔ سوائے ان کے جو تمھیں بتا دیئے گئے ہیں۔ گندگی (یعنی بتوں) سے اجتناب کرو اور باطل و بے ہودہ باتوں سے بچو۔

Marfat.com

تفسیر

مناسکِ حج کا ایک اور اہم حصّہ

مناسکِ حج کے متعلق مندرجہ بالا بحث کے بعد زیرِ نظر آیت میں انہی کے ایک اور حصّے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا جارہا ہے۔ اس کے بعد اپنی گندگی اور فالتو اجزار کو اپنے آپ سے دور کریں (ثُمَّ لیقضوا تفثھم)۔ اور اپنی نذریں پوری کریں۔ (ولیوفوا نذورھم) اور مرورِ زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ گھر کا طواف کریں۔ (و لیطوفوا بالبیت العتیق)۔

اکثر اہلِ زبان اور مشہور مفسرین کے بقول "تفث" کا مطلب میل کچیل کثافت اور غیر ضروری اعضاء بدن جیسے ناخن، اور غیر ضروری بال ہیں۔ بعض کے مطابق اصل میں ناخن کے نیچے میل کچیل اور اس قسم کی چیزوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔[۱]

کئی دوسرے ماہرینِ لسانیات کے مطابق یہ لفظ سرے سے عربی زبان میں موجود ہی نہیں ہے۔ لیکن "مفرداتِ راغب" کے مطابق ایک صحرائی عرب نے اپنے اس ساتھی سے جو میل کچیل اور گندگی سے اٹا ہُوا تھا، کہا

"ما اتفثك وادرنك"

"تو کس قدر گندا اور غلیظ ہے۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان میں یہ لفظ موجُود ہے۔

روایات میں بھی بارہا اس جُملے کا مفہوم ناخن کاٹنا، بدن صاف کرنا اور احرام اتارنا بیان کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ جُملہ "تقصیر" کے عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو مناسکِ حج میں سے ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں "سر منڈوانے" کے لیے بھی یہ جُملہ استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی "تقصیر" کا حصّہ ہے

کنزالعرفان میں اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ اس جُملے سے مراد تمام مناسکِ حج کو انجام دینا ہے۔[۲] لیکن اس قول کی کوئی دلیل ہماری نظر میں نہیں ہے۔

ایک لائقِ توجہ روایت ہے کہ امام صادقؑ نے "ثُمَّ لیقضوا تفثھم" کی تفسیر اپنے زمانے کے امام سے ملاقات کرنے سے کی ہے اور جب راوی نے وضاحت چاہی اور عرض کیا کہ لوگ تو اس سے مراد ناخن کاٹنا اور غلاظت کو دُور کرنا لیتے ہیں۔ تو آپؑ نے فرمایا۔ "قرآن مجید ظاہر و باطن رکھتا ہے" یعنی امام سے ملاقات کا تعلق

---

[۱] کنزالعرفان، تفسیر مجمع البیان اور دوسری تفاسیر، نیز قاموس اللغۃ اور مفردات راغب۔

[۲] کنزالعرفان ج ۱ ص۲۰

Marfat.com

آیت کے باطنی معنیٰ میں سے ہے۔[1]

ہوسکتا ہے اس حدیث میں یہ نکتہ پنہاں ہو کہ خانۂ خدا کا زائر مناسک حج ادا کرنے کے بعد جس طرح گندگی اور غلاظت کو اپنے بدن سے دور کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے زمانے کے امام سے ملاقات کے بعد روحانی غلاظتوں سے پاک ہوجاتا ہے علی الخصوص جن ادوار میں ظالم اور جابر بادشاہ عام حالات میں مسلمانوں کو ائمہ اطہار سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتے تھے مناسک حج اس سعادت کا بہترین موقع ہوا کرتا تھا۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت امام باقرؑ سے مروی ہے۔ آپؑ نے فرمایا

تمام الحج لقاء الامام

حج کی تکمیل اپنے امام سے ملاقات پر ہوتی ہے۔[2]

حقیقت بھی یہی ہے کہ مناسک حج اور ملاقات امامؑ دونوں ہی ذریعہ تطہیر ہیں"۔ ایک ظاہری غلاظت وکثافت کی کی تطہیر کا اور دوسرا باطنی جہالت واخلاقی انحطاط کی تطہیر کا۔

رہ گیا منتیں اتارنے کا مسئلہ تو اس سے مراد ہے کہ صدر اسلام میں بعض مسلمان منت مان لیتے تھے کہ اگر انہیں حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو مناسک حج کے علاوہ امور خیر صدقات اور قربانی بجالائیں گے۔ بسا اوقات اپنی مراد پانے کے بعد منت اتارنا بھول جاتے تھے۔ اس لیے قرآن مجید میں منت اتارنے کی تاکید آئی ہے۔[3]

خانہ کعبہ کو "بیت العتیق" کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "عتیق" لفظ "عتق" سے مشتق ہے اور اس کا معنی قید وبند سے آزاد ہونا ہے۔ احتمال یہ ہے کہ چونکہ خانۂ کعبہ "انسان کی قید وبند سے ماوراء ہے اور کسی زمانے میں بھی اللہ کے علاوہ کسی کی ملکیت نہیں رہا۔ حتیٰ کہ ابرہہ جیسے جابروں اور سرکشوں کے تسلط اور غلبے سے بھی آزاد ہی رہا۔ اس لیے اسے "بیت العتیق" کہا گیا ہے۔

عتیق کا ایک اور معنیٰ بیش بہا اور قابل قدر بھی ہے۔ یہ معنیٰ بھی خانہ کعبہ کے لیے بالکل درست ہے۔ "عتیق" کا ایک اور مطلب "قدیم بھی ہے۔ جیسے مفردات راغب میں ہے۔

العتیق المتقدم فی الزمان او المکان او الرتبۃ

عتیق، وہ چیز ہے جو زمان ومکان اور رتبے کے لحاظ سے اولیٰ ہو"

اولیت کا معنیٰ بھی خانہ کعبہ پر بھی عین منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ سورہ آل عمران آیۃ ۹۶ میں ہے۔

---

[1] تفسیر نورالثقلین ج ۳ ص ۴۹۲

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۲۵۵ ابواب المزار باب نمبر ۲ حدیث نمبر ۱۳۔

[3] بعض مفسرین نے "نذر" سے خود مناسک حج مراد لیا ہے۔ لیکن مزاج قرآن کے مطابق لفظ "نذر" "منت" ہی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس کا "مناسک حج" کا معنیٰ ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

Marfat.com

اِنّ اوّل بیتٍ وضع للنّاس للّذی ببکۃ مبارکًا وھدی للعالمین

دنیا میں سب سے پہلا مبارک اور ہدایت کنندۂ توحید وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے۔

بہر حال کو حرج نہیں، اگر یہ لفظ اپنے تمام معانی کے ساتھ خانہ کعبہ کی تمام خصوصیات کی وجہ سے اس کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگرچہ مفسرین میں سے ہر ایک نے ان میں سے بعض معانی کی طرف اشارہ کیا ہے یا مختلف روایات میں سے ہر ایک روایت میں کسی ایک معنیٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں "طواف" کا ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون سا طواف ہے؟ چونکہ منیٰ میں قربانی کے بعد حجاج کرام دو طواف بجا لاتے ہیں، پہلے کو "طواف زیارت" اور دوسرے کو "طوافِ نساء" کہا جاتا ہے بعض فقہاء اور مفسرین کا خیال ہے کہ چونکہ آیت میں لفظ طواف بلا قید اور غیر مشروط ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم عام ہے۔ یعنی اس لفظ سے سبھی طواف مراد لیئے جا سکتے ہیں۔ طوافِ زیارت، طوافِ نساء، حتیٰ کہ طواف عمرہ بھی اس میں شامل ہے۔[۱]

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف طوافِ زیارت ہے جو کہ احرام کھولنے کے بعد واجب ہوتا ہے۔[۲]

اس ضمن میں جو روایات آئمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مطابق اس سے مراد "طواف نساء" ہے۔ چنانچہ امام صادقؑ فرماتے ہیں۔

ولیوفوا نذورھم ولیطوفوا بالبیت العتیق میں طواف سے مراد طواف نساء ہے۔

امام رضاؑ سے بھی یہی معنیٰ مروی ہیں[۳]

یہ وہی طواف ہے جسے اہل سنّت "طواف وداع" کہتے ہیں۔

بہر حال مندرجہ بالا احادیث کے پیش نظر آخری تفسیر زیادہ قوی دکھائی دیتی ہے۔ علی الخصوص اس کا امکان ہے کہ "ثم لیقضوا تفثھم" کے جملے سے بدن کو غلاظت سے پاک کرنے کے بعد پاکیزگی کی تکمیل کے لیے معطر کرنا بھی مراد ہو۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ حج کے سلسلے میں معطر صرف اس وقت ہوا جا سکتا ہے۔ جب حاجی طواف وسعیٔ زیارت سے فارغ ہو چکا ہو لہٰذا اس صورت میں "طواف نساء" کے سوا اور کوئی طواف حاجی کے ذمے نہیں ہوتا۔ (غور کیجیے گا۔

گذشتہ آیتوں کی بحثوں کو سمیٹتے ہوئے بعد والی آیت میں کہا جا رہا ہے۔ مناسک حج کی تفصیلات یہی ہیں۔

(ذٰلک)[۴]

اس کے بعد مذکورہ فرائض اور ذمہ داریوں کی تاکیدِ مزید کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ "جو شخص اللہ کے لائحہ عمل کا احترام

---

[۱] کنز العرفان ج ۱ ص ۲۷۱

[۲] تفسیر مجمع البیان میں یہ نظریہ مفسرین کا نام لیے بغیر درج کیا گیا ہے۔

[۳] وسائل الشیعہ ج ۹ ص ۳۹۰ ابواب الطواف باب نمبر ۲

[۴] اس لفظ کے تحت ایک پورا جملہ محذوف ہے وہ یہ ہے۔ کذالک امر الحج والمناسک۔

Marfat.com

کرے اور اس کو اہم جانے اس کے لیے اللہ کے ہاں بہتر جزا موجود ہے (ومن یعظم حرمات اللہ فھو خیر لہ عند ربہ)۔

واضح سی بات کہ "حرمات" سے مراد مناسک حج ہیں۔ ہوسکتا ہے، خصوصی طور پر خانہ کعبہ اور عمومی طور پر حرم مکہ کا احترام و تکریم بھی اس میں شامل ہو۔ لہٰذا خاص طور پر تمام اوامر و نواہی کو اس میں شامل کر لینا ظاہر آیت کے خلاف ہے "حرمات" جمع ہے "حرمت" کی اور لفظ "حرمت" اس چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کا احترام ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے اور اس کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیئے۔

اس کے بعد احکام احرام کی مناسبت سے چوپاؤں کے حلال ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوپائے (بھیڑ بکری، گائے بھینس اور اونٹ وغیرہ) تمہارے لیے حلال ہیں۔ سوائے اُن کے جو بعد ازاں بتائے جائیں گے۔ اور ان کی ممانعت کا حکم دیا جائے گا۔ (واحلت لکم الانعام الا ما یتلیٰ علیکم)۔ اس آیت کا آخری حصّہ (الا ما یتلیٰ علیکم) حالت احرام میں شکار کی حرمت کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ سورہ مائدہ آیت ۹۵ میں فرمایا گیا ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا لا تقتلوا الصید وانتم حرم

اے صاحبانِ ایمان! حالتِ احرام میں شکار نہ کرو"

سورہ مائدہ، سورہ حج کے بعد نازل ہوئی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حرمت، زیرِ بحث آیت کے اُس جملے کی طرف اشارہ ہو جو بتوں کے لیے کی جانے والی قربانیوں کی حرمت کے بارے میں آیا ہے۔ کیونکہ یہ مُسلم ہے کہ جانور کا حلال ہونا، صرف اس صورت میں ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے نہ کہ بتوں یا کسی اور کا۔

آیت کے آخر میں، مناسکِ حج کے ذیل میں اور زمانۂ جاہلیّت کے طور طریقوں کے خلاف دو مزید حکم دیے جا رہے ہیں بتوں کی غلاظت وگندگی سے اجتناب کرو" (فاجتنبوا الرجس من الاوثان)۔

اوثان جمع وثن (بروزن کفن) ہے، اس سے مراد وہ پتھر ہیں۔ جو معبود کے طور پر رکھے جاتے تھے یہاں لفظ "اوثان" "رجس" کی وضاحت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو اس سے پہلے ہے یعنی آیت کا جملہ کچھ یوں ہے۔ گندگی اور غلاظت سے اجتناب کرو۔ بعد میں کہا جاتا ہے گویا کہ پلیدگی وہی بُت ہیں۔ توجہ طلب نُکتہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے بت پرست، قربانی کرنے کے بعد، قربانی کا خون بتوں کے سروں اور چہروں پر مل دیتے تھے۔ اس طرح بڑی کریہہ المنظر کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ممکن ہے، زیرِ بحث آیت میں اسی طرف اشارہ ہو۔

"اور بے ہودہ گفتگو سے اجتناب کرو" (واجتنبوا قول الزور)۔

Marfat.com

نکتہ

"قول الزور" کیا ہے؟

بعض مفسرین کے مطابق "قول الزور" سے مراد قبل از اسلام حج کے دوران مشرکین کا "تلبیہ" ہے انہوں نے توحید کے آئینہ دار "تلبیہ" کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ تلبیہ مشرکانہ روشوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ اس طرح "تلبیہ" کہتے تھے۔

لبیك لا شریك لك الّا شریكا هولك، تملكه وما ملك

"ہم نے تیری دعوت کو قبول کیا اور ہم تیری بارگاہ میں آحاضر ہوئے۔ اے وہ خدا جس کا سوائے اس مخصوص شریک کے کوئی شریک نہیں تو بھی اس کا ہے اور اس کی ہر شے کا مالک بھی تو ہی ہے۔"

یہ جملہ بلاشک و شبہ خرافات سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے اور قول الزور کا صحیح مصداق ہے۔ جس کا مطلب، جھوٹ، باطل اور نامناسب کلام ہوتا ہے۔

اس صورت میں اگر کہا جائے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے حج کے طور طریقے سے متعلق ہے تو یہ آیت کا کلی مفہوم سے مانع نہیں ہے اور ہر قسم اور ہر طرح کے بُت سے پرہیز اور ہر لغو اور بے ہودہ بات سے اجتناب کا حکم اس میں شامل رہتا ہے۔ بعض روایات میں "اوثان" سے شطرنج (جو جوئے کی ایک قسم ہے) مراد لیا گیا ہے اور قول الزور سے غناء اور جھوٹی گواہی مراد ہے۔ دراصل یہ سب ایک کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ اور زیر بحث آیت ان سب پر محیط ہے۔ نہ یہ کہ کسی ایک معنی میں منحصر ہے۔

اسلام کے قابل احترام پیغمبرؐ سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے موعظہ کے دوران فرمایا۔

"ایها الناس عدلت شهادة الزور بالشرك بالله"

اے لوگو! جھوٹی گواہی دینا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینے کے مترادف ہے

پھر آپ نے یہی آیت " فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور" کی تلاوت فرمائی۔

یہ حدیث بھی زیر بحث آیت کی وسعت پر دلالت کرتی ہے۔

Marfat.com

۳۱۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ○

۳۲۔ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ○

۳۳۔ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ○

ترجمہ

۳۱۔ (مناسک حج بجالاؤ) اس طرح کہ صرف اللہ ہی کے لیے خالص رہو۔ کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو اور جو شرک کرے گا، گویا کہ آسمان سے گرتے ہوئے ایسے پرندے (فضامیں) اُچک لیتے ہیں یا آندھی کے جھکڑ اسے دور دراز اڑا لے جاتے ہیں

۳۲ (مناسک حج اسی طرح ہیں) اور جو شعائر اللہ کا احترام کرے تو یہ عمل تقوائے دل کی علامت ہے۔

۳۳۔ ایک خاص وقت (ان کے ذبح ہونے کے دن) تک قربانی کے جانوروں

Marfat.com

میں تمھارے لیے فائدے ہیں ۔ پھر محترم اور قدیمی خانہ کعبہ ان کی جگہ ہے (عمرۂ مفردہ کی صورت میں قربانی کی جگہ خود مکہ ہے، جب کہ حج کی صورت میں منٰی ہے جو مکہ کے نواح میں واقع ہے۔)

تفسیر

شعائر اللہ کی تعظیم علامتِ تقوٰے ہے

گذشتہ آیت کے آخر میں توحید اور جملہ بتوں اور ہر قسم کی بت پرستی سے اجتناب کی تاکید پر بحث ہو رہی تھی۔ یہ آیت بھی اسی نکتے کے ذیل میں بیان کر رہی ہے۔ مناسکِ حج اور تلبیہ خالصتاً للہ ادا کرو اور کسی طرح بھی اس میں شرک کا گزر نہ ہو (حنفاء للّٰہ غیر مشرکین بہٖ)[1]

"حنفاء" "حنیف" کی جمع ہے۔ جس سے مراد وہ شخص ہے، جو گمراہی اور افراط و تفریط سے ہٹ کر راہِ راست اور میانہ روی کی طرف میلان رکھتا ہو۔ بالفاظِ دیگر غلط راستے سے ہٹ کر "صراطِ مستقیم" پر قدم رکھے۔ کیونکہ "حنف" (بروزن "صدف") جھکاؤ اور میلان کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ (ہر قسم کی گمراہی سے منہ موڑ کر دوسری جانب جھکنے ہی کا نتیجہ "صراطِ مستقیم" پر گامزن ہوتا ہے)

اس طرح سے یہ آیت اخلاص اور ارادۂ قربتِ خدا کو حج اور دیگر عبادات میں اصل محرک کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عبادت کی روح اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ کسی قسم کا شرک اور غیر قدرتی عنصر اس میں کار فرما نہ ہو۔ امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپ سے "حنیف" کی تشریح کے لیے سوال کیا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا

ھی الفطرۃ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ قال۔
فطرھم اللّٰہ علی المعرفۃ

حنیف اس فطرت کا نام ہے، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدا کردہ فطرت میں کبھی تغیر و تبدل نہیں نہیں ہوا کرتا۔ اس کے بعد فرمایا اللہ تعالےٰ نے توحید کو انسانی سرشت میں قرار دیا ہے۔[2]

زیرِ بحث آیت کی جو تفسیر مندرجہ بالا روایت میں آئی ہے وہ "خلوص" کی حقیقی بنیاد کی طرف اشارہ ہے۔ فطرت توحیدی

---

[1] "حنفاء" اور غیر مشرکین دونوں حال ہیں اور گذشتہ آیت کے افعال "فاجتنبوا" اور اجتنبوا سے متعلق ہیں۔
[2] تفسیر صافی بحوالہ توحید صدوق۔

Marfat.com

تصد قربت اور محرک کا منبع ہے۔

اس کے بعد مشرکین، ان کے زوال، بدبختی اور تباہی کی حقیقت بیان تصویر کشی کی گئی ہے:

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دے، اس کی مثال آسمان سے اس گرنے والے کی سی ہے جس پر مردار خوار پرندے جھپٹتے ہیں (اس کے جسم کا ایک ایک جزو کسی نہ کسی مردار خوار پرندے کی چونچ میں ہوتا ہے) اور یا داگر ان کی گرفت سے بچ نکلے تو) آندھیاں اس کے جسم کے اعضاء چاروں طرف بکھیر دیتی ہیں (ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق)۔[1]

دراصل اس آیت میں آسمان کو توحید کے لیے کنایے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور شرک کو آسمان سے گرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ فطری حقیقت ہے کہ آسمان پر سورج اور چاند روشنی پھیلاتے ہیں۔ اور ستارے چمکتے ہیں خوشا بحال وہ جو اس آسمان پر اگر شمس و قمر کی طرح نمایاں نہیں ہو سکتا تو کم از کم ستاروں کی طرح تو چمکتا ہے۔ مگر انسان جب اس رفعت سے گرتا ہے تو دو انجاموں میں سے ایک اس کا مقدر بن جاتا ہے یا یہ کہ زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی مردار خوار بڑے بڑے پرندوں کا تر نوالہ بن جاتا ہے۔ یعنی اطمینان بخش مرکز سے ہٹ جانے کے بعد خواہشات نفسانی کے اضطراب و گرداب میں پھنس جاتا ہے اور ہر خواہش نفسانی گویا اس کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو اچک لیتی ہے اور اسے ختم کر دیتی ہے اور اگر اس مرحلے سے صحیح سلامت نکل جائے تو تیز و تند آندھیاں اور جھکڑ اسے آ لیتے ہیں۔ زمین پر ادھر اُدھر اُسے اس طرح پٹختے ہیں کہ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ یہ آندھیاں اور جھکڑ دراصل شیطان کی طرف اشارہ ہے جو تاک لگائے بیٹھا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جو شخص بلندی سے پستی کی طرف جاتا ہے، وہ قوت فیصلہ اور قوت ارادی سے محروم ہو جاتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی تیزی کی وجہ سے وہ نیستی و عدم کی طرف بڑھتا جاتا ہے، حتّٰی کہ بالکل معدوم و محو ہو جاتا ہے۔

واقعی جو شخص آسمان توحید کے مرکز کو کھو دے، وہ اپنی تقدیر کی لگام تھامنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں جتنا آگے بڑھتا ہے اس کے تنزل اور زوال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حتّٰی کہ تمام انسانی جوہر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

واقعی "شرک" کے لیے اس سے زیادہ واضح اور منہ بولتی مثال نہیں دی جا سکتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ دور میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ جہاں کشش ثقل نہ ہو وہاں انسان کا کوئی وزن نہیں ہوتا اسی لیے خلا باز ایسی فضا میں بے وزنی کی مشق کرتے ہیں، جہاں کشش ثقل ختم کر دی جاتی ہے۔ وہاں انسان پر جو اضطراب

---

[1] تخطفہ "خطف" (بروزن "عطف") کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی جھپٹ کر پکڑنا ہے۔
"سحیق" دور دراز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "سحوق" کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو بہت اونچا ہو اور اس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوں۔

Marfat.com

بے قراری کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، بے وزنی ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بے شک جو شخص فراز ایمان سے نشیب شرک کی طرف لڑھکتا ہے۔ دراصل اپنے مستقر اور مسکن کو کھونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک بے وزنی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس کے بعد شدید اضطراب اس پر طاری ہو جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں مناسک حج اور شعائر اللہ کی تعظیم کی بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا جارہا ہے: بات یونہی ہے، جیسے بیان کر دیا گیا ہے (ذٰلک)۔

جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے، انھیں برتر جانے اور دین مقدس اسلام کی نشانیوں اور اس کی اطاعت کی علامتوں کا احترام کرے، خود اس کے متقی ہونے کا ثبوت ہے (ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب)۔

"شعائر" "شعیرۃ" کی جمع ہے، جس کا معنیٰ علامت اور نشانی ہے۔ لہٰذا "شعائر اللہ" کا مطلب اللہ کی نشانیاں ہوا۔ جس میں دین مبین کا مجموعی پروگرام اس کے چیدہ چیدہ مبانی واصول وارکان ہیں کہ جو پہلی ہی نظر میں نمایاں نظر آنے لگتے ہیں اسی میں سے "مناسک حج" بھی ہیں، جو انسان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلاتے ہیں۔ اگرچہ مناسک حج بلاشبہ ان شعائر میں سے ایک ہیں، جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ علی الخصوص قربانی کا مسئلہ جو اس سورۃ کی آیت ۳۶ میں پوری وضاحت کے ساتھ انہی شعائر سے ایک جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

لیکن واضح رہے کہ اس میں تمام اسلامی شعائر کا مفہوم پوری شد و مد سے موجود ہے اور کسی طور بھی انہیں صرف مناسک حج یا قربانی کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ قربانی کے بارے میں شعائر اللہ کا ذکر لفظ "من" کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قربانی ان تمام "شعائر" میں سے ایک ہے، جن کو شعائر اللہ کہا جاتا ہے اور یہاں لفظ "من کو" "من تبعیضی" کہتے ہیں۔ اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۸ میں صفا و مروہ کے بارے میں ہے۔

"اِنَّ الصفا والمروۃ من شعائِر اللہ"

بے شک صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ تمام ارکان مقامات اور اشیاء جن کا تعلق دین کے کسی نہ کسی پروگرام سے ہے اور انسان اللہ کی یاد دلاتی ہیں اور دین کی عظمت و حشمت کا مظہر ہیں وہ سب کی سب شعائر اللہ ہیں اور ان کی تعظیم و تکریم بذات خود تقوٰی و پرہیزگاری کی علامت ہے۔

ایک اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کی تعظیم و تکریم سے مراد یوں نہیں کہ جیسے بعض ظاہر بین مفسرین نے قربانی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی بڑائی کا مفہوم اس کا جسمانی طور پر بڑا ہونا ہے۔ بلکہ تعظیم کی حقیقت یہ ہے کہ "شعائر اللہ" کی حقیقت، مقام اور کیفیت کے بارے میں اپنے افکار و اذہان کو اونچا کریں اور اسی مناسبت سے ان کا شایانِ شان احترام کریں۔ اس عمل کا دل میں پائے جانے والے تقوٰی و پرہیزگاری سے گہرا تعلق ہے اور درحقیقت "تعظیم" قصد

Marfat.com

ارادہ، کا جزو ہے۔ یُوں تو منافق بھی ظاہری اعمال سے "تعظیم" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر ان کے اعمال کا سرچشمہ "دلی تعظیم" اور تقویٰ و پرہیزگاری نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کی قطعی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حقیقی تعظیم ان افراد ہی کی طرف سے ہے جو صاحبانِ تقوٰے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ پرہیزگاری اور احکاماتِ خداوندی کے سلسلے میں جواب دہی کا احساس باطنی امور ہیں اور ان کا مرکز انسان کا دل اور رُوح ہیں، جہاں سے یہ سارے جسم کی طرف سرایت کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ "شعائر اللہ" کی تعظیم و احترام تقوٰے کی ایک علامت ہے۔[1]

تفسیر قرطبی ج ، ص۴۴۴۸ میں رسولِ اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپ نے اپنے سینۂ اطہر کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا

"التقوٰی ھٰھُنا"

"تقوٰی کی حقیقت یہاں ہے"

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس طرح کے عقیدے کا حامل ہے کہ قربانی کے ارادے سے لے جائے جانے والے اونٹ یا دوسرے جانور کو اپنے وطن سے میقات اور وہاں سے مکہ لائے تو اثنائے سفر میں ذاتی استعمال میں نہیں لانا چاہیئے۔ یعنی نہ اس پر سواری کرنی چاہیئے۔ نہ اس کا دودھ ذاتی طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔ وہ مجموعی طور پر اپنے لیے اس کا استعمال ممنوع سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس فضول اور لایعنی ذھنیت کی نفی کرتا ہے اور یوں کہتا ہے "ایک مقررہ وقت تک (یعنی ان کے ذبح ہُونے تک) قربانی کے جانوروں سے تم فائدے حاصل کر سکتے ہو (لکم فیھا منافع الی اجل مُسمّی)

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ جاتے ہُوئے ایک شخص کو دیکھا جو بڑی مُشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جبکہ ایک اونٹ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا

"ارکبھا"

"اس اونٹ پر سوار ہو جا۔"

اس نے عرض کیا۔

---

[1] عربی زبان کی گرائمر کے قواعد کی رُو سے شرطیہ جملوں میں "شرط" اور "جزاء" کے درمیان کوئی تعلق ضرور ہونا چاہیئے اور دونوں کا موضوع بھی ایک ہونا ضروری ہے۔ مذکورہ آیت میں "جزاء" محذوف ہے اور دراصل یُوں ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فان تعظیمھا من تقوی القلوب۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جزاء کلی طور پر محذوف ہو۔ چونکہ "فانھا من تقوی" علت ہے۔ اور اپنے معلول کی جانشین ہے اور پورا جملہ یوں ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فھو خیرٌ لہٗ فان تعظیمھا من تقوی القلوب۔

Marfat.com

"یارسول اللہ انہا ھدی"

"یارسول اللہ یہ قربانی کا اُونٹ ہے"

آپؐ نے قدرے غصے سے فرمایا۔

ارکبھا ویلک

افسوس ہے تیرے حال پر میں کہہ رہا ہوں سوار ہو جا۔ ۱؎

اسی طرح کی متعدد روایات اہل بیتؑ کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات میں سے ایک ابو بصیر امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں آپؑ نے فرمایا۔

ان احتاج الی ظھرھا رکبھا، من غیر ان یعنف علیھا وان کان لھا لبن حلبھا حلابا لا ینھکھا۔

اگر حاجی کو قربانی کے جانور کو بطور سواری استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو سوار ہو جائے۔ مگر اس پر تشدد نہ کرے۔ اگر قربانی دودھ دینے والا جانور ہو تو بے شک دودھ دھوے۔ مگر اس پر زیادتی نہ کرے۔ ۲؎

مذکورہ بالا روایات دو انتہائی نظریات کے درمیان "معتدل" طریقے کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ ایک طرف اس طرح کے لوگ تھے کہ قربانی کے جانوروں کا سرے سے کسی قسم کا احترام ہی ملحوظ نہ رکھتے تھے اور کبھی تو وقت و مقام قربانی سے پہلے ہی ذبح کر کے کھا لیتے تھے۔ جس کی طرف سورۂ مائدہ آیت ۲ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد

شعائر اللہ ماہِ حرمت اور قربانی کو من مانے طریقے سے اپنے استعمال میں نہ لاؤ۔

دوسری طرف بعض لوگ اس طرح کرتے کہ جس جانور کو قربانی کے لیے چنتے نہ اس کے دودھ سے فائدہ اُٹھاتے اور نہ ہی اس پر سواری کرتے۔ اگرچہ مکے آتے ہوئے ان کو طویل راستوں میں اس کی سخت ضرورت بھی ہوتی، مذکورہ آیت نے ان کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا تفسیر پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ بحث آیت سے پہلے کی آیت میں قربانی کے جانور کا کوئی ذکر ہی نہیں آپ نے ضمیر ان کی طرف کیسے لوٹا دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے پہلی آیت میں "شعائر اللہ" کا ذکر تو واضح ہے اور مسلمہ طور پر قربانی، شعائر اللہ میں سے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اور بعد میں بھی کیا جائے گا۔ لہٰذا شعائر اللہ کے ضمن میں ضمیر قربانی کے جانور کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ ۳؎

۱؎ تفسیر کبیر فخرالدین رازی ج ۲۳ ص۳۳

۲؎ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص۴۹

۳؎ مذکورہ بالا اس آیت کی واضح تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین نے دو اور خیالات کا بھی اظہار کیا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

بہر حال آیت کے آخری حصے میں قربانی کے آخری مقام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے۔

اس کا مقام وہ قدیم اور محترم گھر خانہ کعبہ ہے (ثم محلها الی البیت العتیق)۔

اس طرح جب تک قربانی کا جانور قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس سے ذاتی کام لیا جاسکتا ہے اور قربان گاہ تک پہنچنے کے بعد اُس کی قربانی کے فرض کو ادا کرنا چاہیئے۔ فقہاء نے اسلامی اسناد کی بنیاد پر کہا ہے کہ اگر قربانی حج سے متعلق ہے۔ تو اس کی قربان گاہ میدانِ منٰی ہے، اگر عمرہ مفردہ سے متعلق ہے تو مکۃ المکرمہ ہے۔ البتہ زیر بحث آیت مناسک حج پر گفتگو کررہی ہے لہٰذا "بیت العتیق" (خانہ کعبہ) کو وسیع تر معنیٰ یعنی مکہ مکرمہ اور اس کے گردو نواح (میدان منٰی) کے معنیٰ میں بھی سمجھنا چاہیئے۔ (قابلِ غور ہے)

(ا) "فیها" کی ضمیر تمام مناسک کی طرف پلٹتی ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یوں ہوگا۔ (ایک مقررہ وقت تک (ایام حج یا دنیا کے ختم ہونے تک) مناسک حج میں تمہارا مفاد ہے۔

حج کا آخری رکن جس کو بجالانے کے بعد حاجی احرام کھول کر "محل" ہوجاتا ہے، خانہ کعبہ کے قریب طواف زیارت یا طواف نساء کا بجالانا ہے، اس بنا پر زیر بحث آیت (لیشهدوا منافع لهم) کے مشابہ ہے، جس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

(ب) "فیها" کی ضمیر تمام شعائر اللہ اور اسلام کے نمایاں ارکان اعمال کی طرف پلٹتی ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یوں ہوگا (شعائر اللہ اور تمام اسلامی احکام میں رہتی دنیا تک تمہارے لیے بہت فائدے ہیں۔ اس کے بعد تمہاری اخروی جزا، خانہ کعبہ کے خالق کے ذمہ ہے۔

لیکن جس تفسیر کو ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح اور روایات سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

Marfat.com

۳۴۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا
اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ
الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ
أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۝
۳۵۔ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ
وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي
الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝

ترجمہ

۳۴۔ ہر ایک امت کے لیے ہم نے ایک قربان گاہ مقرر کی ہے تاکہ وہ روزی کے طور پر دیئے جانے والے چوپایوں پر (ان کی قربانی کرتے ہوئے) خدا کا نام لیں اور تمہارا خدا معبودِ یکتا ہے۔ اس کے حضور سرِ تسلیم خم کرو اور منکسر و برباد لوگوں کو خوش خبری سنا دو۔

۳۵۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل خوفِ الٰہی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں جو مصیبتیں پہنچتی ہیں اُن پر صابر اور مضبوط رہتے ہیں اور یہ لوگ نماز قائم کرنے والے

Marfat.com

ہیں اور انھیں جو روزی دی گئی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر

بُردبار لوگوں کے لئے بشارت

گذشتہ آیتوں کے حوالے سے مجملہ قربانی کے مضمون سے شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اسلامی شریعت میں یہ کیسی عبادت ہے۔ کہ خداوند قدوس کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے جانوروں کی قربانی دی جائے۔ آیا خدا کو قربانی کی ضرورت ہے؟ آیا یہ حکم دوسرے ادیان میں بھی آیا ہے یا صرف یہ مشرکین کا طریقہ کار تھا؟ انھیں سوالات کی وضاحت کے ذیل میں قرآن مجید زیر بحث پہلی آیت میں فرمارہا ہے۔ قربانی اور خدا کے لیے جانور ذبح کرنے کا حکم صرف ہی نہیں دیا گیا۔ بلکہ "ہم نے ہر اُمت کے لیے ایک قربان گاہ قرار دی ہے تاکہ وہ روزی کے طور پر دیئے جانے والے جانوروں کو قربان کرتے ہوئے ان پر اللہ کا نام لیں" (ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام)۔

راغب اپنی "مفردات" میں کہتے ہیں کہ

"نسك" کے معنی عبادت کے ہیں "ناسك" بمعنی "عابد" ہے۔ لہٰذا "مناسک حج" یعنی وہ مقامات یا اوقات گاہیں جہاں یہ عبادت بجالائی جاتی ہے یا پھر خود انہی اعمال کے معنی میں ہے۔

لیکن مجمع البیان، میں جناب طبرسی اور رُوح الجنان، میں جناب "ابوالفتوح رازی" کے بقول "منسك" بروزن "منصب" ہے اور ایک احتمال کے مطابق عبادات میں سے علی الخصوص "قربانی" کے معنی میں ہے۔ [1]

اس بنا پر اگرچہ "منسك" ایک عام مفہوم رکھتا ہے، جس میں منجملہ عبادات کے "مناسکِ حج" بھی شامل ہیں۔ اور زیرِبحث آیت (لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام" تاکہ اس پر اللہ کا نام لیں کے قرینے سے بالخصوص "قربانی" کے معنی میں ہے۔

بہرحال، ہمیشہ سے قربانی کے متعلق سوالات اُٹھائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر سوالات کی وجہ فضول اور بے ہودہ رسمیں ہیں، جو اس عبادت کے ساتھ نتھی کردی گئی ہیں۔ مثلاً ایک خاص رسم کے تحت مشرکین کا بتوں کے لیے

---

[1] اسی بنا پر کہا جاتا ہے "نسکت الشاۃ" یعنی میں نے بھیڑ ذبح کی۔

Marfat.com

قربانی کرنا، مگر اس کے برعکس اللہ کے نام پر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربانی کرنا جو دراصل کسی کا راہِ خدا میں جان نثاری اور اپنی قربانی دینے کی آمادگی کے جذبے کا مظہر ہے اور جانور کی قربانی کے بعد اس کے گوشت سے غربا مساکین اور محتاجوں کی خوراک کے لیے استفادہ کرنا وغیرہ صریحاً منطقی اور قابلِ فہم ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں مذکور ہے۔ تمھارا خدا معبود یکتا و یگانہ ہے (اور اس کا پروگرام بھی ایک ہی ہے) (فالٰھکم الٰہ واحد)۔

جب حقیقت یہی ہے تو اس کے حضور سرِ تسلیم خم کردو۔" (فلہ اسلموا) اور احکامات خدا کے سامنے جھک جانے والوں کو خوشخبری سنا دو" (وبشر المخبتین) لہ

بعد والی آیت میں" مخبتین" (انکساری کرنے والوں اور بردبار لوگوں) کی صفات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے دو حصے روحانی ہیں اور دو مادی۔

(۱) پہلے فرمایا جا رہا ہے" وہ لوگ ایسے ہیں کہ جونہی اللہ کا نام ان کے سامنے لیا جائے۔ تو ان کے دل خوفِ الٰہی سے معمور ہو جاتے ہیں (الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم)۔ یہ خوف صرف اللہ کے غیظ و غضب کی وجہ ہی سے نہیں اور نہ ہی اس کی رحمت بے پایاں میں کسی قسم کے شک و شبہ کی وجہ سے ہے۔ بلکہ یہ خوف ان ذمہ داریوں اور فرائض کی وجہ سے ہے جو ان کے کندھوں پر ہیں اور انہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں ان ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے مزید برآں یہ خوف اللہ کی بے انتہا عظمت و جلالت کی وجہ سے ہے جس کا ان کو ادراک ہے کیونکہ انسان ہیبت و جلالت سے خائف ہوتا ہے۔

(۲) زندگی میں پیش آنے والے مصائب و آلام پر نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں (والصابرین علیٰ ما اصابھم)۔

حالات کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوں اور ان مشکل حالات کی وجہ سے ان کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے یہ لوگ گھبرا کر گھٹنے نہیں ٹیک دیتے اور نہ ہی ان کے اطمینان اور سکون میں فرق پڑتا ہے اور نہ وہ اپنے موقف سے دست بردار ہوتے ہیں اور نہ رحمتِ خدا سے مایوس ہوتے ہیں اور نہ ہی کبھی کسی لفظ کے ذریعے کفرانِ نعمت کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر حال میں یہ استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوئے منزل رواں دواں رہتے ہیں اور کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

(۳) اور (۴) نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (والمقیمی

لہ "مخبتین" "اخبات" کے مادہ سے ہے" خبت" (بروزن" ثبت") سے لیا گیا ہے۔ جو ہموار اور وسیع و عریض زمین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جس پر انسان آرام سے چل پھر سکتا ہے۔ بعد ازاں یہ مادہ اطمینان اور انکساری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ اس زمین پر چلنے والا مطمئن اور اس کے پاؤں تلے زمین منکسر و متواضع ہوتی ہے۔

ٓلہ خدا خوفی کے علل و اسباب کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۷، میں سورہ انفال کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں ہم شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

الصلوٰۃ ومما رزقنا ھم ینفقون)۔

یعنی ایک طرف اللہ کے ساتھ ان کا گہرا ربط ہے اور دوسری طرف ان کی جڑیں خلق خدا میں دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ "اخبات" عجز و انکساری اور تسلیم کہ جو مومنین کی خاص صفات میں سے ہیں۔ صرف باطنی پہلو نہیں رکھتیں، بلکہ اس کے آثار ظاہر و آشکار ہونے چاہئیں۔

Marfat.com

٣٦۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ
اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ
عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ
سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○
٣٧۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَ
لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا
هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ○
٣٨۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ○ ع

ترجمہ

٣٦۔ اور موٹے تازے اونٹوں کو ہم نے تمہارے شعائر اللہ میں
سے قرار دیا ہے۔ ان میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے
جب وہ قربانی کے لیے قطار میں کھڑے کیے جائیں، اور
ان کی صف بندی کر کے (قربانی کرتے وقت) اللہ کا نام

Marfat.com

نو اور جب ان کے دست و بازو (کٹ کر) گر پڑیں تو خود بھی ان کا گوشت کھاؤ اور قناعت پسند غریبوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح سے ہم نے انھیں تمھارا تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔

۳۷۔ اللہ کے پاس ہرگز ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، اس کے پاس تو صرف تمھارا تقوای پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے انہیں تمھارے تابع کر دیا ہے تاکہ جیسے اس نے تمھیں ہدایت کی ہے۔ اس طرح اس کی کبریائی بیان کرو اور نیکوکاروں کو بشارت دے دو۔

۳۸۔ یقیناً اللہ اہل ایمان کا دفاع کرتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے اور بددیانت کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر

قربانی کیوں کی جاتی ہے؟

زیر بحث آیتوں میں ایک دفعہ پھر مناسک حج، شعائر اللہ اور قربانی کے مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ پہلی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے۔ موٹے تازے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔ (والبدن جعلناها لكم من شعائر الله)۔

ایک طرف اونٹ تم سے متعلق ہیں۔ اور دوسری طرف وہ اللہ کی نشانیوں میں سے قرار دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ حج کی قربانی۔ اس باشکوہ عبادت کا ایک نمایاں حصہ ہے۔ جس کے فلسفے کے بارے میں ہم تفصیلات کر چکے ہیں۔

"بُدن" بروزن "قدس" ہے اور یہ "بدنہ" (بروزن عجلہ) کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ موٹا تازہ اور زیادہ گوشت والا اونٹ ہے، چونکہ اس طرح کے جانور قربانی کرنے اور فقراء و مساکین اور ضرورت مندوں کو کھلانے کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ لہذا خصوصی طور پر ایسے جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ احکام

Marfat.com

قربانی کے مطابق قربانی کے جانور کا موٹا تازہ ہونا ضروری شرائط میں سے نہیں۔ بس اتنا دیکھا جاتا ہے کہ کمزور اور لاغر نہ ہو۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اس قسم کے جانوروں میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے (لکم فیھا خیر)۔

یعنی ایک طرف تم ان کے گوشت سے بھی خود استفادہ کرتے ہو اور دوں کو بھی دیتے ہو اور دوسری طرف ایثار، قربانی اور عبادت بجالاکر روحانی نتائج سے بہرہ مند ہوتے ہو اور اس کی بارگاہ میں رسائی پاتے ہو۔

اس کے بعد قربانی کرنے کی کیفیت کے بارے میں ایک مختصر سا جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ جب تم قطار میں کھڑے جانوروں کی قربانی کرنے لگو تو اللہ کا نام لو (فاذکروا اسم اللہ علیھا صواف)۔

بے شک اونٹ کو نحر کرتے وقت یا دوسرے چوپایوں کو ذبح کرتے وقت جس طرح سے بھی اللہ کا نام لے لیا جائے صحیح ہے اور آیت بھی ظاہری طور پر یونہی کہہ رہی ہے، لیکن بعض روایات میں ابن عباس سے اس موقع کے لیے ایک خاص ذکر نقل کیا گیا جو دراصل ایک اکمل ذات کی تعریف ہے۔ وہ ذکر یہ ہے (اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللّٰھم منک ولک۔ [1]

امام صادقؑ سے بہت رسا اور عمدہ جملے نقل ہوئے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا

جب تم قربانی کرنے لگو اسے قبلہ رو لٹاؤ یا کھڑا کرو اور ذبح یا نحر کرتے وقت یہ پڑھو: وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا مسلما وما انا من المشرکین ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا من المسلمین۔ اللّٰھم منک ولک بسم اللہ وباللہ واللہ اکبر، اللّٰھم تقبل منی۔ [2]

لفظ "صواف" "صافہ" کی جمع ہے اور اس کا معنیٰ قطار میں کھڑے ہونے کے ہیں۔ روایات میں ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قربانی کرتے وقت اونٹ کے اگلے دونوں پاؤں ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک باندھ دیئے جائیں۔ مگر وہ کھڑا رہے۔ تاکہ نحر کرتے ہوئے وہ نہ ہلے اور نہ بھاگے۔ طبعی طور پر جب خون کی کافی مقدار خارج ہو جاتی ہے تو اگلے پاؤں ضعف کی وجہ سے کمزور پڑ جاتے ہیں اور اونٹ زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ لہٰذا آیت میں اسی کیفیت کا بیان آیا ہے کہ جس وقت اس کا پہلو ساکن ہو جائے۔ (اس کی جان نکل جائے) تو اس کا گوشت خود بھی کھاؤ، قناعت پیشہ اور غریبوں اور مقروض محتاجوں کو بھی کھلاؤ (فاذا وجبت جنوبھا

---

[1] اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں تفسیر مجمع البیان اور روح المعانی "تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ
[2] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۱۳۵ ابواب الذبح باب ۳۷۔

Marfat.com

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ)۔
"قانع" اور "معتر" میں فرق ہے۔ "قانع" اس شخص کو کہتے ہیں جسے جو کچھ بھی دیا جائے اس پر قناعت کرتے ہوئے راضی ہو جائے اور کسی قسم کا اعتراض نہ کرے اور نہ اظہار ناراضگی کرے جبکہ "معتر" ایک تو سوال کرتا ہے۔ دوسرے کبھی اوقات جو کچھ ملے اسے ناکافی جانتے ہوئے تقاضائے مزید کرتا ہے۔ اور جزبز ہوتا ہے۔ "قانع" "قناعت" کے مادہ سے اور "معتر" "عر" (بروزن "شر" اور بروزن "حر") مادہ سے اور اصل میں ایک بیماری جسے "جرب" کہتے ہیں کے معنی میں ہے (یہ خارش کی طرح کی ایک جلدی بیماری ہے)۔ اس کے علاوہ اس سائل کو جو سوال کرنے کے بعد اس پر اصرار کرتا ہے اور کبھی تو کچھ نہ ملنے پر اظہار ناراضگی و خفگی بھی کرتا ہے "معتر" کہا جاتا ہے۔ "قانع" کو "معتر" پر ترجیح اس لیے دی گئی ہے کہ محروم طبقے میں سے سفید پوش، عفیف النفس اور خود دار افراد توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔
ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے "کلوا منھا" اس میں سے کھاؤ کہہ کر آیت نے ظاہراً حاجی پر واجب کر دیا ہے کہ اپنی قربانی کا گوشت خود بھی ضرور کھائے۔ شاید یہ حکم اُن کے اور غریبوں اور محتاجوں میں مساوات کے لیے ہے۔
آیت کا اختتام ان الفاظ پر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے ہم نے ان جانوروں کو تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم شکر گذار بندے بن جاؤ۔ (كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ)۔
سچ سچ یہ عجیب ہی تو ہے کہ عظیم الجثہ اور قوی ہیکل جانور اپنی تمام تر قوتِ جسمانی کے باوجود ایک کمزور جسم والے انسان کے آگے گویا بے بس کھڑا ہو جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے پاؤں جکڑ لے اور نحر کرے (نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گردن اور اگلی دو ٹانگوں کے ملاپ پر جو گڑھا سا ہوتا ہے، اس میں چھری گھونپ دی جاتی ہے۔ اور جانور تھوڑی ہی دیر میں جان دے دیتا ہے)۔
کبھی یہ ہوتا ہے کہ ان جانوروں کے مطیع ہونے کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ ان پر سے مطیع و فرمانبردار رہنے کا حکم اٹھا لیتا ہے۔ بس اچانک وہی جانور جو ایک بچے کے پیچھے بھی نہایت فرمانبردار بن کر عام طور پر چلا کرتا ہے۔ غضب ناک اور خطرناک آفت کا روپ دھار لیتا ہے، اور کئی طاقت ور افراد مل کر بھی اس پر قابو نہیں پا سکتے۔
بعد والی آیت دراصل ان سوالات کا واضح جواب ہے کہ آخر اللہ کو قربانی کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ قربانی کا فلسفہ کیا ہے، کیا قربانی اس کے لیے کسی طرح سے فائدہ رساں ہے؟ جواباً فرمایا جا رہا ہے۔ قربان شدہ جانوروں کا گوشت اور خون ہرگز خدا تک نہیں پہنچتا (لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا)۔ اصولی طور پر خدا کو گوشت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو جسم نہیں ہے اور نہ ہی ضرورت مند ہے وہ اکمل اور لامتناہی ذات ہے۔ بلکہ وہ چیز جو اللہ تک پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال نیک اور تمہارا تقویٰ ہے (وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ)۔

Marfat.com

بالفاظ دیگر قربانی سے مقصد یہ ہے کہ تم مدارج تقوٰی طے کر کے ایک انسان کامل بن جاؤ اور دن بدن اللہ کے قریب ہوتے جاؤ، کیونکہ عبادات انسان کے لیے تربیتی کلاسیں ہیں۔ قربانی انسان کو جاں نثاری، خود گذشت اور راہ خدا میں شہادت کا درس دیتی ہے۔ مزید برآں محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کا سلیقہ سکھاتی ہے۔

یہ جملہ کہ قربان شدہ جانوروں کا خون تک نہیں پہنچتا، کس مفہوم میں ہے، حالانکہ خون سے ظاہراً کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس جملے سے زمانۂ جاہلیت کی بے ہودہ اور فرسودہ رسُوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس وقت ایک رسم یہ تھی کہ قربانی کا خون بتوں کے سروں پر ملتے تھے۔ اور کبھی تو کعبہ کے در و دیوار پر بھی چھڑک دیتے تھے۔ بعض بے خبر مُسلمان بھی چاہتے تھے۔ کہ ان رسومات پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا اس آیت سے اِن کو منع کر دیا گیا [1]

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض علاقوں میں ابھی تک یہ بے ہودہ رسومات باقی ہیں۔ چنانچہ جب کبھی مکان کی تعمیر کے سلسلے میں قربانی کرتے ہیں تو جانوروں کا خون بنیادوں، دیواروں یا چھتوں پر چھڑک دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض مساجد کی تعمیر کے دوران بھی یہ قبیح عمل دہرایا جاتا ہے۔ جو مسجد کی نجاست کا سبب بنتا ہے روشن فکر مسلمانوں کو اس کے خلاف مہم چلانی چاہیئے۔

اس کے بعد ایک مرتبہ پھر جانوروں کے مطیع کیے جانے کی نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے "اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے چوپایوں کو مطیع بنادیا ہے تاکہ تم اپنی ہدایت کیے جانے پر اللہ کی بڑائی بیان کرو" (کذلک سخرنا ھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم)۔

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت سے شناسائی پیدا کرو، جس نے تمہارے لیے فطری اور قانونی دونوں طریقوں سے ہدایت کی ہے۔ ایک طرف طریقۂ حج اور سلیقہ اطاعت و بندگی تمہیں سکھایا اور دوسری طرف قوی ہیکل اور طاقتور جانوروں کو تمہارا مطیع و فرمانبردار بنایا تاکہ اللہ کی اطاعت کرنے، قربانی کرنے، ضرورتمندوں کی ضرورت کو پورا کرنے اور معیشت کا معیار بھی بلند کرنے میں ان سے استفادہ کرو۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے "نیکو کاروں کو خوشخبری سنا دو" (وبشر المحسنین)۔

وہ لوگ جو ان نعمتوں کو اللہ کی اطاعت میں صرف کرتے ہیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بطریق احسن انجام دیتے ہیں اور علی الخصوص اپنا مال و متاع راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ نیک لوگ نہ صرف دوسروں سے نیکی کرتے ہیں۔ بلکہ اس طرح اپنی بھی بہترین خدمت انجام دیتے ہیں۔

مشرکین کی بعض بیہودہ حرکات کہ جن کا اس سے پہلی آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے کے استقامت یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ مشرکین ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے انتقامی کاروائی کرتے ہوئے مُسلمانوں سے بھڑ جائیں۔ چنانچہ پروردگار

---

[1] کنز العرفان ج ۱ ص ۳۱۴۔

Marfat.com

عالمین کو مومنین کو دلا سا دیتا ہے اور اپنی مدد کے وعدے سے ان کو حوصلہ بندھاتے ہوئے فرماتا ہے: "اللہ صاحبان ایمان کا دفاع کرتا ہے" (انّ اللہ یدافع عن الّذین اٰمنُوا)۔

اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین یہودی، نصاریٰ اور سینکڑوں چھوٹے چھوٹے قبیلے اور خاندان باہم متحد ہو کر اپنے زعم باطل میں مومنین کو دبا کر نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ مگر اللہ نے قیامت تک کے لیے بقائے اسلام اور سلامتی مومنین کا وعدہ فرمایا۔ مشرکین کے خلاف مومنین کے دفاع کا وعدہ دورِ پیغمبر اکرمؐ سے ہی مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ یہ تمام ادوار و اعصار پر یکساں جاری و ساری ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ہم "الّذین اٰمنُوا" کا مصداق بنیں، پھر خدائی دفاع لازمی امر ہے اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ بے شک اللہ مومنین کی حمایت اور دفاع کرتا ہے۔

آیت کے آخری حصے میں مشرکین اور اس کے ہم ذہنیت لوگوں کا اللہ کے ہاں مقام اس طرح بتایا گیا ہے: اللہ کسی بددیانت ناشکرے کو پسند نہیں کرتا (ان اللہ لا یحب کُلّ خوّان کفور)۔

وہی کہ جو اللہ کا شریک بناتے ہیں یہاں تک کہ "لبیک" کہتے ہوئے واضح طور پر بتوں کا نام پکارتے ہیں، اور یوں اپنی بددیانتی پر مہر تصدیق صبر کر لیتے ہیں۔ اس طرح قربانی کرتے ہوئے اللہ کا نام چھوڑ کر بتوں کا نام لیتے ہوئے کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اندریں حالات کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بددیانت اور کفرانِ نعمت کرنے والے کو پسند کرے۔

Marfat.com

۳۹۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ
وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ۝

۴۰۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ
اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ
صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ
كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

۴۱۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

ترجمہ

۳۹۔ ان لوگوں کو جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، جن پر جنگ ٹھونسی
گئی ہے، کیوں وہ ظلم وستم کا نشانہ بنے ہیں اور اللہ سبحانہ، وتعالےٰ
ان کی مدد و نصرت پر قادر ہے۔

۴۰۔ وہ لوگ ناحق اپنے گھروں سے نکال باہر کیے گئے ہیں، ان کا قصور سوائے

Marfat.com

اس کے اور کہا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے اور اللہ بعض کے ذریعے بعض کو مغلوب نہ کرے تو دیر، گرجے، عبادت خانے اور مساجد کہ جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ ویران کر دیئے جاتے اور اللہ ان لوگوں کی جو اس کی مدد کرتے ہیں (اور اس کے دین کی حمایت کرتے ہیں) مدد کرتا ہے۔ اللہ طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔

۴۱۔ (خدا کے یار و مددگار) وہ لوگ ایسے ہیں کہ جنہیں جب زمین پر صاحب اقتدار بنایا گیا تو انہوں نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، نیکی کا حکم دیا اور بدی سے روکا اور ہر چیز کا انجام اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

تفسیر

جہاد کا پہلا حکم

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمان مکہ میں تھے تو اکثر مشرکینِ مکہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ بڑی تکالیف اور اذیتیں اٹھاتے تھے اور جب کبھی مار پیٹ کے بعد رنجیدہ خاطر ہو کر بارگاہ رسول میں آتے اور مظالم کے خلاف شکایت کرتے (اور جہاد کی اجازت مانگتے) تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے۔ صبر کرو، ابھی مجھے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی تو مذکورہ بالا آیت نمبر ۳۹ جو جہاد کی اجازت لیے ہوئے ہے نازل ہوئی۔[1]

چنانچہ جہاد کے بارے میں نازل ہونے والی پہلی آیت ہے۔

اگرچہ اس کے حکم جہاد کے لیے پہلی آیت ہونے کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے پہلی آیت گردانتے ہیں اور بعض سورۂ بقرکی آیت۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ..... " (بقرہ ۱۹۰)
کو پہلی آیت قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض مفسرین سورۃ توبہ کی آیت
اِنَّ اللّٰہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم واموالھم..... " (توبہ ۔ ۱۱۱)
کو اس سلسلے کی پہلی آیت سمجھتے ہیں۔[1]

لیکن "اذنِ جہاد" کے موضوع کی مناسبت سے یہ آیت کا لب ولہجہ زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے کیونکہ لفظ "اذن" کا قرینہ صراحت کے ساتھ اجازت دے رہا ہے۔ جبکہ یہ قرینہ مذکورِ بالا باقی دو آیتوں میں نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اس آیت کی تعبیر اس خاص موضوع کے بارے میں ہے۔

بہرحال اگر گذشتہ آخری آیت جس مومن کے دفاع اور حمایت کا وعدہ کیا گیا ہے، کو ذہن میں رکھا جائے تو زیرِ بحث آیت کا اس سے تعلق خاصہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ زیرِ نظر پہلی آیت فرمایا جارہا ہے: اللہ نے ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونس گئی۔ جہاد کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے (اذن للّذین یقاتلون بانھم ظلموا)۔

اس کے بعد قادر و طاقتور خدا کی طرف سے کامیابی کے وعدے کے ساتھ اذن جہاد کی تکمیل کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے: اللہ ان کی مدد و نصرت پر قادر ہے (وان اللّٰہ علیٰ نصرھم لقدیر)۔

ہوسکتا ہے اس جملے سے جو خدائی طاقت و قوت کے ساتھ نصرتِ الٰہی کی ضمانت دے رہا ہے، اس طرف اشارہ ہو کہ خدائی مدد اس وقت میسر ہوگی مقدور بھر دفاع کیلئے تیار ہوجاؤ گے تاکہ یہ گمان نہ ہوجائے کہ گھر بیٹھے اللہ مدد کردے گا بہ الفاظ دگر عالم اسباب میں سے جو بھی میسر ہے اسے کام میں لایا جائے اور تمھاری قوت ختم ہوجائے تو مایوس ہونے کی بجائے اللہ قادر کی نصرت کے منتظر رہو یہی وہ کلیہ تھا جسے پیغمبر اکرمؐ نے تمام غزوات و سرایا میں عملی طور پر اپنایا اور کامیاب ہے

اس کے بعد ان مظلوموں کی حالتِ زار کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے اور جہاد سے متعلق اسلامی نکتۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے: وہی لوگ جو ناحق اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ (الّذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق)۔

ان کا قصور سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے (الا ان یقولوا ربنا اللّٰہ)۔

کھلی سی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید و یگانگت کا اقرار گناہ نہیں، بلکہ مایہ ناز ہے۔ یہ کوئی ایسا عمل نہیں جس کی بنیاد پر مشرکین کو یہ حق مل جائے کہ وہ انہیں ان کے گھروں اور علاقوں سے نکال باہر کریں اور مکے سے مدینے کی طرف ہجرت پر مجبور کردیں۔ آیت نے اس مفہوم کے بیان میں تعبیر استعمال کی ہے وہ ایسے مواقع پر مدمقابل کو محکوم و مغلوب کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بعض اوقات ہم خدمت و نعمت پر ناشکری کرنے والے شخص کے لیے یوں کہتے ہیں (ہمارا گناہ صرف یہ تھا کہ ہم نے تیری خدمت کی) مخاطب کی بے خبری کے اظہار کے لیے یہ لطیف کنایہ ہے، جس نے خدمت

---

[1] المیزان ج ۱۴ ص ۴۱۹

Marfat.com

کے بدلے ایسا رویہ اختیار کیا جو کسی جرم کے جواب میں روا رکھا جاتا ہے۔[1]

اس کے بعد حکم جہاد کے فلسفے اور مصلحت کی وضاحت کرتے ہوئے اس طرح ارشاد ہوتا ہے: اگر اللہ مومنین کا دفاع نہ کرے اور جہاد کی اجازت دے کر بعض کو بعض کے ذریعے مغلوب نہ کرے تو دیر، گرجے یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے اور مساجد کہ جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے، ویران ہو جائیں (ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرًا)۔

بے شک اگر صاحبان ایمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، ظالموں، جابروں اور بے ایمان دنیا پرستوں کی تباہ کن کارستانیوں کے مقابلے میں خاموش تماشائی بنے رہیں اور انہیں کھل کھیلنے کی کھلی چھٹی دیتے رہیں۔ تو یقیناً وہ معابد اور عبادت گاہوں کا نام و نشان تک نہ چھوڑیں۔ کیونکہ معابد و عبادت گاہیں، بیداری کی درس گاہیں ہیں، محراب عبادت میدان جنگ ہے اور مسجد سرکشوں کے خلاف مورچہ ہے۔ دراصل ہر قسم کی خدا پرستی کی دعوت ان کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے، کیونکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں۔ کہ خدا کی طرح خود ان کی پرستش کی جائے، چنانچہ اگر انہیں موقع ملے تو خدا پرستی کے تمام مراکز کو مسمار کر دیں۔ جہاد کا حکم دینے اور جنگ جہاد کی اجازت دینے کا یہ ایک مقصد بیان کیا گیا ہے۔

"صوامع" "بیع" صلوات اور مساجد میں فرق سے متعلق مفسرین میں اختلاف ہے، لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ صوامع "صومعہ" کی جمع ہے، یہ اس جگہ کو کہتے ہیں جو عام طور پر شہروں کے باہر لوگوں کے شور و غل سے دور تارک الدنیا زاہدوں اور عبادت گذاروں کے لیے بنائی جاتی ہے۔ فارسی میں اسے "دیر" کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ "صومعہ" اس عمارت کو کہتے ہیں، جس کا اوپر کا حصہ ایک دوسرے سے ملحق ہوتا ہے، ظاہراً اس سے چوکور گلدستوں کی طرف اشارہ ہے جو راہب لوگ اپنے دیروں کو سجانے کے لیے بناتے ہیں۔

"بیع" "بیعۃ" کی جمع ہے، اس سے مراد عیسائیوں کی عبادت گاہ یعنی گرجا ہے "صلوات" "صلوٰۃ" کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہودیوں کی عبادت گاہوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اسے "صلوثا" کا معرب سمجھتے ہیں۔ جو عبرانی زبان میں نماز خانہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "مساجد" "مسجد" کی جمع ہے۔ جو مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ اس بنا پر اگرچہ "صوامع" اور "بیع" دونوں ہی عیسائی عبادت گاہوں سے متعلق ہیں، مگر ان میں ایک اجتماعی عبادت گاہ ہے اور دوسری تارکین دنیا کی نیز "بیع" کو عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کی عبادت گاہوں کے لیے لفظ مشترک سمجھا جاتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی ذکر ہو جائے کہ جملہ "یذکروا اسم اللہ فیھا کثیرًا" (کثرت سے ذکر خدا کیا جاتا ہے) مساجد کی تعریف میں آیا ہے، کیونکہ جملہ مذاہب کے تقابلی جائزے کے مطابق مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ سال بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے عبادتی مراکز سب سے زیادہ بارونق رہتے ہیں، جبکہ بہت سے دوسرے مذاہب کے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں استثناء، استثنا متصل ہے۔ البتہ کنائی معنی میں اور ادعائی موضوع کی نسبت سے۔ (قابل غور ہے)

Marfat.com

عبادتی مراکز ہفتے میں ایک بار یا سال بھر میں چند مخصوص ایام میں استعمال میں آتے ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر خدائی مدد کے وعدے کا اعادہ کیا جا رہا ہے : یقیناً اللہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے ہیں اس کے دین اور عبادت گاہوں کا دفاع کرتے ہیں۔ (ولینصرن اللہ من ینصرہ)

اس میں شک و شبہ نہیں کہ خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ قادر اور ناقابل شکست ہے (ان اللہ لقوی عزیز)۔

یہ اس لیے فرمایا کہ توحید کے متوالے اور پاسدار کہیں یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ وہ رزم حق و باطل اور طاقتور دشمنوں کے نرغے میں اکیلے اور بے سہارا ہیں۔ اسی وعدے کے پرتو میں اکثر مسلمان مجاہدوں نے باوجود اس کے کہ تعداد اور آلاتِ حرب و ضرب کے لحاظ سے کفار کے مقابلہ میں کہیں کم تھے، زبردست اور شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کامیابیوں کی وجہ غیبی نصرتِ الٰہی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ زیرِ بحث آخری آیت جو اللہ کے یاوران و ناصرین کی تفصیل بیان کر رہی ہے، جن سے گذشتہ آیت میں مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔

ان کی یوں تعریف کی گئی ہے : وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب زمین پر ہم ان کو صاحب اقتدار بناتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں (الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر)۔

وہ کامیابی کے بعد سرکشوں، متکبروں اور ظالموں کی طرح کبھی دادِ عیش نہیں دیتے، نہ لہو و لعب میں زندگی ضائع کرتے ہیں اور نہ نشۂ اقتدار سے بدمست ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ کامیابیوں، کامرانیوں اور اس توفیقِ خاص کو اپنی اور معاشرے کی اصلاح و تعمیر و ترقی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں وہ حکومت حاصل ہونے کے بعد خدا کے خلاف ایک اور طاغوتی طاقت بن کر نہیں اُبھرتے بلکہ خداوند عزوجل اور اس کی مخلوق کے ساتھ ان کے روابط اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ جو اللہ سے گہرے روابط کی علامت ہے، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ جو حقوق بشر و خدمت خلق کی نشانی ہے، بھلائی کی ترغیب دے کر اور بُرائی کی حوصلہ شکنی کر کے صاف ستھرا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، یہی چار صفات ان کے تعارف کے لیے کافی ہیں۔ انہی کے زیر سایہ باقی عبادات اعمال صالح اور اچھے معاشرے کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور فلاحی کام پروان چڑھتے ہیں۔ [1]

یاد رہے "مکنا" "تمکین" کے مادہ سے ہے۔ جس کا مطلب وسائل و ذرائع کی فراہمی ہے۔ قطعِ نظر اس سے کہ وہ آلات ہوں یا کافی علم و آگاہی یا جسمانی و فکری توانائی "معروف" اچھے اور پسندیدہ امور کے معنی میں ہے اور "منکر" قبیح و ناپسندیدہ اور باطل کے معنی میں کیونکہ اول الذکر ہر عقل سلیم رکھنے والے شخص کے لیے جانا پہچانا ہے اور موخر الذکر اجنبی و بے گانہ با لفاظ دیگر اول الذکر فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ جبکہ موخر الذکر خلاف فطرت آیت کے آخر میں ارشاد ہو

---

[1] امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت اور ان سے متعلق بقیہ مسائل اور اس سلسلے میں اٹھنے والے جملہ سوالات کے جوابات تفصیل کے ساتھ سورہ آل عمران آیہ ۱۰۴ کی تفسیر کے ذیل ج ۲ میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

Marfat.com

رہا ہے، تمام کاموں کا انجام و اختتام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (وللّٰہ عاقبۃ الامور)۔

جس طرح ہر کام، ہر کامیابی اور تسلط کی ابتدا و منتہا اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اس کا اختتام و انجام و نتیجہ کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔ کیونکہ۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

چند اہم نکات

۱۔ حکم جہاد کا فلسفہ اگرچہ گزشتہ صفحوں میں ہم نے اس مسئلہ پر خاصی بحث کی ہے[۱] لیکن اس لحاظ سے کہ زیر بحث آیت ان پہلی آیات میں سے ہے جن میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے اور ان آیتوں کا مضمون اور مفہوم اس حکم کے فلسفے اور مصلحت پر روشنی ڈالتا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند نکات اگرچہ اعادہ کے طور پر ہی کیوں نہ ہوں بیان کیے جائیں۔ ان آیات میں جہاد کے فلسفے کے دو اہم اجزاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) ظالم اور جابر کے خلاف مظلوم کا جہاد: بلاشک و شبہ یہ مظلوم کا پیدائشی، فطری اور عقلی حق ہے کہ ظلم کے سنگ گراں کے نیچے پسنے کی بجائے ظالم کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو، چیخ و پکار کرے، ہتھیار اُٹھائے، اس کو اس کے اصلی مقام تک پہنچائے اور اپنے حقوق کی جانب اُٹھنے والے اس کے ہاتھوں کو قطع کر دے۔

(۲) طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد: طاغوتی طاقتیں دلوں سے نام خدا کو نکالنے اور خدا کے ذکر و عبادت کے مراکز کو ویران اور برباد کر دینا چاہتی ہیں۔ کیونکہ یہی عبادت گاہیں شعور و بیداری کے مراکز ہیں۔ لازم ہے کہ ان طاقتوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا جائے تاکہ وہ نام خدا کو محو نہ کر سکیں اور لوگوں کی سوچ پر پہرے بٹھا کر ان کو اپنا زر خرید غلام نہ بنالیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ معابد و مساجد کو برباد کرنے کا صرف یہی طریقہ نہیں ہے کہ ان کی عمارات کو مسمار کر دیا جائے۔ بلکہ بالواسطہ ذرائع بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں اور منفی سرگرمیوں اور غلط پراپیگنڈے کے ذریعے سے بھی عوام کو مساجد و معابد سے بدظن کیا جا سکتا ہے تاکہ وہ خود ہی مساجد و معابد کا رُخ نہ کریں اور بارونق مساجد ویرانوں میں بدل جائیں۔

بعض لوگ یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ اسلام نے دلیل و منطق کی بجائے مسلح جنگ کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب ہم گذشتہ سطور میں دے چکے ہیں۔ کیا وہ ظالم درندے جو صرف "لا الٰہ الا اللہ" کہنے کے جرم میں لوگوں کو بے گھر اور دربدر کر دیتے ہیں، ان کے سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے ہیں ان پر طرح کا ظلم روا رکھنے کے لیے کسی قانون کی پاسداری نہیں کرتے، کیا ایسے بے منطق وحشیوں کا مقابلہ طاقت کی زبان کے علاوہ کسی اور طرح سے ممکن ہے؟ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اسرائیل کے ساتھ میز پر بیٹھ کر مذاکرات سے مسائل کا حل کیوں نہیں کرتے؟ جواباً عرض ہے، وہی اسرائیل جو غاصب و جابر ہے، جس نے تمام بین الاقوامی قوانین، عالمی اداروں کی تمام قراردادیں اور تنبیہیں اور ہر قوم مذہب اور ملت کے مسلمہ انسانی حقوق کو پامال کر دیا ہے، آیا وہ مذاکرات میں دلیل و منطق کی زبان سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے؟ وہ اسرائیل جس نے ہزاروں بچوں اور بوڑھوں

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۱۹۳ کی تفسیر کے ذیل میں ج ۲ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

عورتوں، مردوں اور ہسپتالوں پر بمباری کر کے، ان کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا، کیا اس پر مذاکرات کا کچھ اثر ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے اور لوگ جو عوام الناس کی بیداری اور شعور کے مراکز مساجد اور دیگر عبادت گاہوں، جن کو وہ اپنے غیر قانونی مفاد کے حصول میں سدرہ سمجھتے ہیں۔ کو جیسے تیسے تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیا اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کیا جائے؟

بہر حال نظریاتی مسائل سے قطع نظر اگر آج دُنیا کے مختلف معاشروں کی حقیقی کیفیت پر غور کریں اور ان پر ماضی قریب بعید میں گزرنے والے واقعات پر نظر رکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ بعض حالات میں طاقت اور آلات حرب و ضرب کا سہارا لینا ناگزیر ہو جاتا ہے، اس لیے نہیں کہ دلیل و منطق میں کسی قسم کا جھول ہے۔ بلکہ ظالموں اور جابروں کو دلیل اور صحیح منطق کی طرف مائل کرنے کے لیے۔ یقیناً جہاں کام دلیل و برہان سے بنتا ہو وہاں منطق مقدم ہے۔

۲۔ اللہ نے کن لوگوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے؟ یہ نظریہ غلط ہے کہ مذکورہ بالا آیت یا دوسری آیتوں میں اللہ نے مومنین کے دفاع، مدد اور کامیابی کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ قوانین اور ضابطۂ آفرینش و فطرت کے خلاف ہے۔ یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے کیا گیا ہے۔ جو مقدور بھر قوت و طاقت اور تمام تر وسائل کے ساتھ میدان میں آئیں۔ آیت میں بھی یہی فرمایا گیا ہے۔

"لولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض"

خدا جابر و ظالم طاقتوں کو (سوائے استثنائی اور معجزاتی حالات کے غیبی طاقتوں مثلاً صاعقہ اور زلزلہ سے ختم نہیں کرتا بلکہ) خالص اور سچے مومنین کے ذریعے دور کرتا ہے۔

ان سچے مومنین کی مدد اور حمایت کی جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ کہیں اللہ کے وعدے نہ صرف یہ مسلمانوں کی سستی، کاہلی اور عدمِ احساس ذمہ داری کا موجب بن جائیں، بلکہ حرکت، فعالیت اور حصولِ مقصد کے لیے تشویق و ترغیب کا سبب بھی بنیں، البتہ اس صورت میں حتمی کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مومنین کا یہ طبقہ کامیابی سے پہلے ہی اللہ سے متمسک نہیں ہوتا، بلکہ کامیابی کے بعد بھی اس آیۃ " الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلٰوۃ " کا مصداق بنتے ہوئے اللہ سے اپنا رابطہ مستحکم کر لیتا ہے اور دشمن پر کامیابی کو حق، انصاف اور شرافت کی ترویج کا ذریعہ بناتا ہے۔

بعض روایات میں عمومی طور پر حضرات آلِ محمدؐ امام مہدیؑ کے انصار کو مندرجہ بالا آیت کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً امام باقرؑ نے اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا۔

یہ آیت اوّل سے آخر آلِ محمدؐ اور حضرتِ مہدیؑ کے انصار اور جاں نثاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یملکھم اللہ مشارق الارض ومغاربھا، ویظھر الدین، ویمیت اللہ بہ وباصحابہ البدع والباطل کما امات الشقاۃ الحق، حتٰی لا یری این الظلم، ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

Marfat.com

اللہ زمین کے مشرق و مغرب کو ان کی حکمرانی میں دے دے گا۔ اپنے دین کو غالب قرار دے گا، امام مہدی اور آپ کے اصحاب کے ذریعے بدعت اور باطل کو اسی طرح ملیامیٹ کر دے گا، جس طرح غاصبوں نے حق کو کیا تھا اور دُور دور تک کہیں ظلم کا نام ونشان تک نہ ملے گا۔ (کیونکہ) وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کریں گے۔[1]

اس سلسلے میں اور احادیث بھی روایت کی گئی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ایسی روایات ہمیشہ آیت کے اعلیٰ اور نمایاں مصادیق کا ذکر کرتی ہیں۔ آیت کے عام مفہوم پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر اس آیت کا وسیع تر مفہوم تمام صاحبان ایمان مجاہدوں اور مومنین کو دامن میں لیے ہُوئے ہے۔

۴۔ "محسنین" "مخبتین" اور اللہ کے انصار

مندرجہ آیات اور ان سے پہلے کی آیات کہتی ہیں کہ "محسنین" کو خوشخبری سنا دو اور بعد ازاں ان کا تعارف صاحبان ایمان اور کفران نعمت نہ کرنے والوں کی حیثیت سے کراتی ہیں اور کبھی مخبتین (عجز و انکساری کرنے والے) کے طور پر اُن کا ذکر کیا ہے اور انہیں ذکر خدا کے موقع پر خوف خدا سے لرزاں اور مصائب و شدائد کے مواقع پر صبر و تحمل کے پیکر بننے والے، نماز قائم کرنے والے اور اپنے خداداد وسائل و نعمات میں بندگان خدا کو شریک کرنے والے، کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں "اللہ کے انصار" کا یُوں تعارف کرایا جاتا ہے کہ وہ غالب آنے کے بعد گھمنڈ، غرور اور تکبر کی بجائے تواضع و عاجزی کی روش اختیار کرتے ہُوئے نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اگر ان آیتوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل سچے اور خالص مومن وہ ہیں جو ایک طرف نظریات، اعتقادات اور احساس کی ذمہ داری کے اعتبار سے بہت مضبوط اور دوسری طرف میدان عمل میں خالق و مخلوق دونوں کے تمام حقوق پُوری طرح ادا کرتے ہیں، بدعنوانیوں اور برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور ہر قسم کی مشکلات و مصائب کا مقابلہ بڑی پامردی اور استقامت سے کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۰۶ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

Marfat.com

۴۲- وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝

۴۳- وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝

۴۴- وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝

۴۵- فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝

ترجمہ

۴۲- اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے نوح کی قوم، عاد اور ثمود نے بھی (اپنے نبیوں کو) جھٹلایا ہے۔

۴۳- اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم نے بھی۔

۴۴- اور مدین کے عوام (شعیب کی قوم) نے اور (فرعون کے پیرؤں نے) موسیٰ کو جھٹلایا۔ میں نے انہیں مہلت دی، مگر پھر میں نے ان کو پکڑ لیا، تو نے دیکھا کس طرح میں نے ان کے عمل کو مسترد کر دیا (اور ان کو کیا جواب دیا)

Marfat.com

۴۵۔ کتنے ہی شہر اور بستیاں ان کے (رہنے والوں کے) ظلم وستم کی وجہ سے ہم نے تباہ و برباد کردیں۔ اس طرح سے کہ ان کی چھتیں اُن پر گرا دیں (پہلے چھتیں گرائی گئیں، پھر دیواریں چھتوں پر آگریں) کتنے ہی لبالب کنوئیں لاوارث ہوگئے اور کتنے پختہ فلک بوس محل بھی۔

تفسیر

لاوارث کنوئیں اور فلک بوس محل

گذشتہ آیتوں میں مومنین کے لیے اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے پیدا کردہ، پیچیدہ، گھمبیر اور طاقت فرسا مسائل کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ توحید پرستی کے جُرم میں طاغوتیوں نے مومنین کو کس طرح اور کیسی کیسی اذیتیں اور تکالیف پہنچائیں۔ انہیں آوارہ وطن اور دربدر کیا اور ان مظالم سے نمٹنے کے لیے مومنین کو جہاد کی اجازت دی گئی۔ زیر بحث آیت ایک طرف پیغمبر اسلامؐ اور مومنین کی دل جوئی کرتی ہے اور دوسری طرف کفار کے منحوس اور بُرے انجام کی وضاحت کرتی ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا جارہا ہے: اگر تمہیں جھٹلایا گیا ہے تو پریشان نہ ہو۔ کیونکہ ان سے پہلے نوحؑ کی قوم، عاد اور ثمود بھی اپنے نبیوں کو جھٹلا چکی ہیں۔ (وان یکذبوك فقد كذبت قبلهم قوم نوح وعاد وثمود)۔ اور اسی طرح، ابراہیمؑ ولوطؑ کی قوموں نے بھی ان دو عظیم پیغمبروں کو جھٹلایا (وقوم ابراهيم وقوم لوط)۔ اور مدین کے باسی بھی شعیبؑ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فرعون اور اس کے پیروکاروں نے موسیٰؑ کو جھٹلایا۔ (واصحاب مدين وكذب موسىٰ) یعنی جس طرح ماضی میں شدید مخالفین رکاوٹیں اور تکذیبیں ان عظیم پیغمبروں کی دعوت توحید حق وعدالت کی راہ میں کمزوری کا باعث نہ بن سکیں، اسی طرح بلاشک وشبہ تیری پاک اور با استقامت رُوح پر بھی اثر نہ کرسکے گی۔ لیکن اندھے دلوں والے یہ کفار کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی ناپاک تخریب کاری اور سیاہ کاریاں ہمیشہ جاری رکھ سکیں گے۔" ماضی میں پہلے تو ان کو مہلت دی گئی تاکہ ان کی آزمائش مکمل ہوجائے ان پر حجت تمام ہوجائے اور وہ پُرتعیش زندگی میں مگن رہیں۔ پھر قانون مکافات کے تحت ان کو دھر لیا (فاملیت للكافرين ثم اخذتهم)۔ دیکھا! کتنی حقارت سے میں نے ان کی بداعمالیوں کو یکسر مسترد کردیا اور کتنی وضاحت سے ان کی بداعمالیوں کی قباحت وشناعت کو طشت از بام کیا (فکیف

Marfat.com

کان نکیر)۔ ؎۱

ان کو دی گئی نعمتیں چھین لیں اور اذیت، زحمت اور بدنصیبی ان کا مقدر بنادی۔ زندگی سے کرموت دے دی۔ زیر بحث آخری آیت کے پچھلے جملے میں اللہ کی سزا سے اجمالی کی تفصیل بیان کردی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کتنی ہی بستیاں اور آبادیاں ایسی ہیں جن (کے باسیوں) کو ہم نے ہلاک کر ڈالا۔ کیونکہ وہ ظالم اور ستم گر تھے۔ (فکاین من قریۃ اھلکنا ھا وھی ظالمۃ) ان کی چھتیں نیچے آگریں۔ (فھی خاویۃ علی عروشھا) یعنی شدید عذاب اس قدر سخت تھا کہ صحیح وسالم مکانات کی یک دم چھتیں بیٹھ گئیں اور ان پر دیواریں آرہیں۔ اور کتنے پر از آب کنویں لاوارث ہو گئے پانی زمین میں جذب ہوگیا اور وہ بے کار ہو گئے۔ نہ کوئی ان سے پانی نکالنے والا رہا اور نہ کوئی پیاس بجھانے والا بچا۔ (وبئر معطلۃ)

کتنی پختہ سر بفلک پر شکوہ عمارتیں زمین بوس ہو گئیں اور ان میں رہنے والے ملک عدم کے رہی ہو گئے (وقصر مشید)۔ ؎۲

اس طرح سے ان کے پر تعیش محلات ومساکن لاوارث ہو گئے۔ اور ان کی زمین کی سرسبزی وشادابی کے ضامن ذرائع آبپاشی بھی ختم ہوکر رہ گئے۔

ایک نکتہ

اہل بیت اطہارؑ کے ذریعے سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک توجہ طلب نکتہ بیان کیا گیا ہے، کہ "بئر معطلۃ" سے مراد وہ علما اور دانش ور ہیں جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہوں اور جن کے علوم و دانش سے کوئی کسب فیض نہ کرتا ہو۔ امام موسیٰ کاظمؑ سے (وبئر معطلۃ وقصر مشید) سے متعلق روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"البئر المعطلۃ الامام الصامت، والقصر المشید الامام الناطق"

"وہ کنواں جس سے استفادہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس امام و رہبر کی طرح ہے جو خاموش اور عالم سکوت میں ہو۔ جبکہ "قصر مشید" سے مراد وہ امام و رہبر ہے جو منصب رہبری پر عملاً فائز ہو۔"

؎۱ "نکیر" کا لغوی معنیٰ انکار کرنا ہے اور یہاں سزا دینے اور عذاب وعقاب کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

؎۲ "مشید" "شید" (بروزن "بید") کے مادہ سے ہے۔ اس کے دو معنیٰ ہیں۔ (۱) بلند وبالا (۲) سیمنٹ اور چونا پہلے معنیٰ کے مطابق، سر بفلک اور فلک بوس محلات مراد ہے اور دوسرے معنیٰ کے مطابق، پختہ پکے اور موسمی تغیر وتبدل سے محفوظ مراد ہے۔ چونکہ اس زمانے میں اکثر اور عام لوگوں کے مکانات کچے اور مٹی کے بنے ہوتے تھے جو فطری عوامل کے سامنے کمزور ہوتے تھے۔ مگر وڈیروں اور سرمایہ دار حاکموں کے محلات چونے یا اس قسم کے پختہ مواد سے بنائے جاتے تھے۔

Marfat.com

اس طرح کی ایک روایت امام صادقؑ سے بھی نقل کی گئی ہے۔ [1]

یہ روایات دراصل تشبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (جیساکہ حضرت مہدیؑ اور آپ کی عالمگیر عادل حکومت کو روایات میں "ماءٍ معین" (یعنی آبِ جاری) کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب رہبر اور امام مسندِ حکومت پر فائز ہو تو وہ ایک عالیشان سربفلک اور مضبوط محل کی مانند ہے۔ جو قریب و بعید سے ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور سب کے لیے ایک مرکز و پناہ گاہ کا کام دیتا ہے۔ مگر جب اسے مسندِ اقتدار سے ہٹا کر نا قابل اور نا اہل افراد کو اس کی جگہ پر بٹھا دیا جائے تو وہ اس متروک کنویں کی طرح ہو جائے گا۔ جس سے نہ کوئی پیاس بجھائے اور نہ زمین اس سے سیراب ہو۔

"بئر معطلۃ" اور "قصر مشید" کے محاورے کو ایک عرب شاعر نے بھی بڑے دلکش انداز میں نظم کیا ہے۔ [2]

بئر معطلۃ و قصر مشرف　　　مثل لآل محمد مستطرف
فالقصر مجدھم الذی لایرتقی　　　والبئر علمھم الذی لاینزف

متروک کنواں اور بلند محل آلِ محمدؐ کے حالات کے لیے بڑی عمدہ مثال ہے" قصر" ان کی رفعت بلندی اور وقار کی مثال ہے کہ جہاں تک کسی کی رسائی نہیں اور کنواں، ان کے علم کا مظہر ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ [2]

---

[1] تفسیر برہان ج ۳ صفحہ ۔

[2] تفسیر برہان ج ۳ صفحہ ۔

Marfat.com

۴۶۔ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ
قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَاۚ
فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى
الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ‏ ○
۴۷۔ وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ وَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ
وَعۡدَهٗؕ وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ
مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ○
۴۸۔ وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَمۡلَيۡتُ لَهَا وَهِىَ
ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذۡتُهَاۚ وَاِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ○

ترجمہ

۴۶۔ کیا وہ زمین پر چلتے پھرتے نہیں کہ ان کے دل ادراک حقیقت کر سکتے اور کان صدائے حق سننے والے ہوتے۔ کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینے کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

۴۷۔ اور وہ تجھ سے عذاب میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا اور تیرے ربّ کے ہاں ایک دن تمہارے حساب کے ہزار سال کے برابر ہے۔

Marfat.com

۴۸۔ کتنی بستیاں اور آبادیاں ایسی ہیں، جن کو میں نے مہلت دی۔ جب کہ وہ ظالم تھے۔ (لیکن انھوں نے اپنی اصلاح کے لیے اس مہلت سے فائدہ نہیں اُٹھایا) پس میں نے ان کو دھر لیا اور سب کی بازگشت میری ہی طرف ہے۔

تفسیر

سیر و سیاحت اور دلوں کی بیداری

گذشتہ آیتوں میں ان بداعمال اور روسیاہ ظالموں کے بارے میں گفت گو کی جا رہی تھی، جن کو اللہ نے کیفر کردار تک پہنچایا اور ان کے شہروں کو برباد کر دیا۔ زیر بحث پہلی آیت میں اسی مضمون کی تاکید مزید کے طور پر ارشاد ہوتا ہے۔ آیا وہ زمین میں سیر و سیاحت نہیں کر، کہ ان کے دل حقیقت شناس ہو جائیں یا ان کے کان صدائے حق سن لیں۔ (افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا اواذان یسمعون بھا)۔

بے شک ظالموں کے محلات اور دُنیا پرستوں کے ٹھکانے اور مساکن جن کا اقتدار کبھی بہت ملبند تھا اس خاموشی کے باوجود ہزار ہزار باتیں کہہ رہے ہیں اور ہر بات میں ہزار ہزار نکتے پوشیدہ ہیں۔ یہ ویران اور اجڑی ہوئی بستیاں، گویا ان اقوام کی سوانح کردار و رفتار، شرمناک طرز زندگی اور عبرت ناک انجام پر منہ بولتی کتابیں ہیں۔

یہ کھنڈرات اور ان سے نظر آنے والے آثار انسان کے دل و دماغ پر ایسے اثرات مرتب کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان میں سے کسی ایک جگہ کا مشاہدہ کثیر مطالعے سے زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے اور تاریخ کے دہرائے جانے کے تناظر میں، جو انسانی زندگی کی بنیاد ہے، ان کھنڈرات کا مشاہدہ انسان کے مستقبل کو مجسم شکل میں اس کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ واقعی سابقہ اقوام کا مطالعہ اور ان کے آثار کا مشاہدہ کان کو شنوا اور آنکھ کو بینا کر دیتا ہے۔

Marfat.com

اسی لیے قرآن مجید کی متعدد آیات میں سیاحت کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن الٰہی اور اخلاقی سیاحت جس کی غرض وغایت عبرت حاصل کرنا اور سبق سیکھنا ہو، سیاح کی آنکھوں سے گویا اس کا دل جھانک رہا ہو جو مدائن کے ایوانوں اور فراعنہ کے محلوں کو نگاہِ عبرت سے دیکھ رہا ہو کبھی دجلہ کے ساتھ ساتھ مدائن کی وادیوں میں پہنچے اور کبھی مدائن میں اپنے آنسوؤں سے ایک نیا دجلہ بہا دے۔

ظالم بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں میں ٹوٹے ہوئے برجوں سے نصیحت حاصل کرے اور دل کے کانوں سے وہاں کی خاک کے ہر ذرّے سے سُنائی دیتا ہُوا یہ نغمہ دل نشیں سُنے ۔

گامی دو سہ بر، مانہ

اشکی دو سہ بفشان

یعنی دو تین قدم چلو اور دو تین آنسو بہاؤ۔[۱]

اس کے بعد قرآن مجید اس حقیقت کو کہ اکثر لوگ ظاہراً صحیح و سالم آنکھیں اور کان رکھتے ہیں۔ مگر دل کے اندھے اور بہرے ہوتے ہیں۔ زیادہ واضح کرتے ہُوئے ارشاد فرماتا ہے۔ کیونکہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں (فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور)۔

حقیقت یہ ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم جو عرفِ عام میں اندھے کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات بہت روشن دل اور باخبر ہوتے ہیں حقیقی اندھے تو وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل کی آنکھ اندھی ہو گئی ہو اور وہ صحیح ادراک نہ کر سکتے ہوں۔ اسی لیے حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا۔

شر العمی عمی القلب

بدترین اندھاپن دل کا اندھاپن ہے

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔

اعمی العمی عمی القلب

"سب سے شدید اندھاپن دل کا اندھاپن ہے"[۲]

غوالی اللئالی میں ایک اور روایت درج ہے۔

حضرتِ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں۔

اذا اراد اللہ بعبد خیرًا فتح عین قلبہ فیشاھد بھا ماکان

---

[۱] ادوار ماضی اور سابقہ لوگوں کے آثار کے متعلق سیر و سیاحت کے آداب کے بارے میں سورۂ آلِ عمران آیت نمبر ۱۳۷ کی تفسیر کے ذیل میں ہم اس تفسیر کی جلد نمبر ۳ میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

[۲] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۰۵

Marfat.com

غائبًا عنہ۔
جب اللہ کسی بندے کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے دل کی آنکھیں روشن کر دیتا ہے تاکہ وہ اس ذریعے سے پوشیدہ حقائق کا مشاہدہ کر سکے ہیں۔ [۱]

یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ادراک حقائق کی نسبت سینے کے اندر دل سے کیوں دی گئی ہے۔ حالانکہ دل کا کام صرف خون کو گردش دینا ہے۔ اس کا جواب ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر کے ذیل میں پہلی جلد میں دے چکے ہیں البتہ یہاں خلاصہ پیش خدمت ہے

دل کو عقل کے معنیٰ میں بھی لیا گیا ہے اور سینہ انسان کی ذات اور سرشت کے معنیٰ میں ہے، اس کے علاوہ جذبات اور میلانات کا مظہر بھی دل ہی ہے۔

جب کبھی جذباتی ادراک کی کوئی برقی رو جو شدید تحریک کا سبب ہوا کرتی ہے۔ انسانی رُوح میں ظاہر ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس سے متاثر ہونے والا عضو بدن یہی 'دل' ہی ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ خون بڑی تیزی سے بدن کے ہر عضو میں پہنچتا ہے اور جسم کو ایک تازہ نشاط اور نئی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے رُوح کے ظواہر کی نسبت "دل" کی طرف دی جاتی ہے۔ (قابل غور ہے)

زیر بحث آیت میں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ انسان کے مجموعی ادراکات کی نسبت دل (عقل) اور کانوں کی طرف دی گئی ہے گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ادراکِ حقیقت کے صرف دو راستے ہیں۔

۱۔ اندرونی

۲۔ بیرونی

یعنی یا تو انسان اپنے اندر سے جوش و ولولہ لے کر اس کا تجربہ کرے اور اس طرح حقائق تک پہنچے یا بیرونی عوامل، مثلاً انبیاءؑ، اوصیاءؑ، اولیاءؑ اور ناصحین و ناقدین کی حقیقت آفریں باتوں سے حق کو پالے یا دونوں طریقوں سے حق تک پہنچے۔ [۲]

دوسری زیر نظر آیت میں بے ایمان، جاہل، بے خبر اور دل کے اندھوں کا ایک اور چہرہ دکھایا گیا ہے کہ وہ جلد عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "اگر تم سچے ہو تو پھر خدا کا عذاب کیوں ہمیں آ نہیں لیتا"

(وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ)۔

"ان سے کہہ دیجئے کہ جلدی نہ کریں اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ (وَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهُ) کیونکہ جلدی اور عجلت تو اُسے ہوا کرتی ہے۔ جسے یہ ڈر ہو کہ کہیں موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے اور اس کے وسائل و اختیارات ختم نہ ہو جائیں۔ جبکہ اللہ جو ازل سے ابد

---

[۱] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۰۹

[۲] تفسیر المیزان زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں ج ۱۴ ص ۴۲۶

Marfat.com

تک ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے کسی کام میں جلدی کیوں کرے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے وعدوں کو بروقت پورا کرتا ہے، اس کے نزدیک ایک لمحہ، دن یا ایک سال سب برابر ہیں" کیونکہ تیرے پروردگار کے ہاں ایک دن تمھارے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے"

(وان یوماً عند ربک کالف سنة مما تعدون)

چنانچہ وہ سنجیدگی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کریں یا بطور تضحیک و استہزاء ایسا کہیں کہ "کیوں عذاب خدا ہم پر نازل نہیں ہوتا"

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی طرف سے آنے والا عذاب ان کی گھات میں ہے جلدی یا بدیر ضرور ان کو آئے گا۔ یہ مہلت جو انھیں دی گئی ہے اس کا مقصد ان کو بیداری شعور اور تجدید نظر کا موقع فراہم کرتا ہے۔

اور جب عذاب نازل ہو گیا تو معافی اور توبہ کے تمام دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں۔ شعور اور نجات کا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔

"ان یوماً عند .... مما تعدون" کے جملے کی مندرجہ بالا تفسیر کے علاوہ اور مفاہیم بھی مفسرین نے پیش کیے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمھیں ہزار سال کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ مگر اللہ کو نہ کسی تیاری کی ضرورت ہے نہ وقت کی احتیاج، بلکہ وہ کسی کام (عذاب) کو ایک دن (بلکہ اس سے کم) میں بھی انجام دے سکتا ہے۔

ایک اور مفہوم یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آخرت کا ایک دن دُنیا کے ہزار سال کے برابر ہے (اسی لحاظ سے وہاں کی جزاء اور سزا کی طوالت بھی زیادہ ہے) اسی سلسلے کی ایک روایت نقل کی گئی ہے

انّ الفقراء یدخلون الجنة قبل الاغنیاء نصف یوم ای خمسة مائة عام۔

"غریب لوگ امیر کبیر لوگوں کے مقابلہ میں آدھا دن یعنی پانچ سو سال قبل جنت میں داخل ہوں گے"۔ [۱]

آخری آیت میں گذشتہ آیتوں میں بیان شدہ بنیادی نقطہ اعادۃً بیان کیا جا رہا ہے اور اسی طرح ہٹ دھرم کفار کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔

"ایسی کتنی بستیاں اور آبادیاں ہیں، جنہیں ہم نے مہلت دی، حالانکہ وہ ظالم تھے (مہلت اس لیے دی گئی تاکہ وہ خواب غفلت سے جاگ اُٹھیں۔ مگر جب ایسا نہ ہوا تو پھر ہم نے انھیں ڈھیل دی تاکہ پُرتعیش زندگی میں مگن ہو جائیں، پھر اچانک ان کی سزا یعنی شدید عذاب نے انھیں آلیا" (وکاین من قریة املیت لها وهی ظالمة ثمّ اخذتها) وہ بھی تماری

---

[۱] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

Marfat.com

طرح عذاب میں تاخیر پر شکایت کرتے تھے اور مذاق اڑایا کرتے تھے اور اس تاخیر عذاب کو پیغمبروں کے جھوٹا ہونے کی دلیل بنا لیا کرتے تھے۔ لیکن آخرکار عذاب میں مبتلا ہوئے اور آہ و بکا کرنے لگے مگر اس آہ و بکار کی شنوائی نہ ہو سکی۔ بے شک یہ سب میری طرف ہی لوٹیں گے۔ تمام راہیں اللہ ہی پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اور تمام ذخائر و وسائل اور یہ تمام دولت و ثروت یہاں باقی رہ جائے گی اور وہی ان سب کا مالک ہے۔ (و الی المصیر)۔

Marfat.com

۴۹۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ

۵۰۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○

۵۱۔ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○

ترجمہ

۴۹۔ کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۵۰۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلائی کے کام کیے ان کے لیے معافی اور اچھا رزق ہے۔

۵۱۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری نشانیوں کے بارے میں (مٹانے کی) کوشش کی، اور یہ سمجھے کہ وہ ہم پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ وہ اہلِ جہنم ہیں۔

تفسیر

رزقِ کریم

گذشتہ آیتوں میں کفار کی طرف سے عذاب میں تعجیل کے مطالبے کا ذکر تھا اور یہ مسئلہ صرف ذات پروردگار عالم اور اُس کی حکمت آفریں مشیت سے متعلق ہے۔ یہاں تک کہ انبیاءؑ کو بھی اس میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ زیرِ بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے، کہہ دیجئے۔ اے لوگو! میں تمھارے لیے صرف ایک کھُلم کھُلا ڈرانیوالا

Marfat.com

ہوں: (قل یاایھا الناس انما انا لکم نذیر مبین) البتہ سرکشی اور نافرمانی کی سزا کے طور پر جلد یا بدیر کوئی عذاب تم پر نازل ہو۔ تو اس کا تعلق مجھ سے نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغبر اکرمؐ ڈرانے والے بھی ہیں اور خوشخبری دینے والے بھی مگر اس آیت مبارکہ میں خوشخبری کا ذکر نہ کرنے اور صرف ڈرانے کی بات کرنے کی وجہ مخصوص نظریے کے مخاطب ہیں۔ چونکہ وہ بے ایمان اور ہٹ دھرم قسم کے افراد تھے۔ جو خدائی عذاب و عقاب کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے۔ البتہ بعد والی دو آیتوں میں بشارت اور ڈراوا، دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ کی رحمتِ واسعہ اس کے عذاب پر سبقت رکھتی ہے۔ لہٰذا پہلے بشارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے بھلے کام کیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی اور اعلیٰ رزق و روزی ان کے لیے مخصوص ہے (فالذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لھم مغفرۃ ورزق کریم) یعنی پہلے اللہ کی معافی، بخشش اور عفو و درگزر کی جاری نہر میں غوطہ زن ہو کر کثافت و غلاظت کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ پاک باطن بن جاتے ہیں، پھر اس کے لطف و کرم کی طرح طرح کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے کہ "کریم" سے مراد ہر قابلِ قدر اور اعلیٰ چیز ہوا کرتی ہے "رزق کریم" ایک وسیع مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو تمام مادی اور معنوی گرانقدر نعمتوں پر محیط ہے۔

بے شک اللہ اپنے اس کریم مہمان خانے میں طرح طرح کی کریم نعمتوں کے ساتھ اپنے مومن، صالح اور کریم بندوں پر فیوض و برکات کی بارش کرے گا۔

راغب اپنی مشہور کتاب "مفردات" میں لکھتا ہے کہ لفظ "کرم" عام طور پر بہت نیک، بھلے، اچھے اور قابلِ قدر امور کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کم درجے کی نیکی اور اچھائی کے لیے ہیں۔ بعض مفسرین نے "رزق کریم" سے غیر منقطع، مسلسل بے نقص، روزی کے معنی مراد لیے ہیں اور بعض نے مناسب اور حسبِ حال کا مفہوم لیا ہے۔ اصل میں یہ سب مفاہیم مندرجہ مذکور مفہوم میں شامل ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ فرمایا گیا ہے: لیکن وہ لوگ جو اللہ کی نشانیوں کو مٹانے اور تخریبی کارروائیوں میں سرگرم ہیں اور اپنے زعم باطل میں اللہ کے ارادوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دوزخی ہیں (والذین سعوا فی اٰیاتنا معاجزین اولٰئک اصحاب الجحیم) ؂[1]

---

[1] "سَعَوْا" "سَعی" کے مادہ سے دوڑنے کے معنی میں ہے اور یہاں آیاتِ الٰہی کو مٹانے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "معاجزین" "عَجز" کے مادہ سے ہے۔ یہاں ان لوگوں کے ارادوں کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت و سطوت پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض مفسرین "معاجزین" کو پیغمبر اور مومن کے ساتھ منسوب سمجھا ہے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کے بارے میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کو عاجز کرنا چاہتا ہو۔ حالانکہ یہی تعبیر دوسری قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں آئی ہے (سورہ جن۔ ۱۲ اور توبہ ۲، ۳) اور مراد یہ ہے کہ کسی کا عمل اس کے چہرے سے ظاہر ہو۔

Marfat.com

"جَحِیمُ" حَجَمُ (بروزن شَرَمَ) کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنیٰ آگ کا شدت سے بھڑکنا اور غیظ وغضب کی شدت ہے۔ لہٰذا جَحِیم وہ جگہ ہوئی، جہاں آگ، غیظ اور غضب شدت سے بھڑکتے ہیں۔ یعنی دوزخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

۵۲۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ
اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ
مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ
عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ‏

۵۳۔ لِّيَجۡعَلَ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ فِتۡنَةً لِّـلَّذِيۡنَ فِىۡ
قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡقَاسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ
وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ۙ‏

۵۴۔ وَّلِيَـعۡلَمَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّهُ
الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَيُؤۡمِنُوۡا بِهٖ فَتُخۡبِتَ لَهٗ
قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏

ترجمہ

۵۲۔ ہم نے تجھ سے پہلے جو بھی نبی بھیجا۔ جب بھی وہ کوئی آرزو کرتا (اور اپنے الٰہی اہداف کی تکمیل کے لیے کوئی منصوبہ بناتا) تو شیطان ضرور اس میں وسوسے پیدا کر دیتا اور اپنی نشانیوں کو استحکام بخشتا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

Marfat.com

۵۳۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ شیطانی وسوسوں کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دے، جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو سنگ دل ہیں اور ظالم حق سے دور شدید لغض و عناد میں بھرے ہُوئے ہیں۔

۵۴۔ علاوہ بر ایں مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ جنہیں اللہ نے علم دیا ہے جان لیں، کہ تیرے پروردگار کی طرف سے یہ حق ہے۔ چنانچہ ایمان لے آئیں، دل سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور اللہ صاحبانِ ایمان کو راہِ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

انبیائؑ کے خلاف شیطانی وسوسے

گذشتہ آیتوں میں کفار اور مشرکین کی طرف سے دینِ خدا کی تضحیک اور استہزاء اور اسے مٹانے کی سرگرمیوں کا ذکر تھا زیرِ بحث آیتوں میں لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ دین دشمن و سیہ کاریاں کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ہمیشہ سے طاغوتی اور شیطانی شکوک و شبہات انبیاء کے مقابلے میں پھیلائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "تجھ سے پہلے ہم نے جب کبھی بھی کوئی نبی بھیجا اور اس نے خدائی مقاصد کی توسیع و ترقی کا جو منصوبہ بھی بنایا۔ ضرور شیطان نے اس میں شکوک و شبہات پیدا کیئے"۔ (وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ ولانبی الا اِذا تمنّٰی القی الشیطان فی امنیته) لیکن اللہ شیطان کے ان وسوسوں کے ہجوم میں اپنے پیغمبر کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ "اللہ شیطان کے شکوک و شبہات کو زائل کر دیتا اور اپنی نشانیوں کو استحکام بخشتا (فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثُمَّ یحکم اللہ ایاتہ) اور یہ کام اللہ کے لیے آسان ہے، کیونکہ وہ "علیم و حکیم ہے، تمام منفی ریشہ دوانیوں سے پُوری طرح با خبر ہے۔ اور ان کو ناکام بنانے کے طریقوں سے اچھی طرح واقف ہے (واللہ علیم حکیم)۔ البتہ دین دشمن طاقتوں کی سیاہ کاریاں اور طاغوتی کارستانیاں ہمیشہ مومنین، باخبر افراد اور کفار سب کے لیے امتحان کا سبب بنتی ہیں، چنانچہ بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے" یہ تمام امور بیمار دل اور سنگ دل افراد کی آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ (لیجعل ما یلقی الشیطان فتنة لِلّذین فی قلوبھم مرض والقاسیة قلوبھم) اور ظالم و نا انصاف لوگ حق سے

Marfat.com

سے بہت دُور ہیں اور ان کے دل بغض و عداوت سے بھرے پڑے ہیں (وان الظّالمین لفی شقاق بعید) علاوہ برایں ان کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ آگاہ اور باخبر لوگ حق و باطل میں تمیز کریں، خدائی ضابطوں اور شیطانی شکوک میں امتیاز کریں اور دونوں کا موازنہ کرکے سمجھ جائیں کہ خدائی قانون ہی دینِ حق ہے اور تیرے رب کی طرف سے ہے، چنانچہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل پوری طرح اللہ کی بارگاہ میں جُھک جائیں (ولیعلم الذین اوتوا العلم انه الحق من ربك فیؤمنوا به فتخبت له قلوبهم)۔ بے شک اللہ ان آگاہ اور حق طلب مومنین کو ان خطرناک راہوں میں اکیلا نہیں چھوڑتا ، بلکہ اللہ صاحبان ایمان کو راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے (وان الله لھاد الذین اٰمنوا الیٰ صراط مستقیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ شیطانی شکوک و شبہات کیا ہیں؟

مندرجہ بالا تفسیر کے علاوہ ان آیتوں کے بارے میں اور خیالات کا بھی اظہار کیا گیا ہے اگرچہ مذکورہ بالا تفسیر بعض محقق مفسرین کے نظریات سے ہم آہنگ ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "تمنی" اور "امنیه" کے معنیٰ تلاوت یا قرارت کے ہیں اور بعض عرب شعراء نے بھی ان الفاظ کو اسی معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ اس بنا پر زیرِ بحث پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ماضی میں جب انبیاء اللہ کے احکامات لوگوں کو سناتے تھے تو شیاطین (خصوصاً شیاطین نما انسان) ان کی گفتگو میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے اور پیغمبروں کی ہدایت کو غیر مؤثر بنانے کے لیے، ان کی تقریر کے دوران ہی باطل نظریات کا پرچار کرنے لگتے ــــ لیکن اللہ اپنی قدرت کاملہ سے ان باطل افکار کے اثرات کو زائل کر دیتا اور اپنے احکامات کو پختگی بخشتا، یہ مفہوم۔

"ثم یحکم الله اٰیاته"

کے جملے سے مطابقت رکھتا ہے اور بعد میں آنے والے "غرانیق" کے فسانے سے ملتا جلتا ہے (اگرچہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے) لیکن زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ "تمنی" اور "امنیة" تلاوت کے معنیٰ میں شاذ ہی استعمال ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خود قرآن الحکیم میں کہیں بھی اس معنیٰ میں استعمال نہیں ہُوئے۔ "تمنی" کا اصل مادہ "منی" (بروزن مشی) ہے اور یہ دراصل تقدیر اور فرض کے معنیٰ میں ہے۔ انسان اور حیوان کے نُطفہ کو اسی لیے "منی" کہا جاتا ہے کہ اس سے بچے کی شکل و صورت معین ہوتی ہے۔ "منیه" موت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ موت انسان کے لیے مقدر ہوتی ہے۔ آرزوؤں کو بھی تمنی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے ذہن میں ان کی تصویر بنا لیتا ہے اور انھیں اپنا مقدر سمجھنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس لفظ کی بنیاد ہر جگہ تقدیر، فرض اور تصویر ہی ہے۔ یوں تو تلاوت اور قرارت کو بھی اس معنے سے مرتبط کیا جا سکتا ہے کہ تلاوت الفاظ کی تقدیر و تصویر ہی تو ہے۔ مگر یہ ربط بہت دور کا ہے اور عربی زبان میں ایسے ربط کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ البتہ انبیاء و مرسلین کے منصوبوں اور پروگراموں والا معنیٰ جو ہم نے پیش کیا ہے وہ اس لفظ کے بنیادی اور اصلی معنیٰ

Marfat.com

کے بہت قریب ہے۔

اسی ذیل میں ایک تیسرا احتمال یہ بھی پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ شیطانی وسوسے ہیں۔ جو بہت ہی کم وقفے کے لیے انبیاءؑ سے پاک اور نورانی افکار میں ڈالے جاتے تھے مگر مقام عصمت کی وجہ سے اللہ کی غیبی قوت اور مدد کے ذریعے ان وسوسوں کو بہت جلد زائل کر دیا جاتا تھا اور ان کو بدستور راہ راست پر قائم رکھا جاتا تھا۔ یہ مفہوم بھی بعد کی آیتوں سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ بعد والی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ شیطانی شکوک اور وسوسے صاحبان علم، مومنین اور کافروں کے لیے آزمائش کا ذریعے تھے چنانچہ اس مفہوم کا تعلق انبیاء کی قلبی اور فکری کیفیت سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ بہت جلد شیطانی وسوسوں کو سمجھ لیتے تھے اور ان سے دُور رہتے تھے۔

بہرحال اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے جس میں انبیاءؑ کی کارکردگی اور منصوبوں کے مدّمقابل شیطانی سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جن کے ذریعے وہ انبیاء کے فلاحی اور تعمیری منصوبوں کو ہمیشہ سبوتاژ کرنے کے درپے رہتے تھے۔ مگر اللہ ان کو ناکام بنا دیا کرتا تھا۔

۲۔ "غرانیق" کا من گھڑت فسانہ

بعض کتب اہل سنت میں اس موقع پر ابن عباس سے ایک عجیب روایت نقل کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ رسول اللہؐ سورۂ نجم کی تلاوت میں مصروف تھے جب آپ اس مجیدہ

أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝

جس میں مشرکین کے بتوں کے نام لیے گئے ہیں، پر پہنچے تو شیطان نے آپؐ کی زبان پر یہ جملے جاری کرا دیئے

"تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى"

یہ دلکش بلند پایہ پرندے ہیں جن سے شفاعت کی امید باقی ہے۔ [۱]

یہ سننا تھا کہ مشرکین مکّہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "آج پہلا موقع ہے کہ محمدؐ نے ہمارے خداؤں کے نام اچھائی کے ساتھ لیا ہے"

اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے سجدہ کیا اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا، جبرائیلؑ نازل ہوئے اور اطلاع دی کہ موخر الذکر دو جملے میں آپ کے پاس نہیں لایا تھا۔ بلکہ وسوسہ شیطانی تھے اور اس وقت (وما ارسلنا من قبلك من نبى ....) والی آیت نازل ہوئی اور اس طرح رسول اللہؐ اور مومنین کو تنبیہ کی گئی۔ [۲]

بعض اسلام دشمنوں نے پیغمبر اکرمؐ کے مشن کو نقصان پہنچانے کے لیے اس روایت کو اپنے لیے بڑی عمدہ

---

[۱] "غرانیق" "غرنوق" (بروزن "مزدور") کی جمع ہے۔ یہ سفید یا سیاہ رنگ کا ایک آبی پرندہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ لفظ اور معنٰی میں بھی آیا ہے۔ (قاموس اللغۃ)

[۲] تفسیر المیزان زیر بحث آیت کی تفسیر سے ذیل میں یہ حدیث اہلِ سُنّت کے حفاظ حدیث سے نقل کی گئی ہے۔ ان میں ابن حجر بھی شامل ہیں۔

Marfat.com

دستاویز بنالیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس معاملے کو بڑی شد و مد سے نقل کیا ہے اور اس پر بہت حاشیے چڑھائے ہیں۔ جب ایسے بہت سے قرائن موجود ہیں، جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ ایک من گھڑت حدیث ہے۔

(i) مثلاً بقول محققین اس حدیث کے راوی ضعیف اور غیر ثقہ ہیں اور ابن عباس سے اس کا روایت ہونا ثابت نہیں ہے۔ بقول محمد ابن اسحاق یہ قصہ زندیقوں اور ملحدوں کے بہت سے گھڑے ہوئے قصوں میں سے ایک ہے۔ اس نے یہ بات اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے [1]

(ii) سورۂ نجم کی ابتدائی آیتوں میں صریحاً ان خرافات کی نفی کی گئی ہے۔ اس سورۃ کی تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ

"رسول اللہ ہوائے نفس سے کلام نہیں کرتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وحی ہوا کرتی ہے"

اس آیت کی موجودگی میں مذکورہ فسانہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

(iii) سورۂ نجم کے نزول کے دوران اور اس کے بعد حضرت پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کے سجدہ کرنے کے بارے میں مختلف کتابوں میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ مگر کسی میں غرانیق والا افسانہ موجود نہیں ہے، جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ 'فسانہ' بعد میں بڑھایا گیا ہے۔ [2]

(iv) ان بتوں کے نام والی آیت کے بعد آنے والی آیتیں سب کی سب بتوں کی شدید مذمت کر رہی ہیں اور ان کی پستی و ضلالت کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ تمہارے من گھڑت اوہام و تصورات ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و اٰباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدیٰ۔

مذمت کے ان یہ الفاظ کے بعد کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے کہ پہلے کی کسی آیت میں بتوں کی تعریف و توصیف کی گئی ہو۔ مزید برآں قرآن مجید کے بارے میں صریحاً کہا گیا ہے کہ یہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے منزہ ہے۔ سورۂ حجر آیت ۹ اس طرح ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔

(v) پیغمبر اکرمؐ نے زندگی بھر بتوں کے خلاف مسلسل و پیہم جہاد فرمایا اور کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی ان سے سمجھوتہ نہیں فرمایا۔ ابتدائی سن مبارک سے لے کر آخری دنوں تک بتوں اور بت پرستی کی طرف معمولی سا جھکاؤ اور میلان بھی نہیں دکھایا۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج نمبر ۲۳ صفحہ ۵۰۔

[2] تفسیر کبیر فخر الدین رازی ج نمبر ۲۳ صفحہ ۵۰۔

Marfat.com

جا سکتا۔ یہاں تک کہ سخت ترین حالات میں بھی آپ کے رویے میں ذرا سی لچک بھی پیدا نہ ہوئی تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ یہ الفاظ آپ کی زبان مبارک پر آئے ہوں۔

(۷) وہ لوگ جو مسلمان نہیں اور آپ کو منصوص من اللہ نہیں مانتے۔ وہ بھی آپ کو ایک مدبر مفکر اور دانشور ضرور سمجھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی حکیمانہ تدبیروں سے شاندار کامیابیاں حاصل کریں تو اس کردار کی حامل شخصیت جو زندگی بھر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا نعرہ بلند کرے۔ کسی قسم کی مصالحت اور سمجھوتے کے بغیر شرک بُت پرستی کے خلاف جہاد مسلسل جاری رکھے۔ کیا ممکن ہے کہ یکایک اپنے مقصد کو چھوڑ کر بتوں کی تعریف کرنے لگ جائے۔

مندرجہ بالا مفصل بحث یہ واضح کر رہی ہے کہ "غرانیق" کا قصہ عیار دشمنوں اور بے خبر مخالفوں کا خود ساختہ ہے۔ جنہوں نے قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی حیثیت کو داغدار کرنے کے لیے بے بنیاد اور گمراہ کن روایات گھڑی ہیں۔ شیعہ و سُنی سے بالاتر ہو کر اسلام کے تمام محققین نے اس روایت کی پوری شدومد کے ساتھ نفی کی ہے۔ [1]

البتہ بعض مفسرین نے اس قصے کی توجیہ کی ہے۔ لیکن توجیہ کی وقعت تو تب ہے، جب اصل حدیث صحیح ثابت ہو جاتی بہر حال انہوں نے توجیہ یوں کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ قرآن مجید کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کیا کرتے تھے اور آیات کے درمیان چند لمحوں کا وقفہ کیا کرتے تھے تاکہ آیات سامعین کے ذہن نشین ہو جائیں۔ سورۂ نجم کی تلاوت کے دوران میں بھی جب آپؐ نے (افرأیتم الات والعزّٰی ..... الاخری) والی آیت تلاوت کرنے کے بعد وقفہ فرمایا تو شیطان صفت ہٹ دھرم مشرکین نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے (تلک الغرانیق ..... لترتجی) کا جملہ اسی خاص لحن کے ساتھ کہہ دیا تاکہ پیغمبر اکرمؐ کا تمسخر اڑے اور لوگوں میں شکوک پیدا ہوں۔ [2]

مگر بعد والی آیتوں نے مسئلے کو واضح کرتے ہوئے اس کا دندان شکن جواب دے دیا اور بت پرستی کی شدید مذمت کی۔ اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض افراد نے "غرانیق" والی داستان متعصب مُشرک بت پرستوں کی ہٹ دھرمی کے باوجود ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے پیغمبر اکرمؐ کے جھکاؤ اور میلان کے طور پر بیان کی ہے۔ ایسا کرنے میں وہ فاش غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا خود اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے۔ کہ انھیں جاہل بت پرستوں کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کے دو ٹوک رویے کا ادراک نہیں ہے اور ان تاریخی حقائق سے یا تو بے خبر ہیں یا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ جن کے مطابق مُشرک، پیغمبر اسلامؐ کو مُنہ مانگے دام دینے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ آپ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر آپ نے ان کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اپنے موقف سے سرمو اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر فی ظلال، تفسیر صافی، تفسیر رُوح المعانی، تفسیر المیزان اور دوسری تفاسیر (اسی آیت کے ذیل میں)

[2] تفسیر قرطبی ج ۷، ص ۴۴۷۴۔ تفسیر مجمع البیان میں مرحوم طبرسی نے بھی ایک طرح اس کا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

۴۔ "رسول" اور "نبی" میں فرق اس مسئلے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، ہماری نظر میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ رسولؐ ان انبیاءؑ کو کہتے ہیں جو اپنے دین کی تبلیغ و ترویج اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے پر مامور تھے، جیسا کہ ان کی سوانح حیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں انتھک کوشش کرتے تھے۔ معمولی سی فروگذاشت بھی نہیں کرتے تھے اور ہر طرح کی سختی اور تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

البتہ "نبی" جیسا کہ خود اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ اس شخصیت کو کہا جاتا ہے جو وحی الٰہی کی خبر دے۔ اگرچہ وہ وسیع سطح پر تبلیغ پر مامور نہیں ہوتا۔ دراصل وہ ایک ڈاکٹر کی مانند ہوتا ہے، جس کو تلاش کر کے اس سے لوگ اپنی بیماری کا علاج کراتے ہیں مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف پیغمبروں کے ماحول حالات میں خاصا فرق تھا اور ہر ایک کے فرائض و ذمہ داریاں جدا جدا تھیں۔ [1]

---

[1] سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۲۴ کی تفسیر کے ذیل میں اسی سلسلے میں بحث ہو چکی ہے۔

Marfat.com

۵۵۔ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ
حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ
عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ○
۵۶۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۗ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۗ فَالَّذِينَ
اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ ○
۵۷۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ○
۵۸۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ
قُتِلُوٓا اَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۗ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○
۵۹۔ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ
لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ ○

ترجمہ

۵۵۔ کفار ہمیشہ قرآن کے بارے میں شک میں مبتلاء رہیں گے ، یہاں تک کہ اچانک قیامت آجائے یا یومِ عقیم (وہ دن جب وہ کسی تلافی کے قابل نہ ہوں گے) کا عذاب ان کو آلے ۔

۵۶۔ اس دن صرف اللہ کی حکمرانی ہوگی ۔ وہ ان کا فیصلہ کرے گا ۔

Marfat.com

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے اچھے عمل کیے ہیں۔
وہ بہشت کے نعمتوں سے معمور باغوں میں ہوں گے۔

۵۷۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا
ہے ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔

۵۸۔ اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ہجرت کی پھر قتل ہُوئے یا فوت ہو گئے
اللہ انھیں بڑا عمدہ رزق دے گا اور اللہ ہی بہترین روزی دینے
والا ہے۔

۵۹۔ اللہ انھیں ایسے مقام پر لے جائے گا کہ وہ خوش ہو جائیں گے اور
اللہ صاحب علم و حلم ہے۔

تفسیر

رزقِ حسن

گذشتہ آیتیں، اللہ کی نشانیوں کو محو کرنے کے لیے مخالفین کی سرگرمیوں کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیتوں میں انہی متعصب اور ضدی لوگوں کی ان مذموم کوششوں کے جاری رہنے کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے "کفار ہمیشہ قرآن مجید اور تیرے توحیدی دین کے بارے میں دروز قیامت تک شکوک میں مبتلا رہیں گے۔ حتیٰ کہ قیامت اچانک آجائے گی۔ یا یوم عقیم کہ جس دن وہ کسی قسم کی تلافی کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں گے کا عذاب ان کو آلے گا۔ (ولا یزال الذین کفروا فی مریۃ منہ حتیٰ تأتیھم الساعۃ بغتۃ او یأتیھم عذاب یوم عقیم)۔

واضح ہے کہ کافرین سے مراد تمام کفار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں کے بہت سے تبلیغ کے دوران پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لے آئے تھے اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے۔ یہاں کافرین سے مراد ان کے ضدی اور متعصب سردار اور ہٹ دھرم کینہ پرور لوگ جو آخر تک ایمان نہ لائے اور تخریبی کاروائیوں میں معروف رہے۔

Marfat.com

لفظ "مریۃ" جس کا معنیٰ ریشک، تردد اور تذبذب ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ کفار قرآن اور اسلام کو یقین کی حد تک غلط نہیں سمجھتے تھے اگرچہ زبان سے ایسا ہی کہتے تھے، وہ اسلام کے خلاف یقین کی منزل سے گر کر کم از کم شک کی سطح پر آگئے تھے مگر تعصب اور کینہ انھیں حقیقت کو پانے کے لیے مزید مطالعے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لفظ "ساعۃ" کے متعلق اگرچہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا مطلب "موت" اور "لمحات مرگ" ہے، مگر بعد کی آیتیں بتلاتی ہیں کہ اس سے مراد قیامت کا آنا ہے۔ علی الخصوص "بغتۃ"، یعنی اچانک اور "ناگہانی" کے قرینے سے "یوم عقیم" کے عذاب سے مراد قیامت کی سزا ہے۔ اس کو "بانجھ" اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد ان کا کوئی ایسا دن میسر نہ آئے گا کہ اپنے گناہوں کا کفارہ، یا کوتاہیوں کا ازالہ کرسکیں اور اپنی حالت و کیفیت میں کسی قسم کی تبدیلی کرسکیں۔ اس کے بعد قیامت کے دن اللہ کی ہمہ جہت حاکمیت اعلیٰ کا ذکر کیا گیا ہے، اس دن صرف اور صرف اللہ ہی کی حکمرانی ہوگی۔ (الملک یومئذ للہ) یہ بات صرف قیامت کے دن سے ہی مخصوص نہیں ہے، کیونکہ اللہ تو ہمیشہ ہمہ جہت اور مطلق حاکم ہے۔ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ البتہ دنیا میں چونکہ دوسرے حکام اور فرمانروا بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی حکومت محدود اور کمزور ہوتی ہے اور اس کی صورت صرف ظاہری ہوتی ہے

البتہ یہی بات ہوسکتی ہے، اس امر کا باعث بنے کہ کہا جائے کہ اللہ کے علاوہ اور بھی حاکم و مالک موجود ہیں۔ لیکن روز قیامت جبکہ دنیاوی تمام حاکموں اور بادشاہوں کی بساط لپیٹ دی جائے گی، تب یہ حقیقت ہر زمانے سے زیادہ واضح ہوگی کہ حاکم و مالک صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔

بالفاظ دیگر حاکمیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی حاکمیت جو خالق کو مخلوق پر حاصل ہے۔ دوسری اعتباری اور قرار دی گئی۔ حاکمیت جو لوگوں کے درمیان ایک نظام قائم رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ دنیا میں یہ دونوں قسم کی حاکمیتیں موجود ہیں مگر آخرت میں اعتباری اور قرار دی گئیں حکومتیں سب کی سب ختم کردی جائیں گی۔ اور صرف خلاق عالم کی حاکمیت باقی رہ جائے گی[1]

بہرحال حقیقی مالک وہی ہے، چنانچہ حقیقی حاکم و فرمانروا بھی وہی ہوگا، لہٰذا وہ کافر و مومن تمام انسانوں کا فیصلہ کرے گا اس کا نتیجہ وہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے بعد کیا گیا ہے، یعنی: جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے۔ بہشت میں طرح طرح کی نعمتوں والے باغوں میں رہیں گے۔ ایسے باغات جہاں ہر وہ نعمت اور ہر خیر و برکت موجود ہوگی۔ جس کا وہ تصور کریں گے (فالذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فی جنٰت النعیم)۔ البتہ جو منکر بنے اور جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہ ذلت آمیز عذاب میں مبتلا رہیں گے (والذین کفروا وکذبوا باٰیاتنا فاولٰئک لھم عذاب مھین)۔ واقعی کیا منہ بولتی اور زندہ تصویر پیش کی گئی ہے یہ عذاب ان لوگوں کو رسوا اور پست کرے گا جو مغرور اور متکبر تھے۔ جو اپنے آپ کو باقی مخلوق خدا سے برتر سمجھتے تھے۔ خود کو بڑے اور دوسروں کو پست اور چھوٹا سمجھتے تھے۔

---

[1] المیزان، ج ۱۴ ص ۴۳۳۔

Marfat.com

قرآن مجید کی مختلف آیات میں عذاب کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں" الیمہ" "عظیمہ" اور "مھین" ان میں سے ہر قسم، گناہ کی اس قسم کے ساتھ مطابقت و مناسبت رکھتی ہے جو مغرور اور متکبر لوگ کرتے رہے ہوں گے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین اور کفار دونوں کے ساتھ دو دو چیزوں کی نسبت دی گئی ہے۔ مومنین کے لیے، ایمان، اور عمل صالح، اور کفار کے لیے، کفر اور تکذیب، دراصل یہ ہر گروہ کی اندرونی اعتقاد اور ظاہری آثار کی عکاسی ہے۔ کیونکہ انسان کے اعمال و کردار کا سرچشمہ اس کے نظریات ہیں۔

گذشتہ چند آیتوں میں اللہ اور اس کے دین کے لیے اپنے گھر بار چھوڑنے والے مہاجرین کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیت میں ان کو ایک ممتاز طبقے کے طور پر پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور اس کے بعد جام شہادت نوش کیا یا ویسے ہی چل بسے۔ اللہ ان کو عمدہ روزی اور مخصوص نعمتوں سے نوازے گا۔ کیونکہ وہ بہترین روزی دینے والا ہے (والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقا حسنا و ان اللہ لھو خیر الرازقین)۔

بعض مفسرین نے "رزق حسن" سے مراد وہ نعمتیں لی ہیں، جن پر اگر انسان کی نظر پڑے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اور اس میں ایسا کھو جاتا ہے کہ کسی دوسری چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا اور ایسی روزی صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔

بعض علماء نے اس آیت کی شان نزول یہ بیان کی ہے۔

> جب مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی، وہاں کچھ مسلمان تو طبعی موت سے دنیا سے اٹھ گئے اور بعض نے جام شہادت نوش کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کا ایک گروپ یہ تاثر دینے لگا کہ تمام درجات اور فضیلتیں صرف ان ہی سے مخصوص ہیں جو شہید ہوئے ہیں اور ویسے فوت ہونے والوں کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور دونوں کو نعمتوں کا مستحق بتایا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اصل اہمیت راہِ خدا میں جان دینا ہے۔ چاہے میدانِ کارزار میں جام شہادت نوش کرتے ہوئے دے یا اطاعتِ خدا میں فوت ہو جائے۔ اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے مرنے والا بھی شہداء کے ثواب کا حامل ہوتا ہے۔

ان المقتول فی سبیل اللہ والمیت فی سبیل اللہ شھید۔ [1]

آخری آیت میں عمدہ روزی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اللہ انھیں ایسے مقام پر لے جائے گا۔ کہ وہ خوش ہو جائیں گے۔ (لیدخلنھم مدخلا یرضونہ)۔ یعنی اگر اس دنیا میں وہ اپنے گھر بار سے بڑی پریشانی اور دکھ کے عالم میں نکلنے پر مجبور کر دیے گئے، تو اللہ ان کو دوسرے جہان میں ایسی رہائش گاہ اور مسکن دے گا۔ جو ہر لحاظ سے ان کے لیے لذت انگیز اور نشاط

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۷، صفحہ ۴۴۷۸

Marfat.com

انبساط بخش ہوگا۔ اور یوں ان کی جاں نثاری اور قربانی کی تلافی بہ طریقِ احسن کرے گا۔ آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ان کے اعمال و کردار سے پوری طرح باخبر ہے۔ نیز حلیم و برد بار ہے اور سزا و جزا میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ تاکہ اس امتحان گاہ میں مومنین کی تربیت بھی ہو۔ اور مکمل امتحان بھی۔ (وان اللہ لعلیم حلیم)۔

Marfat.com

۶۰۔ ذٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهٖ
ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ
لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ○
۶۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ
بَصِيْرٌ ○
۶۲۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ○

ترجمہ

۶۰۔ بات یہی ہے اور جو شخص اپنے اوپر کی گئی زیادتی کے برابر سزا دے اور پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اور اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۶۱۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدلتا ہے۔ اور اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۶۲۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اس کے علاوہ وہ جسے بھی پکارتے ہیں باطل ہے اور اللہ بلند مقام اور بڑا ہے۔

Marfat.com

شانِ نزول

بعض روایات کے مطابق محرم کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور صرف ایک دو راتیں باقی تھیں کہ مشرکین نے باہم صلاح مشورہ کیا کہ محمدؐ کے اصحاب اور ساتھی اس مہینے میں جنگ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ للذا آؤ ان پر حملہ کر کے انھیں ختم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے پہلے اپیل کی کہ اس مقدس مہینے میں جنگ نہ کی جائے۔ مگر جب کفار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تو مسلمانوں نے ڈٹ کر دفاع کیا اور اللہ نے ان کو فتح دی۔ اس کے بعد زیرِ بحث پہلی آیت نازل ہوئی۔ [1]

کامران کون ہے؟

گذشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں اور اللہ کی طرف سے قیامت میں انھیں عظیم جزا کا ذکر تھا۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے کہ اللہ کی طرف سے لطف و کرم اور کامیابیاں صرف آخرت کے لیے ہیں۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں اسی دنیا میں اس کی طرف سے انعام اور مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "بات یہی ہے اور جو شخص اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کے برابر بدلہ لے اور پھر اس پر مزید زیادتی کی جائے تو اللہ اس کی مدد کرے گا (ذٰلک ومن عاقب بمثل ما عوقب بہ ثم بغی علیہ لینصرنہ اللہ)۔ یہ اس حق کی طرف اشارہ ہے کہ ظلم و ستم کے مقابلے میں ہر ایک شخص دفاع کا فطری حق رکھتا ہے اور ہر شخص اقدام کا مجاز ہے۔ مگر "مثل" کی قید سے یہ تاکید کر دی گئی ہے کہ "حد" سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ "ثم بغی علیہ" اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا دفاع کرتے ہوئے دشمنوں کے نرغے میں آ جائے تو اس کی مدد خود اللہ کرے گا۔ یعنی یہ واضح کیا جا رہا ہے۔ کہ جو شخص سرے سے ظلم کے مقابلے میں خاموش بیٹھا رہے تختۂ مشق ظلم بنا رہے۔ اپنے دفاع کے لیے کوئی موثر اقدام نہ اُٹھائے تو ہرگز اللہ کی مدد کا مستحق قرار نہیں پائے گا۔ چنانچہ اللہ نے اپنی مدد کا وعدہ صرف ان لوگوں سے مخصوص کر رکھا ہے جو اپنی تمام تر توانائیوں کو ظالموں اور جابروں کے مقابلے میں بروئے کار لائیں اور اپنا بھرپور دفاع کریں۔ لیکن پھر بھی ظلم سے نجات حاصل نہ کر سکیں۔ نیز چونکہ ضروری ہے کہ قصاص، سزا اور عفو و درگزر ساتھ ساتھ ہوں تا کہ اپنے جرم پر نادم ہونے والے اور سرِ تسلیم خم کر لینے والے سائے تلے پر سکون بیٹھ سکیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ بہت معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے (ان اللہ لعفو غفور)۔

یہ آیت قصاص کی دوسری آیتوں کے مشابہ ہے جو ایک طرف مقتول کے وارث کو بدلہ لینے کی اجازت دیتی ہے تو دوسری طرف معاف کر دینے کو بہتر شمار کرتی ہے (البتہ انہیں جو معافی کے لائق ہوں)

[1] مجمع البیان، اور در منثور زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

Marfat.com

چونکہ نصرت و مدد کا وعدہ صرف اس صورت میں موثر اور حوصلہ افزا ہوگا جب مدد کرنے والا کوئی قادر و توانا ہو۔ چنانچہ بعد والی آیت میں وسیع عالم ہستی میں پروردگار عالم کی طاقت و اقتدار کا ایک رُخ پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "یہ اس لیے ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدلتا رہتا ہے اور ہمیشہ ان میں کمی بیشی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح لاکھوں سالوں سے یہ باقاعدہ نظام چل رہا ہے" (ذٰلک بان اللہ یولج الیل فی النھار ویولج النھار فی الیل)۔

"یولج" اور "ایلاج" "ولوج" کے مادہ سے ہے۔ جو "دخول" کے معنی میں ہے۔ یہ اس حیثیت کی تعبیر ہے کہ سال کے مختلف حصّوں میں رات دن میں تدریجی کمی بیشی کا نظام باقاعدہ تغیر و تبدل کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ایک میں کمی اور دوسرے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے طلوع و غروب آفتاب کی طرف اشارہ ہو۔ زمین کی مدوّر شکل اور ہوا کے غلاف کی وجہ سے کبھی طلوع و غروب کی اچانک یا فوری تبدیلی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ہوا کے غلاف کے اوپر کے حصے پر سورج کی پہلی شعائیں پڑنے سے طلوع فجر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ پھر تدریجاً نیچے کے حصے روشن ہوتے ہیں اور زمین کی سطح منوّر ہوتی ہے۔ گویا تدریجاً دن رات میں داخل ہوتا ہے اور افواجِ نور تاریکی کے لشکر پر غالب آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس غروبِ آفتاب کے موقع پر سورج کی شعائیں پہلے سطح زمین سے اوپر فضا میں اٹھتی ہیں جس سے معمولی سی تاریکی ہو جاتی ہے اور تدریجاً ہوا کے غلاف کے اوپر کی سطح تک چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ سورج کی آخری کرنیں ہوا کے غلاف کے آخری کناروں سے بھی ہٹ جاتی ہیں اور یوں اندھیرا ہر جگہ کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو طلوع و غروب اچانک اور فوری تبدیلی سے رونما ہوتے رات دن اور دن رات میں اچانک بدل جاتا اور جسمانی اور روحانی لحاظ سے انسان کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ اجتماعی طور پر بھی یہ ناگہانی تبدیلی کئی مشکلات کا سبب بنتی۔ بہرحال اگر یہ کہا جائے کہ زیر بحث آیت مذکورہ بالا دونوں امور کی طرف اشارہ کرتی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (وان اللہ سمیع بصیر)۔

مومنین کی امداد کے تقاضے سنتا ہے۔ ان کی کیفیت اور کارکردگی سے باخبر ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کا فضل و کرم ان کے شاملِ حال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ دشمن کی کارستانیوں اور ناپاک عزائم سے بھی مطلع ہے۔ زیر بحث آخری آیت دراصل پہلی آیت کے دعوے کی دلیل ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ حق ہے اور اس کو چھوڑ کر وہ جسے بھی پکارتے ہیں باطل ہے اور اللہ بلند مقام اور بڑا ہے (ذٰلک بان اللہ ھو الحق وان ما یدعون من دونہ ھو الباطل وان اللہ ھو العلی الکبیر)۔ اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ حق کی افواج کامران ہوتی ہیں۔ باطل قوتیں پیچھے ہٹتی ہیں اور منہ کی کھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم کفار کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ مومنین کی مدد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار باطل ہیں اور مومنین برحق۔ وہ نظامِ عالم ہستی کے برخلاف ہیں۔ چنانچہ ان کا انجام فنا اور بربادی ہے اور مومنین کائنات کے قوانین سے ہم آہنگ ہیں۔ اصول یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ حق ہے اور اس کا غیر باطل چنانچہ وہ تمام لوگ، بلکہ ہر وہ موجود جو اللہ سے مربوط ہوگا۔ وہ برحق ہے۔ اسی طرح جو اس سے منقطع ہیں وہ اپنے درجۂ انقطاع کی نسبت

Marfat.com

سے درجۂ باطل پر ہیں۔ [1]

"علی" "علو" کے مادہ سے بلندی اور رفعت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز اس ذات کو "علی" کہتے ہیں جو صاحب قدرت وسطوت ہو اور اس کے ارادے کے سامنے کھڑا ہونے کی کسی میں ہمت نہ ہو۔

"کبیر" بھی پروردگار عالم کی عظمت علم وقدرت کی طرف اشارہ ہے۔ ان صفات کا حامل مالک اپنے بندوں کی مدد پر پوری طرح قادر کرتا ہے اور دشمنوں کو نیست ونابود کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے بندوں کو اس کے وعدے پر مطمئن رہنا چاہیئے۔

---

[1] تفسیر "المیزان" میں ہے کہ حق کا اطلاق اللہ پر اور باطل اس کے غیر پر یا اس وجہ سے ہے کہ وہ "حق" جو کسی طرح سے بھی باطل کے ساتھ مخلوط نہیں اللہ ہی ہے یا اس وجہ سے ہے کہ وہ "حق" جو اپنی ذات میں "قائم" اور خود مختار ہے، وہ اللہ ہی ہے اور دوسرے اس کے ساتھ رابطے کی وجہ سے برحق کہلاتے ہیں۔

Marfat.com

۶۳- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ
خَبِيْرٌ ○

۶۴- لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○

۶۵- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي
الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ
بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى
الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ
لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

۶۶- وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ
يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ○

ترجمہ

۶۳- کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے بارش
برسائی اور زمین (اس کی وجہ سے) سرسبز و شاداب ہوگئی
اور اللہ لطیف و خبیر ہے۔

Marfat.com

۶۴۔ آسمانوں اور زمین کا سب کچھ اسی کا ہے اور اللہ بے نیاز ہے۔ اور ہر ستائش کے لائق ہے۔

۶۵۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ زمین میں جو کچھ ہے۔ اللہ نے تمھارے لیے مسخر کیا ہے اور اسی کے حکم سے سمندروں میں کشتیاں اور بحری جہاز چلتے ہیں۔ وہ آسمان (اجرام فلکی اور آسمانی پتھروں) کو روکے ہوئے ہے۔ مگر یہ کہ اسی کا حکم ہو اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶۶۔ وہ وہی ہے، جس نے تمھیں زندگی دی پھر موت دے گا۔ پھر زندہ کرے گا۔ مگر یہ انسان کفرانِ نعمت کرنے والا اور ناشکرا ہے۔

تفسیر

کائنات میں اللہ کی نشانیاں

گذشتہ آیتوں میں اللہ کی لامتناہی طاقت اور اس کی حقانیت مطلقہ کا ذکر تھا۔ زیرِ بحث آیتوں میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس کی طاقت اور اختیار کی مختلف علامتوں کا ذکر کیا جارہا ہے، ارشاد ہوتا ہے، کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ اور اس سے خشک اور مردہ زمین کو سرسبز و شاداب کیا۔ (الم تر انّ اللہ انزل من السمآء مآء فتصبح الارض مخضرۃ)۔ یعنی وہ زمین جس سے زندگی کے آثار معدوم ہوگئے تھے، چٹیل سیاہ، اور کریہۃ المنتظر ہوگئی تھی۔ وہ بارش کے حیات بخش قطروں سے زرخیز ہوگئی۔ اس میں زندگی عود کر آئی اور لہلہانے لگی۔ بے شک اتنی آسانی سے زندگی کو وجود میں لانے والا اللہ لطیف و خبیر ہے۔ (انّ اللہ لطیفٌ خبیر)۔

Marfat.com

"لطیف" "لطف" کے مادہ سے نہایت عمدہ اور باریک کام کو کہتے ہیں۔ اللہ کی خاص رحمتوں کو بھی "لطف" اس کی عمدگی اور باریکی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

"خبیر" اسے کہتے ہیں جو گہرے اور باریک مسائل سے آگاہ ہو۔

اللہ کا "لطیف" ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ منوں مٹی میں دبے ہوئے ننھے ننھے نباتاتی بیجوں کی نشو ونما کرے قانونِ کشش ثقل کے برعکس ان کو گہری تاریک مٹی سے نہایت باریک بینی اور لطف سے اوپر مٹی کی سطح کی طرف بھیجے۔ اور سورج کی گرم اور روشن شعاعوں، ہوا کے جھونکوں کے سامنے پھیلائے اور یوں آخر کار ایک بار آور سرسبز پودے، یا تنومند درخت بنا دیے۔

اگر اللہ بارش نہ برساتا اور بیج کے ارد گرد کی مٹی نرم اور ملائم نہ ہو جاتی۔ تو وہ ہرگز نشو ونما نہ پاتا، مگر اس نے بارش کے ذریعے سخت زمین کو نرم و لطیف بنایا تاکہ کمزور اور نازک بیج کی پرورش کی تمام ضروریات مہیا ہو سکیں اور وہ مٹی کی تہوں میں بیج کی ضروریات سے لے کر شگوفے کی صورت میں زمین سے نکلنے تک ہر مرحلے سے مکمل باخبر ہے۔ اللہ کے "لطیف" ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ بارش برسائے مگر "خبیر" ہونے کا تقاضا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ایسا کرے۔ یعنی اگر بارش زیادہ برسے تو سیلاب کا عذاب بن جائے اور اگر کم برسے تو خشک سالی کا وبال۔ یہ ہے اس کے لطیف خبیر ہونے کا مفہوم سورۂ مومنون آیت نمبر ۱۸ میں ہے۔

" وانزلنا من السماء ماء بقدر فاسکناہ فی الارض ۔"

ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے مطابق پانی نازل کیا پھر اسے (حسب مصلحت) زمین میں ٹھہرائے رکھا۔

اسی کا بھی یہی مفہوم ہے۔ [1]

اپنی بے پایاں طاقت اور اختیار کی دوسری علامت بیان کرتے ہوئے اللہ ارشاد فرماتا ہے:

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کا تو ہے (لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض)۔ سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ اس وجہ سے سب پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ اس کائنات میں وہی اکیلا، بے نیاز و تونگر ہے۔ اور ہر طرح کی تعریف و ستائش کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے۔ (وان اللہ لھو الغنی الحمید)۔

"غنی" اور "حمید" کی دو صفات بہت مربوط طریقے سے استعمال کی گئی ہیں۔ کیونکہ۔

(ا) بہت سے لوگ متمول اور مالدار ہیں، مگر کنجوس، استحصالی ذہن کے مالک، دولت کو اپنے تک محدود رکھنے والے اور متکبر اور اپنی عیش و عشرت میں مست ہیں۔ چنانچہ کسی کا غنی ہونا گویا مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہونا بھی ہے مگر اللہ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے بندوں کے لیے صاحب لطف و عنایت، فیاض، فیض رساں اور سخی و جواد بھی ہے، جو اسے حمد و ستائش کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

(ب) امیر لوگوں کی دولت و ثروت ظاہری ہے۔ اگر وہ ساتھ ساتھ سخی بھی ہوں تو بھی وہ اپنا مال و دولت تو کسی کو نہیں دیتے

---

[1] اسی تفسیر کی جلد نمبر ۵ میں سورۂ انعام آیت نمبر ۱۰۳ کی تفسیر کے ذیل میں اللہ کے "لطیف" ہونے کے بارے میں بڑی قابل توجہ بحث کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

کیونکہ یہ درحقیقت تمام ثروت اور مال اللہ کا دیا ہوا ہے اور چونکہ اصلی اور ذاتی طور پر صاحب ثروت و دولت صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ لہٰذا حمد و ثناء کا مستحق بھی دراصل وہی ہے۔

(ج) امیر اور دولت مند لوگ اگر کوئی کام کرتے ہیں تو اس کی منفعت عام طور پر انہی کے حاصل ہوتی ہے۔ یہ صرف اللہ ہی ہے کہ جو بے حساب دیتا ہے اور کسی قسم کا نفع خود اسے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا جود و سخا اس کے بندوں کے لیے ہے۔ اسی سبب سے وہی سب سے زیادہ تعریف اور حمد و ثنا کے لائق ہے۔

اس کے بعد اپنی لامتناہی طاقت سے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کرنے کے بارے میں ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا اللہ نے زمین کی ہر ایک چیز تمہارے زیر تسلط قرار دی ہے اور تمام قدرتی وسائل طرح طرح کی نعمتیں اور چیزیں، سب کی سب تمہارے اختیار میں دے دی گئی ہیں۔ تاکہ جس طرح چاہو ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ (الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض)۔ اس طرح اللہ کے حکم سے سمندروں میں چلنے والے اور پانی کا سینہ چیر کر سوئے منزل بڑھنے والے جہاز بھی زیر تسلط قرار دیئے گئے ہیں۔ (والفلک التی تجری فی البحر بامرہ) علاوہ ازیں" اللہ آسمان کو اس کی جگہ پر روکے ہوئے ہے اور اس کی بلا اجازت زمین پر نہیں گر سکتا۔"

(ویمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ) ایک طرف قوت دافعہ و جاذبہ مدار کے باقاعدہ متوازن نظام کے تحت CENTRIPETAL اور CENTRIFUGAL FORCES اجرام فلکی کو اپنے اپنے مدار پر رہنے اور ایک دوسرے سے نہ ٹکرانے کا پابند کر رکھا ہے۔ دوسری طرف زمین کے گرد ہوا کا اس طرح غلاف لپیٹ رکھا ہے تاکہ فضا میں منتشر پتھر زمین سے ٹکرا نہ سکیں اور اہل زمین کے لیے تکلیف اور پریشانی کا سبب نہ بنیں۔

بے شک اپنے بندوں پر یہ اس کی رحمت، لطف اور کرم ہے کہ یوں زمین کو ہر قسم کے خطرات سے خالی امن کا گہوارہ بنا دیا تاکہ وہ انسان کے لیے پرسکون اور آسائشوں کا مرکز بنی رہے۔ نہ پتھر اس سے ٹکرائیں اور نہ کوئی آسمانی کرّہ۔ چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ بے شک اللہ بندوں پر بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ (ان اللہ بالناس لرؤف رحیم)۔

زیر بحث آخری آیت میں اللہ کے بے پایاں اختیار کے حوالے سے زمین پر اہم ترین مسئلے یعنی "موت و حیات" کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی (تم بے جان مٹی تھے، تم میں حیات کی روح پھونکی) (وھو الذی احیاکم)۔ پھر زمانہ حیات کے بعد تمہیں موت دیتا ہے۔ (اور جس مٹی سے تم اٹھے تھے واپس اسی میں چلے جاؤ گے)، (ثم یمیتکم) پھر روز قیامت ایک نئی زندگی ملے گی (مردہ مٹی سے نکلو گے اور حساب اور جزاء و سزا کے لیے آؤ گے) (ثم یحییکم) زمین و آسمان میں اللہ نے یہ تمام نعمتیں انسان کے لیے مخصوص کی ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان بہت ناشکرا ہے۔ واضح اور کھلی نشانیاں کے باوجود اللہ کے وجود کا انکاری ہے۔ (ان الانسان لکفور)۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ **پروردگارِ عالم کی خاص صفات** مندرجہ بالا آیتوں اور اس سے پہلے کی دو آیتوں میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ اللہ کی چودہ مختلف صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر آیت کے آخر میں دو صفات کا ذکر ہے۔

(۱) علیم و حلیم (۲) عفو و غفور (۳) سمیع و بصیر (۴) علی و کبیر
(۵) لطیف و خبیر (۶) غنی و حمید (۷) رؤف رحیم

ان میں ایک صفت دوسری کی تکمیل کرتی ہے۔ عفو، غفران کے ساتھ، سمیع بصیر ہونے کے ساتھ ساتھ رفعت و بلندی بڑائی کے ساتھ، لطیف ہونا مکمل اطلاع اور آگاہی کے ساتھ ساتھ بے نیازی قابلِ ستائش ہونے کے ساتھ اور رؤف ہونا رحیم ہونے کے ساتھ۔ یہ سب صفات ایک دوسری سے ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ علاوہ ازیں ہر صفت اس مفہوم سے متعلق ہے، جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ لہٰذا اعادہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۲۔ **ان آیتوں کا ایک استدلالی پہلو** جس طرح مندرجہ بالا آیتیں اللہ کی قدرت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اور اپنے باایمان بندوں کے لیے اللہ کی مدد پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کی ذاتِ اقدس کی حقانیت پر بھی دال ہیں۔ نیز توحید، معاد اور قیامت کا بھی ثبوت ہیں۔ بارش کے اثر سے مردہ زمینوں کا سرسبز و شاداب ہو جانا، اسی طرح انسان کی پہلی حیات و موت کا تذکرہ اس کی قدرت کا بین ثبوت ہے کہ وہ انسان کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے، قرآن مجید کی اور بہت سی آیتیں انہی امور کے ذریعے مسئلہ معاد و قیامت پر استدلال کرتی ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بیان ہو جائے کہ "ان الانسان لکفور" میں لفظ "کفور" مبالغے کا صیغہ ہے اور انسان کی بڑھتی ہوئی ہٹ دھرمی اور کفر و ضلالت پر دلالت کرتا ہے، یعنی انسان اس قدر ناشکرا اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان تمام آیات عظمت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود راہِ انکار اختیار کرتا ہے۔ یا یہ اس قسم کے افراد کے ناشکرے ہونے کی طرف اشارہ ہے، جو سرتاپا اس کی نعمتوں سے سرشار ہونے کے باوجود نہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ اس کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ **کائنات کا انسان کیلئے مسخر ہونا** ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ کائنات کے انسان کے لیے مسخر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات انسان کی خدمت گزار ہے۔ اور اس کے مفاد کے لیے ہے (سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۲ تا نمبر ۱۴ کی تفسیر کے ذیل میں اسی تفسیر کی جلد نمبر ۱۱ اور جلد نمبر ۱۰ میں سورۂ رعد آیت نمبر ۲ کی تفسیر کے ذیل میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

دُنیا کی بے شمار نشانیوں اور نعمتوں میں سے سمندر میں چلنے والے جہاز کا خاص طور سے اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ ماضی

Marfat.com

میں اور موجودہ زمانے میں انسانوں کے روابط اور میل جول اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حمل کا بہترین ذریعہ یہی بحری جہاز اور کشتیاں ہیں۔ ان کے علاوہ حمل و نقل کا کوئی اور ذریعہ زیادہ رواج نہیں پا سکا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر ایک دن سمندر میں چلنے والے تمام کے تمام جہاز روک دیئے جائیں تو انسانی زندگی معطل ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ انسانی ضرورت کی تمام اجناس کی نقل و حرکت بری راستے سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی بری راستے اتنے مفید سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً آج ہمارے دور میں جبکہ صنعت و حرفت کی شہ رگ تیل ہے۔ اور تیل کی نقل و حرکت کے لیے اہم ترین ذریعہ یہی بحری جہاز ہیں۔ اس طرح بحری جہازوں کی اہمیت کتنے گنا بڑھ جاتی ہے۔ جتنا تیل ایک بڑے تیل بردار جہاز کے ذریعے لے جایا سکتا ہے۔ اتنا تیل دس ہزار ٹرک بھی نہیں لے جا سکتے اور پائپ لائنوں کے ذریعے بھی ایک محدود علاقوں میں ہی منتقل کیا جا سکتی ہے۔

Marfat.com

۶۷۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ
فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ
اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝

۶۸۔ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

۶۹۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا
كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

۷۰۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

ترجمہ

۶۷۔ ہر اُمت کے لیے ہم نے ایک عبادت مقرر کی ہے تاکہ وہ (اللہ کے حضور) عبادت کریں۔ پس انھیں تیرے ساتھ اس سلسلے میں ہرگز جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ تو اپنے پالنے کی طرف دعوت دے۔ کیونکہ تو یقیناً ہدایتِ مستقیم پر ہے (سیدھا اور صحیح راستہ یہی ہے، جس پر تو گامزن ہے)

۶۸۔ پھر بھی وہ تیرے ساتھ جھگڑنے لگیں، تو کہہ دے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

۶۹۔ روزِ قیامت اللہ تمہارے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا۔

Marfat.com

۷۰۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کا سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب کچھ (اللہ کے لا متناہی علم کی کتاب میں لکھا ہوا ہے اور خدا کے لیے یہ آسان سی بات ہے

تفسیر

ہر اُمت کے لیے ایک عبادت مقرر ہے

ہماری گذشتہ بحثیں مشرکین کے بارے میں تھیں۔ مشرکین مکہ علی الخصوص اور دوسرے اسلام مخالف عناصر علی العموم پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ جھگڑتے رہتے تھے اور پرانے احکامات کی تنسیخ اور نئی شریعت کے نفاذ کو اسلام کی کمزوری خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ تبدیلیاں کسی کمزوری کی دلیل نہ تھیں، بلکہ ارتقاء و تکامل ادیان کے پروگرام کا ایک حصّہ تھیں، چنانچہ زیرِ بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ہر ایک اُمت کے لیے ایک عبادت مخصوص کردی ہے۔ تاکہ وہ اسی طرح اپنے رب کی عبادت کرے۔ (لکل امة جعلنا منسکًا هم ناسکوه)[1]

"مناسك" "منسك" کی جمع ہے۔ اور جیساکہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ "منسك" کا مطلب "عبادت" ہے۔ ہوسکتا ہے، یہاں پر یہ لفظ، مختلف دینی ضابطوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ سابقہ امتیں اپنے لیے ایک مخصوص شریعت رکھتی تھیں، جو مخصوص حالات مختلف زمان و مکان اور دیگر جہات کے لحاظ سے ان کے لیے مکمل "ضابطۂ حیات" تھیں۔ مگر ان مخصوص حالات کے بدل جانے کی صورت میں ضروری تھا کہ وہ ضابطہ بھی بدلا جائے۔ اور نئے احکام اس کی جگہ لے لیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اس وجہ سے ان کو آپ کے خلاف نہیں اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ (فلا ینازعنك في الامر)۔ آپ اپنے پالنے والے کی طرف دعوت دیجئے، کیونکہ سیدھا راستہ یہی ہے، جس پر آپ گامزن ہیں۔

(وادع الی ربك انك لعلی هدی مستقیم) یعنی ان کے بے سروپا اعتراضات اور لغو باتیں آپ کو ذرّہ بھر بھی متاثر نہ کر پائیں، کیونکہ آپ تو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور آپ راہ راست پر ہیں۔ "هدی"[1]

---

[1] بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت مشرکین کے اس سوال کا جواب ہے کہ تم ذبح کرکے گوشت کھا لیتے ہو۔ جبکہ مردہ کا نہیں کھاتے ہو۔ یعنی اپنے مارے ہوئے کو کھاتے ہو۔ مگر خدا کے مارے ہوئے کو نہیں؟ مگر یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ زیرِ بحث آیت میں ہر طرح کے مفہوم کی گنجائش ہے نہ کہ صرف مسئلہ ذبح کی۔ مزید براں، مردار کا گوشت کھانا کسی شریعت میں بھی جائز نہیں تھا۔ اس کے بارے میں قرآن مجید کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہر ایک اُمت کا ذبح کے بارے میں الگ طریقہ تھا۔

Marfat.com

کی صفت "مستقیم" بیان کی گئی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تاکید وتشدید کا اظہار ہو یا یہ بیان مقصود ہو کہ کس منزل کی طرف کئی راستے راہنمائی کر سکتے ہیں۔ نزدیک، دور، ٹیڑھا اور سیدھا، لیکن اللہ کی طرف سے جو راستہ مقرر ہوگا۔ وہ نزدیک ترین اور سیدھا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مخالفت جاری رکھیں اور آپ کی ہدایت سے اثر قبول نہ کریں تو ان سے کہہ دیں کہ اللہ ان کی حرکات سے زیادہ مطلع ہے۔

(وان جادلوک فقل اللہ اعلم بما تعملون)۔ "اللہ تمہارے اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔ (فردائے قیامت، جو اللہ کی طرف بازگشت کا دن ہے اور اتحاد و یکانگت کا دن ہے اور تمام اختلافات مٹ جانے کا دن ہے۔ تم سب پر حقائق واضح کر دے گا۔ (اللہ یحکم بینکم یوم القیامة فیما کنتم فیہ تختلفون) [1]

چونکہ قیامت کے دن بندوں کے گھر اختلافات کو ختم کرنا اور ان کا ٹھیک فیصلہ کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو ذات یہ مرحلہ طے کرے۔ وہ لازمی طور پر بے پناہ علم کی حامل ہو۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے: کیا آپ کو علم نہیں، کہ زمین و آسمان میں ہر چیز سے اللہ واقف ہے" (الم تعلم ان اللہ یعلم ما فی السماء والارض)۔ بے شک یہ سب علوم واشیاء ایک کتاب میں موجود ہیں۔ (ان ذالک فی کتاب)

اللہ علیم وحکیم کے لامتناہی علم کی ڈائری اور کتابِ عالم ہست و بود اور کائناتِ اثر و مؤثر کی کتاب ہے، جس میں سے کچھ ناپید نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ اس میں تغیر وتبدل اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے گلے سے نکلی ہوئی کمزور آواز بھی جو ہزاروں سال پہلے اس کائنات میں وجود میں آئی تھی، فنا نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی فضا میں موجود رہے گی۔ یہ بہت جامع اور مفصل کتاب ہے جس میں ہر ایک چیز لکھی ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ سب کچھ لوحِ محفوظ یعنی "علم الٰہی کی تختی" میں درج ہے اور تمام موجودات اپنی تمام تر تفاصیل کے ساتھ اس کے نزدیک حاضر ہیں اس لیے آیت کے آخری جملے میں ارشاد ہوتا ہے: اللہ کے لیے سب کچھ بہت آسان ہے، کیونکہ تمام موجودات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے ہیں۔ (ان ذالک علی اللہ یسیر)۔

---

[1] ممکن ہے اس آیت کے مخاطب رسولِ اسلام اور مخالفینِ اسلام دونوں ہوں، اس بنا پر (اللہ یحکم بینکم .....) کا جملہ قول پیغمبر اکرمؐ ہوگا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آیت کے مخاطب مسلمان اور کفار ہوں، اس صورت میں یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک مستقل بیان ہوگی۔

Marfat.com

۷۱۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ
سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ نَّصِيْرٍ ۝
۷۲۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ
وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ
يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ
اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝
۷۳۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ
اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ
يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ
الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ
الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝
۷۴۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ
عَزِيْزٌ ۝

ترجمہ

۷۱۔ اللہ کو چھوڑ کر وہ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جن کی عبادت

Marfat.com

کے لیے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور نہ ہی ان کو، اپنے خودساختہ معبودوں کے بارے میں کوئی معلومات ہیں اور گناہگاروں کے لیے کوئی مددگار اور رہبر نہیں۔

۷۲۔ جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو تُو کفار کے چہروں پر انکار کے تیور ملاحظہ کرتا ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ وہ جلد ہی ان پر مکوں سے حملہ شروع کردیں جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔ ان سے کہہ دے کہ کیا تمھیں اس سے بھی بدتر چیز کی خبر دوں، یعنی بھسم کر دینے والی (جہنم کی) آگ جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

۷۳۔ اے لوگو! ایک مثال غور سے سُنو! اللہ کو چھوڑ کر تم جنہیں پکارتے ہو وہ سب مل کر بھی ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو واپس نہیں لے سکتے، طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔

۷۴۔ جس طرح پہچاننے کا حق تھا انہوں نے اللہ کو ہرگز نہیں پہچانا، بیشک اللہ طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔

Marfat.com

تفسیر

مکھی سے بھی کمزور معبود

گذشتہ آیتوں میں شرک اور توحید سے متعلق گفت گو کے لحاظ سے زیر بحث آیت میں دوبارہ مشرکین اور ان کی غلط کاریوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ چونکہ شرک اور بُت پرستی کے بطلان کا واضح ثبوت یہ ہے کہ عقلی اور نقلی کوئی دلیل اس قبیح عمل کا جواز مہیا نہیں کرتی۔ لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا جا رہا ہے: اللہ کو چھوڑ کر جن کی وہ پرستش کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (ویعبدون من دون اللہ مالم ینزل بہ سلطانا)۔

دراصل یہ آیت بُت پرستوں کے اس عقیدے کو باطل کر رہی ہے، جس کے تحت وہ کہا کرتے تھے کہ بُت اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شفیع ہیں اور ہم اس کی اجازت سے ہی ان کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے وہ ایسوں کی عبادت کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں انھیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ (وما لیس لھم بہ علم۔)۔ یعنی اپنے اس فعل سے متعلق وہ نہ تنزل من اللہ کوئی دلیل رکھتے ہیں اور نہ ہی فہم عامہ سے کوئی جواز پیش کر سکتے ہیں۔

واضح سی بات ہے کہ جس شخص کے پاس اپنے عقیدے اور اعمال کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو۔ وہ بڑی حماقت کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے اپنے آپ پر بھی زیادتی کی اور دوسروں پر بھی اور جب وہ گرفتارِ عذاب وعقاب الٰہی ہوگا تو کوئی بھی اس کی حمایت ودفاع کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اس حقیقت کو آیت کا آخری حصہ واضح کر رہا ہے: ستمگروں کا کوئی یار و مددگار نہیں (وما للظالمین من نصیر)۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں "نصیر" کا مطلب دلیل و بُرہان لیا ہے۔ کیونکہ دلیل ومنطق ہی حقیقی مددگار چیزیں ہیں۔[1]

یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "نصیر" سے مراد رہبر و راہنما ہے اور اب تک کی بحث کا نتیجہ بھی یہی ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ ان باطل عقیدہ رکھنے والوں کے پاس نہ خدا کی طرف سے کوئی دلیل ہے اور نہ ہی عقل ومنطق کی برہان کہ جس تک وہ خود پہنچے ہوں اور نہ کوئی ایسا رہبر و رہنما انہیں میسر ہے جو زندگی کے پُرپیچ راستوں میں ان کی راہبری کر سکے وہ بڑے ظالم ہیں کہ حق کے مطیع نہ ہوئے۔ مندرجہ بالا تین مختلف مفاہیم ایک دوسرے سے منافی نہیں ہیں۔ اگرچہ پہلا مفہوم زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کے احکامات سننے کے بعد بت پرستوں کے شدید منفی ردِعمل، ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی

---

[1] تفسیر المیزان اور کبیر زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

Marfat.com

کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"جب ہمارے واضح احکامات (جن کی عقلی و منطقی صحت بڑی واضح ہے) جن سے فائدہ اٹھانا عقل سلیم رکھنے والے ہر فرد کے لیے آسان ہے، ان کے سامنے بیان کیے جاتے ہیں، تو کفار کے چہروں پر انکار و تنفر کے آثار ملاحظہ کرتا ہے (و اذا تتلی علیھم ایاتنا تعرف فی وجوہ الذین کفروا المنکر)[1]

حقیقت کہ جب یہ صاف ستھرے اور منطقی احکامات بیان کیے جاتے ہیں۔ تو اسے اپنے جاہلانہ اور باطل عقائد متضاد نظر آتے ہیں، چونکہ وہ سچائی اور صداقت کو قبول نہیں کرتے اس لیے غیر اختیاری طور پر نفرت و ناپسندیدگی کے آثار ان کے چہروں سے عیاں ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں بلکہ تعصب، ہٹ دھرمی اور ضد کی شدت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ وہ جلد ہی احکامات کو غور سے سننے والوں سے ہاتھا پائی اور دھینگا مشتی پر اتر آئیں (یکادون یسطون بالذین یتلون علیھم ایاتنا)۔

"یسطون" "سطوت" کے مادہ سے ہے اور آستینیں چڑھا کر ہاتھ اٹھا کر مدمقابل پر حملہ آور ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ بقول راغب کے جب گھوڑا پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں اٹھاتا ہے، اسے 'سطوت' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا مفہوم بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان عقل و منطق سے غور کرے تو اپنے مخالف کی دلیل سے نہ چہرے کے تاثرات میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہے اور نہ ہی مکّہ لہرانے کی بلکہ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہے۔ کفار کا غلط ردِ عمل ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ کسی دلیل و منطق کو سننے پر تیار نہیں۔ بلکہ جہالت ہٹ دھرمی اور طاقت و تشدد کے قائل ہیں۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ "یکادون یسطون" فعل مضارع ہے اور کفار کی مذکورہ بالا کیفیت کے استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی اگر وہ مار پیٹ کا موقع پاتے تو ضرور مارتے اور اگر موقع نہ پاتے تو مار پیٹ کے لیے تیار ضرور رہتے۔ ہماری زبان میں وہ اکثر دانت پیستے ہی رہتے ہوں گے کہ وہ مار پیٹ پر قادر نہیں ہیں۔ ایسے احمقوں کے مقابلے میں رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے کہہ دے کہ اس سے بدتر چیز کی تم کو خبر دوں! جہنم کی بھسم کر دینے والی آگ اس سے کہیں تکلیف دہ ہے (قل افانبئکم بشر من ذٰلکم النار)[2] یعنی اگر اللہ کی واضح اور کھلی ہوئی آیتیں تمھیں بری معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ تمھارے منفی اور ناگل بجو نظریات کے برعکس

---

[1] "منکر" مصدر میمی ہے۔ "انکار اور ناپسندیدہ افعال کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے یہاں اس کے آثار مراد ہیں۔ جو چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔

[2] اس جملے میں "النار" مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہے ھی النّار (وہ آگ ہے) بعض مفسرین کے خیال میں خود "النار" مبتدا ہے اور جملہ (وعدھا اللہ . . . .) اس کی خبر لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ نیز اسی جملے میں "وَعَدَ" کے دو مفعول ہیں۔ پہلا الذین کفروا اور دوسرا ھا کا مقدم ہونا شاید مخصوص ہونے کو واضح کرنے کے لیے ہے۔)

Marfat.com

ہیں تو کہیں زیادہ بُری چیز کی تم کو خبر دے دوں اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے تیار کیا ہوا اذیت ناک عذاب اور سزا ہے۔ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کا آخری ٹھکانا ہے۔ "بھسم کر دینے والی وہی آگ، جس کا اللہ نے کفار سے وعدہ کر رکھا ہے" (وعدھا اللہ الذین کفروا)۔ اور یہ آگ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے (وبئس المصیر)

حقیقت یہ ہے کہ ان بدخو اور تندمزاج مخالفین کہ جن کے دلوں میں ہمیشہ تعصب اور ہٹ دھرمی کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں، کا بدلہ جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ ہمیشہ اللہ کی طرف سے دی جانے والی سزا گناہ کے تناسب ہوا کرتی ہے۔

اس کے بعد بتوں اور خود ساختہ معبودوں کی کیفیت، کمزوری اور ناتوانی کا دلچسپ اور حسب حال خاکہ بیان کیا گیا اور مشرکین کے نظریات کو بڑے واضح انداز میں باطل ثابت کیا گیا ہے

عوام الناس سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ اے لوگو! بیان کی جانے والی ایک مثال توجہ سے سنو۔ (اس پر غور و خوض کرو۔)

(یا ایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ)۔ اللہ کو چھوڑ کر جن کو بطور خدا پکارتے ہو۔ وہ تو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ سب کے سب مل کر اس کے لیے اجتماعی کوششیں کریں۔ (ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابًا ولو اجتمعوا لہ)۔ تمام بت اور دیگر معبود، سب دانشور صاحبان فکر و نظر اور بنی نوع انسان کے تمام کے تمام صنعت کار اور موجد اگر مل کر بھی کوشش کریں تو ایک مکھی تک پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایسے ہیں وہ کس بنا پر ان نااہل چیزوں کو اس پروردگار عالم کا ہم پلہ قرار دے سکتے ہیں۔ جو زمین و آسمان پر ہزار ہا ذی رُوح موجودات، دریاؤں، ریگستانوں، جنگلوں، زیر زمین اور زیر آب خزانوں کا بنانے والا اور پیدا کرنے والا ہے وہ اللہ جو زندگی کو مختلف شکلوں اور طرح طرح کی صورتوں میں پیش کرنے والا ہے، جس کی قدرت کاملہ کے حیرت انگیز اور عجیب و غریب مظاہر انسان کو اس کی تحسین و آفرین اور حمد و ستائش کرنے پر بے اختیار مجبور کرتے ہیں۔ یہ کمزور و نااہل معبود کہاں اور وہ قادر حکیم مطلق کہاں۔

تاکید مزید کے طور پر اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ بناوٹی معبود مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ خالق و معبود حقیقی کی پیدا کی ہوئی ایک مکھی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایک مکھی ان سے کچھ چھین لے تو یہ واپس تک لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (و ان یسلبھم الذباب شیئًا لا یستنقذوہ منہ)۔

ایسا کمزور اور بے بس موجود جو ایک مکھی کے مقابلے میں شکست کھا جائے، کیا یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہم اسے اپنی تقدیر کا مالک اور حلال مشکلات سمجھ سکیں؟ بلاشک و شبہ ایسے معبود ان کی عبادت کرنے والے اور خود یہ معبود دونوں ہی ضعیف و بے بس ہیں۔ (ضعف الطالب والمطلوب)۔

روایات میں ہے کہ بت پرست قریش ان بتوں پر جو انہوں نے خانہ کعبہ کے گرد و نواح میں جمع کر رکھے تھے، شہد مشک عنبر اور زعفران چھڑکتے اور طواف کرتے ہوئے۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لاشریک لک، الا شریک ھو لک تملکہ وما

Marfat.com

ملک کا غلغلہ کرتے ۔ یہ خرافات توحید پرستوں کی لبیک کی واضح تحریف اور ان کے شرک کی واضح دلیل تھی جو ان پست و حقیر چیزوں کو خالق کون و مکان کا شریک سمجھتے تھے، لیکن ان بتوں پر مکھیاں بھنبھناتیں اور شہد و زعفران اور مشک و عنبر اڑا لے جاتیں اور یہ بُت مکھیوں کو روک نہ سکتے تھے۔ قرآن مجید اس منظر کو بتوں کی بے بسی اور مشرکین کی کمزور منطق کے بیان کے لیے بطور ایک مثال ذکر کرتا ہے۔ گویا کہ چیلنج کر رہا ہے کہ اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ وہ چیزیں جن کو تم اپنے معبُود اور مشکل کشا سمجھتے ہو کس طرح ہماری پیدا کردہ ایک مکھی کے سامنے بے بس ہیں اور اس حقیر مخلوق کے مقابلے میں بھی اپنا دفاع نہیں کر رہا ہے۔ یہ کس قدر پست و حقیر معبُود ہیں۔ "طالب و مطلوب" سے وہی مراد ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی "طالب" بتوں کو پوجنے والے اور "مطلوب" خود بت، دونوں ہی کمزور و بے بس ہیں۔

بعض مفسرین نے "طالب" سے مکھی مراد لی ہے اور "مطلوب" سے بُت کیونکہ مکھیاں بتوں پر لگی ہوئی خوراک کھانے ان پر بیٹھتی ہیں۔

بعض دیگر مفسرین نے "طالب" سے بت مراد لیے ہیں اور "مطلوب" سے مکھی، کیونکہ بالفرض بُت مکھی جیسی حقیر شے بھی پیدا کرنا چاہیں تو بھی نہ کر سکیں گے، لیکن پہلا مفہوم زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا مثال دینے کے بعد قرآن مجید نتیجۃً یہ کہہ رہا ہے: جس طرح اللہ کو پہچاننے کا حق تھا انہوں نے نہیں پہچانا (ما قدروا اللہ حق قدرہ)۔ اللہ کی معرفت کے بارے میں وہ اس قدر پیچھے ہیں کہ اس باعظمت و جلالت خدا کو اتنا پست کر دیا کہ اتنی بے وقعت چیزوں کو اس کا شریک گردانا۔ اللہ کی اگر تھوڑی سی بھی معرفت رکھتے تو اس بے حیثیت جوڑ پر شرمندہ ہوتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی طاقت و سطوت کا اظہار کرتے ہُوئے ارشاد فرماتا ہے: اور اللہ طاقتور اور صاحب سطوت ہے (ان اللہ لقوی عزیز)۔ اور ہرگز ان جھوٹے اور بے بس خداؤں کی طرح نہیں ہے جو ایک حقیر سا جانور پیدا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور نہ مکھی سے مقابلے کی تاب رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اس پورے عالم میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جو اس کے سامنے ٹھہر سکے۔

چند اہم نکات

۱۔ بتوں کی ناتوانی کی ایک واضح مثال

اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیتوں میں "مثال" کے بارے میں گفتگو ضرور ہے۔ مگر خود مثال کو بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن مجید کے دیگر مطالب کا ذکر کیا گیا ہے یا یہاں "مثال" صرف بمعنیٰ ثبوت یا اصل مطلب یا ایک حیرت انگیز چیز کے معنیٰ میں استعمال کی گئی ہے نہ کہ اپنے معمول کے معنیٰ میں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے ان آیتوں میں "مثال" کے تحت جس چیز کو پیش کیا ہے اور جس پر غور و خوض کی عمومی دعوت دی ہے وہ "مکھی" ہی تو ہے، جسے کمزور مخلوق مگر خوراک چھیننے والی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ مثال مشرکین عرب کے مقابلے میں پیش کی گئی ہے۔ مگر آیت مجیدہ کے عمومی خطاب (یا ایھا الناس) کو مدنظر رکھتے ہُوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لکڑی اور پتھروں کے بتوں تک

Marfat.com

ہی محدود نہیں بلکہ ان تمام معبودوں کے مقابلے میں ہے۔ جن کی اللہ کے علاوہ کسی طور پر بھی پرستش کی جاتی ہے، منرود، فرعون۔ بت چھوٹی شخصیتیں اور طاقتیں وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ سب کے سب اگر اکٹھے ہو جائیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع، علوم اور ٹیکنالوجی بروئے کار لائیں اور نابغۂ روزگار سائنس دانوں کی بھرپور صلاحیتوں سے استفادہ کریں۔ لیکن پھر بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے اور یہاں تک کہ اگر مکھی ان کے دستر خوان سے کھانے کا ایک ذرہ اٹھا کرے جائے تو اس سے واپس لینے کی اہلیت نہیں رکھتے

۲- ایک سوال کا جواب

ہو سکتا ہے اس مقام پر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آج کا انسان اپنے علم اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ایسی ایسی ایجادیں کر چکا ہے جو مکھی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ ہیں۔ مثلاً تیز رفتار ذرائع آمد و رفت، خلانوردی کے ذرائع، آواز سے زیادہ تیز رفتار راکٹ اور سیارچے جو پلک جھپکنے میں زمین کے مدار سے نکل جاتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر اور روبوٹ جو ریاضی کے پیچیدہ سوال ایک لحظے میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ تو کیا مذکورہ بالا مثال ہمارے اس ترقی یافتہ انسان کے لیے بھی صادق آتی ہے؟

جواباً ہم عرض کریں گے کہ بیشک ان محیر العقول وسائل اور اشیاء کی ایجاد آج کے انسان کی غیر معمولی ترقی کی روشن دلیل ہے مگر یہ سب کچھ ایک زندہ اور بارادہ مخلوق کی خلقت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

اگر ہم فزیالوجی اور بیالوجی کی ان کتب کا بغور مطالعہ کریں، جن میں مکھی جیسے چھوٹے سے کیڑے مکوڑے کی جسمانی ساخت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہے، تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ ایک مکھی کے دماغ کی ساخت اعصاب کا جال اور نظام ہاضمہ آج کے با سائش ہوائی جہاز کی ساخت سے کہیں پیچیدہ اور اعلیٰ ہے اور کسی لحاظ سے بھی اس سے موازنہ کے لائق نہیں دراصل زندگی، زندہ موجودات کی حرکات واحساسات اور نشو و نما علی الخصوص ان کی پیدائش ابھی تک بڑے بڑے سائنسدانوں اور دانش وروں کے لیے لاینحل مسائل، معمات کی طرح ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی خلقت کے لیے کن باریکیوں اور تکنیک کی ضرورت ہوگی، کسی کو خبر نہیں ہے۔

علوم طبیعات کے ماہرین کے بقول بعض حشرات کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ جو مزید کئی سو چھوٹی آنکھوں سے مرکب ہیں۔ یعنی وہ ایک آنکھ جس کو بڑی مشکل سے دیکھا جا سکتا ہے اور شاید وہ بھی سوئی کی نوک کے حجم کے برابر ہے۔ کئی سو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرکب کو آنکھ کہتے ہیں۔ بہرحال فرض کریں اگر انسان بے جان مواد سے ایک زندہ چیز بنا لے۔ مگر کس میں یہ صلاحیت ہے کہ کئی سو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو باہم مربوط کر کے اس کے دماغ تک اس طرح لے جائے کہ وہ کچھ شاہدات دماغ کو منتقل کر سکے تو کیا وہ چیز کسی موقع پر اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کر سکتی ہے؟ اور کیا تمام قابل انسان مل کر بھی مذکورہ بالا حقیر سی مگر پیچیدہ اور پُراسرار شے بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ اگر انسان مذکورہ بالا فرض کو حقیقت بھی کر دکھائے تو کیا اسے "خلقت" کا نام دیا سکتا ہے! یا اسے صرف "ASSEMBLING" یعنی پرزوں کو جوڑنے کا نام دیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح صرف پرزوں کو جوڑ کر گاڑی تیار کرنے والے اس کے "جوڑنے والے" تو کہلا سکتے ہیں مگر موجد نہیں کہلائے جا سکتے۔

Marfat.com

٧٥۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ
النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝
٧٦۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَ
اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝
٧٧۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا
وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ۝ السجدة
٧٨۔ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ
مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ
مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا
عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا
بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ
النَّصِيْرُ ۝ ع

ترجمہ

٧٥۔ اللہ فرشتوں میں سے پیغامبر منتخب کرتا ہے اور اسی طرح انسانوں میں

Marfat.com

سے بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

۷۶۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، وہ جانتا ہے اور تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔

۷۷۔ اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ بجا لاؤ اور اپنے پالنے والی کی عبادت کرو اور نیک کام کرو تاکہ نجات پا جاؤ۔

۷۸۔ اور راہ خدا میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے اور دین میں تم پر مشقت طلب بوجھ نہیں ڈالتا۔ یہ وہی تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اس نے پہلی کتب اور اس کتاب میں تمہارا نام "مسلمان" رکھا ہے تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔ لہٰذا نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے ساتھ وابستہ رہو، کیونکہ وہی تمہارا مولا اور سرپرست ہے اور وہ کیسا اچھا مولا اور کتنا عمدہ مددگار ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کے بقول، ولید بن مغیرہ، جو مشرکین کا دماغ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اور اس جیسے بعض دیگر مشرکین پیغمبرِ اسلام کے مبعوث برسالت ہونے کے بعد حیرت سے کہا کرتے تھے۔

"ءانزل علیہ الذکر من بیننا"

"کیا ہم سب کو چھوڑ کر (ہم میں سے محمد جیسے یتیم و مفلوک الحال) پر وحی نازل ہوئی ہے

اس تعجب کا جواب بن کر زیرِ بحث پہلی آیت نازل ہوئی (اور انہیں بتایا گیا کہ انبیاء اور فرشتوں کا رسالت کے لیے انتخاب لیاقت و قابلیت اور معنوی معیار کی بنا پر ہوا کرتا ہے) [1]

---

[1] تفسیر قرطبی، ابوالفتوح رازی، فخرالدین رازی اور روح المعانی زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

Marfat.com

تفسیر

پانچ اہم اور تعمیری احکام

گذشتہ آیات توحید، شرک اور مشرکین کے خیالی اور خود ساختہ معبودوں کے بارے میں تھیں اور اس لحاظ سے کہ بعض لوگوں نے فرشتوں اور بعض انبیاء کو بھی معبود بنا لیا تھا، زیر بحث پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے آنے والے تمام پیغمبر اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے تھے۔ "اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول انتخاب کرتا ہے" (اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً ومن الناس)۔

فرشتوں میں سے رسولوں کی مثال جبرائیل امین کی ہے اور انسانوں میں سے تمام رسول اس کی مثال ہیں۔ ملائکہ کے سلسلے میں "من" کا لفظ جیسے "من تبعیض" کہتے ہیں۔ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ تمام فرشتے انسان کی طرف اس کے رسول بن کر نہیں آئے، بلکہ ان میں سے چند ایک کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے سورۂ فاطر کی پہلی آیت

"جاعل الملائکۃ رسلاً"

"اللہ نے فرشتوں کو رسول بنایا"

اس آیت کی نفی نہیں کرتی، کیونکہ وہاں جنس ملائکہ مراد ہے نہ کہ افرادِ جنس۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ (ان اللہ سمیع بصیر)۔

یعنی اللہ اپنے رسولوں کی کارکردگی سے بے خبر نہیں بلکہ لحظہ لحظہ سے مطلع ہے، ان کی بات چیت سنتا اور ان کے افعال و اعمال ملاحظہ کرتا ہے۔ اس کے بعد تبلیغ و ترویج رسالت کے سلسلے میں رسول کی ذمہ داریوں اور اللہ کی طرف سے ان کی نگرانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اللہ اُسے بھی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہے اور اُسے بھی جو اُن کے پیچھے ہے (یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم)۔ یعنی اللہ ان کے ماضی اور مستقبل اور ان کے آثار سے پوری طرح آگاہ ہے۔ "اور تمام کاموں کی انتہا اور بازگشت اللہ کی طرف ہے" اور سب اس کے سامنے ہی جواب دہ ہیں۔ (والی اللہ ترجع الامور)۔ تاکہ وہ لوگ اچھی طرح جان لیں کہ فرشتے اور پیغمبر بھی بندے ہیں۔ اللہ کے مطیع، فرمانبردار اور اس کی بارگاہ میں جواب دہ ہیں، ان کے پاس جو کچھ ہے، ان کا اپنا نہیں، بلکہ سب کچھ خدا کا دیا ہوا ہے، اور وہ ہرگز اللہ کے مقابلے میں معبود یا لائق پرستش نہیں ہیں۔ اس بنا پر (یعلم ما بین ایدیھم .....) کا جملہ دراصل انبیاء کی شرعی ذمہ داریوں بارگاہ پروردگار میں جوابدہی اور ان کے افعال و کردار پر اللہ کی طرف سے کڑی نگرانی کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح سورۂ جن کی آیت نمبر ۲۷ اور ۲۸ میں بھی کہا گیا ہے۔

Marfat.com

فلا یظھر علیٰ غیبہ احداً الا من ارتضی من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بما لدیھم،

اللہ کسی کو اپنے اسرارِ غیب نہیں بتاتا، سوائے چُنے ہُوئے پیغمبروں کے جن سے وہ راضی ہے اور ان پر ایسے نگران مقرر کرتا ہے جو ان کے آگے پیچھے رہتے ہیں۔ تاکہ پتہ چلے کہ وہ اپنے پروردگار کے احکامات پہنچاتے ہیں یا نہیں اور ان کی ہر ایک شے سے اللہ پوری طرح باخبر ہے۔ ؎۱

ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ "مابین ایدھم" سے مراد مستقبل اور "ما خلفھم" سے مراد انبیاً سے قبل کے واقعات ہیں۔

اس کے بعد سورۂ حج کی آخری دو آیات میں مومنین کے دنیوی و اُخروی، ہمہ جہتی مفاد کے ضامن بنیادی اور مجموعی احکامات بیان کرتے ہُوئے اُن سے خطاب کیا جا رہا ہے اور یوں سُورہ حج کا "حسنِ اختتام" ہوتا ہے۔ سب سے پہلے چار اہم احکامات کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا گیا ہے: اے ایمان والو! رکوع کرو۔ سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور اچھے کام کرو تاکہ کامیاب رہو۔ (یاایھا الذین اٰمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون)۔

ارکانِ نماز میں سے صرف رکوع و سجود کا ذکر ان کی اشد اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد عمومی طور پر عبودیت کا جو بلا قید حکم ہے۔ اس سے مراد اللہ کی ہر قسم کی عبادت و بندگی ہے۔ " ربکم کہہ کر اللہ کی عبادت کے لیے اہلیت ثابت کی گئی ہے اور اس کے غیر کی نا اہلیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عالم کائنات میں صرف وہی اکیلا مالک اور پالنے والا ہے" فعل الخیرات " کا حکم بھی مطلق ہے اور کسی قسم کی قید و شرط کے بغیر ہے چنانچہ اس سے ہر نیک کام مراد ہے۔ اس سلسلے میں ابن عباس کی روایت کہ اس سے مراد صلہ رحمی اور "مکارم الاخلاق ہے۔ دراصل اس کے وسیع مفہوم کا ایک تعمیری مصداق ہے۔

اس کے بعد لفظ 'جہاد' وسیع معانی میں استعمال کرتے ہُوئے پانچواں حکم دیا جاتا ہے۔ "راہ خدا میں اس قدر جہاد کرو کہ جہاد کا حق ادا ہو جائے (وجاھدوا فی اللہ حق جھادہٖ)۔ اکثر مفسرین نے اس جگہ جہاد سے مسلح جنگ مراد نہیں لیا۔ بلکہ جیسا کہ اس لفظ کے لغوی معنیٰ ہیں۔ راہ خدا میں مجموعی جدّ وجہد، کوشش اور نیک کام نیز سرکش اور احکامِ الہٰی کی باغی ہوا و ہوس کو قابو میں رکھنا، یعنی جہادِ اکبر اور ظالم و جارح دشمن کا میدانِ کارزار میں مقابلہ کرنا یعنی "جہادِ اصغر مراد لیا ہے۔

؎۱ تفسیر المیزان میں زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں جناب علامہ طباطبائیؒ "لیعلم مابین ایدیھم ....) کو مسئلہ عصمت اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں یہ بعید ہے۔

Marfat.com

"مجمع البیان" میں مرحوم جناب طبرسی بہت سے مفسرین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "حق جہاد" سے مراد خلوص نیت اور اعمال کو صرف اور صرف اللہ کے لیے انجام دینا ہے۔

بیشک "حق جہادہ" بھی عمومی اور وسیع معنے رکھتا ہے، جس میں مقدار، تعداد، کیفیت، حیثیت اور زمان و مکان سب شامل ہیں، مگر چونکہ اخلاص کی منزل جہاد بالنفس کے سلسلے میں مشکل ترین مراحل میں سے ہے، البتہ اس کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ انسان کے دل اور اعمال میں شیطانی خیالات و افکار کا عمل دخل بہت لطیف اور خفیہ انداز سے ہوتا ہے اور اللہ کے خاص بندوں کے سوا اس سے شاید ہی کوئی بچ نکلتا ہے۔

دراصل قرآن مجید نے ان پانچ احکامات کے ذیل میں آسان ترین مرحلے سے شروع کر کے مشکل ترین اور اعلیٰ ترین منزل تک راہنمائی کی ہے۔ سب سے پہلے رکوع کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اس سے برتر فعل سجدے کی بات ہے۔ پھر مجموعی عبادت اور آخر میں تمام اچھے اور نیک اعمال وکردار کا ذکر ہے جس میں عبادات و غیر عبادات سب شامل ہیں۔ اس کے بعد انفرادی، اجتماعی، ظاہری باطنی، قولی اور فعلی جدوجہد، کوشش، تگ و دو اور اخلاق وخلوص نیت کی بات کی گئی ہے

یہ ایک جامع آئین ہے کہ جس کے نتیجے میں سو فی صد کامیابی وکامرانی ہے۔ ممکن ہے، اس مقام پر یہ خیال پیدا ہو کہ کمزور بندوں کو کس طرح ان بھاری اور سنگین ذمہ داریوں اور احکامات کا حامل قرار دیا گیا ہے، جبکہ ان میں سے ہر ایک ذمہ داری دوسری سے زیادہ وسیع اور جامع ہے، اس کے بعد میں آنے والے جملوں میں مختلف پیرائے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا ذمہ داریاں بارگاہ احدیت میں مومنین کے مقام و منزلت اور عظمت و شخصیت کی علامت ہیں اور اللہ کی طرف سے مومن پر خاص لطف وکرم کا مظہر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔ "اس نے تمہارا انتخاب کر لیا ہے (ھو اجتباکم) یعنی اگر تم اللہ کے منتخب کیے ہوئے نہ ہوتے تو یہ سنگین ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر نہ ڈالی جاتیں

پھر ارشاد ہوتا ہے، اس نے ان کڑی ذمہ داریوں کی انجام دہی کو تمہارے لیے باعث زحمت و مشقت قرار نہیں دیا۔ (وما جعل علیکم فی الدین من حرج) یعنی اگر عقل سلیم سے سوچو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ذمہ داریاں کڑی اور سخت نہیں ہیں۔ بلکہ تمہاری فطرت سے ہم آہنگ اور تمہارے مزاج اور طبیعت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اصولی طور پر چونکہ تمہارے ارتقاء وتکامل کا ذریعہ ہیں۔ ان میں سے ہر ذمہ داری ایک واضح فلسفہ اور کثیر منفعت کی حامل ہے اور یہ منفعت تمہارے لیے ہی ہے۔ اس بنا پر ان کی انجام دہی تمہارے لیے قطعاً شاق اور تلخ نہیں ہے، بلکہ نہایت شیریں اور خوشگوار ہے۔ تیسری بات یہ بیان کی جا رہی ہے کہ یہ پروگرام تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔

(ملۃ ابیکم ابراھیم)۔ حضرت ابراہیم کو "باپ" کہنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔

(i) عرب اور اس وقت کے مسلمان زیادہ تر حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے تھے۔

(ii) اس وقت کے تمام لوگ حضرت ابراہیم کو اپنا بزرگ اور روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اس طرح تقریباً سبھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا صاف ستھرا مقدس دین طرح طرح کی خرافات سے آلودہ کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اسی سلسلہ میں ایک اور ارشاد ہوتا ہے، سابقہ کتب آسمانی اور اس وقت کی آسمانی کتاب (قرآن حکیم)

Marfat.com

میں اس نے تمہارا نام "مسلمان" رکھا ہے (ھو سماکم المسلمین من قبل و فی ھذا)۔ اور مسلمان وہ ہے جو تمام احکامات خداوندِ قدوس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اپنے لیے ایک بڑا اعزاز تصور کرے۔

"ھو سماکم ....." میں ضمیر "ھو" کے مرجع پر شدید اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کے خیال میں "ھو" کا مرجع "اللہ" ہے۔ یعنی خود اللہ نے سابقہ کتب اور قرآن مجید میں مسلمانوں کو اس قابلِ فخر نام سے موسوم کیا۔ بعض دوسرے مفسرین کے خیال میں "ھو" کا مرجع حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ کیونکہ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۲۸ میں مذکور ہے کہ تعمیر خانہ کعبہ کے اختتام پر حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہ اقدس الٰہی میں چند دعائیں کی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ دُعا تھی۔

"ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا اُمۃ مسلمۃ لک"

بارِ الٰہا! ہم دونوں (مجھے اور میرے بیٹے) کو اپنا مطیع رکھ اور ہماری نسل سے ایک "اُمت مسلمہ" جو تیری مطیع و فرمانبردار ہو، پیدا کردے۔

لیکن ہماری نظر میں پہلا نظریہ زیادہ صحیح ہے اور آیت کے مضمون سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ سابقہ کتب اور قرآن مجید میں مُسلمانوں کا نام رکھنے کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف دینا مناسب نہیں، بلکہ یہ نسبت اللہ ہی کی طرف مناسب ہے[1]

پانچواں اور آخری شوق آفریں نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعارف تمام امتوں کے لیے ایک نمونہ اور علامت کے طور پر کرایا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: مقصد یہ تھا کہ پیغمبر تمہارے گواہ ہیں۔ اور تم تمام لوگوں کے گواہ ہو۔ (لیکون الرسول شھیدًا علیکم وتکونوا شھدآء علی الناس)۔

"شھید" "شھود" کے مادہ سے ہے اور اس کا مطلب وہ آگاہی و باخبری ہے، جو چشم دید ہو، اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا تمام مسلمانوں پر گواہ ہونا، تمام اعمال و کردار سے باخبر ہونے کے معنیٰ میں ہے۔ یہ مفہوم ان تمام آیات و روایات جن میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں "عرض اعمال" کا ذکر ہے، کے عین مطابق ہے۔ ان روایات کے مطابق ہفتہ بھر میں ایک دن تمام امت کے تمام اعمال آپ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اور آپ کی رُوح مطہر ان سے باخبر ہوتی ہے۔ اس بنا پر آپ اُمت کے گواہ ہیں۔

یہ بات کہ امت کس طرح تمام لوگوں کی گواہ بنی؟ بعض روایات کے مطابق اس سے مراد امت کے معصوم افراد، یعنی ائمہ اطہارؑ ہیں جو لوگوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔ امام علی الرضا علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔

"نحن حجج اللہ فی خلقہ ونحن شھداء اللہ واعلامہ فی بریتہ"

---

[1] سورۃ مائدہ آیت نمبر ۳ میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کا نام اسلام رکھا ہے۔

واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا۔

متعدد آیات میں رسول اکرمؐ کو "اوّل المسلمین" فرمایا گیا ہے، جن میں سورۃ انعام آیت نمبر ۱۴ اور سورۃ زمر آیت نمبر ۱۲ بھی شامل ہیں۔

Marfat.com

"اللہ کی مخلوق اور بندوں میں ہم اس کے نمائندے گواہ اور نشانیاں ہیں"۔ [1]

دراصل لتکونوا کے ذریعے اگرچہ ظاہراً ساری اُمت سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ مگر درحقیقت امت کے سید و سردار اور بزرگ مراد ہیں۔ جزو کی بنا پر کل سے خطاب کی ہمارے سامنے بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ چند افراد سے خطاب کے لیے سب سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ آیت نمبر ۲۰ میں ارشاد ہوتا ہے

"اللہ نے تمھیں بادشاہ اور فرمانروا بنایا"۔

یہ خطاب بنی اسرائیل کو دی گئی نعمتوں کے شمار کے ذیل میں تمام اُمت سے کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس منصب کے حامل تو معدودے چند افراد تھے۔

"شہود" ایک اور معنیٰ بھی رکھتا ہے اور وہ ہے "عملی شہادت" یعنی اپنے کردار سے کسی بات کی گواہی دینا، یعنی موازنہ اور مقابلہ سنجی، کسی عمل و کردار کو دوسرے کے عمل و کردار سے موازنہ کرنا بالفاظ دیگر ایک شخص کے اعمال و کردار کا دوسروں کے لیے نمونہ ہونا۔ اس معنیٰ میں تمام سچے مسلمان شامل ہو سکتے ہیں یعنی وہ بہترین دین پر مکمل عمل پیرا ہو کر تمام لوگوں کے لیے شرافت اور کردار کی رفعت کا ایک پیمانہ بن جائیں۔ حضرت رسول اکرم سے ایک روایت ہے۔

اللہ نے مسلمانوں کو چند فضیلتیں عطا کی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ گذشتہ ادوار، جبکہ ہر اُمت کے لیے نمونہ ان کا پیغمبر ہوتا تھا، کی بجائے اللہ نے میری ساری اُمت کو مخلوق کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔ فرماتا ہے :-

لیکون الرسول شہیدًا علیکم وتکونوا شہداء علی الناس) [2]

یعنی جس طرح ہر نبی اپنی امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونہ ہوتا ہے، تم ساری دُنیا کے لیے ایک مثالی کردار اور نمونہ ہو۔ یہ مفہوم، ایک تو پہلے بیان شدہ مفہوم کے منافی نہیں اور مزید برآں ہو سکتا ہے یہ مفہوم بھی ہو کہ یوں تو تمام اُمت ہی گواہ ہے مگر آئمہ اطہارؑ ممتاز اور نمایاں گواہ اور نمونہ ہیں۔ [3]

آیت کے آخر میں مذکورہ پانچ ذمہ داریوں کو تاکیداً تین جملوں میں زیادہ مختصر پیرائے میں فرمایا جا رہا ہے: اب اگر یوں ہے اور تم اعزازات اور امتیازات کے حامل ہو تو نماز ادا کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور پروردگار عالم کی بے پایاں عنایات کے پرتو میں آئینِ اسلام سے متمسک رہو (فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واعتصموا باللہ) کیونکہ تمھارا سرپرست اور مددگار وہی ہے "(ھو مولاکم)" اور کتنا اچھا سرپرست اور کیسا عمدہ اور باصلاحیت مددگار ہے (فنعم المولیٰ ونعم النصیر) دراصل یہ جملہ "واعتصموا باللہ ھو مولاکم" کی دلیل ہے

---

[1] نور الثقلین جلد نمبر ۳ ص۵۲۶ کے مطابق کتاب "کمال الدین" اور اسی طرح کی دوسری روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔

[2] تفسیر برہان جلد نمبر ۳ ص۱۰۵

[3] اسی تفسیر کی پہلی جلد میں سُورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۴۳ اور سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ کی تفسیر کے ذیل میں ہم اس مضمون سے متعلق سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

یعنی اگر تمھیں کہا گیا ہے کہ صرف الطاف و عنایاتِ پروردگار سے وابستہ رہنا بلاوجہ نہیں۔ کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ، اچھا، اور مناسب یاور و ناصر ہے۔

بارِالٰہا! ہمیں یہ توفیق عطا فرما کہ صرف تجھی سے وابستہ اپنے اور خالق و مخلوق سے رشتے کی وجہ سے لوگوں کے لیے نمونہ و معیار بنیں اور تیری عظیم کتاب کی جامع اور نمونہ تفسیر" مکمل کریں۔

خدایا! جس طرح سابقہ کتب اور اس قرآن حکیم میں تو نے ہمیں "مسلمان" کہہ کر پکارا ہے۔ یہ توفیق دے کہ سراپا تیرے حکم کے بندے بن جائیں۔

پروردگارا! وہ دشمن جو آج ہر طرف سے قرآن و اسلام پر حملہ آور ہو رہا ہے، ہمیں اس پر غلبہ عطا فرما کہ تو ہی بہترین مولا اور مددگار ہے۔ (فنعم المولیٰ ونعم النصیر)۔

سورۂ حج کی تفسیر اختتام کو پہنچی

Marfat.com

سورۂ مؤمنون

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اس کی ۱۱۸ آیتیں ہیں

Marfat.com

سورۂ مؤمنون
کی
فضیلت

پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰؑ کی طرف سے ہم تک پہنچنے والی روایات کے مطابق یہ سورت بڑی فضیلت کی حامل ہے۔
رسول اکرمؐ سے ایک روایت ہے۔

من قرء سورة المؤمنين بشرته الملائكة يوم القيمة بالروح والريحان وما تقربه عينه عند نزول ملك الموت۔

اس سورت کی قرات کرنے والے ہر شخص کو روز قیامت، فرشتے، رُوح اور ریحان کی بشارت دیں گے اور جس وقت ملک الموت اس کی رُوح قبض کرنے کے لیے آئے گا۔ اور اسے ایسی خوشخبری سنائے گا۔ اس کی آنکھیں روشن اور ٹھنڈی ہو جائیں گی [1]

ایک اور روایت امام صادقؑ سے مروی ہے۔

من قرء سورة المؤمنين ختم الله له بالسعادة إذا كان يدمن قرائتها فی کل جمعة، وکان منزله فی الفردوس الاعلی مع النبيين والمرسلين۔

جو شخص سورۂ مومنون کو پڑھے اور ہر جمعہ برابر پڑھتا رہے۔ اس کا خاتمہ سعادت پر ہوگا۔ اور انبیا و مرسلین کے ساتھ فردوس بریں میں رہے گا۔ [2]

ہم اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا فضائل اور قرأت کی برکتیں، مفاہیم و مطالب سورت پر غور و فکر اور ان پر عمل کے ارادے کے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ یہ آسمانی کتاب، انسان سازی اور تعمیر کردار کے تربیتی

---

[1] تفسیر مجمع البیان ج، ص ۹۰

[2] تفسیر مجمع البیان ج، ص ۹۰

Marfat.com

کورس کے عملی پروگراموں کا مجموعہ ہے اور واقعی اگر کوئی شخص اس سورہ میں بیان شدہ مطالب کا عملی نمونہ بن جائے۔ اگرچہ مومنین کی صفات کے بیان پر مشتمل پہلی چند آیتوں پر ہی عمل پیرا ہو جائے تو تمام کے تمام اعزازات نصیب ہوں گے اسی لیے بعض روایت میں ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا۔

لقد انزل الی عشر آیات من اقامهن دخل الجنة۔

مجھ پر دس آیتیں ایسی نازل ہوئی ہیں، کہ اگر کوئی ان کا عملی نمونہ بن جائے تو جنت میں جائے گا۔[1]

"قرء" (پڑھے) کے بجائے "اقام" (عمل کرے) کا لفظ ہمارے مذکورہ بالا مفہوم کی تائید کرتا ہے کہ آیتوں میں بیان شدہ مفاہیم کا مقصد عملی شکل میں ان کو اپنانا ہے۔ نہ یہ کہ صرف زبان سے پڑھ لینا۔

سورہ مؤمنون کے مندرجات

اس سورۂ کے نام سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کا اہم حصہ مومنین کی برگزیدہ صفات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد عقیدے اور عمل کے سلسلے میں کچھ بحثیں ہیں۔ جو دراصل مذکورہ صفات ہی کی تکمیل کا بیان ہے۔

اس سورہ کے جملہ مطالب کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصّہ

پہلی آیت (قد افلح المؤمنون . . . . . .) سے شروع ہو کر بعد کی چند آیتوں تک مومنین کی فلاح و کامیابی کے سبب چند صفات پر مشتمل ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ صفات کتنی جچی تلی، جامع اور زندگی کے انفرادی اور اجتماعی کئی پہلوؤں کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

دوسرا حصّہ

چونکہ پہلے حصّے میں بیان شدہ تمام اوصاف کی بنیاد توحید اور ایمان باللہ پر ہے۔ لہٰذا اس حصّے میں معرفت ذات باری کی مختلف علامتوں اور عالم کائنات میں اللہ کی بہت سی آفاقی اور ذاتی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کائنات کی آفرینش و ابتدا کے حیرت انگیز نظام میں سے آسمان، زمین، انسان اور جانوروں کی پیدائش اور نباتات کو اللہ کی عجیب و غریب قدرت کے کرشمے شمار کیا گیا ہے۔

تیسرا حصّہ

اس حصّے میں عملی جہت کی تکمیل کے لیے چند عظیم پیغمبروں، مثلاً حضرت نوحؑ، ہودؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی کچھ سبق آموز سوانح بیان کی گئی ہے اور ان کی زندگی کے بعض نشیب و فراز بیان کئے گئے ہیں۔

چوتھا حصّہ

اس حصّے میں متکبر اور مغرور طاقتوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ منطقی دلائل بلکہ تند و تیز تنبیہوں کے ذریعے

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۱۸ ص ۲۔

Marfat.com

انہیں اللہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے تاکہ "رجوع الی اللہ" پیدا ہو سکے۔

پانچواں حصّہ

اس حصے میں اختصار کے ساتھ معاد اور قیامت کا ذکر ہے۔

چھٹا حصہ

اس حصے میں کائنات پر اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور ہر جگہ پر اس کے حکم کے اثر و نفوذ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ساتواں اور آخری حصّہ

اس حصے میں قیامت، حساب کتاب، نیک لوگوں کی جزا، اور بداعمالیوں کی سزا کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی غرض خلقت کے بیان کے ساتھ سورہ کا اختتام ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا کہ اعتقادی، عملی اور پیدائش و آفرینش سے متعلق مسائل اور مومنین کے سیر و سلوک کو شروع سے آخر تک بیان کرنے والی یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ مگر بعض مفسرین کے بقول اس سورت کی چند آیتیں مدینہ میں نازل ہوئیں چونکہ اس سورۃ میں زکوٰۃ سے متعلق آیت موجود ہے اور سب کو معلوم ہے کہ زکوٰۃ کا حکم مدینے میں آیا۔ لہٰذا یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ سورت ساری کی ساری مکہ میں نازل نہیں ہوئی۔

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۳ : خذ من اموالهم صدقة ....

جب نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے بعض اشخاص کو حکم دیا کہ مختلف علاقے کے لوگوں سے وصول کریں البتہ ذہن میں رہے کہ زکوٰۃ کا مفہوم بہت وسیع ہے اس سے مراد "زکوٰۃ واجب" ہی نہیں، بلکہ زکوٰۃ مستحبی بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ اکثر روایات میں ہے کہ نماز و زکوٰۃ ساتھ ساتھ رہی ہیں۔

بعض علماء کے خیال میں مکہ میں بھی زکوٰۃ واجب تھی۔ مگر اجمالی طور پر یعنی ہر مسلمان پر واجب تھا کہ اپنے مال میں سے ایک معین مقدار غریبوں اور محتاجوں کو دے۔ جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو باقاعدہ ایک نظام زکوٰۃ تشکیل دیا گیا۔ نصاب مقرر کیے گئے عمّال کا تقرر ہوا اور اسلامی مملکت کے مختلف حصوں سے زکوٰۃ کی وصولی حکومتی سطح پر کی گئی۔ [1]

---

[1] اس سلسلے میں امام باقرؑ اور امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔

"فرض الله الزكوة مع الصلوة"

اللہ نے زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ واجب فرمایا۔

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

۱۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ لا

۲۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ لا

۳۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ لا

۴۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ لا

۵۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ لا

۶۔ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ
فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ ج

۷۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْعٰدُوْنَ ۝ ج

۸۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ لا

۹۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

۱۰۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ لا

۱۱۔ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ

مہربان اور رحم کرنے والے اللہ کے نام سے ۔

Marfat.com

۱۔ مومنین کامیاب ہوئے۔

۲۔ وہ جو نماز میں عجز و انکساری کرتے ہیں

۳۔ اور وہ جو لغویات اور بے ہودگی سے بچتے ہیں۔

۴۔ اور وہ جو زکوٰۃ دیتے ہیں

۵۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

۶۔ سوائے اپنی بیویوں اور کنیزوں کے کیونکہ ان کے سلسلے میں وہ لائق ملامت نہیں ہیں۔

۷۔ اور اس راستے سے انحراف کرنے والا ہی تجاوز کرنے والا ہے۔

۸۔ اور وہ جو امانتوں اور وعدوں پر پورا اترتے ہیں

۹۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

۱۰۔ (بیشک) وہی وارث ہیں۔

۱۱۔ وہ فردوس بریں کے وارث ہوں گے اور مدام اسی میں رہیں گے۔

تفسیر

مومنین کے نمایاں اوصاف

پہلے بھی بیان کیا جاچکاہے کہ اس سورہ کا نام اسس کی ابتدائی آیتوں کی وجہ سے ہے جو مومنین کی خصوصیات پُر مغز اور بامعنی چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کرتی ہیں۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین کے اوصاف کے بیان سے پہلے ان کی پُر کیف اور مایۂ ناز زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ دلوں میں اس بلند و بالا مرتبے کو حاصل کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے۔ مومنین کامیاب ہوگئے اور ہر لحاظ سے اپنے مقصد کو پاگئے۔ (قد افلح المؤمنون)۔

Marfat.com

"افلح" "فلح" اور"فلاح" سے ہے۔اس کے اصلی معنیٰ چیرنا اور پھیڑنا ہیں۔اس کے علاوہ ہمہ جہت کامیابی حاصل کرنا، مقصد کو پالینا اور خوش نصیب ہونا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ دراصل جتنے افراد کامیاب نجات یافتہ اور خوش بخت ہوتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کو چیر کر ہی اپنی منزلِ کامیابی کی طرف راستہ بناتے ہیں۔

البتہ فلاح اور کامیابی مادی اور معنوی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے اور مومنین کے لیے دونوں جہات مراد ہیں۔ دنیاوی کامرانی و کامیابی یہ ہے کہ انسان آزاد، سربلند، مستحکم اور بے نیاز رہے اور ایمان کے بغیر یہ مقام حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اُخروی کامیابی یہ ہے کہ اللہ کے جوارِ رحمت میں اچھے ساتھیوں اور ابدی نعمتوں میں باوقار اور سربلند رہے۔ راغب اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں۔

دنیاوی فلاح تین چیزوں میں مضمر ہے۔ (i) بقاء (ii) بے نیازی اور (iii) عزت و وقار اور فلاح اُخروی چار چیزوں میں ہے۔

(i) بقاءِ غیر فانی (ii) ہر قسم کی احتیاج سے بے نیازی اور (iii) ہمہ جہت وقار اور عزت اور (iv) ہر قسم کی جہالت سے نجات دینے والا علم۔

اس کے بعد مومنین کے اوصاف میں سب سے پہلے نماز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو عالم نماز میں سراپا عجز و انکساری بنے ہُوئے ہوتے ہیں۔ (الذین ھم فی صلاتھم خاشعون)۔

"خاشعون" "خشوع" سے ہے۔ اس کا معنیٰ جسمانی اور ذہنی عجز و انکساری ہے۔ یہ لفظ اس حالت کو بیان کرتا ہے جو ایک بزرگ و برتر ذات کی موجودگی میں کسی شخص میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہوتی ہے۔

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید مومنین کے نماز پڑھنے کو اس کی علامت شمار نہیں کرتا۔ بلکہ نماز میں عجز و انکساری کو ان کی خصوصیت قرار دیتا ہے۔ یعنی یہ واضح کرتا ہے کہ مومنین کی نماز بے معنیٰ اور بے رُوح حرکات و سکنات نہیں۔ بلکہ عالم نماز میں وہ پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ غیر اللہ سے مکمل طور پر منقطع ہوتے ہیں۔ اور صرف ذات پروردگار عالم سے رشتہ جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ ذہنی اور حسی طور پر اپنے پالنے والے سے راز و نیاز کرتے ہُوئے عالم استغراق میں کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں۔ کہ ان کے بدن کے ہر ایک عضو پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ ذاتِ لامتناہی کے مقابلے میں اپنے کو ایک ذرہ اور بحرِ ناپیدا کنار کے مقابلے میں ایک قطرہ سمجھنے لگتے ہیں۔ نماز کے لمحات ان کے لیے تہذیبِ نفس اور تربیت رُوح کا بہترین ذریعہ ہُوتے ہیں۔

پیغمبرِ اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ایک شخص کو حالت نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلتے ہُوئے دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔

"اما انہ لو خشع قلبہ لخشعت جوارحہ!"

"اگر اس کا دل حالتِ عجز میں ہوتا کہ اس کے اعضاء بھی ہوتے"

Marfat.com

یہ روایت اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ نماز میں خشوع، ایک باطنی کیفیت ہے جو ظاہر پر اثر انداز ہوتی ہے عظیم ہادیانِ اسلام عالم نماز میں اس درجہ خضوع و خشوع میں ہوتے تھے کہ غیر اللہ سے بالکل بے گانہ ہو جاتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے کبھی پیغمبر اسلامؐ حالتِ نماز میں آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے۔ مگر اس آیت کے نزول کے بعد آپ ہمیشہ اپنی نظریں زمین کی طرف رکھتے تھے۔ ؎1

عالم نماز میں عجز و انکساری کے ذکر کے بعد مومنین کی دوسری صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ نیز وہ ہر قسم کی بے ہودگی سے منہ موڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

(والذین ھم عن اللغو معرضون)۔

دراصل مومنین کی زندگی کی تمام حرکات و جہات، مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے ہیں۔ اور مقصد بھی تعمیری اور مفید۔ کیونکہ لغو کا مطلب بے مقصد یا وہ مقصد جس کا مفید نتیجہ برآمد نہ ہو۔ بقول عظیم مفسروں کے لغو کے مندرجہ ذیل معانی ہیں۔ ؎2

(i) بے مقصد، بے ہودہ اور مفید نتیجہ نہ دینے والا فعل (ii) ہر وہ گفتگو یا عمل جو خاطر خواہ نتیجہ نہ رکھتا ہو

(iii) باطل (iv) گناہ (v) جھوٹ

(vi) گالی یا جوابی گالی (vii) موسیقی اور گانا بجانا (viii) شرک

مندرجہ بالا سب کے سب معانی مجموعی اور کلی معنیٰ کا حصہ ہیں۔ "لغو" میں صرف بے ہودہ باتوں اور افعال کا مفہوم ہی نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ بے ہودہ باتیں یا وہ فضول قسم کے افعال جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیں۔ نیز معقول اور مفید امور پر غور و فکر کرنے کا موقع نہ دیں۔ سب لغو کے مفہوم میں شامل ہیں۔

درحقیقت مومنین ایسے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ جو نہ صرف باطل افکار، بے ہودہ گفتگو اور فضول کاموں میں مشغول نہیں ہوتے، بلکہ ان سے منہ موڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مومنین کی تیسری صفت بیان کی گئی ہے جو معاشرتی اور مالی پہلو رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون)۔ ؎3

ہم سطور بالا میں بیان کر آئے ہیں کہ چونکہ یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں عام زکوٰۃ کا حکم نہیں آیا تھا۔ لہٰذا مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہماری نظر میں صحیح بات یہ ہے کہ اس آیت میں زکوٰۃ کا حکم واجب زکوٰۃ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ مستحبی

؎1 تفسیر صافی اور مجمع البیان، زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

؎2 تفسیر مجمع البیان اور تفسیر فخر الدین رازی۔

؎3 یہاں "زکوٰۃ" مصدری معنیٰ رکھتی ہے اسی لیے بعد میں "فاعلون" آیا ہے۔ مگر بعض مفسرین نے زکوٰۃ کے مشہور معنیٰ ہی سمجھے ہیں یعنی اپنے مال میں سے ایک معین مقدار، راہ خدا میں خرچ کرنا، اس صورت میں فاعلون یعنی "مؤدون" (ادا کرنے والا) ہوگا۔

Marfat.com

زکاتیں شریعت اسلام میں بکثرت جس زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں آیا وہ واجب تھی۔ لیکن مستحبی زکوٰۃ کا حکم مدینہ سے پہلے بھی آچکا تھا۔
بعض مفسرین کے بقول مکہ میں بھی واجب زکوٰۃ کا حکم تھا۔ مگر نصاب مقرر نہ تھا۔ مسلمان پابند تھے کہ اپنے مال میں سے کچھ مقدار محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دیں۔ جب مدینہ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ "بیت المال" تشکیل دیا گیا اور ایک مالی نظام کے طور پر "زکوٰۃ" کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ تب نصاب مقرر ہوا اور پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے ملک کے مختلف حصوں میں عمال بھیجے گئے۔ تاکہ حکومتی سطح پر زکوٰۃ جمع کرسکیں۔
البتہ فخرالدین رازی اور آلوسی جیسے مفسرین نے اور راغب نے اپنی کتاب "مفردات" میں لکھا ہے کہ اس آیت میں زکوٰۃ سے مراد ہر قسم کا کارِ خیر، تزکیہ اور تہذیب نفس ہے۔ مگر ہماری نظر میں یہ بعید بات ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے اسلوب کے تحت جہاں بھی نماز اور زکوٰۃ اکٹھے ذکر ہوئے ہیں۔ وہاں زکوٰۃ سے مراد مالی خرچ ہے۔ لہٰذا یہاں بھی زکوٰۃ راہ خدا خرچ کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معنی کرنے کے لیے "قرینے" کی ضرورت ہے جو یہاں مفقود ہے۔
مومنین کی چوتھی صفت پاکدامنی، عفت اور ہر قسم کے غیر قانونی جنسی اختلاط سے پرہیز ہے۔ ارشاد ہورہا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی شرمگاہ کو بے حیائی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ (والذین ھم لفروجھم حافظون)۔[1]
البتہ اپنی بیویوں، کنیزوں سے جنسی تلذذ حاصل کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ کسی طرح بھی قابل ملامت نہیں ہیں۔
(الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین)۔
نفسانی خواہشات میں جنسی خواہش، بڑی طاقتور اور سرکش ہے۔ لہٰذا اس پر قابو پانے کے لیے قوی ایمان اور اور بلند درجے کے تقویٰ کی ضرورت ہے۔ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے بعد کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: جو شخص (قانونی تلذذ جنسی) کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرے، وہی حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔
(فمن ابتغیٰ وراء ذٰلک فاولٰئک ھم العادون)۔
"شرمگاہ کی حفاظت" کی اصطلاح اس حقیقت کو آشکار کررہی ہے۔ اگر جنسی خواہش کو دبانے کے لیے نفس کی مسلسل اور برابر نگرانی نہ کی جائے تو جنسی بے راہ روی کا زبردست اندیشہ ہے۔
"بیویوں" سے مراد دائمی اور وقتی دونوں ازواج ہیں۔ البتہ بعض اہل سنت مفسرین اس مسئلے میں ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔
"غیر ملومین" (وہ قابل ملامت نہیں ہیں) کی اصطلاح شاید گمراہ عیسائیوں کے باطل افکار کی طرف اشارہ کررہی ہے، بعض عیسائی جو اصل مذہب عیسائیت سے منحرف ہوچکے ہیں۔ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہر قسم کا جنسی اختلاط حرام ہے اور انسانی شرف کے منافی ہے اور اسے ترک کرنا انسان کی شان تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں "رومن کیتھولک" فرقے کی عورتیں اور مرد تارک الدنیا ہوتے ہیں اور کنوارپن میں ہی زندگی بسر کرلیتے ہیں۔ ارشادی کو روحانی منصب کے خلاف تصور

---

[1] "فروج" "فرج" کی جمع ہے اور افزائش نسل کی طرف اشارہ ہے۔

Marfat.com

کرتے ہیں (اگرچہ درپردہ وہ جنسی تسکین کے کئی راستے اپنا لیتے ہیں) عیسائی مصنفین نے خود اس عنوان سے جو کتابیں لکھی ہیں۔ وہ پادریوں اور راہباؤں کے جنسی اختلاط کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ [1]

بہرحال یہ ممکنات میں سے ہے کہ جو فطری میلان اور خواہش ایک بہترین نظام کے اہم جزو کے طور پر پیدا کیا جائے اور پھر اس کی تسکین کو حرام سمجھا جائے یا اسے انسانی شرف کے منافی سمجھا جائے۔

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ بیوی کی علت کے سلسلے میں بعض استثنائی مواقع پر قربت سے ممانعت مثلاً ان کے ماہانہ مخصوص ایام میں اصل مسئلہ سے کوئی تضاد نہیں رکھتا۔ کنیزوں کے حلال ہونے کے مسئلے میں بھی بعض شرائط عائد کی گئی ہیں۔ جن کا ذکر فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ یوں نہیں ہر کنیز ہر مالک پر ہر حالت میں حلال ہو۔

بہت سے پہلوؤں اور حالات کے اعتبار سے کنیزوں کی شرائط بیویوں کی شرائط سے ملتی جلتی ہیں۔

زیر بحث آٹھویں آیت میں مومنین کی پانچویں اور چھٹی نمایاں صفت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو امانتیں لوٹاتے ہیں۔ اور وعدہ وفا کرتے ہیں۔

(والذین ھم لاماناتھم وعھدھم راعون)

امانتوں کی حفاظت اور ان کا صحیح وسالم مالک کو لوٹانا اپنے وسیع تر مفہوم میں مومنین کی نمایاں صفت ہے اور اس طرح خالق ومخلوق سے کیے گئے وعدوں کو نبھانا بھی امانت کے وسیع تر مفہوم میں اللہ اور انبیاء کی امانتیں بھی شامل ہیں۔ اسی طرح لوگوں کی امانتیں بھی اس میں آتی ہیں۔ اللہ کی ان گنت نعمتوں میں سے ہر ایک اس کی امانت ہے۔ دین، قانونِ الٰہی، آسمانی کتابیں دینی راہنماؤں کی ہدایات سب کی سب امانتیں ہیں۔ اور اس طرح اولاد، مال منصب اور مقام بھی مومنین ساری زندگی ان امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی ادائیگی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اور دُنیا سے جاتے ہُوئے اپنی شریف النفس نسل جسے انہوں نے ان کی حفاظت کے لیے تربیت کیا ہوتا ہے کے سپرد کر دیتے ہیں۔

لفظ "امانت" کی عمومیت کی دلیل لفظ وسعت اور اطلاق کے علاوہ، امانت کے مفہوم کے بارے میں متعدد روایات بھی ہیں۔ جو امانت کی تفسیر میں بیان ہوئی ہیں کبھی امانت سے مراد آئمہ معصومینؑ کی امانت لیے جیسے ایک امام دُنیا سے جاتے ہُوئے اپنے بعد کے امام کے سپرد کرتا ہے۔ [2] اور کبھی مطلقاً "ولایت وحکومت"۔

امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے معتمد علیہ شاگرد جناب زرارہ سورہ نساء آیت نمبر ۵۸۔

ان تؤدوا الامانات الی اھلھا

کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

یہاں امانت سے مراد حکومت وولایت ہے، جس کو اس کے اہل کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔ [3]

---

[1] ویل ڈیورانٹ کی مشہور تاریخ ملاحظہ ہو۔

[2]، [3] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۱۸۰۔

Marfat.com

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و ولایت اہم ترین امانت ہے ، جسے اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے ۔ اسی طرح عہد و پیمان نبھانے کے لیے عمومی دلیل بھی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بیان کی گئی ہیں ۔ منجملہ فرمایا گیا ہے ۔

"واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم" (نحل ۹۱)

"جب تم اللہ سے کوئی وعدہ کرو تو وفا کرو" (نحل - ۹۱)

توجہ طلب بات یہ ہے کہ بعض آیتوں میں امانت کی ادائیگی یا امانت میں خیانت نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ جب کہ زیر بحث آیت میں صرف "امانت" کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ جو امانت کی مکمل حفاظت نگرانی اور صحیح ادائیگی دونوں پر محیط ہے ۔ اس بناء پر اگر کبھی کسی امانت کے ضمن میں اس چیز کی اصلاح میں کوتاہی کی وجہ سے نقصان کا ڈر ہو تو امانت دار کی ذمہ داری بھی ہو گی کہ مطلوبہ اصلاح بھی کرے تو یوں امانت کے ذیل میں تین کام سپرد کیے جاتے ہیں ۔

i - ادائیگی (ii) حفاظت (iii) اصلاح ۔

بہر حال یہ مسلمہ امر ہے کہ انسان کے اجتماعی نظام کی بنیاد وعدوں کی وفا امانتوں کی حفاظت اور ان کی ادائیگی پر ہے ۔ ورنہ معاشرے کا توازن بگڑ جائے اور ہر چیز درہم برہم ہو جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ لادین افراد اور معاشرے بھی اپنے توازن کو برقرار رکھنے کے وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت سے بچتے ہیں ۔ اور کم از کم اپنے مجموعی اجتماعی مسائل میں ان دو امور کی حفاظت اپنی ذمہ داری جانتے ہیں ۔

امانت کی اہمیت کے عنوان سے ہم اسی تفسیر کی جلد نمبر ۳ میں سورۂ نساء کی آیت ۵۸ اور جلد نمبر ۷ میں سورۂ انفال آیت نمبر ۲۷ کی تفسیر کے ذیل میں تفصیلاً بحث کر چکے ہیں ۔ نیز وعدہ وفائی کے عنوان سے جلد ۴ میں سورۂ مائدہ آیت ۱ اور جلد ۱۱ میں سورۂ نحل آیت ۹۱ کی تفسیر کے ذیل میں مفصل لکھ چکے ہیں ۔

نویں آیت میں مومنین کی آخری نمایاں صفت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ، وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کے لیے کوشاں رہتے ہیں ۔

(والذين هم على صلواتهم يحافظون) ۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین کی پہلی بیان شدہ خصوصیت وصفت "نماز میں خضوع و خشوع" ہے اور آخری "نماز کی حفاظت" مختصر یہ کہ مومنین کے اوصاف کی ابتدا بھی نماز ہے اور انتہا بھی نماز ، کیونکہ نماز خالق و مخلوق کے درمیان بہترین رابطہ ہے ۔ نماز اعلیٰ تربیت کا اعلیٰ سطح کا مدرسہ ہے ۔ نماز روح کی بیداری کا ذریعہ اور گناہوں سے بچاؤ ذریعہ ہے ، نماز روح کی بیداری کا ذریعہ اور گناہوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے ۔ مختصر یہ کہ اگر نماز تمام آداب و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے تو تمام نیکیوں اور خوبیوں کے لیے قابلِ اطمینان وسیلہ بن جاتی ہے ۔

یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے کی پہلی اور آخری آیت دو مختلف مفاہیم پیش کر رہی ہیں ، پہلی آیت میں "صلوٰۃ" مفرد استعمال ہوا ہے ۔ جبکہ آخر میں "صلوات" جمع کی صورت میں آیا ہے ۔ پہلی آیت روحِ نماز یعنی خضوع و خشوع اور ایک باطنی کیفیت کی اہمیت بیان کر رہی ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جو انسان کے تمام اعضاء و جوارح پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ جبکہ آخری آیت نماز کے اوقات ، آداب شرائط اور مقام نماز ، تعداد وغیرہ کی اہمیت کو اجاگر کر رہی ہے ۔ گویا کہ سچے مومن

Marfat.com

نمازیوں کو ہدایات دے رہے ہیں۔ کہ ہر ایک نماز کی ادائیگی کے عالم میں تمام مذکورہ آداب و شرائط کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ نماز کی اہمیت کے بارے میں ہم اسی تفسیر کی جلد ۹ میں، سورۂ ہود آیت ۱۱۴ اور جلد ۴ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۰۳ اور جلد نمبر ۱۳ سورۂ طٰہٰ آیت ۱۴ تفسیر کے ذیل میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

مومنین کے نمایاں اوصاف کے بیان کے بعد نتیجۃً بیان کیا جاتا ہے۔ وہی وارث ہیں۔ (اولٰئك هم الوارثون)۔ وہی ہیں جو فردوس بریں کے بھی وارث و مالک ہیں۔ اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (الذین یرثون الفردوس هم فیها خالدون)۔

فردوس" لغوی طور پر اس لفظ پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ دراصل یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ بعض اسے رومی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور بعض کے خیال میں فارسی زبان سے آیا ہے۔ بہر حال اس کا معنیٰ باغ یا ایسا باغ جس میں زندگی کی تمام نعمات خداوندی موجود ہوں۔ بہر حال یہ ایسی بہشت بریں ہے۔ جو جنت کے بہترین باغوں میں سے ہے۔

وارث ہونے سے شاید یہ مراد ہو کہ مومنین بغیر زحمت کے اس مقام تک پہنچ جائیں گے۔ جس طرح انسان بغیر کسی زحمت و کوشش کے وراثت پالیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مومنین کو جنت تک پہنچنے کے لیے دنیا میں تزکیہ نفس کے عمل کو پورا کرتے ہوئے بڑی جانسوز مشقت اٹھانا پڑی۔ مگر فردوس بریں کی شکل میں جتنی عظیم کثیر اور اعلیٰ جزا انہیں دی جائے گی۔ اس کے مقابلے میں ان کے اعمال دنیا گویا کچھ بھی نہیں اور یوں معلوم ہوگا، جسے بغیر کچھ کیے ہی اتنا کچھ مل گیا ہو۔

اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث پیشِ نظر رہنی چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

ما منكم من احد الا وله منزلان، منزل فی الجنة، ومنزل فی النار فان مات ودخل النار ورث اهل الجنة منزله

تم میں سے ہر ایک شخص دو گھروں کا مالک ہے۔ ایک جنت میں دوسرا جہنم میں۔ اگر ایک شخص مرجائے اور دوزخ میں جائے تو اس کا جنت والا گھر، اہل جنت کو ورثے میں مل جائے گا۔"

" ورثہ" کی اصطلاح کے ذیل میں مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید از قیاس نہیں جانا کہ یہ لفظ مومنین کے انجام کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ ورثہ آخر کار ورثا تک پہنچتا ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیتوں کے مطابق جنت کا یہ عالی شان درجہ ان مومنین کے لیے مخصوص ہے جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہوں۔ رہ گئے دوسرے جنتی لوگ تو وہ نچلے درجے میں ہوں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ **افلح کا مفہوم:** فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ مومنین کی حتمی کامیابی کے سلسلے میں فعل ماضی کا استعمال تاکید کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کی کامیابی اور فلاح اس قدر مسلم امر ہے گویا کہ پہلے ہی طے ہے۔ مزید برآں جملے کے

Marfat.com

کے آغاز میں "قد" کا استعمال تاکید مزید کے لیے ہے۔ "خاشعون" "معرضون" "راعون" اور "یحافظون" جو "اسم فاعل" یا "فعل مضارع" کے صیغے ہیں، اس حقیقت کو ظاہر کررہے ہیں کہ مومنین کے یہ اعلیٰ اوصاف وقتی اور عارضی نہیں ہیں۔ بلکہ مستقل و دائمی ہیں۔

۲۔ **دائمی اور کم مدتی شریکِ حیات:** مذکورہ بالا آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں پر دو طرح سے حلال ہیں

ا۔ بیوی کی صورت میں۔

اا۔ کنیز اور لونڈی کی صورت میں (خاص شرائط کے ساتھ)

اس لیے یہ آیت فقہی کتب میں "باب نکاح" میں کئی مباحث کے لیے مستند قرار پائی ہے۔

بعض اہل سنت مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس آیت کو نکاح موقت کی نفی اور اسے زنا ہی کے ذیل میں ثابت کرنے کے لیے سند کے طور پر پیش کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ نکاح موقت متعہ مسلمہ طور پر پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آغاز اسلام میں بہت سے صحابہؓ نے اس پر عمل کیا تھا۔ اور کوئی مسلمان اس کی صحت سے انکار نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ اس میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں رائج تھا، مگر بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے اسے حرام قرار دیا۔

اس مسلمہ حقیقت کے پیش نظر مذکورہ اہل سنت علماء کے نظریئے کا یہ مفہوم سمجھا جائے گا (العیاذ باللہ) پیغمبر اکرم نے زنا کو جائز جانا (چاہے تھوڑی سی مدت کے لیے ہی سہی) مگر یہ ناممکنات میں سے ہے۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر، غور کیجیئے کہ حقیقت یہ ہے کہ "متعہ" بھی نکاح کا ایک طریقہ ہے اور اس کی اکثر شرائط وہی ہیں۔ جو دائمی شادی کی ہیں اس لیے یہ بھی (الا علی ازواجھم) کے جملے میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "کچھ مدتی شادی" کا صیغہ نکاح پڑھتے ہوئے وہی الفاظ اور صیغے "انکحت" "زوجت" مدت کی قید کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور یہی اس کی حلت اور جواز کی بہترین دلیل بھی ہے۔

اسی تفسیر کی جلد ۳ میں سورۂ نساء آیت ۲۴ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نکاح موقت اسلام میں اس کا شرعی جواز اس کا منسوخ نہ ہونا اور اس کا اجتماعی فلسفہ وغیرہ جیسے مسائل پر سیر حاصل بحث کرچکے ہیں۔

۳۔ **خضوع وخشوع رُوحِ نماز ہے** اگر قرأت رکوع، سجود اور اذکار کو ایک جسم سے تشبیہ دیں تو حقیقت نماز کی طرف اور اس کی طرف جس کی نماز پڑھتے ہیں۔ قلبی توجہ اور باطنی یکسوئی رُوحِ نماز ہے۔

"خشوع"، عجز و انکساری اور ادب کے ساتھ دلی توجہ کا دوسرا نام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مومنین نماز کو ایک بے رُوح ڈھانچہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی پوری توجہ نماز کی باطنی کیفیت اور حقیقت پر ہوتی ہے۔ اکثر لوگ ایسے ہیں جو نماز میں از حد کوشش کرتے ہیں کہ عالم نماز میں خضوع وخشوع اور اللہ کی طرف دلی توجہ کریں، مگر وہ ایسا کر نہیں پاتے، نماز اور دیگر عبادات کے دوران

Marfat.com

خضوع، خشوع اور حضورِ قلب کے لیے مندرجہ ذیل امور پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے۔

۱۔ معلومات کو اس حد تک پہنچائے کہ انسان کی نگاہ میں دُنیا کی ذلت و پستی اور اللہ کی رفعت و بلندی اور عظمت و بزرگی واضح ہو جائے تاکہ کوئی بھی دنیاوی امر اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔

۲۔ پریشان خیالی اور ذہنی انتشار حواس کو ایک طرف مرکوز رکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا انسان جتنا ان کو کم کرے۔ دلی توجہ اور یکسوئی میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

۳۔ اس سلسلے میں نماز اور دیگر عبادات کے لیے مقام کا محل وقوع بھی خاصہ مؤثر ہے۔ اسی بنا پر ایسی جگہوں پر نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ جو انسان کی توجہ ہٹانے کا سبب ہوں۔ مثلاً آیئنے کے سامنے نماز پڑھنا، کھلے دروازوں کے سامنے جہاں سے لوگوں کی آمد و رفت ہوئی ہو، نماز پڑھنا اور کسی تصویر یا پرکشش منظر کے سامنے نماز ادا کرنا وغیرہ اسی وجہ سے مساجد زیب و زینت اور آرائش سے خالی ہونی چاہئیں تاکہ انسان کی توجہ مکمل طور پر اللہ کی طرف ہی رہے۔

۴۔ گناہ سے پرہیز کرنا۔ کیونکہ گناہ کے ارتکاب سے انسان اللہ سے دُور ہو جاتا ہے اور نماز میں حضورِ قلبی سے محروم رہتا ہے۔

۵۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی اور اس کے افعال و اذکار سے واقفیت حاصل کرنا۔

۶۔ نماز کے مخصوص آداب اور مستحبات کو ادا کرنا، چاہے ان کا تعلق مقدماتِ نماز سے ہو یا خود اصل نماز سے۔

۷۔ مذکورہ بالا تمام امور سے قطع نظر خضوع و خشوع کے حصول کے لیئے مسلسل اور پیہم مشق اور پوری توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان شروع شروع میں تھوڑی دیر کے لیے دلی یکسوئی پیدا کر لیتا ہے اور اگر وہ اس کی مسلسل مشق کرے اور ہر نماز میں برابر اس کے اضافے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسا ملکہ پیدا نہ کرے کہ ہمیشہ حالتِ نماز میں وہ غیر اللہ سے بالکل بے نیاز ہو جائے۔ (قابلِ غور ہے)

Marfat.com

۱۲۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ
۱۳۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۠
۱۴۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۗ
۱۵۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۗ
۱۶۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۔ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔
۱۳۔ پھر ہم نے اسے نطفے کی صورت میں ایک اطمینان بخش جگہ (رحم) میں رکھا۔
۱۴۔ پھر نطفے کو علقہ (جمے ہوئے خون) کی صورت دی اور علقہ کو مضغہ (گوشت کے لوتھڑے کی سی چیز) کی شکل بخشی اور پھر ہم نے اس لوتھڑے کو ہڈیوں کی شکل دی۔ اس کے بعد ہم نے اس کو ایک نئی صورت

Marfat.com

میں پیدا کیا۔ وہ خدا عظیم ہے، جو خلق کرنے والوں میں سے سب سے بہتر ہے۔

۱۵۔ اس کے بعد تمھیں مرنا ہے۔

۱۶۔ پھر روز قیامت دوبارہ اُٹھائے جاؤ گے۔

تفسیر

رحم مادر میں "جنین" کے ارتقائی مراحل

گذشتہ آیتوں میں سچے مومنین کے اوصاف اور ان کی بہترین اُخروی اجزا کا ذکر اور ان کی صفوں میں شامل ہونے کے شوق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن کیونکر اور کس طریقے سے؟ زیر بحث اور اس کے بعد آنے والی آیتوں کا ایک حصّہ ایمان اور معرفت کے حصول کے بنیادی طریقوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پہلے انسان کے باطنی اور اندرونی اسرار و رموز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر قرآن درحقیقت انسان عالم النفس کی سیر کرواتا ہے۔ اور اس کے بعد میں آنے والی آیتوں میں انسان کی توجہ خارجی کائنات کے حیرت انگیز وجود کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور یہ دراصل سیر آفاق ہے۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔ ہم نے۔ انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ (ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين)۔[1]

بے شک یہ انسان کی خلقت کی پہلی منزل ہے، وہ انسان جو بے پناہ قابلیتوں اور صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اتنی رفعت کا حامل ہے کہ "افضل مخلوقات اور افضل موجودات اس کا طرّہ" ہے۔ اس بے قیمت مٹی سے بنا ہے، وہ مٹی جو بے اہمیت ہونے میں ضرب المثل ہے، یہی تو اللہ کی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے حقیر سے مادے سے "رفیع شاہکار" بنایا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، پھر ہم نے اسے پُرامن جگہ پر بطورِ نطفہ ٹھہرایا۔ (ثم جعلناه نطفة في قرار مكين)۔

---

[1] "سلالة" (بروزن "عصارہ") اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو کسی دوسری چیز سے لی جائے اور درحقیقت اس کا نچوڑ اور جوہر ہو۔ (تفسیر مجمع البیان)

Marfat.com

دراصل پہلی آیت عمومی طور پر تمام انسانوں کی خلقت کی ابتدار کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس میں آدم بھی شامل ہیں اور اس کی اولاد بھی اور یہ بتا رہی ہے کہ سب مٹی اور گارے سے پیدا کیے گئے ہیں۔ دوسری آیت میں دوام اور افزائش نسل آدم کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ کہ رحم مادر میں نر و مادہ کا نطفہ کس طرح ترکیب پاتا ہے۔ درحقیقت یہ بحث سورۂ سجدہ آیت ۷ اور ۸ میں بیان شدہ مطلب کے مشابہ ہے اور وہ یہ ہے۔

"وبدء خلق الانسان من طين ثمّ جعل نسله من سلالة من ماء مهين"۔

انسان کی ابتدار گارے سے ہوئی، پھر اس کی نسل ایک ٹپکنے والے حقیر پانی کے ذریعے باقی رکھی گئی۔

رحم مادر کو قرار مکین پر امن قیام گاہ کہہ کر انسانی جسم میں اس کی خاص حیثیت اور مقام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رحم، انسانی جسم میں ایک محفوظ ترین مقام پر واقع ہے۔ ایک طرف سے ریڑھ کی ہڈی کا مضبوط ستون ہے دوسری طرف ہنیدے کی مانند کمر کی مضبوط ہڈیاں، تیسری طرف سے پیٹ کے تہہ بتہہ پردے اور چوتھے طرف بازوؤں کی حفاظت یہ سب اس پر امن قیام گاہ کے واضح مظاہر ہیں۔ اس کے بعد رحم مادر میں نطفے کے تعجب انگیز اور ہوش رُبا مختلف مراحل اور خلقت کی مختلف صورتیں جو انسان کی دسترس سے باہر یکے بعد دیگرے اس پُرامن قیام گاہ میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، پھر ہم نطفے کو جمے ہوئے خون، کی شکل میں لے آئے، پھر جمے ہوئے خون کو چبائے ہوئے گوشت کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر اس کو ہڈی کی شکل دی اور پھر ہڈیوں پر گوشت کی تہہ چڑھادی۔ (ثمّ خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحمًا۔)

نطفے کے مرحلے سمیت مذکورہ بالا پانچ مختلف مراحل تشکیل پاتے ہیں۔ جن میں کا ہر ایک بجائے خود ایک حیرت انگیز عالم ہے۔ جو عجائبات کا مجموعہ ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں جنین شناس جس پر گہری تحقیق کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جس زمانے میں قرآن مجید نے "انسانی جنین" کی خلقت کے عجوبے کا انکشاف کیا تھا۔ اس وقت اس سائنسی ترقی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

آیت کے آخری حصے میں واقعی اہم ترین مرحلے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ یہ مرحلہ بلاشبہ سربستہ اور معنی خیز ہے پھر ہم نے اس میں ایک نئی خلقت پیدا کردی (ثمّ انشأ ناه خلقًا اخر)۔

وہ خدا جو خلق کرنے والوں میں سے بہترین ہے وہ بہت عظیم ہے۔ (فتبارك الله احسن الخالقين)۔

بے شک، رحم مادر میں تاریکی کے پردوں کے اندر حقیر پانی کے قطرے سے اتنی عمدہ خوبصورت اور عجیب و غریب کمالات کی حامل تصویر بنانے کا بے مثال کمال لائق صد تحسین و آفرین ہے۔ اس حقیر سے موجود میں اتنی قابلیتیں اور صلاحیتیں بھر دینے والا علم و حکمت کا حامل لائق ستائش و تحسین ہے۔ آفرین اس پر اس کی اس بے نظیر خلقت پر۔

Marfat.com

ضمنی طور پر یہ بھی بیان ہو جائے کہ "خالق" "مادہ "خلق" ہے اور اس کا مطلب ماپنا اور پیمائش کرنا ہے۔ عرب جب چمڑے کو کاٹنے کے لیے ماپتے ہیں۔ تو اس کے لیے "خلق" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ خلقت میں چونکہ پیمائش اور ناپ تول کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ لہٰذا اس پر بھی "خلق" کا لفظ استعمال ہوتا ہے

"احسن الخالقین" اضافت کی یہ ترکیب ذہنوں میں ایک سوال کو جنم دیتی ہے کہ کیا اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا خالق بھی ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی طرح طرح سے توجیح کی ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں اور لفظ "خلق" غیر اللہ کی ایجاد، اختراع اور صنعت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ اللہ کا کسی چیز کو خلق کرنا اور مخلوق کا خلق کرنا ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اللہ کسی چیز کو خلق کرتے ہوئے اس کے اصل مادہ اور شکل وصورت دونوں کو خلق کرتا ہے۔ جبکہ انسان کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے تو پہلے سے موجود مواد کو استعمال کر کے کوئی نئی شکل دیتا ہے۔ مثلاً تعمیراتی مواد (ریت، مٹی، پتھر) سے عمارتیں اور لوہے اور دیگر دھاتوں سے کاریں، بسیں یا مشینیں بنا لیتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کی خلقت اور پیدا کرنا، لامتناہی و غیر محدود ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ۔ (رعد - ۱۶)

جب کہ انسان بہت ہی محدود پیمانے پر ایجادات کر سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انسان کی ایجادات میں کئی نقائص پائے جاتے ہیں۔ اور چاہیے کہ مسلسل عمل کرتے ہوئے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ مگر اللہ کی مخلوق ہر قسم کے عیوب ونقائص سے مبرا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر انسان یہ قابلیت اور تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو یہ بھی اللہ کی مرضی سے ہی ہے۔ کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر تو درخت کا پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۱۱۰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے۔

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی

جب تم میری اجازت سے گیلی مٹی سے پرندے کی طرح کی ایک شکل بناتے تھے۔

بعد کی آیت توحید اور مبدا کے بارے میں بات کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی لطافت اور سلیقے سے مسئلے کا رخ معاد اور قیامت کی طرف موڑ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ان تمام عجیب وغریب خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوصف انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک وقت آئے گا کہ یہ عجیب عمارت زمین بوس ہو جائے گی اور پھر تم اس زندگی کے بعد سب کے سب مر جاؤ گے۔

ثم انکم بعد ذلک لمیتون۔

لیکن اس تصور کی نفی کے لیے کہ انسان کے مرنے سے تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ چند روزہ عظمت و شوکت

Marfat.com

کس کام کی، بس یہ ایک فضول کھیل ہے) فوراً یہ کہا جاتا ہے: پھر تم روزِ قیامت، اُٹھائے جاؤ گے (دوبارہ تمھیں زندگی دی جائے گی. البتہ وہ زندگی اعلٰے درجے کی اور وسیع تر جہان میں ہوگی۔ (ثم انکم یوم القیامۃ تبعثون)

چند اہم نکات

۱۔ مبتدا اور معاد کا اثبات ایک دلیل سے

توجہ طلب بات یہ ہے کہ "عالم جنین میں خلقت انسان کے مختلف مراحل کو زیر بحث آیت میں اللہ کی قدرت کاملہ اور بے مثال کمال کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے سورۂ حج میں اسی مسئلے کو انسان کی بازگشت، کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس پر مستزاد، یہ کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی مسئلے کی بنیاد پر معاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[1]

جی ہاں! پنہاں رحم میں انسانی خلقت کے عجائبات ہر روز نیا رُخ اختیار کرتے ہیں، اس عظمتِ الٰہی کو پہچاننا چاہیئے۔ گویا ماہر مصوروں، کاریگروں اور تخلیق کاروں کا ایک گروہ ہے۔ جو پانی کے ایک قطرے کے پاس بیٹھا اور شب و روز اس پر کام کر رہا ہے اور اس قطرۂ ناچیز کو بڑی باریکی سے اور انتہائی لطیف انداز سے زندگی کے مختلف مراحل سے گزار رہا ہے۔

جنین کے رشد اور نشوونما کے مختلف مراحل کی اگر ایک مکمل اور صحیح فلم بن سکتی ہے اور ہم اسے دیکھ سکتے تو ہم سمجھتے کہ کیسے عجائب وغرائب اور کیسی عمدہ کاریگری اس میں پنہاں ہے۔

تاہم عصرِ حاضر میں جنین شناسی کے بارے میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ ماہرین کی روز افزوں تحقیقات اور تجربات نے اس سلسلے میں بہت سے مسائل واضح کر دیے ہیں۔ انسان کی نگاہ جب ان تحقیقات کے نتائج پر پڑتی ہے تو بے اختیار "فتبارک اللہ احسن الخالقین" کا نغمہ اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف ہر روز نیا رُوپ اختیار کر لینے والی پے در پے تخلیقات اور پھر خصوصاً پانی کے ایک چھوٹے سے قطرے سے ایک مکمل انسان کی پیدائش اس امر کی غماز ہے کہ اللہ معاد اور انسان کو حیاتِ نو عطا کرنے پر قادر ہے۔

اس طرح سے ایک دلیل سے دو مقصد پُورے ہوتے ہیں۔ اور ایک کرشمے سے دو کام انجام پا جاتے ہیں۔[2]

۲۔ رحم مادر میں انسان کی ارتقاء کا آخری مرحلہ

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں رحم میں انسان کی خلقت کے پانچ مراحل کا ذکر لفظ "خلق" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر آخری مرحلے کو "انشاء" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ماہرین لغت کے بقول "کسی چیز کو ایجاد کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے پالنے کو "انشاء" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آخری منزل پہلے تمام مراحل (نطفہ، علقہ

---

[1] سورۂ حج کی ابتداء میں آیت ۵ تا ۰، کے ذیل میں ہم نے جنین شناسی کے حوالے سے معاد پر گفتگو کی ہے۔ (اسی چودھویں جلد کے آغاز کی طرف رجوع کیجئے)

[2] مراحل جنین اور شاہکار تخلیق کے بارے میں تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں ہم نے سورۂ آل عمران کی چھٹی آیت کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

Marfat.com

مضغہ ہڈی اور گوشت کے غلاف) سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ ایک اہم مرحلہ ہے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید اجمالی طور پر صرف یہ کہہ رہا ہے کہ پھر ہم نے اسے ایک نئی خلقت دی اور اس کے بعد فوراً پکار اٹھتا ہے۔

"فتبارک اللہ احسن الخالقین"

یہ کیسی منزل ہے کہ جو اس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ یہ وہی مرحلہ ہے۔ جب بے جان "جنین" زندگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اس میں حرکت اور احساس پیدا ہوتا ہے۔ جنبش کرتا ہے۔ اسلامی روایات میں اس مرحلے کو "نفخ روح، (روح پھونکے جانے کا مرحلہ) کہتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے۔ جہاں انسان ایک جست کے ساتھ جماداتی اور نباتاتی زندگی سے حیواناتی اور اس سے بھی کہیں آگے انسانی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور اس کا فاصلہ پہلے مراحل سے اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ "ثم خلقنا" کے الفاظ اس کا مفہوم ادا کرنے سے کوتاہ دامنی کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا "ثم انشانا" فرما کر اس منزل کی رفعت کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ وہ منزل ہے، جہاں انسان ایک مخصوص ساخت اور پرداخت کا حامل ہو کر عالم میں ممتاز حیثیت حاصل کر لیتا ہے جس بنا پر یہ اللہ کی خلافت کا اہل بنتا ہے اور جو امانت آسمان اور پہاڑ نہ اٹھا سکے تھے۔ اس کا قرعہ اس کے نام نکلتا ہے۔

واقعی یہ وہ مقام ہے جہاں "عالم کبیر" اپنی تمام تر وسعتوں اور رفعتوں کے ساتھ اس "عالم صغیر" میں سمو دیا جاتا ہے اور حقیقی معنیٰ میں (تبارک اللہ احسن الخالقین) کا شاہکار قرار پاتا ہے۔

۳۔ ہڈیوں پر گوشت کا غلاف زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں تفسیر فی ظلال القرآن" کا مؤلف ایک عجیب جملہ لکھتا ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ "جنین" جب "علقہ" اور "مضغہ" کے مراحل سے گزر جاتا ہے تو اس کے تمام سیل ہڈیوں کے خلیوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد تدریجاً ہڈیوں پر عضلات اور گوشت کا غلاف چڑھتا ہے۔ اس بنا پر (کسونا العظام لحما) کا جملہ ایک سائنسی معجزہ ہے جو ایسے سائنسی مسئلہ کی نقاب کشائی کر رہا ہے، جو اس زمانے میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا۔ کیونکہ قرآن مجید یہ نہیں کہتا کہ ہم نے "مضغہ" کو ہڈی اور گوشت میں بدلا۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ "مضغہ" کو ہڈی بنایا، پھر اس پر گوشت کا غلاف چڑھایا۔ گویا واضح کر رہا ہے کہ "مضغہ" پہلے ہڈی میں تبدیل ہوتا ہے اور اس کے بعد اس پر گوشت کی تہ چڑھتی ہے۔

۴۔ ہڈیوں کا پائیدار اور محافظ غلاف دراصل عضلات اور گوشت پوست کو ہڈیوں کے لباس سے تعبیر کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ اگر ہڈیوں کے اوپر یہ لباس نہ ہوتا تو انسان کا جسم نہایت کریہہ المنظر اور بدصورت دکھائی دیتا۔ (بالکل ان انسانی ساپنوں کی طرح جو اگر چہ ہم نے دیکھے نہیں۔ البتہ ان کی تصاویر ضرور دیکھی ہیں۔)

قطع نظر اس سے کہ لباس انسان کے جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ گوشت پوست اور عضلات بھی ہڈیوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر ہڈیوں پر یہ موٹا غلاف نہ ہوتا تو جسم پر لگنے والی ہر چوٹ ہڈیوں کو براہ راست

Marfat.com

نقصان پہنچاتی اور انھیں توڑ دیتی۔

جس طرح لباس انسان کے جسم کی سردی یا گرمی سے حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح گوشت ہڈیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جو انسانی جسم کا اصل ڈھانچہ ہیں۔ ان تمام امور کا واضح بیان قرآن مجید کے علوم کی گہرائی کی روشن علامت ہے۔

Marfat.com

۱۷۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا
كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝
۱۸۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ
فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ ۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ۚ
۱۹۔ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ
لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ۙ
۲۰۔ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ
وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ۝
۲۱۔ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا
فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّ
مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ۙ
۲۲۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝ۧ

ترجمہ

۱۷۔ اور یقیناً ہم نے تمہارے اوپر سات راستے (منزلیں) بنائے ہیں اور
ہم (اپنی) مخلوق سے نہ کبھی غافل تھے اور نہ ہیں۔
۱۸۔ اور ہم نے آسمان سے ایک معین مقدار میں پانی اتارا اور اسے زمین

Marfat.com

میں (مخصوص جگہوں پر) ٹھہرا دیا اور ہم اسے لے جانے پر مکمل طور پر قادر ہیں۔

۱۹۔ پھر اسی کے ذریعے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ اگائے اور ان باغوں میں بہت زیادہ پھل ہیں۔ کہ جن میں سے تم کھاتے ہو۔

۲۰۔ اور وہ درخت جو طور سینا سے اُگتا ہے، اس میں روغنیات بھی ہیں اور کھانے والوں کے لیے سالن بھی فراہم ہوتا ہے۔

۲۱۔ اور تمہارے لیے چوپایوں میں ایک سبق ہے، ان کے پیٹ میں (دودھ کی صورت میں) جو کچھ ہے، اس سے ہم تمھیں سیراب کرتے ہیں۔ ان میں تمہارے لیے بہت سے فائدے ہیں اور ان کا گوشت بھی تم کھاتے ہو۔

۲۲۔ نیز تم ان پر اور کشتیوں پر سواری کرتے ہو۔

تفسیر

توحید کی نشانیوں کا ایک بار پھر تذکرہ۔

ہم نے اُوپر بیان کیا کہ مومنین کے اوصاف بیان کرنے کے بعد قرآن مجید ایمان کے حصول کے طریقے بیان کرتا ہے گذشتہ آیتوں میں اللہ کی قدرت وعظمت کی وہ نشانیاں جو خود ہمارے جسموں میں موجود ہیں۔ کا تذکرہ کیا گیا۔ زیرِ بحث آیتوں میں انسان سے باہر کی کائنات میں اللہ نشانیوں میں سے زمین وآسمان میں اس کی عظمتِ قدرت کے مظاہر کا تذکرہ ہے۔

سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں (و لقد خلقنا فوقکم سبع طرائق)۔

"طرائق" "طریقہ" کی جمع ہے۔ اور اس کا مطلب راستہ یا عمارت کی منزل ہے۔ اولذکر معنیٰ کی بنیاد

Marfat.com

پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ ہم نے تمھارے اُوپر سات راستے بنائے۔ شاید یہ فرشتوں کی آمد ورفت کے راستوں کا ذکر ہو یا ستاروں اور سیاروں کے مداروں کا ذکر ہو۔ موخرالذکر معنی کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے تمھارے اوپر سات منزلیں (سات آسمان) بنائے۔

سات آسمان کے بارے میں ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارۃً عرض ہے کہ اگر سات کے عدد کو تکثیر کے معنی میں لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمھارے اوپر بہت سے کرات سماوی، اجرام فلکی، عوالم، ستارے اور سیارے ہیں۔

منزلوں کا مفہوم کسی طرح بھی بطلیموسی نظریئے پر منطبق نہیں ہوتا۔ کہ جس کے مطابق سات آسمان پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر موجود ہیں اور نہ ہی یہ تصور ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید ایک باطل مفروضے کو اپنی گفتگو کی بنیاد بنائے، بلکہ طرائق اور طبقات اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ ہم سے مختلف فاصلوں پر مختلف عوالم اور جہان آباد ہیں اور ہمارے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک دوسرے سے اُوپر ہے۔ بعض بہت دُور ہیں اور بعض نزدیک۔

اور اگر "سبع" کے معنیٰ صرف سات لیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جس کائنات کو ہم دیکھتے ہیں۔ (جو ہماری کہکشاؤں، سیاروں اور ستاروں کا مجموعہ ہے) اس کے علاوہ اور عالم ہیں جو ہمارے اوپر بنائے گئے ہیں۔ اور جن تک ابھی انسان کو دسترس حاصل نہیں ہوئی ہے۔

اگر نظام شمسی کا بغور جائزہ لیں، سُورج کے گرد مختلف سیاروں کی ترتیب کا گہرا مطالعہ کریں تو ایک اور تفسیر بھی کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ سُورج کے گرد گھومنے والے سیاروں کی کل تعداد ۹ ہے، عطارد اور زہرہ نامی دو سیاروں کا مدار زمین کے مدار کے نیچے ہے اور باقی چھ سیاروں کا مدار زمین کے اُوپر عین اس طرح ہے، جس طرح چند منزلہ عمارت کی منزلیں ہوتی ہیں۔ مزید براں چاند کا مدار بھی زمین کے اُوپر ہی ہے، اس طرح زمین کے اُوپر منزل بہ منزل کل سات مدار ہُوئے گویا زمین کے اوپر سات منزلیں قرار پاتی ہیں۔ (غور کیجیے گا) [1]

مختلف کہکشاؤں اور عوالم کی کثرتِ وسعت سے شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے کہ ان کا پیدا کرنے والا کہیں ان سے غافل نہ ہو جائے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہُوئے آیت کے آخری حصّے میں ارشاد ہوتا ہے۔ ہم اپنی پیدا کردہ خلقت سے غافل نہ تھے اور نہ ہیں۔ (وماکنا عن الخلق غٰفلین)۔

یہاں لفظ "خلق" استعمال کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ "خلقت کا وجود بجائے خود دلیل ہے کہ پیدا کرنے والے کے علم میں سب کچھ ہے اور اس کی پوری توجہ اس کی طرف مبذول ہے اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا، کہ پیدا کرنے والا اپنی مخلوق سے غافل ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کی تفسیر یہ ہو کہ ہم نے فرشتوں کی آمد ورفت کے لیے تمھارے اوپر بہت سے راستے بنا رکھے ہیں۔ ہم تمھارے حالات سے بے خبر نہیں اور ہمارے فرشتے بھی تمہاری حرکات وسکنات کے گواہ ہیں۔

---

[1] سات آسمانوں کی مزید وضاحت کے لیے اسی تفسیر کی پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

بعد کی آیت زمین و آسمان کی ان گنت برکتوں اور نعمتوں اور اللہ کی قدرت کاملہ کے لاتعداد مظاہر میں سے ایک مظہر "بارش" کے بارے میں کہہ رہی ہے : ہم نے آسمان سے ایک معین مقدار میں پانی اُتارا ۔ (وانزلنا من السماء ماء بقدر)۔ نہ اتنی زیادہ بارش کہ بہالے جانا والا سیلاب بن جائے اور نہ اتنی کم نباتات وحیوانات کی پیاس بھی نہ بجھے ۔ اس میں شک نہیں کہ آسمانوں کے بعد جب زمین پر نظر کریں تو عطیات پروردگار میں سے اہم ترین عطیہ پانی ہے ۔ جو تمام زندہ موجودات کی زندگی کا ضامن ہے ۔ اس کے بعد اس سلسلے کا ایک اور زیادہ اہم مسئلہ یعنی زیرزمین پانی کے ذخائر کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ ہم نے اس پانی کو زیرزمین پانی کے ذخائر میں محفوظ کیا ہے ۔ حالانکہ اگر ہم چاہتے کہ اسے ختم کر دیں ۔ تو ہمیں ایسا کرنے کی پوری طاقت ہے (فاسکناہ فی الارض وانا علی ذھاب بہ لقادرون)۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین کی دو بالکل مختلف طبقوں سے تشکیل پائی ہے ایک پانی کو اپنے اندر جذب کرنے والا اور دوسرا جذب نہ کرنے والا۔ اگر زمین کا کرلیسٹ (THE CROST) ہر جگہ جاذب ہوتا تو چاہے کتنا بھی مینہ برستا زمین کے اندر ہی جذب ہو کر اس کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے ، وسیع و عریض زمین کی تمام سطح خشک رہتی اور پانی کا ایک قطرہ تک نہ ملتا۔

اس کے برعکس اگر ہر جگہ زمین کی سطح غیر جاذب اور سنگلاخ ہوتی تو بارش کا سارے کا سارا پانی سطح زمین کے اوپر ہی رہتا اور رطوبت تعفن کا یہ عالم ہوتا کہ عرصۂ زمین انسان کے لیے تنگ ہو جاتا اور زندگی کا ضامن پانی انسان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتا ۔ لیکن احسان کرنے والے عظیم اللہ نے زمین کی سطح کے اُوپر کے حصّے کو جاذب آب اور نچلے حِصّے کو غیر جاذب بنایا تاکہ سطح زمین سے پانی تو نیچے چلا جائے ۔ مگر اتھاہ گہرائیوں میں کم ہونے کی بجائے ایک خاص گہرائی تک جا کر غیر جاذب سطح پر رُک کر اکٹھا ہو جائے ۔ تاکہ بعد میں کنوؤں اور چشموں اور ٹیوب ویلوں کی صورت میں فضا کو مکدر کیے بغیر انسان کے لیے قابلِ استفادہ بن سکے۔

یہ خوشگوار اور مزیدار پانی جو آج ہم گہرے کنوؤں سے نکال کر اپنے اندر نئی توانائی پیدا کرتے ہیں ۔ شاید ہزاروں برس پہلے برسنے والی گھٹاؤں کا ہو جو متعفن ہوئے بغیر آج کے لیے جمع کیا گیا ہو۔ بہر حال وہ ذات بابرکات جس نے انسان کو زندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور پانی کو زندگی کا اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس نے انسان سے بہت پہلے اس مادہ حیات کو جمع کرنے کیلئے اہم ذخائر پیدا کئے اور ان میں پانی جمع کیا۔

البتہ "برف" کی صورت میں اس "مادۂ حیات" کا ایک حصّہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی ہے ۔ جو یا تو سال بھر برابر پگھل پگھل کر دریاؤں کا منبع قرار پاتا ہے یا صدیوں بلکہ ہزاروں سال "گلیشیر" کی صورت میں وہیں رُکا رہتا ہے ، حتیٰ کہ موسمی تغیر و تبدل کے ذریعے اسے نیچے پھسلنے کا حکم دیا جاتا ہے تاکہ پیاسے اور خشک بیابانوں کو سیراب کرے ۔

لیکن "فی الارض" میں "ارض" کے ساتھ "فی" پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت زیرزمین پانی کے ذخائر کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔ نہ کہ اُوپر کے ذخائر کی طرف ۔

---

۱ یاد رہے کہ گندے پانی کا زمین میں جذب ہونا اس کی تطہیر کا سبب بنتا ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد بارش کے بابرکت اثرات اور اس سے ہونے والی پیداوار کی طرف اشارہ ہو رہا ہے: اور اس کے ذریعے ہم نے تمہارے لیے کھجور اور انگور کے باغ اگا دیئے جن میں تمہارے کھانے کے لیئے ڈھیر سارے پھل موجود ہیں۔ (فانشأنا لکم بہ جنات من نخیل واعناب لکم فیھا فواکہ کثیرۃ ومنھا تأکلون)۔

بارش سے پیدا ہونے والے پھل صرف کھجور اور انگور ہی تو نہیں ہوں۔ بلکہ طرح طرح کے ان گنت پھل ہیں اور دیگر پیداوار بھی ہے۔ آیت میں صرف ان دو کا ذکر مجموعی پیداوار میں سے عمدہ اور اعلیٰ ہونے کی بنا پر کیا گیا ہے اور "منھا تأکلون" یعنی ان میں سے تم کھاتے ہو" شاید اس طرف اشارہ ہو کہ نعمتوں سے مالا مال ان باغوں میں صرف پھل فروٹ ہی تو نہیں۔ بلکہ یہ کھانے پینے کی چیزیں ان گنت پیداوار کا ایک حصہ ہیں۔

نخلستانوں سمیت تمام باغات انسان کی غذائی ضروریات کے علاوہ اور بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔ مثلاً ان کے پتوں سے چٹائیاں اور بعض اوقات کپڑے بھی بنتے ہیں۔ ان کی لکڑی سے گھر، فرنیچر اور سواریاں بنتی ہیں۔ بعض درختوں کی جڑی بوٹیوں سے دوائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ انسان کے کام کرنے والے جانور پتوں سے پیٹ پالتے ہیں۔ اور لکڑیاں بطور ایندھن استعمال ہوتی ہیں۔

فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں "منھا تأکلون" سے ایک اور احتمال کا اظہار بھی کیا ہے۔ بقول ان کے اس سے یہ مراد ہے کہ

یہ باغات تمہارا ذریعۂ معاش ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں کام سے روٹی کھاتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی کی گزربسر اس کام پر ہے۔ [1]

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ زیر بحث آیت میں انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز "نطفے کا پانی" اور نباتاتی زندگی کا نقطۂ آغاز "بارش کا پانی"، بیان کیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ زندگی کے ان دونوں نمونوں کا سرچشمہ پانی ہے۔ بے شک ہر جگہ اللہ کا ایک ہی قانون حکم فرما ہے۔

اس کے بعد بارش کے پانی سے نمو پانے والے ایک اور بابرکت درخت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ کھجور، انگور اور دیگر پھلوں کے درختوں کے علاوہ "طور سینا سے اُگنے والا ایک اور درخت بھی ہے۔ جس سے تیل اور سالن کھانے والوں کو حاصل ہوتا ہے" (وشجرۃ تخرج من طور سیناء تنبت بالدھن وصبغ للأکلین)۔

طور سینا کے متعلق مفسرین نے دو عمدہ احتمالات کا اظہار کیا ہے۔

(۱) صحرائے سینا میں موجود مشہور "کوہ طور" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے کوہ طور سے اگنے والے درخت کو "زیتون کا درخت" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حجاز کے عرب جب بے آب و گیاہ صحراؤں سے گذرتے ہوئے شمال کی طرف بڑھتے تھے۔ تو زیتون کے درختوں سے بھرا ہوا پہلا زرخیز علاقہ صحرائے سینا کے جنوب میں یہی طور کا علاقہ تھا (نقشہ دیکھنے سے

---

[1] پہلی تفسیر کی بنا پر "من" "تبعیضیہ" ہے اور دوسری کے مطابق "نشویہ" ہے۔

Marfat.com

بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے)

(۱) "طورسینا" بطور صفت استعمال ہوا ہے یہ اصطلاح بابرکت اور مقدس پہاڑ یا "درختوں سے بھرا ہوا پہاڑ اور یا خوبصورت وحسین پہاڑ کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ "طور" بمعنی پہاڑ ہے، اور "سینا" بابرکت، خوبصورت اور سرسبز وشاداب کے معنے میں ہے۔

"صبغ" کا مطلب دراصل "رنگ" ہے۔ عام طور کھانا کھاتے ہوئے انسان جب چپاتی سالن کے ساتھ کھاتا ہے تو وہ رنگین ہوجاتی ہے۔ لہذا تمام قسم کے روٹی سالن کو "صبغ" کہا گیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ صبغ زیتون کے تیل، کی طرف اشارہ کررہا ہو، جسے کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے یا مختلف قسم کے سالن کی طرف اشارہ ہو جو مختلف درختوں سے تیار کیے جاتے ہیں۔

اس مقام پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ طرح طرح کے بے شمار پھلوں میں سے صرف کھجور، انگور اور زیتون تین پھلوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے، ماہرین خوراک کی جدید تحقیق کے مطابق بہت کم پھل ایسے ہیں۔ جو انسانی صحت کے لیے ان تین پھلوں کے برابر مفید اور مؤثر ہوں۔

زیتون کا تیل انسانی بدن کی ساخت اور مفید رطوبتوں کے لحاظ سے بڑی قابل قدر شے ہے، اس میں حرارتی عنصر بہت زیادہ ہے جگر کے لیے مفید ہے اور گردوں کے کئی عارضوں کو ختم کرنے والا ہے، گردے کے درد اور پتھری کا بہترین نسخہ ہے۔ اعصاب کے لیے مقوی ہے۔ مختصر یہ کہ انسانی صحت کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

"کھجور" کی اتنی تعریف کی گئی ہے کہ اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہے، کھجور سے حاصل کی ہوئی چینی اعلیٰ اور مکمل چینی ہے ماہرین خوراک کی اکثریت کے مطابق کھجور "مانع سرطان" ہے۔ ماہرین نے اس میں تیرہ قسم کی حیاتین اور پانچ قسم کے وٹامن کا انکشاف کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ کھجور کو قیمتی غذا کے سرچشمہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اور "انگور" بعض ماہرین کے مطابق ایک فطری "میڈیکل سٹور" ہے۔ انسانی بدن کے لیے شیر مادر کی سی خاصیتیں رکھتا ہے، جسم میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے، مصفیٰ خون ہے، بدن کے زہریلے مادے خارج کردیتا ہے اور اس میں موجود طرح طرح کے وٹامن انسان کو قوت وطاقت دیتے ہیں۔ [1]

نباتاتی نعمتوں کے بعد بارش کے پانی سے پلنے والی حیواناتی نعمتوں کے ایک اہم حصے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ چوپایوں میں تمہارے لیے لمحہ فکریہ ہے (وان لکم فی الانعام لعبرة)۔[2]

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے، اس سے ہم تمھیں سیراب کرتے ہیں۔ (نسقیکم مما فی بطونها)۔

---

[1] ان تین حیات بخش پھلوں کی مزید تفصیلات کے لیے اس تفسیر کی جلد ۱۱ ص۲۱۲ پر سورۂ نحل آیت نمبر ۱۱ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

[2] یہاں۔ "عبرة" کا بطور نکرہ استعمال اس عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔

Marfat.com

بے شک خون اور اسی طرح کی کئی ایک غلاظتوں میں سے "دودھ" جیسی مزیدار اور خوشگو مقوی اور مکمل غذا نکالی جاتی ہے۔ تاکہ انسان سمجھ سکے کہ اللہ آلودہ چیزوں میں سے پاک اور مزیدار چیز نکالنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہا جا رہا ہے کہ جانوروں سے متعلق سبق آموز امور کی برکتیں اور نعمتیں صرف دودھ تک ہی محدود نہیں بلکہ ان میں تمہارے لیے اور بھی فائدے ہیں اور تم ان کا گوشت کھاتے ہو (ولکم فیھا منافع کثیرۃ ومنھا تأکلون)۔

حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے گوشت کا استعمال جسم کی غذائی ضرورت کو پورا کرتا ہے، اس کے علاوہ ان کی کھالیں کئی قسم کے لباس اور شامیانے وغیرہ بنانے کے کام آتی ہیں۔ ان کے بالوں سے چٹائیاں، لباس، اون اور کئی طرح کے اوچھاڑ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ ان کے بدن کے بعض اعضاء سے دوائیاں بنتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے گوبر سے ایندھن کے علاوہ درختوں اور فصلوں کے لیے بڑی مفید کھاد تیار کی جاتی ہے۔ ان سب سے قطع و نظر سواری کے لیے خشکی میں چوپایوں کو اور دریاؤں میں کشتی کو استعمال کرتے ہو اور اپنی منزلوں تک پہنچتے ہو۔

(وعلیھا وعلی الفلک تحملون) [1]

جانوروں کی انواع، خواص اور فوائد واقعی سرمایۂ غور و فکر ہیں۔ ایک طرف یہ انسان کو ان نعمتوں کے پیدا کرنے والے کی معرفت دلاتے ہیں اور دوسری طرف اس کو شکر گزاری کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔ [2]

یہاں صرف ایک سوال باقی رہتا ہے، وہ یہ کہ چوپائے اور کشتیاں ایک ہی صف میں کیسے کھڑی کر دی گئی ہیں؟ ایک نقطے کو سمجھنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انسان کو ساری زمین میں سواری کی ضرورت ہے۔ اس لیے بری سواری کے ساتھ ساتھ بحری سواری کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ میں بھی انسان کو عطا کی جانے والی نعمتوں کے ذیل میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

"وحملناھم فی البر والبحر"

"ہم انہیں خشکیوں اور پانیوں میں ادھر ادھر لے جاتے ہیں۔"

---

[1] اس تفسیر کی جلد ۱۱ میں سورۂ نحل آیت ۸۰ کی تفسیر کے ذیل میں جانوروں سے استفادہ کے بارے میں مفصل بحث موجود ہے۔

[2] اس تفسیر کی جلد ۱۱ میں سورۂ نحل آیت نمبر ۱۴ اور اسی جلد ۱۴ سورۂ حج آیت ۶۵ کی تفسیر کے ذیل میں کشتیوں کی اہمیت اور ان سے استفادہ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

۲۳۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

۲۴۔ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○ ۚ

۲۵۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ○

ترجمہ

۲۳۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، انھوں نے اپنی قوم سے کہا" اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی اور معبود نہیں کیا تم (پھر بھی بتوں کی پرستش سے) پرہیز نہیں کرتے؟

۲۴۔ ان کی قوم کے سردار (اور مغرور لوگ) کہ جو کافر تھے، کہنے لگے کہ یہ شخص تمھاری ہی طرح کا بشر ہے اور یہ تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے، اور اگر اللہ نبی بھیجنا چاہتا تو فرشتے نازل کرتا، ہم اپنے آباء و اجداد سے اس قسم

Marfat.com

کی کوئی بات کبھی نہیں سُنی ۔

۲۵۔ یہ آدمی تو بس ایک طرح کے جنون میں مبتلا ہے۔ کچھ عرصہ اس کے بارے میں صبر کرو (یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو جائے یا یہ اس بیماری سے نجات پالے)

تفسیر

کوردل مغروروں کی منطق

گذشتہ آیتوں میں توحید، معرفت پروردگار اور عالم خلقت میں اس کی عظمت کے دلائل کے بارے میں گفتگو تھی اسی مطلب کو عظیم انبیاءؑ کی زبانی اور ان کی تاریخ کے حوالے زیر بحث لایا گیا ہے۔ آئندہ کی آیات میں بھی یہی سلسلۂ کلام جاری جاری ہے۔

سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر حضرت نوحؑ جو توحید کے داعی اور اس کی تبلیغ و ترویج کرنے والے ہیں۔ سے ابتدا کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا، میری قوم! خدائے واحد کی عبادت کرو کہ جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ (ولقد ارسلنا نوحًا الیٰ قومہ فقال یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ)۔

کیا اس واضح بیان کے باوجود تم بتوں کی پرستش سے پرہیز نہیں کرتے (افلا تتقون)۔

اس پر ان کی قوم کے دولت مند، مالدار اور مغرور افراد جو صرف ظاہر بین اور کور باطن تھے، کہنے لگے۔ یہ تمہاری طرح کا ایک عام آدمی ہے، جو تم پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی جذبے کے تحت یہ تم پر مسلط ہونا چاہتا ہے۔ (فقال الملؤا الذین کفروا من قومہ ماھذا الا بشر مثلکم یرید ان یتفضل علیکم)۔

اور یوں ان کا انسان ہونا انہیں حضرت نوحؑ کا پہلا "عیب" نظر آیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے ان پر الزام لگایا کہ یہ "ہوس اقتدار" میں مبتلا ہے۔ اور اس مقصد کو پانے کے لیے اُس نے توحید، دین اور تبلیغ کرنے کا ڈھونگ رچایا ہے۔ انہوں نے یہ کہا: اگر اللہ کوئی رسول بھیجتا بھی یقیناً اس مقصد کے لیے فرشتے بھیجتا (ولو شاء اللہ لانزل ملٰئکۃ)۔

Marfat.com

اس مہمل اور فضول منطق کی دلیل انھوں نے یہ پیش کی کہ "ہم نے اپنے آباء و اجداد سے کبھی یہ نہیں سُنا کہ ایک انسان نبوت کا دعوٰی کرے یا اپنے آپ کو اللہ کا نمائندہ سمجھے۔ (ما سمعنا بھٰذا فی اٰبائنا الاولین)۔

لیکن ان بے بنیاد باتوں نے عظیم پیغمبرؑ کے پائے استقلال میں کوئی تزلزل پیدا نہ کیا۔ اور انہوں نے پُورے زور وشور سے اپنی دعوت جاری رکھی اور ان کے کسی کام میں بڑا بننے اور خواہش اقتدار کی کوئی علامت نہ تھی۔

چنانچہ انہوں نے ان پر "پاگل پن اور دیوانگی" کا ایک اور الزام لگایا۔ یہ وہ الزام ہے جو تاریخ انبیاء میں اکثر پیغمبروں پر لگایا جاتا رہا ہے۔ وہ کہنے لگے: وہ تو ایک پاگل اور دیوانہ آدمی ہے، لہٰذا اس وقت تک تمہیں صبر کرنا چاہیئے کہ اسے موت آجائے یا اس مرض سے شفا پالے (ان ھو الا رجل بہٖ جنۃ فتربصوا بہٖ حتّٰی حین)۔

لائق توجہ بات ہے کہ انھوں نے اس اولوالعزم پیغمبرؑ پر "پاگل پن" اور "دیوانگی" کی تہمت اس لیے لگائی تاکہ وہ اس حقیقت کو پُوری طرح چھپا سکیں کہ اس کی ساری باتیں عقل و منطق کی بہترین مثال ہیں۔ دراصل وہ کہنا چاہتے تھے کہ چونکہ دیوانگی کی کئی قسمیں ہیں اور بیشتر پاگل پن کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ ان پر دوروں کی سی کیفیت ہوتی ہے کبھی صحیح العقل نظر آتے ہیں اور کبھی پاگل۔

"فتربصوا بہٖ حتّٰی حین" کا جملہ شاید حضرت نوحؑ کی موت تک کے انتظار کی طرف اشارہ ہو، جس کا مخالفین بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے سے "دیوانگی" کی بیماری پر وہ تاکید مزید کر رہے ہوں، یعنی ان کی صحت یابی تک انتظار کرو۔ [1]

بہرحال حضرت نوحؑ پر انہوں نے اپنی باتوں میں تین بیہودہ اور متضاد الزامات لگائے اور ہر ایک الزام کو ان کی رسالت کی نفی کی دلیل قرار دیا۔ اُن کی طرف سے یہ الزامات تھے۔

(i) اصولی طور پر انسان کی طرف سے نبوت کا دعوٰی سراسر جھوٹ ہے اور پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا اور اگر اللہ نبی ہی بھیجنا چاہتا تو لازمی طور پر فرشتوں سے یہ کام لیتا۔

(ii) نوحؑ ایک اقتدار پسند شخص ہے اور اپنے اس مقصد کو پانے کے لیے اس نے نبوت کے دعوے کو ذریعہ بنایا ہے۔

(iii) نوحؑ صحیح الدماغ آدمی نہیں ہے اور اس کا دعوائے نبوت اسی بیماری کا نتیجہ ہے۔

چونکہ ان بے بنیاد اور بے ربط الزامات کے جوابات بالکل واضح ہیں۔ اور کئی جگہ پر دیئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر قرآن مجید نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ مُسلم ہے کہ انسان کا رہبر خود اسی کی نوع سے ہونا چاہیئے

---

[1] - بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ "اس کو کچھ مدت کے لیے قید کر دو، اور بعض نے یہ مراد لی ہے "سردست اسے اس کے حال پر چھوڑ دو پھر دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ دونوں تفسیریں ہرگز صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

Marfat.com

تاکہ وہ انسانی ضروریات، تکالیف اور مسائل سے واقفیت رکھتا ہو، مزید برآں ہمیشہ سے ہی پیغمبرؑ خود بنی نوع انسان سے ہی ہوا کرتے تھے۔ دوسرے انبیاءؑ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ان کی نمایاں ترین صفات تواضع انکساری اور ہر قسم کی بالادستی اور اقتدار پسندی کی نفی رہی ہے اور انبیاء کی عقل اور سوجھ بوجھ ان کے دشمنوں پر بھی بالکل آشکار تھی اور وہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

Marfat.com

۲۶۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ○
۲۷۔ فَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا
فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِیْهَا مِنْ
كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ
عَلَیْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ
ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○
۲۸۔ فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○
۲۹۔ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ
الْمُنْزِلِیْنَ ○
۳۰۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ○

ترجمہ

۲۶۔ (نوح نے کہا) پالنے والے مجھے جھٹلانے والوں کے خلاف میری مدد فرما۔

۲۷۔ ہم نے (نوح کو) وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہمارے فرمان کے مطابق کشتی بنا۔ پس جب (ان کو غرق کرنے کے لیے) ہمارا حکم

Marfat.com

آئے اور تنور سے پانی ابلنے لگے (جو طوفان آپہنچنے کی نشانی ہے) تو تمام جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں بٹھالے۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی بٹھالے، سوائے ان کے جن کی ہلاکت کا پہلے ہی سے حکم جاری کر دیا گیا ہے (یہ اشارہ حضرت نوحؑ کی بیوی اور ان کے ناخلف بیٹے کی طرف ہے) اور ان ظالموں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا، کیونکہ انھیں تو ہلاک ہی ہونا ہے۔

۲۸۔ اور جب تم اور تمھارے ساتھی کشتی میں ٹھیک سے بیٹھ جائیں تو کہنا تعریف کے لائق وہی ذات ہے۔ جس نے ہمیں ظالموں سے نجات بخشی۔

۲۹۔ اور کہنا: پالنے والے ہمیں بابرکت جگہ پر پار لگا۔ کہ تو بہترین پار لگانے والا ہے۔

۳۰۔ (بے شک) اس (واقعے) میں عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور ہم یقیناً سب کی آزمائش کریں گے۔

تفسیر

ایک باغی قوم کا انجام

گذشتہ آیتوں میں دشمنوں کی طرف سے حضرت نوحؑ پر لگائے جانے والے چند بے بنیاد الزامات کا تذکرہ کیا گیا۔ قرآن مجید کی دیگر آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرکش قوم کی طرف سے دی جانے والی اذیتیں یہی نہیں تھیں۔ بلکہ وہ جس طرح سے بھی آپؑ کو تنگ کر سکتے تھے۔ انہوں نے کیا۔ حضرت نوحؑ نے اپنی تمام ممکنہ کوششوں کے ساتھ انہیں شرک

Marfat.com

کفر اور گمراہی سے نکالنا چاہا۔ لیکن حب سوائے معدودے چند افراد کے ان پر کوئی ایمان نہ لایا تو آپؑ مایوس ہو گئے اور اللہ سے مدد چاہی۔ اس مرحلے کا ذکر زیرِ بحث پہلی آیت میں کیا جا رہا ہے۔

اس نے عرض کیا: پالنے والے! مجھے جھٹلانے والوں کے خلاف میری مدد فرما۔ (قال رب انصرنی بما کذبون)۔[1]

اللہ کا حکم آپہنچا حضرت نوحؑ اور آپ کے چند ساتھیوں کو نجات ملی اور ہٹ دھرم کافروں اور مشرکوں کی سزا کے لیے حالات پیدا ہو گئے۔ "ہم نے نوحؑ کو وحی کی کہ ہماری ہدایات کے مطابق اور ہماری نگرانی میں کشتی بنا۔ (فاوحینا الیہ ان اصنع الفلک باعیننا ووحینا)۔

"باعیننا" یعنی ہماری نظروں کے سامنے) اس کا یہ مفہوم ہے کہ تمہاری تمام تر کارکردگی ہمارے سامنے ہے اور تمہیں ہماری پوری تائید حاصل ہے۔ لہٰذا مطمئن ہو کر اپنے مشن کو جاری رکھو اور کسی خوف وخطر کو خاطر میں نہ لاؤ۔ "وحینا" سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی سازی کی تفصیلات وحی سے سیکھیں، کیونکہ تاریخ کے مطابق اس زمانے تک کشتی کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے مقصد کی ضروریات کے مطابق کشتی کو ہر عیب اور نقص کے بغیر بنایا اس کے بعد ارشاد ہوا۔ اور جب ہمارا فرمان پہنچے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ تنور سے پانی ابلنے لگے گا۔ سمجھ لینا کہ طوفان کا وقت آگیا ہے تو فوراً ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں بٹھا لینا۔ (فاذا جآء امرنا وفار التنور فاسلک فیھا من کل زوجین اثنین)۔

اپنے اہلِ خانہ اور دوستوں میں سے صاحبانِ ایمان کو بھی بٹھا لینا، مگر ان کو نہ بٹھانا جن کی ہلاکت کا پہلے سے فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ (حضرت نوحؑ کی بیوی اور ایک بیٹے کی طرف اشارہ ہے) (واھلک الا من سبق علیہ القول منھم)۔

اس کے بعد یہ کہا جا رہا ہے: اور ان ظالموں (کہ جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اور دوسروں پر بھی ظلم کیا) کے بارے میں کوئی سفارش نہ کرنا، کیونکہ وہ سب کے سب غرق ہو کے رہیں گے۔ اور اس میں کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون)۔

یہ تنبیہ اس لیے کر دی گئی تھی کہ شاید حضرت نوحؑ انسانی فطری جذبے، شفقتِ پدری سے متاثر ہو جائیں اور ان کی سفارش کر بیٹھیں، جب کہ وہ کسی قسم کی سفارش کے مستحق نہیں تھے۔

بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: جس وقت تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں ٹھیک سے بیٹھ جاؤ۔ تو اس نعمت

---

[1] "بما کذبون" کی "با" شاید سببی ہو یا بائے سببیت" اور اس میں "ما" شاید "مصدریہ ہو یا "موصولہ" ہر ایک صورت میں معنی جدا ہوں گے، مگر مفہوم میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہو گا۔

(قابل غور ہے)

Marfat.com

عظمی پر اللہ کی حمد و ثناء کرو اور کہو کہ تعریف ہے اس خدا کی جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دی (فاذا استویت انت ومن معك على الفلك فقل الحمد لله الذى نجانا من القوم الظالمين)۔

اللہ کی حمد کے ظالموں سے نجات" جیسی عظیم نعمت پانے کے بعد یوں دعا کرو: اور کہو! پالنے والے! مجھے بابرکت جگہ پر پارلگانا کہ تو بہترین پار لگانے والا ہے۔ (وقل رب انزلنى منزلا مباركا وانت خير المنزلين)۔

لفظ "منزل" شاید اسم مکان ہو، یعنی طوفان ختم جانے کے بعد ہماری کشتی ایسی سرزمین پر پہنچانا جو کثیر برکتوں کی حامل ہو۔ تاکہ ہم اطمینان سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ یہ مصدر میمی بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ہمارا زمین پر اترنا نہایت موزوں اور مناسب ہو۔ کیونکہ طوفان کے بعد جب کشتی زمین پر رکے گی۔ تو کشتی میں سوار لوگوں کو کئی خطرات کا سامنا ہوگا۔ مثلاً رہنے سہنے کے لیے سازگار جگہ کا نہ ہونا، خوراک اور غذا کی کمی اور وبا پھوٹنے کا ڈر وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضرت نوحؑ دعا کر رہے ہیں۔ کہ یا اللہ انھیں صحیح و سالم اور موزوں کیفیت میں زمین پر اتار دے۔

زیر نظر آخری آیت میں مجموعی طور پر پورے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ نوحؑ اور ان کی کامیابی اور ظالم اور باغی قوم کو ان کی بداعمالیوں کی سخت سزا کے اس سارے واقعے میں صاحبان عقل و فکر کے لیے عبرت و سبق کی نشانیاں موجود ہیں۔ (ان فى ذلك لآيات)۔

اور یقیناً ہم سب کی آزمائش کریں گے (وان كنا لمبتلين)۔

شاید یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ ہم نے قوم نوحؑ کو ہر طرح سے آزمایا اور جب وہ لوگ ہر امتحان میں ناکام رہے، تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا کہ اس سے جملے کا مفہوم یہ ہو کہ ہم ہر زمانے میں ہر جگہ کے لوگوں کو آزماتے اور پرکھتے رہیں گے۔ اور مذکورہ بالا واقعات صرف قوم نوحؑ ہی سے خصوصیت نہیں رکھتے۔ ہر دور میں مختلف طریقوں سے آزمائش جاری رہے گی اور جو لوگ انسان کی ترقی و تکامل کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے۔ انہیں ہٹا دیا جائے گا۔ تاکہ انسان اپنی راہ تکامل پر گامزن رہے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ زیر بحث آیتوں میں صرف حضرت نوحؑ کے کشتی بنانے اور ان کے اور ان کے ساتھیوں کے سوار ہونے اور نجات پانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر گنہگاروں کا انجام کیا ہوا، کچھ وضاحت نہیں کی گئی۔ البتہ (انهم مغرقون) (وہ یقیناً غرق ہوں گے) کے جملے سے انکا انجام بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا وعدہ ہمیشہ سچا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ قوم نوحؑ عظیم پیغمبر کے خلاف ان کی کاروائیاں اور پھر ان کا عبرتناک انجام، کشتی سازی کا واقعہ تنور سے پانی کا ابلنا، طوفان کا سب کو گھیر لینا، حضرت نوحؑ کے بیٹے کا غرق ہونا وغیرہ بہت سے اہم نکات ہیں۔ جن کا ہم نے جلد ۹ میں سورۂ ہود کی تفسیر کے ذیل میں مفصل جائزہ لیا ہے۔ انشاء اللہ باقی تفصیلات سورۂ نوحؑ کی تفسیر میں آئیں گی۔

Marfat.com

۳۱- ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۚ ۝
۳۲- فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝
۳۳- وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا
تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝
۳۴- وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ۝
۳۵- اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّ
عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝
۳۶- هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝
۳۷- اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝
۳۸- اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ ۨافْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ
لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝
۳۹- قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝

Marfat.com

۴۰۔ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝

۴۱۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ
فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۱۔ پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور قوم کو پیدا کر دیا۔

۳۲۔ اور ہم نے انہی میں سے ایک رسول ان کی طرف بھیجا کہ خدائے
یکتا کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کوئی اور تمھارا معبود نہیں۔ کیا
(اس کے باوجود شرک و بت پرستی) سے تم پرہیز نہیں کرتے۔

۳۳۔ اس کی قوم کے وہ وڈیرے جو کافر ہو گئے اور انھوں نے بقائے
آخرت کو جھٹلایا تھا اور جنھیں ہم نے دنیا میں نعمتوں سے نوازا تھا بولے
یہ تو تمھاری ہی طرح کا ایک بشر ہے۔ جو تمھاری ہی طرح کھاتا ہے اور جو کچھ تم
پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔

۳۴۔ اور اگر اپنی ہی طرح کے ایک بشر کی اطاعت کرو گے تو گھاٹے میں
رہو گے۔

۳۵۔ کیا تم سے وہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو
جاؤ گے۔ تو دوبارہ تم قبروں سے نکلو گے۔

۳۶۔ بہت بعید اور بہت بعید ہیں وہ وعدے کہ جو تم سے کیے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

۳۷۔ زندگی یہی دُنیا ہی کی ہے۔ برابر یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ کچھ لوگ مرجاتے ہیں اور دوسرے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ہم ہرگز دوبارہ اُٹھائے نہیں جائیں گے۔

۳۸۔ یہ محض ایک جھوٹا شخص ہے، جس نے اللہ پر بہتان باندھا ہے، ہم اس کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

۳۹۔ اس نے عرض کیا! پالنے والے ان کی طرف سے جھٹلانے کے خلاف میری مدد فرما۔

۴۰۔ اللہ نے فرمایا: بہت جلد وہ اپنے کیئے پر پچھتائیں گے۔ مگر اس وقت جب کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

۴۱۔ پس بجا طور پر آسمانی بجلی نے انھیں آلیا۔ اور ہم نے انھیں سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی مانند کردیا، دُور ہوا ئے ظالم قوم! رحمت خدا سے۔

تفسیر

قوم ثمود کا عبرتناک انجام

زیر بحث آیتیں، حضرت نوح کے بعد آنے والی دیگر اقوام اور ان کے نظریات جو سابق کفار سے ہم آہنگ تھے۔ کا تذکرہ کررہی ہیں۔ اسی طرح ان کے دردناک انجام کا ذکر کرتے ہیں۔

گذشتہ آیتوں میں کی گئی بحث کی تکمیل کررہی ہیں۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے۔: ان کے بعد ہم نے ایک اور گروہ کو پیدا کیا اور ایک دوسری قوم معرض وجود میں آگئی۔ (ثم انشأنا من بعدھم قرنا اٰخرین)

"قرن" کا مادہ "اقتران" ہے۔ اور اس کا معنی قریب اور نزدیک ہے۔ چنانچہ وہ قومیں جو ایک ہی زمانے میں ہوں ان کو "قرن" کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان کے دور کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔ مختلف قوموں کے نزدیک قرن کی مقدار مختلف ہے یہ تیس سال کا بھی ہوتا ہے اور سو سال کا بھی۔

Marfat.com

چونکہ انسان کسی منصوص من اللہ رہبر و قائد کے بغیر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ للہذا اللہ نے توحید کی دعوت دینے اور آئین حق کی تبلیغ کے لیے ایک پیغمبر کو ان کی طرف بھیجا تاکہ ان کو کہے کہ اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں (فارسلنا فیھم رسولا منھم ان اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ)۔

یہ وہی دعوت ہے جو انبیاءؑ کے مشن کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ توحید کی آواز تھی جو انفرادی اور اجتماعی تمام بھلائیوں کی اساس ہے۔ اس کے بعد اللہ کا نمائندہ تاکید مزید کے طور پر کہتا ہے: "کیا اس واضح دعوتِ توحید کے بعد بھی تم شرک و بت پرستی سے پرہیز نہیں کرو گے (افلا تتقون)۔

یہ کونسی قوم تھی اور ان کے پیغمبر کا کیا نام تھا۔ اس سلسلے میں مفسرین نے قرآن مجید کی دیگر آیات کے مطالعہ سے دو احتمالات کا اظہار کیا ہے۔

(ا) یہ قوم ثمود ہے جو حجاز کے شمال میں آباد تھی۔ اللہ کے عظیم نبی حضرت صالحؑ ان کی طرف مبعوث برسالت ہُوئے۔ مگر قوم نے انکار کیا نافرمانی اور سرکشی کی۔ آخر کار دل دہلا دینے والی ایک "صیحہ آسمانی" (ہولناک بجلی) گری اور وہ سب نیست و نابود ہو گئے اس دعوے کا ثبوت ان کو دی جانے والی سزا "صیحہ" ہے جو زیرِ بحث آیت کے آخر میں بیان کی گئی ہے اور سُورہ ہُود کی آیت نمبر ۶۷ میں بھی قوم صالح کے بارے میں اسی سزا کا ذکر ہے۔

(ii) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ قوم عاد ہے۔ ان کے پیغمبر حضرت ہُود تھے۔ قرآن مجید کی بعض آیتوں میں ان کی روداد قوم نوح کے واقعات کے فوراً بعد بیان کی گئی ہے۔ یہی اس دعوے کی دلیل ہے۔ [1]

لیکن سورۂ "الحاقہ" کی آیت ۶، ۷ کے مطابق قوم عاد کی سزا شدید قسم کی تیز آندھی تھی جو برابر سات راتیں اور آٹھ دن ان کے درپے رہی۔ اس لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ اس عظیم پیغمبرؑ کی دعوتِ توحید کے جواب میں سرکش قوم کا ردّ عمل کیا تھا، قرآن مجید کے بقول وڈیروں کے اس خود پسند طبقے نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا کہ آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا۔ حالانکہ ہم نے انہیں دُنیا کی بہت سی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تمہاری ہی طرح کا انسان ہے۔ جو تم کھاتے ہو۔ یہ بھی کھاتا ہے۔ اور جو تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔ (و قال الملا من قومہ الذین کفروا وکذبوا بلقاء الاخرۃ واترفناھم فی الحیوۃ الدنیا ماھذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منہ و یشرب مما تشربون)۔

بے شک وہ اشراف کا خوشحال طبقہ جو قرآن مجید کی اصطلاح میں "ملاً" ہے۔ (یہ طبقہ صرف ظاہر بین تھا اور کور باطن تھا) وہ اس عظیم پیغمبر کے مشن کو اپنے مفاد کا مخالف، ناجائز منافع خوری، استحصال اور بے جا بالادستی سے متصادم دیکھ رہا تھا۔ یہ طبقہ اپنی پُر تعیش زندگی کی وجہ سے اللہ سے کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اور آخرت کا منکر تھا۔

---

[1] سورہ ہود آیت ۵۰، سورۂ اعراف آیت ۶۵ اور سورۂ شعراء کی آیت نمبر ۱۲۳ ملاحظہ ہوں۔

Marfat.com

یہ طبقہ اس عظیم پیغمبر کے مقابلے میں آگیا۔ اس کے خیالات اور نظریات بالکل وہی تھے جو قوم نوحؑ کے متکبر وڈیروں کے تھے۔ انہوں نے اللہ کے نمائندوں کے انسان ہونے اور دیگر انسانوں کی طرح کھانے پینے کو ان کی رسالت کی نفی کی دلیل قرار دیا۔ حالانکہ یہ بات ان مایۂ ناز شخصیتوں کی نبوت و رسالت کی پُرزور تائید تھی۔ کہ وہ عام لوگوں میں سے ہوں تاکہ انسان کی ضروریات اور مسائل سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ مزید براں وہ ایک دوسرے سے کہتے۔ اگر تم اپنے ہی جیسے آدمی کے مطیع ہوگے تو یہ بڑی نقصان دہ بات ہوگی۔ (ولئن اطعتم بشرًا مثلکم انکم اذًا الخاسرون)۔

یہ کور باطن اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ خود تو یہ توقع کر رہے ہیں کہ لوگ ان کے شیطانی عزائم کی تکمیل اور پیغمبر سے مقابلے کے لیے ان کی پیروی کریں، مگر اس شخصیت کی اطاعت و پیروی کو جو منبع وحی سے وابستہ ہے اور جس کا دل نورِ علم پروردگارِ عالمین سے منور ہے۔ انسان کے لیے ذلت، ننگ و عار اور "حریت" کے منافی بتا رہے تھے۔

اس کے بعد انھوں نے معاد اور قیامت کا انکار کیا، جس کو ماننا ہمیشہ سے خود سر اور ہوا و ہوس کے رہبر لوگوں کے لیے مشکل رہا ہے۔ اور کہا، کیا یہ شخص تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ مرنے کے بعد مٹی اور بوسیدہ ہڈی ہو جانے کے بعد تم ایک بار پھر قبروں سے نکلو گے اور ایک نئی زندگی پاؤ گے۔ (ایعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابًا وعظامًا انکم مخرجون)۔

بہت دور اور بہت دُور کی بات ہیں وہ وعدے جو تم سے کیئے گئے، بالکل بے بنیاد اور کھوکھلے ہیں۔ (هیهات هیهات لما توعدون)۔

مجموعی طور پر کیا یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی جو مر گیا ہو۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا ہو، اس کے اجزاء ادھر اُدھر بکھر گئے ہوں، وہ دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ محال ہے، یہ محال بات ہے۔

مزید براں معاد کے انکار پر تاکید مزید کے طور پر انہوں نے یہ بھی کہا:

زندگی صرف یہی دنیاوی زندگی ہی تو ہے۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ ایک گروہ مر جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ لہٰذا موت کے بعد کچھ بھی نہیں ہے اور ہم ہرگز قبروں سے نہیں اٹھیں گے۔ (ان هی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین)۔

آخر میں اپنے نبی پر ایک مجموعی الزام لگاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ یہ ایک جھوٹا شخص ہے، جس نے اللہ پر بہتان باندھا ہے اور ہم اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے (ان هو الا رجل افترٰی علی اللّٰهِ کذبًا وما نحن له بمؤمنین)۔

نہ اس کی رسالت اللہ کی طرف سے ہے نہ قیامت سے متعلق اس کے وعدے سچے ہیں اور نہ ہی دوسرے احکام ایسے ہیں۔ کوئی عقلمند آدمی اس پر کیسے ایمان لا سکتا ہے۔ یوں ان کی سرکشی اور ہٹ دھرمی حد سے بڑھ گئی، شرم و حیا کی تمام حدود پھلانگ گئے اور اپنے نبی کے معجزات، پیغام اور انسان ساز دعوت کے انکار میں آخری حد تک چلے گئے۔ بالفاظ دیگر ان سب پر جب حجت تمام ہوگئی تو اس عظیم پیغمبر نے اللہ سے فریاد کی، پالنے والے ان کی طرف سے جھٹلائے جانے کے

Marfat.com

خلاف میری مدد فرما۔ (قال رب انصرنی بما کذبون)۔

انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا اور میرے خلاف جو بھی کر سکتے تھے کر گزرے۔ میری مدد تو فرما۔ اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا۔ بہت جلد یہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ اور جو انہوں نے بویا ہے ضرور کاٹیں گے۔ (قال عما قلیل لیصبحن نادمین)۔

مگر وہ اس وقت پشیمان ہوں گے، جب گذر چکا ہوگا اور وہ ایسی جگہ پہنچ چکے ہوں گے جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں۔ اور نہ ہی ان کا پچھتاوا ان کو کوئی فائدہ دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اچانک بجا طور پر ایک اندوہناک صیحۂ آسمانی نے انھیں آلیا (فاخذتهم الصيحة بالحق)۔

دل دہلا دینے والی مہیب آواز کے ساتھ دہشت ناک بجلی کوندی اور زبردست دھماکہ ہوا۔ ہر جگہ تہ و بالا ہوگئی۔ سب کچھ درہم برہم ہوگیا اور ان کے مردہ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ان کی بربادی کچھ ایسی صورت کے ساتھ ہوئی کہ ان کو اپنے گھروں سے بھاگ نکلنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ گھروں میں ہی دب کے رہ گئے اور آیت کے آخری حصے میں اس کا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے۔ "ہم نے ان کو اس طرح کچل کے رکھ دیا جس طرح سیل زندہ رو کے سامنے بھوسے کے ایک تنکے کی حالت ہوتی ہے (فجعلناهم غثاء)

اور اے ظالم قوم، رحمتِ خدا سے دور ہو۔ (فبعداً للقوم الظالمين)۔

چند اہم نکات

۱۔ پر تعیش زندگی اور اس کے منحوس نتائج

مذکورہ بالا آیتوں میں اشراف کی پر تعیش زندگی اور قیامت و معاد کے انکار میں ایک خاص ربط نظر آتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ پُر تعیش زندگی بسر کرنے والے عام طور پر مادر پدر آزادی چاہتے ہیں۔ حیوانی لذات اور مادی جذبات کی تسکین کے لیے ہر ہتھکنڈے کو جائز سمجھتے ہیں۔ واضح ہے کہ اللہ کی نگرانی اور قیامت کی عدالت پر ایمان ان کے اس طرز عمل میں زبردست رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

ان کے دل غیر مطمئن رہتے ہیں۔ اور عوام الناس کو ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اسی سبب سے ایسے لوگ مبداء اور اللہ کی طرف بازگشت کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور اس کی بندگی کا جوا رکھیسر اپنے گلے سے اتار پھینکتے ہیں۔ اور مذکورہ بالا آیت کے بقول وہ یہ کہتے رہتے ہیں۔ کہ زندگی اسی دُنیا کی زندگی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور جو شخص بھی اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے۔ وہ جھوٹا ہے۔ اس دنیا میں جتنا وقت بھی ملے اس کو غنیمت جانو۔ چار دن کی زندگی ہنسی خوشی گزار دو۔ ہر درخت کا پھل چکھو۔ لذت کا ہر ذریعہ استعمال کرو اور ہر لذت کا لطف اٹھاؤ ...... وغیرہ وغیرہ۔ یوں وہ اپنی سیاہ کاریوں اور بد اعمالیوں کی توجیہہ کرتے رہتے ہیں۔

علاوہ بریں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کے وسائل دوسروں کے حقوق غصب کر کے ہی مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ اور ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ انبیاء کی نبوت اور قیامت کا انکار کیے بغیر طمطراق سے زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی اور یہ وہ مقام ہے جہاں تک پہنچنے والوں کی اکثریت عام مشاہدہ کے مطابق ہر حقیقت سے صرف نظر آتی ہے اور قابل احترام حقائق کو نہایت

Marfat.com

تحقیر کے ساتھ روندتی چلی جاتی ہے۔ یہ دل کے اندھے اور بہرے، ہوس نفسانی کے جنگل میں پوری طرح جکڑے ہوتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور لطف و کرم سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر شہوات حیوانی کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ دوسروں کے غلاموں کی بندگی کرتے ہیں۔ یہ لوگ کوتاہ فکر، پست خیال، کورہ ذہن، غلیظ رُوح اور تاریک دل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا دور کا منظر اور ظاہر شاید بعض لوگوں کے لیے خوش نما اور جاذب نظر ہو۔ مگر قریب کا منظر اور حقیقی حال بڑا دحشت ناک اور گھناؤنا ہوتا ہے۔ کیونکہ ارتکاب گناہ اور جرائم کی وجہ سے برابر مضطرب اور بے چین رہتے ہیں۔ اور تعیش و عیش پرستی کے وسائل چھن جانے اور موت آنے کا خوف ہمہ گیر خوف ان کو مسلسل بے قرار کئے رکھتا ہے۔

۲۔ "تراب" اور "عظام" کا مفہوم "تراب" کا مطلب مٹی اور "عظام" کا معنیٰ ہڈیاں ہے۔ مرنے کے بعد عام طور پر جسد خاکی پہلے بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہوتا ہے اور اس کے بعد مٹی بن جاتا ہے لیکن مذکورہ آیت میں "تراب" کو "عظام" پر مقدم کیا گیا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے ؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ شاید آیت میں جسد خاکی کو دو حصے مانا گیا ہو۔ یعنی گوشت اور ہڈیاں، گوشت پہلے ہڈیوں سے الگ ہو کر گر جاتا ہے اور مٹی میں فنا ہو جاتا ہے، ہڈیاں سالوں بعد فنا ہوتی ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ "تراب" سے مراد زمانہ قدیم کے لوگ ہوں، جو بالکل مٹی ہو چکے ہیں اور "عظام" سے ماضی قریب کے اسلاف ہوں، جن کی بوسیدہ ہڈیاں ابھی باقی ہیں [۱]

۳۔ "غثاء" سے کیا مراد ہے مذکورہ بالا آیت کے مطابق "صیحہ آسمانی" کی وجہ سے قوم ثمود "غثاء" کی طرح ہوگئی۔ "غثاء" کے لغوی معنےٰ "بھوسے" کے ہیں، جو سیلاب کے پانی کے اوپر انتہائی پراگندہ صورت میں نظر آتا ہے۔ اس جھاگ کو بھی "غثاء" کہتے ہیں۔ جو پکتے ہوئے کھانے کی دیگ میں جوش کی صورت میں اوپر آجاتی ہے۔ قوم ثمود کے بے جان لاشوں کو "غثاء" سے تشبیہ دینا اور دراصل ان کی نہایت کمزور شکستہ، منتشر اور ذلیل و پست کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ سیل تند رو کی طاقت وعظمت کے سامنے حقیر بھوسے کے تنکے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ سیلاب کے وقت بھوسہ اپنے ارادے اور مرضی سے کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ سیلاب کے بعد اس کا کوئی نام و نشان باقی رہتا ہے۔

"صیحہ آسمانی" کے بارے میں اس تفسیر کی جلد ۹ میں سورۂ ہود آیت نمبر ۶۷ کی تفسیر کے ذیل میں ہم مفصل بیان کر چکے ہیں۔ البتہ یہ عذاب صرف قوم ثمود پر ہی نازل نہیں ہوا، بلکہ بعض دوسری نافرمان قوموں پر بھی آیا ہے، جنکی تفصیل اپنے مقام پر بیان کردی گئی ہے۔

۴۔ ایک عمومی انجام دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ آیت کے آخری حصے میں مسئلے کو خصوصی کیفیت سے نکال کر ایک عمومی شکل دی گئی ہے۔ یعنی ایک قاعدہ کلیہ بنایا گیا ہے۔ کہ

---

[۱] تفسیر روح المعانی زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں۔

Marfat.com

"ظالم لوگ رحمتِ پروردگار سے دور ہیں"

دراصل یہ ان آیات میں بیان شدہ کفر، تکذیب اور معاد و قیامت سے انکار اور نافرمان قوم کے عبرتناک انجام سارے واقعے کا آخری اور حتمی نتیجہ ہے۔ جو کسی خاص اُمت اور گروہ سے خصوصیت نہیں رکھتا۔ بلکہ تمام نافرمان لوگ اس میں شامل ہیں۔

Marfat.com

۴۲۔ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ؕ
۴۳۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ؕ
۴۴۔ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا
كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ
فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ پھر ان کے بعد ہم نے اور قومیں پیدا کیں۔

۴۳۔ کوئی قوم وقت سے پہلے اپنے انجام کو نہیں پہنچتی اور نہ ہی وقت آنے پر اس میں تاخیر ہوسکتی ہے۔

۴۴۔ پھر ہم نے یکے بعد دیگرے بہت سے پیغمبر بھیجے، جب کسی امت کی (ہدایت کے لیے) اس کے پاس نبی بھیجا گیا، اس کو جھٹلایا گیا، پس ہم نے بھی ایک ایک کر کے سب کو ہلاک کر دیا۔ اور ان کو قصہ پارینہ بنا دیا (اور وہ اس طرح مٹ گئیں کہ صرف نام باقی رہ گیا) پس دُور ہو رحمتِ خدا سے اے بے ایمان قوم!

Marfat.com

تفسیر

سرکش اقوام کی یکے بعد دیگرے ہلاکت

زیر بحث آیتوں میں قرآن مجید قوم ثمود کے بعد اور حضرت موسیٰ سے پہلے آنے والی اقوام کا ذکر رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کے بعد پھر ہم نے دوسری قومیں پیدا کردیں۔ (ثُمَّ انشانا من بعدھم قرونا اخرین)۔

کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے فیوض و برکات کو منقطع نہیں کرتا۔ بلکہ اگر ایک قوم انسان کے ارتقاء و تکامل کی راہ میں حائل ہو تو اسے ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لے آتا ہے اور یونہی انسانیت کا قافلہ سُوئے منزل بڑھتا رہتا ہے۔ البتہ یہ مختلف قومیں اپنے اپنے دور اور معین مدت کے لیے برسرِ عمل رہیں اور کسی قوم کا اختتام اپنے معینہ وقت سے نہ پہلے ہوتا ہے اور نہ اس میں تاخیر کی جاتی ہے (ما تسبق من امۃ اجلھا وما یستأخرون)۔

جب کسی قوم کے اختتام کا پروانہ صادر کردیا جاتا ہے تو اس خاص معینہ وقت پر وہ قوم ہلاک ہو جاتی۔ نہ ایک لمحہ پہلے نہ بعد۔ "اجل" سے مراد کسی چیز کی عمر اور مدتِ وجود ہے۔ کبھی یہ لفظ اختتام کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادھار کی اجل اتنی مدت ہے (یعنی اتنی مدت کے بعد ادھار کا وقت ختم ہو جائے گا) البتہ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں۔ کہ "اجل" کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اٹل (۲) مشروط یا معلق۔

کسی چیز، شخص یا قوم کے اختتام کا حتمی اور فیصلہ شدہ وقت جس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ اسے اٹل اجل کہتے ہیں۔

اجل مشروط یا معلق "کسی چیز، شخص یا قوم کے اختتام کے لیے جو شرائط ہوں۔ وہ پوری نہ ہوں یا کوئی مانع پیش آجائے جس کی وجہ سے اس میں کمی و بیشی ممکن ہو جائے اسے اجل مشروط کہتے ہیں، بہرحال اس سلسلے میں ہم اسی تفسیر کی جلد نمبر ۵ میں سورۃ انعام کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں سیر حاصل بحث کرچکے ہیں۔ البتہ زیر بحث آیتوں میں حتمی اجل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بعد کی آیت اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہے کہ انسانی تاریخ میں انبیاء کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا، ارشاد ہوتا ہے "ہم نے یکے بعد دیگرے لگاتار انبیاء بھیجے۔ (ثم ارسلنا رسلنا تترا)۔

"تترا" کا مادہ "وتر" ہے۔ جس کے معنی لگاتار کے ہیں۔ اور اس سے وہ روایت جو لگاتار راویوں سے ہم تک پہنچیں، ان کو "متواتر روایات" (اخبار متواتر) کہا جاتا ہے، جس سے کسی خبر کے صحیح ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

"وتر" کا اصل مطلب کمان کی وہ رسی یا وہ چمڑا ہے جو کمان کے دونوں سروں سے بندھا ہوتا ہے۔ اور تیر لگاتے

Marfat.com

وقت دونوں سروں کو قریب لے آتا ہے۔ ساخت کے لحاظ سے لفظ "تترا" دراصل "وترا" تھا اور "واؤ" "ت" میں تبدیل ہو گئی ہے۔

بہر حال آسمانی راہبر ہدایت کے لیے آتے تھے۔ مگر نافرمان اور خودسر اقوام جُوں کی توں کفر اور الحاد پر اڑی رہتی تھیں۔ اس طرح سے کہ جب کوئی رسول کسی اُمّت کے پاس آتا تو اُمّت اسے جھٹلاتی۔ (کلما جاء امة رسولها کذبوه)۔

اور جب ان کی سرکشی اور جھٹلانا حد سے بڑھ جاتا اور ہمارے رسول کی طرف سے ہر طرح سے اتمام حجت ہو جاتی۔ تو ہم اس امت کو نابود کر دیتے۔ اس طرح ہم نے کئی قومیں یکے بعد دیگرے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ (فاتبعنا بعضهم بعضًا)۔

قومیں تو مٹ گئیں، البتہ قصّے اور کہانیاں باقی رہ گئیں۔ بے شک ہم نے ان کو قصہ پارینہ بنا دیا۔ (وجعلناهم احاديث)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات بطور مجموعی قوم تو تباہ کر دی جاتی مگر اس کے بعض افراد یا جگہوں کے آثار عبرتناک سبق آموز اور نمایاں کیفیت میں ادھر اُدھر باقی رہ جاتے یا کبھی اس طرح ہوتا کہ قوم مکمل تباہ ہو جاتی اور صرف تاریخ کے صفحوں یا لوگوں کی باتوں میں ان کا نام رہ جاتا، ہماری نظر میں یہ سرکش قومیں دوسری کیفیت کی مصداق ہیں[1]
آیت کے آخری حصے میں گذشتہ آیت کی طرح ارشاد ہوتا ہے: دور ہو بے ایمان قوم! رحمتِ خدا سے۔ (فبعدًا لقوم لا يؤمنون)۔

بے شک یہ دردناک انجام ان کی بے ایمانی کا نتیجہ تھا، اس بنا پر یہ انجام صرف انہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر بے ایمان، باغی اور ظالم کا یہی مقدر ہوگا اور وہ بھی اس طرح نا پید ہوگا کہ صرف اس کا بُرا نام تاریخ میں یا لوگوں کی زبانوں پر باقی رہ جائے گا۔ یہی نہیں کہ اس قسم کے لوگ صرف دُنیا ہی میں رحمت پروردگار سے محروم ہیں۔ بلکہ آخرت میں بھی اللہ کے لطف و کرم اور مہربانیوں سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ آیت کے مفہوم کے مطابق اس محرومی میں دنیا و آخرت دونوں شامل ہیں۔

---

[1] احادیث "حدیث" کی جمع ہے اور ہماری نظر اسی کی مذکورہ بالا تفسیر ہے مگر بعض دوسرے مفسرین کے خیال میں یہ "احدوثہ" کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے "عجیب قصّے" جن کے بارے میں لوگ اکثر باتیں کیا کرتے ہیں۔ فخر الدین رازی نے اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں یہ بات لکھی ہے۔

Marfat.com

۴۵۔ ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَ
سُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ۙ
۴۶۔ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا
قَوۡمًا عَالِيۡنَ ۚ
۴۷۔ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا
عٰبِدُوۡنَ ۚ
۴۸۔ فَكَذَّبُوۡهُمَا فَكَانُوۡا مِنَ الۡمُهۡلَكِيۡنَ
۴۹۔ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ

ترجمہ

۴۵۔ پھر ہم نے موسٰی اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور روشن دلیل دے کر بھیجا۔

۴۶۔ فرعون اور اس کے حامی اشراف کی طرف مگر انہوں نے تکبر کا مظاہرہ کیا اور وہ بڑائی کے خواہاں تھے۔

۴۷۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کی قوم (بنی اسرائیل) ہماری عبادت کرتی ہے (اور ہماری غلام ہے)

۴۸۔ (بہرحال) انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا اور آخرکار وہ سب ہلاک کر

Marfat.com

دیئے گئے۔

۴۹۔ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی کہ شاید وہ (بنی اسرائیل) ہدایت پالیں۔

تفسیر

حضرت موسیٰؑ کا قیام اور فرعونیوں کی تباہی

اب تک حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر سے پہلے کی امتوں کے بارے میں بیان کیا جا رہا تھا۔ زیر بحث آیتوں میں نہایت اختصار کے ساتھ فرعونیوں کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے قیام اور مغرور قوم کے انجام کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے: پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی واضح نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا۔ (ثُمَّ اَرسلنا موسیٰ واخاہ ھارون بِاٰیاتنا وسلطان مبین)۔

"آیات" اور "سلطان مبین" سے کیا مراد ہے اور ان دونوں کا آپس میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مختلف خیال پائے جاتے ہیں۔

(i) بعض نے کہا 'آیات' سے مراد وہ نو معجزات ہیں جو اللہ نے موسیٰ بن عمران کو دیئے۔ بلکہ "سلطان مبین" سے سے مراد فرعونیوں کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کے دندان شکن منطقی دلائل ہیں۔

(ii) بعض دیگر افراد کے خیال میں آیات سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عام معجزات ہیں اور "سلطان مبین" سے مراد بڑے معجزے یعنی "عصا" کا اژدھا بننا اور "ید بیضا" ہے۔ کیونکہ یہ دو بڑے اہم معجزے تھے جو فرعونیوں پر حضرت موسیٰؑ کی واضح کامیابی کا سبب بنے۔

(iii) ایک دوسرے گروہ کے خیال میں "آیات" سے مراد، تورات کی عبادت اور احکام کا بیان اور "سلطان مبین" سے حضرت موسیٰ کے معجزات مراد ہیں۔

لیکن قرآن مجید میں "سلطان مبین" کی اصطلاح کے دیگر استعمال کے پیش منظر، اوّل الذکر تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اکثر مقام پر لفظ "سلطان" یا "سلطان مبین" واضح دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔[۱]

---

[۱] سورۂ نمل آیت ۲۱۔

لاعذبنه عذابًا شديدًا اولا ذبحنه او ليأتيني بسلطان مبين،

اور سورۂ نجم آیت ۲۳

(بقیہ حاشیہ صفحہ برآیندہ)

Marfat.com

بے شک ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو فرعون اور اس کے مغرور وڈیرے حامیوں کی طرف اپنی نشانیوں اور "سلطان مبین" کے ساتھ بھیجا (الیٰ فرعون وملائہ)۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے موسیٰ و ہارونؑ کو فرعون اور اس کے مصاحب سرداروں کی طرف بھیجا، یعنی خوشحال اور مراعات یافتہ طبقے کا ذکر ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ مصر کے تمام لوگوں کی طرف بھیجا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت یہ بتانا چاہتی ہے کہ اس وقت کی تمام بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں کی جڑ یہی مراعات یافتہ طبقہ تھا کہ سرگروہ ٹھیک ہو جاتے تو باقی لوگوں کا مسئلہ آسان تھا، قطع نظر اس سے کہ وہ وقت کے حاکم اور سیاہ وسفید کے مالک تھے دراصل آیت یہ بتانا چاہتی ہے کہ جب تک کسی ملک کے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کی اصلاح نہ ہو، کچھ نہیں ہو سکتا لیکن فرعون اور اس کے مصاحبوں نے تکبر وغرور کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ کی قوت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا (فاستکبروا) اور بنیادی طور پر وہ بڑائی کے خواہاں تھے (وکانوا قومًا عالین)۔

"استکبروا" اور "کانوا قوما عالین" کے الفاظ میں فرق ہے۔ اس طرح کہ "استکبروا" سے مراد حضرت موسیٰ کی دعوت کے مقابلے میں ان کا فوری اظہار تکبر ہے۔ جبکہ "کانوا قوما عالین" کا جملہ اس حقیقت کا عکاس ہے کہ تکبر ان کی فکر و ذہنیت کا جزو تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا لفظ ان کے تکبر کا مظہر ہو اور دوسرا ان کے عام پر تعیش اور ٹھاٹھ کے رہن سہن کی طرف اشارہ ہو، جو دراصل ان کے تکبر کی اصل وجہ تھی۔

ان کے تکبر اور غرور کی روشن نشانی ان کا کہا ہوا اگلا جملہ ہے۔ "وہ بولے کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔ (فقالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومهما لنا عابدون)[1]۔

یعنی نہ صرف یہ کہ ہم ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے، بلکہ انہیں ہماری غلامی کرنی چاہیئے، وہ انبیاء کرامؑ پر الزام لگاتے تھے کہ وہ اور تسلط طلب اور بڑا بننے کے خواہاں ہیں۔ جب کہ خود بدترین اقتدار پرست اور تسلط طلب تھے۔ یہی بات ان کی اس گفتگو سے واضح ہو رہی ہے۔

بہرحال ان مہمل اور بے ہودہ دلائل کا سہارا لے کر انہوں نے حق مخالفت کی اور انہوں نے موسیٰؑ و ہارونؑ کو جھٹلایا اور ہلاک ہونے والوں میں سے قرار پائے۔ (فکذبوهما فکانوا من المهلكين)۔

اور یوں آخرکار بنی اسرائیل کے اصلی دشمن جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی دعوت میں سدِ راہ تھے، تباہ ہو گئے

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

ان هی الا اسماء سمیتموها انتم وآباؤکم ما انزل الله بها من سلطان۔

دونوں آیتوں میں مثال موجود ہے۔

[1] انسان کو "بشر" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا "بشرہ" یعنی جلد برہنہ حالت میں نظر آتی ہے۔ برخلاف حیوانات کے جن پر قدرتی طور پر بال وغیرہ ہوتے ہیں اور عام طور پر کھال دکھائی نہیں دیتی۔ دراصل وہ بے عقل ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو موسمی تبدیلیوں سے بچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے انہیں طبعی لباس دیا گیا، مگر انسان کو صاحب عقل ہونے کی وجہ سے یوں رکھا گیا ہے۔

Marfat.com

اور بنی اسرائیل کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کا زمانہ آگیا۔

اس موقع پر اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل کی اور بنی اسرائیل کو خدائی لائحۂ عمل پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی، چنانچہ آخری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی تاکہ اس کے ذریعے بنی اسرائیل ہدایت پائیں۔ (ولقد اتینا موسی الکتاب لعلھم یھتدون)۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ گذشتہ آیتوں میں جبکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہ السلام کے فرعونیوں کے ساتھ مقابلے کی بات چل رہی تھی تو جملوں کی تمام ضمیریں تثنیہ کی صورت میں آئی ہیں۔ لیکن نزولِ تورات کا ذکر آیا تو حضرت موسیٰؑ کا نام لیا گیا۔ اور حضرت ہارونؑ کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں شخصیتوں میں سے حضرت موسیٰ ہی صاحب کتاب و شریعت اور اولوا العزم تھے۔ مزید برآں نزولِ تورات کے موقع پر صرف حضرت موسیٰ ہی کوہ طور پر موجود تھے اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بنی اسرائیل کے پاس تھے۔[1]

---

[1] حضرت موسیٰؑ کی بعثت، فرعون اور اس کے حواریوں سے آپ کا مقابلہ اور دیگر واقعات کی تفصیل ہم جلد ۶ سورۂ اعراف آیت ۱۰۳ تا ۱۶۲ اور جلد ۱۳ سورہ طٰہٰ کی آیت ۸ تا ۸۰ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

۵۰۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۝

ترجمہ

۵۰۔ ہم نے عیسیٰ ابن مریم اور ان کی والدہ (مریم) کو اپنی نشانی قرار دیا اور ہم نے انہیں ایک بلند و بالا پر سکون اور چشموں والے علاقے میں جگہ دی۔

تفسیر

اللہ کی ایک اور نشانی

انبیاء کے حالات کی تفصیل کے آخری حصے میں مختصر سا اشارہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کی طرف کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

ہم نے عیسیٰؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کو اپنی عظمت و قدرت کی نشانی قرار دیا (وجعلنا ابن مریم وامہ اٰیۃ)۔

لفظ عیسیٰ کی بجائے "ابن مریم" کہہ کر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ کہ آپ بغیر باپ کے اللہ کے خاص حکم سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یوں پیدا ہونا بجائے خود اللہ کی قدرت کاملہ کی ایک بڑی نشانی تھی۔ مزید برآں چونکہ اس محیر العقول پیدائش کا تعلق ایک طرف حضرت عیسیٰ سے ہے اور دوسری طرف جناب مریم سے لہٰذا دونوں کو الگ الگ نشانی اور آیت شمار کیا گیا ہے۔ البتہ دو مختلف زاویوں سے یہ ایک ہی حقیقت ہے (یعنی بچے کا بغیر باپ کے پیدا ہو جانا اور ایک عورت کا بغیر کسی مرد سے ملاپ کے حاملہ ہو جانا) اس کے بعد ان کو عطا کی گئی چند عظیم نعمتوں اور آسائشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے:

ہم نے ان دونوں کو ایک بلند پر سکون اور جاری پانی والی جگہ دی۔ (واوینا ھما الی ربوۃ ذات قرار ومعین)۔

"ربوہ" "ربا" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ زیادہ ہونا اور افزائش ہے اور یہاں بلند اور اونچی جگہ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

Marfat.com

"معین"، "معن" (بروزن "شأن") سے ہے اور اس کا مطلب جاری پانی ہے۔ اس لیے جاری پانی کو "مآء معین" کہتے ہیں۔ بعض نے اس لفظ کو "عین" سے ماخوذ مانا ہے یعنی وہ پانی جو ظاہر ہو اور آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ ¹

بہرحال یہ اس پُرسکون اور پُرآرائش مقام کی طرف ایک مجمل سا اشارہ ہے۔ جو اللہ نے ان دونوں ماں بیٹے کو عطا کیا تھا تاکہ دشمن کی آنکھوں سے اوجھل اطمینان سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ البتہ یہ مقام جغرافیائی لحاظ سے کہاں واقع ہے۔ اس بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

(i) بعض مفسرین کے خیال کے مطابق شامات کا ایک شہر "ناصرہ" حضرت عیسٰی کی جائے ولادت ہے۔ ان کے بقول جب حضرت عیسٰیؑ پیدا ہوئے تو بعض دشمنوں کو ان کی ولادت اور آئندہ پروگرام کے متعلق اجمالی سی معلومات ملیں اور وہ انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوئے۔ مگر اللہ نے انھیں ایک محفوظ اور پُرآسائش مقام پر پہنچا دیا اور انہیں محفوظ رکھا۔

(ii) دوسروں کے خیال میں یہ مصر کا کوئی علاقہ ہے۔ کیونکہ حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدہ ماجدہ نے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک مدت تک مصر میں قیام کیا تھا۔

(iii) بعض کے خیال میں یہ دمشق کا علاقہ ہے۔

(iv) بعض کے خیال میں یہ "رملہ" (بیت المقدس کے شمال میں ایک شہر ہے) کا علاقہ ہے۔ کیونکہ حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ ماجدہ نے ان دونوں علاقوں میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔

(v) یہ خیال بھی ہے کہ مذکورہ بالا جملے سے مراد بیت المقدس کے گرد و نواح میں وہ جنگل ہو، جہاں آپ کی ولادت ہوئی، جہاں ماں بیٹے کے لیے خوشگوار پانی جاری کیا گیا اور تازہ کھجوروں سے ان کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا اور اس جگہ کو ان کے لیے ہر طرح سے محفوظ بھی بنایا گیا۔

بہرحال یہ آیت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ اپنے پیغمبروں اور ان کے اصحاب و انصار کا ہمیشہ حامی و ناصر رہا ہے اور آیت بہ بانگ دہل کہہ رہی ہے کہ اگر ساری دُنیا کا اسلحہ کسی کو تباہ کرنے کے لیے جمع کر لیا جائے۔ لیکن اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی تنہائی اور یار و انصار کی کمی اس کی شکست کا سبب بن سکتی ہے۔

¹ پہلی صورت میں "معین" کی میم جزوِ لفظ ہے اور "فعیل" کے وزن پر ہے۔ دوسری صورت میں "میم" زائدہ ہوگی اور مفعول کے وزن پر "مبیع" کی طرح ہوگی۔

Marfat.com

۵۱۔ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا
صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ؕ
۵۲۔ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا
رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ
۵۳۔ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ
بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ
۵۴۔ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ

ترجمہ

۵۱۔ اے رسولو! پاک و پاکیزہ غذا کھاؤ اچھے کام کرو، کیونکہ جو کچھ بھی تم
کرتے ہو، میں اس سے پوری طرح واقف ہوں۔
۵۲۔ تم سب ایک ہی امت ہو اور میں تمہارا پالنے والا ہوں، پس میری
نافرمانی سے بچو۔
۵۳۔ پھر لوگوں نے اپنے کام میں اختلاف کرکے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔
ہر کوئی الگ ڈگر پر چل نکلا (تعجب کی بات ہے) ہر کوئی اپنی روش پر
خوش ہے۔
۵۴۔ ان کو ان کی غفلت اور جہالت میں رہنے دے، یہاں تک کہ انہیں

Marfat.com

موت آجائے (یا وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جائیں)

تفسیر

سب ایک اُمت ہیں

گذشتہ آیتوں میں انبیاء اور ان کی اُمتوں کی بات چل رہی تھی۔ زیر بحث پہلی آیت میں ان سب سے اس طرح خطاب ہوتا ہے: اے پیغمبرو! پاک و پاکیزہ غذا کھاؤ اور اچھے اچھے کام کرو، کیونکہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو۔ میں پوری طرح سے باخبر ہوں (یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحًا انی بما تعملون علیم)۔

تمہارے اور دوسرے انسانوں میں امتیاز اس لحاظ سے نہیں ہے کہ تم اوصاف بشری نہیں رکھتے یعنی کھاتے پیتے نہیں، بلکہ تمہارا امتیاز یہ ہے کہ تم اپنی خوراک اور غذا کو بھی اپنی ترقی و تکامل کا ایک ذریعہ سمجھتے ہو۔ چنانچہ کھانا کھاتے ہوئے بھی جانچ پڑتال سے کام لیتے ہو اور صرف طیب و طاہر غذا ہی کھاتے ہو۔ جب کہ دوسروں نے صرف کھانے کو رہنا مقصودِ زندگی بنا رکھا ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں ان کی حیوانی تشنگی کس غذا سے دور ہوگی اور وہ کبھی خبیث و طیب اور گندی اور پاک کی پرواہ نہیں کرتے۔

اگر اس نقطے پر غور کریں کہ خوراک انسانی افکار اور کردار پر اثر رکھتی ہے اور مختلف غذاؤں کے مختلف اخلاقی اثرات ہوتے ہیں تو ان دو جملوں کا آپس میں تعلق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پاک پاکیزہ خوراک کھاؤ اور نیک اعمال بجالاؤ اکثر روایات میں بھی ہے کہ حرام غذا قبولیت عبادت اور قبولیت دُعا کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث اس کی شاہد ہے۔

ایک شخص رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اُس نے عرض کیا: میں چاہتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو تو آپ نے فرمایا۔

"طهر مأكلتك ولا تدخل بطنك الحرام"۔

اپنی روزی کو پاک بناؤ اور حرام غذا سے پرہیز کرو۔ [1] و [2]

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ "انی بما تعملون علیم" (جو کچھ تم کرتے ہو۔ میں اس سے آگاہ ہوں) کا جملہ انسان کے عمل صالح کا پابند رہنے کا زبردست ضامن ہے۔ کیونکہ جب انسان کو اس بات کا یقین ہو کہ اس کے ہر فعل کی ہمہ وقت نگران ایسی ذات ہے، جس سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جا سکتی اور جو افعال کی جزئیات پر پوری نگاہ رکھتی ہے۔ تو اس کے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۴ ابواب الدعاء باب نمبر ۶۷ حدیث نمبر ۴

[2] تفسیر نمونہ جلد ۱ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۸ کی تفسیر کے ذیل میں اس موضوع پر کافی بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

اعمال و کردار کی درستی پر بلاشبہ اثر پڑے گا۔

اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیت میں بیان شدہ مفہوم پاک و پاکیزہ رزق کی نعمت جو اسے نصیب ہوئی ہے، انسان میں شکر گذاری کے احساس کو ابھارتی ہے، اس سے بھی انسان کے افعال و کردار پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح اس آیۂ مجیدہ میں اعمال صالح کے لیے تین مؤثر عوامل کا ذکر کیا گیا ہے۔

(i) پاکیزہ غذا کا دل کے صدق و صفا پر اثر کے لحاظ سے۔

(ii) اس نعمت کے ذریعے انسان میں احساس شکر گزاری کی بیداری کے لحاظ سے۔

(iii) اللہ کے ہمارے اعمال و کردار، پر شاہد و ناظر ہونے کے لحاظ سے۔

"طیب" جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، ہر پاک و پاکیزہ چیز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور "خبیث" ہر ناپاک کے لیے۔ راغب اپنی کتاب "مفردات" میں رقم طراز ہیں کہ "طیب" کا لغوی معنیٰ لذت بخش چیز ہے، چاہے اس کا تعلق انسان کے جسم سے ہو یا روح سے۔ البتہ شرعی اصطلاح میں حلال اور پاک چیز کو طیب کہتے ہیں۔ بہر حال قرآن مجید کی بہت سی بحثیں "طیب" اور "طیبات" کے محور کے گرد گھومتی ہیں، جن میں سے بعض ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:۔

ا۔ انبیاءؑ کو حکم دیا گیا ہے کہ صرف پاکیزہ غذا استعمال کریں۔

ب۔ مومنین سے بھی یہی کہا گیا ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم"

"اے صاحبان ایمان! طیبات میں سے جو روزی ہم نے تمھیں دی ہے کھاؤ۔" (بقرہ ۱۷۲)

ج۔ اللہ کی بارگاہ میں صرف وہ افکار اور اعمال باریابی حاصل کر سکتے ہیں۔ جو طیب و طاہر ہوں۔

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ،

اچھی اچھی باتیں اس کی بارگاہ تک پہنچتی ہیں اور اعمال صالح کو وہ اوپر لے جاتا ہے۔ (فاطر ۱۰)

د۔ مزید برآں اللہ نے انسان کو جس اعزاز سے نوازا ہے اور جو خوبی اسے دوسرے موجودات سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا طیبات سے استفادہ کرنا ہے۔

ولقد کرمنا بنی اٰدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلًا۔

ہم نے بنی نوع انسان کو عزت دی، خشکی اور پانیوں میں اس کے لیے سواریوں کا انتظام کیا اور پاک و پاکیزہ روزی اسے عطا کی اور اپنی اکثر مخلوق پر اسے فضیلت دی۔ (بنی اسرائیل ۷۰)

رسول اکرمؐ سے بھی ایک چھوٹی سی مگر پُر مغز حدیث روایت کی گئی ہے۔

آپؐ نے فرمایا۔

"یا ایھا الناس ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا"

Marfat.com

" اللہ خود پاک اور منزّہ ہے اور وہ پاکیزہ عمل کے علاوہ کسی چیز کو شرف قبولیت نہیں بخشتا" ۔ [1]

اگلی آیت انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو توحید و تقویٰ کی دعوت دیتے ہوئے کہتی ہے ۔ تم سب ایک ہی امت ہو (اور تمھارے درمیان اور تمھارے انبیاء کے درمیان موجود فرق ہرگز علیحدگی اور عدم یگانگی کی دلیل نہیں) (وان ھٰذہ امتکم امۃ واحدۃ)۔

اور میں تمھارا رب ہوں، پس میری مخالفت سے پرہیز کرو۔ (وانا ربکم فاتقون)۔

اس طرح گویا یہ آیت انسانی معاشرے کو وحدت کی اور ہر قسم کے انتشار و پراگندگی کے خاتمے کی دعوت دیتی ہے جیسے وہ ایک اکیلا پروردگار ہے ۔ انسان بھی ایک ہی اُمت ہیں ۔ لہٰذا انہیں ایک پروگرام اور نظام کے تحت یکجا ہو جانا چاہیئے ۔ اسی طرح جیسے ان کے انبیاً ایک ہی دین و آئین کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ وہ دین جس کے اصول ہر دور میں ایک جیسے رہے ہیں ۔ اور وہ ہیں توحید و حق شناسی ، معاد و قیامت پر ایمان ، نوع انسانی کے ارتقاء و کمال کی طرف توجہ ۔ طیبات اور پاک چیزوں سے استفادہ کرنا ، عمل صالح انجام دینا اور عدالت و اقدارِ انسانی کی حمایت کرنا ۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہاں لفظ " امۃ " کا معنی گروہ و جمعیت نہیں ، بلکہ دین و آئین ہے ۔ حالانکہ " انا ربکم " میں ضمیر جمع اس پر شاہد ہے کہ اُمت سے مراد انسانوں کی جماعت ہی ہے ۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ " امۃ " استعمال ہوا ہے ۔ وہاں اس سے مراد جمعیت اور گروہ ہے ۔ البتہ بعض استثنائی مواقع ہیں جہاں قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ " امت " کو مجازاً مذہب کے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے ، مثلاً ۔

" انا وجدنا اٰباءنا علٰی امۃ وانا علٰی اٰثارھم مقتدون "

ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک مذہب پر پایا اور ہم ان کی پیروی کریں گے ۔

(زخرف ۔ ۲۳)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی آیت کا مفہوم سُورۂ انبیاء کی آیت ۹۲ میں بھی موجود ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

" ان ھٰذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون

" یقیناً تمھاری یہ امت امتِ واحدہ ہے اور میں تمھارا رب ہوں ، پس میری ہی بندگی کرو "

حالانکہ اس سے پہلے بہت سے انبیاء کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور درحقیقت " ھٰذہ " گذشتہ انبیاء کی امتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو سب اللہ کے نزدیک اُمت واحدہ تھے اور سب کے سب ایک ہی ہدف کے لیے مصروفِ عمل رہے ۔

اگلی آیت انسانوں کو انتشار و پراگندگی سے ان الفاظ میں ڈراتی ہے : لیکن لوگوں نے اپنے کاموں میں انتشار و

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ، ص ۴۵۱۹ زیر بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں ۔

Marfat.com

اختلاف پیدا کر دیا اور ہر گروہ اپنی الگ ڈگر پر چل نکلا۔ (فتقطعوا امرھم بینھم زبرًا)۔
اور تعجب کی بات یہ ہے "کہ ان میں سے ہر گروہ اپنی اپنی حالت پر خوش ہے"۔ اور دوسروں سے بیزار ہے۔
(کل حزب بما لدیھم فرحون)۔

"زبر" "زبرۃ" (بر وزن "لقمہ") کی جمع ہے۔ یہ جانور کی پشت کے بالوں کے اس ایک حصہ کے معنی میں ہے کہ جسے جمع کر کے بقیہ سے الگ کر لیا جائے۔ بعدازاں یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بولا جانے لگا۔ کہ جو دوسری سے الگ کی گئی ہو۔ لہذا "فتقطعوا امرھم بینھم زبرًا" تمام امتوں کے مختلف گروہوں میں منقسم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ "زبر" "زبور" کی جمع ہے، جس کا معنی ہے "کتاب"، یعنی ہر گروہ نے کسی ایک آسمانی کتاب کو پکڑ لیا اور باقی خدائی کتب کا انکار کر دیا، حالانکہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ لیکن "کل حزب بما لدیھم فرحون" کا جملہ پہلی تفسیر کو تقویت دیتا ہے۔

بہر حال یہ آیت ایک اہم نفسیاتی اور اجتماعی حقیقت کو بیان کرتی ہے اور وہ ہے مختلف گروہوں اور جماعتوں کا جاہلانہ تعصب، ہر گروہ نے اپنی ہی ایک ڈگرا اپنا رکھی ہے۔ اور اپنا ہی ایک دین بنا رکھا ہے۔ اور ہر دوسری بات کے لیے اپنی فکر کے دریچے بند کر لیے ہیں۔ وہ تیار نہیں کہ کوئی تازہ روشنی اُن کی فکر کو روشن کرے اور تازہ ہوا ان کے سامنے کسی حقیقت کا دروازہ کھولے۔ یہ حالت کہ جس کا سرچشمہ بہت زیادہ خود خواہی، خود پرستی اور خود پسندی ہے، حقائق کے واضح ہونے اور امتوں کے درمیان وحدت قائم ہونے کی سب سے بڑی دُشمن ہے۔ اپنے طور طریقے پر خوش رہنا اور اس کے علاوہ ہر کسی سے نفرت و بے گانگی بعض اوقات انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ دوسرے کی بات تک سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کہ کہیں اُس کی عادت کے برخلاف کوئی حقیقت اس پر آشکارا نہ ہو جائے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے مشرکین کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم
واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا۔

بار الہا! جب میں نے انھیں تیری طرف آنے کی دعوت دی تاکہ تو اس کے گناہ بخش دے، تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر کپڑا ڈال لیا۔ اور اپنی غلط ڈگر پر ڈٹ گئے اور حق کے کے مقابلے انہوں نے سخت تکبر سے کام لیا۔ (نوح - ۷)

جب تک یہ حالت ختم نہ ہو جائے انسان حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور ہر شخص اپنے طریقہ عمل پر ہٹ دھرمی سے قائم رہتا ہے۔

اسی لیے تو زیر بحث آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: جب یہ صورتِ حال ہے، تو انہیں ان کی جہالت و گمراہی میں

Marfat.com

ڈوبا رہنے دو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے۔ یا پھر وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جائیں۔ (فذرھم فی غمرتھم حتیٰ حین)۔

ہو سکتا ہے لفظ "حین" وقتِ موت کی طرف یا نزولِ عذاب کے وقت کی طرف اور یا پھر دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

لفظ "غمرۃ" (بروزن ضربۃ) دراصل "غمر" سے کسی چیز کا اثر ختم کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ بعد ازاں زیادہ پانی کو "غمر" یا "غامر" کہا جانے لگا جو اپنا راستہ بناتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے، پھر اس لفظ کا اطلاق جہالت و تعصب پر بھی ہونے لگا کہ جو انسان کو گھیر لیتی ہے۔ اور زیرِ بحث آیت میں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

Marfat.com

۵۵۔ اَیَحۡسَبُوۡنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمۡ بِهٖ مِنۡ مَّالٍ
وَّبَنِيۡنَ ۙ
۵۶۔ نُسَارِعُ لَهُمۡ فِي الۡخَيۡرٰتِ ؕ بَلۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ○
۵۷۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ هُمۡ مِّنۡ خَشۡيَةِ رَبِّهِمۡ
مُّشۡفِقُوۡنَ ۙ
۵۸۔ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ۙ
۵۹۔ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِرَبِّهِمۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ ۙ
۶۰۔ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّقُلُوۡبُهُمۡ
وَجِلَةٌ اَنَّهُمۡ اِلٰى رَبِّهِمۡ رٰجِعُوۡنَ ۙ
۶۱۔ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوۡنَ فِي الۡخَيۡرٰتِ وَهُمۡ لَهَا
سٰبِقُوۡنَ ○

ترجمہ

۵۵۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انھیں مال و اولاد میں ترقی دے رہے ہیں۔
۵۶۔ تو یہ گویا انھیں ہم بھلائیاں عطا کرنے میں سرگرم ہیں۔ حالانکہ اصل معاملے کا انھیں شعور نہیں ہے۔
۵۷۔ وہ لوگ کہ جو خوفِ پروردگار سے لرزتے ہیں۔

Marfat.com

۵۸- اور وہ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں۔

۵۹- اور وہ جو اپنے رب سے شرک نہیں کرتے۔

۶۰- اور وہ لوگ کہ جن سے جس قدر بن پڑتا ہے (راہ خدا میں) صرف کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے دل لرزاں ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ جانا ہے۔

۶۱- جی ہاں! یہی لوگ ہیں کہ جو بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں۔

تفسیر

بھلائیوں میں سبقت کرنے والے

گزشتہ آیات میں ان مختلف ہٹ دھرم، متعصب اور خود پسند گروہوں کے بارے میں گفتگو کی گئی تھی کہ جو صرف اپنے عقائد سے چمٹے رہتے ہیں، انہی میں مگن اور خوش رہتے ہیں اور جنہوں نے تحقیق و جستجو کا ہر راستہ اپنی عقل کے لیے بند رکھا ہے۔ زیر نظر آیات میں ان کے بعض متکبرانہ خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا اُن کا گمان ہے کہ ہم نے جو انھیں مال و اولاد دی ہے۔ (ایحسبون انما نمدھم بہ من مال و بنین)۔

یہ اس لیے ہے کہ ہم نے بڑی تیزی کے ساتھ ان کے لیے بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے ہیں (نسارع لھم فی الخیرات)۔

کیا وہ زیادہ مال و اولاد کو اپنی حقانیت کی دلیل خیال کرتے ہیں اور اسے بارگاہِ الٰہی میں قرب و عظمت کی برہان سمجھتے ہیں؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے "بلکہ وہ نہیں سمجھتے" (بل لا یشعرون)۔

وہ نہیں سمجھتے کہ یہ مال و اولاد کی فراوانی درحقیقت ان کے لیے ایک طرح سے عذاب و سزا کی تمہید ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ خدا چاہتا ہے کہ انہیں ناز و نعمت میں غرق کر دے تاکہ جب عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو تو یہ عذاب برداشت کرنا ان کے لیے اور بھی سخت ہو جائے۔ کیونکہ اگر انسان پر نعمت کے دروازے بند ہوں اور اس میں مشکلات گوارا

Marfat.com

کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر سزا اُس کے لیے زیادہ سخت نہیں ہوں معنیٰ اور اگر کوئی ناز و نعمت کی زندگی گزار رہا ہو اور پھر اُسے کسی تاریک وحشت ناک زنداں میں ڈال دیا جائے تو یہ اُس کے لیے انتہائی سخت مرحلہ ہوگا۔

علاوہ ازیں نعمت کی یہ فراوانی ایسے انسان کی آنکھوں پر غفلت و غرور کے پردوں کو زیادہ ضخیم کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اُسے واپسی کی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ اس چیز کو قرآن میں "استدراج در نعمت" قرار دیا گیا ہے۔[1]

ضمناً لفظ "نمد" "امداد" اور "مد" کے مادہ سے کسی چیز کے نقصان اور کمی کو پورا کرنے اور اس کے خاتمے کو روکنے کے معنیٰ میں ہے۔

غفلت میں پڑے ہُوئے ان خود پسند لوگوں کے خیالات کی نفی کے بعد مومنین اور اچھائیوں میں تیزی کرنے والوں کے بارے میں چند آیات میں ان کے بنیادی اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو اپنے پروردگار کے خوف سے لرزاں ہیں (ان الذین هم من خشیة ربهم مشفقون)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "خشیة" ہر قسم کے خوف کو نہیں کہتے، بلکہ یہ وہ خوف ہے۔ جس میں تعظیم و احترام شامل ہو۔ "مشفق" "اشفاق" اور "شفق" کے مادہ سے ہے۔ یہ ایسی روشنی کے معنیٰ میں ہے، جس میں تاریکی ملی ہوئی ہو، اور اس سے مراد ایسا خوف ہے کہ جس میں محبت و احترام کی آمیزش ہو۔ "خشیة" زیادہ تر قلبی اور داخلی پہلو رکھتی ہے جبکہ "اشفاق" عملی پہلو کے لیے ہے۔ آیت میں ان دونوں کا ذکر علت و معلول کے حوالے سے ہے۔ درحقیقت قرآن فرماتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں عظمتِ خدا کی آمیزش رکھنے والا خوف جاگزیں ہے اور اس کے آثار ان کے اعمال میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ احکام الٰہی کی پاسداری کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں "اشفاق" "خشیة" کا مرحلہ کمال ہے کہ جو عمل پر اپنا اثر مرتب کرتا ہے۔ اور گناہ سے پرہیز کرنے اور ذمہ داریاں انجام دینے پر اُبھارتا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: وہ لوگ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (والذین هم بآیات ربهم یؤمنون)۔

آیاتِ پروردگار پر ایمان کے بعد اُسے ہر قسم کی شبیہ و شریک سے پاک سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو اپنے رب کے بارے میں شرک نہیں کرتے۔ (والذین هم بربهم لا یشرکون)۔

درحقیقت شرک کی نفی آیاتِ الٰہی پر ایمان لانے کا نتیجہ ہے، دوسرے لفظوں میں آیاتِ الٰہی پر ایمان اس کی "صفاتِ ثبوتی" کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شرک کی نفی "صفاتِ سلبی" کی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال اس جملے میں ہر قسم کے شرک کی نفی موجود ہے۔ چاہے وہ جلی ہو چاہے خفی۔

اس کے بعد قیامت پر ایمان کا ذکر ہے۔ قیامت کے بارے میں سچے مومنین خاص توجہ رکھتے ہیں، ایسی توجہ کہ جو عمل

---

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۷ میں سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۲ کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

میں انہیں پوری طرح کنٹرول کرتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ کہ جو لوگوں کے اور اللہ کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اطاعت بجا لانے میں اپنی پوری کوشش کرتے ہیں اور ان کے دل اس خیال سے ڈرتے رہتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ جانا ہے (والذین یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الی ربھم راجعون)۔

یہ لوگ کوتاہ فکر لوگوں کی طرح نہیں ہیں کہ جو ایک چھوٹا سا عمل انجام دے کر اپنے آپ کو مقرب پروردگار سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے مقابلے میں سب لوگوں کو پست اور بے وقعت سمجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ یہ اہل ایمان ایسے ہیں کہ اگر ایسا عظیم نیک عمل انجام دیں کہ جو تمام جن وانس کی عبادت کے برابر ہو تو بھی حضرت علی علیہ السلام کی طرح کہتے ہیں۔

آہ من قلۃ الزاد وبعد السفر

آہ! زادِ راہ کی کمی اور سفر کی طوالت!

یہ چار صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں کہ جو نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں۔ اور دوسروں پر سبقت حاصل کرتے ہیں۔ (اولٰئک یسارعون فی الخیرات وھم لھا سابقون)۔

درحقیقت حقیقی بھلائی اور سعادت وہ نہیں کہ جو عیش وعشرت میں غرق غافل ومغرور لوگ خیال کرتے ہیں۔ حقیقی خیر وسعادت اور برکت ان مومنین کے لیے ہے جو مندرجہ بالا اعتقادی اور اخلاقی اوصاف کے مالک ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اعمال صالح انجام دینے کے لیے پیش قدمی کرتے ہیں۔

زیرِ بحث آیات میں ان پیش قدم مومنین کی بہت عمدہ، جاذبِ نظر، منطقی، مکمل اور منظم تصویر پیش کی گئی ہے۔

یہ مومنین خدا سے ایسا خوف رکھتے ہیں۔ کہ جس میں احترام وتعظیم کی آمیزش ہے، یہ خوف آیاتِ الٰہی پر ایمان لانے کا سبب بنتا ہے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کا ذریعہ قرار پاتا ہے۔ یہ مومنین قیامت وعدالتِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو احساس ذمہ داری اور نیک کام کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اہلِ ایمان کی مجموعی طور پر چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور ایک نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔ (غور کیجیے گا)

ضمناً "یسارعون" کہ جو باب مفاعلہ سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں تیزی کرنے کے معنی میں ہے بہت عمدہ اور جاذبِ نظر تعبیر ہے۔ یہ تعبیر مومنین کے مثبت مقابلے کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے کہ جو عظیم اور قیمتی مقصد کے لیے انجام پاتا ہے۔ یہ تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ اہل ایمان کس طرح سے اعمال صالح میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور بغیر توقف کے جد وجہد جاری رکھتے ہیں۔

Marfat.com

۶۲۔ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

۶۳۔ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ○

۶۴۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ ○

۶۵۔ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ○

۶۶۔ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ○

۶۷۔ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ○

ترجمہ

۶۲۔ اور ہم کسی شخص کو اس کی توانائی سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتے اور ہمارے پاس کتاب ہے (کہ جس میں تمام بندوں کے اعمال درج ہیں) اور جو حق بات کہتی ہے۔ لہٰذا ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

۶۳۔ بلکہ اُن کے دل اس نامۂ اعمال (اور روزِ حساب اور آیاتِ قرآن) سے غفلت میں ہیں اور اس کے علاوہ وہ ایسے (بُرے) اعمال میں مبتلا

Marfat.com

ہیں کہ جنہیں وہ ہمیشہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

۶۴۔ یہاں تک کہ جب ہم ان کے عیاشوں کو گرفتارِ عذاب کریں گے، تو اس وقت وہ بڑی دردناک فریاد کریں گے۔

۶۵۔ (لیکن ان سے کہا جائے گا) بند کرو یہ آہ و فغاں، آج ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔

۶۶۔ (کیا تمھیں یاد نہیں کہ) میری آیتیں تمھیں سُنائی جاتی تھیں تو تم منہ پھیر لیتے تھے اور اُلٹے پاؤں بھاگ جاتے تھے۔

۶۷۔ جبکہ ان آیتوں کے مقابلے میں تم غرور کرتے تھے اور راتوں کو اپنی بیٹھکوں میں تم بدگوئی کیا کرتے تھے۔

تفسیر

جہالت میں ڈوبے ہوئے دل

گزشتہ آیات میں مومنین کی نمایاں صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جو ہر نیکی کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسی صفات کا حامل ہو اور ایسے اعمال انجام دے سکے۔

اس سلسلے میں زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: "ہم کسی شخص کو اس کی توانائی سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتے" اور ہر شخص سے اس کی طاقت اور عقل کے مطابق تقاضا کرتے ہیں۔ (ولا نکلف نفسًا الا وسعھا)۔

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالٰی نے انسانوں پر جو فرائض عائد کیے ہیں اور جو احکام دیئے ہیں۔ وہ ان کی توانائی کی حدود میں ہیں اور جن مواقع پر کسی حکم پر عمل کرنا انسان کے بس میں نہ ہو۔ وہاں وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ علماءِ اصول کے مطابق یہ کلیہ تمام احکام اسلام پر لاگو ہوتا ہے اور ان پر مقدم ہے۔

ممکن ہے پھر یہ سوال پیدا ہو کہ کیسے ممکن ہے کہ انسانوں کے تمام چھوٹے بڑے اعمال کا حساب اور جانچ پڑتال ہو سکے اس ضمن میں مزید فرمایا گیا ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے کہ حق بات کہتی ہے (اور تمام بندوں کے اعمال اس میں ثبت ہیں)

Marfat.com

لہٰذا کسی پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ (ولدینا کتاب ینطق بالحق وھم لا یظلمون)۔

یہ ان اعمال ناموں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں انسانوں کے تمام اعمال ریکارڈ کیے گئے ہیں اور وہ خدا کے پاس محفوظ ہیں یہ انسانی اعمال کی ایسی ڈائریاں ہیں کہ جو گویا زبان رکھتی ہیں اور حق بات بیان کرتی ہے، اس طرح سے کہ انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس کتاب سے مراد کہ جو اللہ کے پاس ہے "لوح محفوظ" ہے اور "لدینا" (ہمارے پاس) کی تعبیر اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال زیرِ بحث آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انسانی اعمال کا ایک ذرہ بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا اور تمام اعمال کا بڑی توجہ سے ریکارڈ مرتب ہوگا۔ اس حقیقت پر ایمان نیک لوگوں کو کارِ خیر کا شوق دلاتا ہے۔ اور بُرے کام سے بچاتا ہے۔

"ینطق بالحق" (حق بات بیان کرتی ہے) یہ جُملہ انسانی اعمال کی توصیف ہے۔ فارسی میں بھی ہم کہتے ہیں۔

فلاں نامہ بقدر کافی گویا است

فلاں خط مُنہ بولتا ہے۔

یعنی اس کی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں، گویا خود بولتا ہے، اس کے لیے سر کھپانے کی ضرورت نہیں یہ تو خود سے حقائق واضح کر رہا ہے۔

"وھم لا یظلمون" بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اعمال کا ریکارڈ اگر باریک بینی سے مکمل تیار کیا گیا ہے۔ تو پھر ظلم اور زیادتی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن — یہ حقائق بیان کرنے کا اثر صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے۔ جو کچھ بیداری و آگاہی رکھتے ہوں۔ لہٰذا ساتھ ہی مزید فرمایا گیا: لیکن یہ ہٹ دھرم کافر لوگ یوں جہالت میں ڈوبے ہُوئے ہیں کہ روزِ حساب پیش ہونے والے اپنے نامۂ اعمال سے اور قرآن کے وعدہ و وعید سے بالکل غافل ہیں۔ (بل قلوبھم فی غمرۃ من ھذا)۔[۲]

جہالت کا یہ عالم انہیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان واضح حقائق کا مشاہدہ کریں، اپنے اندر جھانکیں اور اللہ کی جانب پلٹ آئیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس کے علاوہ بھی وہ ایسے اعمال انجام دیتے رہتے ہیں (ولھم اعمال من دون ذٰلک ھم لھا عاملون)۔

---

۱ نامۂ اعمال کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد نمبر ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۳ کے ذیل میں تفصیل بحث کر چکے ہیں۔ اسی طرح سُورۂ کہف آیت نمبر ۴۹ کے ذیل میں بھی کچھ گفتگو کی جا چکی ہے۔

۲ ممکن ہے "ھذا" نامۂ اعمال، روزِ جزا، قرآن مجید یا صالحین کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہو کہ جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔

Marfat.com

مفسرین نے "لھم اعمال من دون ذٰلک" کے بارے میں مختلف تفسیریں ذکر کی ہیں۔

بعض نے اسے غلط اور قبیح اعمال کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو جہالت و نادانی کی وجہ سے ان سے سرزد ہوتے ہیں (اس بنا پر ذٰلک ان کی جہالت کی طرف اشارہ ہے) اور "اعمال" ایسے گناہوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس راستے میں ان سے سرزد ہوتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مُراد یہ ہے کہ وہ کافرانہ عقیدے کے حامل ہونے کے علاوہ اعمال بھی بہت قبیح انجام دیتے ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کافروں کا طرزِ عمل مومنوں کے طرزِ عمل سے بالکل جُدا ہے۔ اور دونوں کے راستے الگ ہیں۔

نتیجے کے طور پر ان تفسیروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور انہیں ایک مجموعی تفسیر میں یکجا کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ ان کے شرمناک اعمال کی بنیاد وہی ان کے دلوں کا جہالت میں ڈوب جاتا ہے۔

لیکن —— وہ اسی طرح عالمِ غفلت میں رہیں گے۔ "یہاں تک کہ وہ دن آپہنچے گا جب ہم مالدار عیش پرستوں کو گرفتارِ عذاب کریں گے۔ اس وقت وہ تلملائیں گے اور بلبلائیں گے" اور اللہ کے شدید عذاب اور دردناک سزا پر فریاد کریں گے۔ (حتّٰی اذا اخذنا مترفیھم بالعذاب اذا ھم یجئرون)۔

لیکن اُن سے کہا جائے گا: بند کرو یہ آہ و زاریاں کیونکہ آج کے دن ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے (لا تجئروا الیوم انکم منا لا تنصرون)۔

یہاں پر خصوصیت سے "مترفین" (ناز و نعمت میں غرق افراد) کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ گناہگار صرف وہ نہیں ہوتے یہ اس لیے ہے کہ یہی لوگ گمراہی کے سردار ہیں۔ یا پھر اس لیے ہے کہ انہیں زیادہ دردناک سزا دی جائے گی۔

ضمناً "عذاب" سے یہاں مراد ہوسکتا ہے۔ عذابِ دُنیا، یا عذابِ آخرت ہو یا پھر دونوں ہوں۔ یعنی اس جہان میں یا اُس جہان میں۔ جب عذابِ الٰہی انہیں دامن گیر ہوتا ہے تو وہ بلبلا اُٹھتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں۔ لیکن واضح ہے۔ کہ اُس دم معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے اور واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

اگلی آیت درحقیقت اس منحوس انجام کی علت بیان کر رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ میری آیات مسلسل تمہارے سامنے پڑھی جایا کرتی تھیں، لیکن بجائے اس کے کہ تم اُن سے سبق لیتے اور بیدار ہوتے، تم مُنہ موڑ لیتے تھے اور اُلٹے پاؤں بھاگ جاتے تھے۔ (قد کانت اٰیاتی تتلٰی علیکم فکنتم علٰی اعقابکم تنکصون)۔

"تنکصون" "نکوص" کے مادہ سے پیچھے ہٹنے کے معنیٰ میں ہے۔ "اعقاب" "عقب" (بروزن "جھش") کی جمع ہے اور "عقب" پاؤں کی ایڑی کے معنیٰ میں ہے۔ مجموعی طور پر اس جملے سے ایسے افراد مراد ہیں کہ جو نامرغوب باتیں سُن کر ایسے پریشان ہوتے ہیں۔ کہ ایڑیوں کے بل تیزی سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

آیاتِ الٰہی سُن کر وہ نہ صرف اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بلکہ "غرور کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

Marfat.com

(مستکبرین بہ)۔ ۱؎
اس کے علاوہ تم رات کو بیٹھکیں جماتے تھے اور رسول، قرآن اور مومنین کی بدگوئی کرتے تھے۔ (سامرًا تھجرون)۔

"سامرًا" "سمر" (بروزن "ثمر") کے مادہ سے "رات کی باتوں" کے معنیٰ میں ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس مادہ کا اصلی معنیٰ "رات میں چاند کا سایہ" ہے کہ جس میں تاریکی اور روشنی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اور رات کی باتیں کبھی کبھی چاند کی روشنی میں ہوتی ہیں۔ مشرکین عرب کے بارے میں منقول ہے کہ وہ چاندراتوں میں کعبہ کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور رسول اللہؐ کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ یہ لفظ اسی ضمن میں استعمال ہوا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہ گندمی رنگ افراد یا خود گندم کو "سمراء" کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ کہ اس کی سفیدی میں کچھ سیاہی بھی ملی ہوتی ہے۔

"تھجرون" "ھجر" (بروزن "فجر") کے مادہ سے جُدائی اختیار کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ بیمار شخص کے ہذیان اور یاوہ گوئی کے معنیٰ میں بھی استعمال ہونے لگا، کیونکہ اس حالت میں وہ نامناسب اور دور کرنے والی باتیں کرتا ہے نیز "ھجر" (بروزن "کفر") گالیاں دینے کے معنیٰ میں بھی آیا ہے اور یہ بھی دوری اور جُدائی کا سبب ہے۔
زیر بحث آیت میں یہ آخری معنیٰ ہی مراد ہے۔ یعنی راتوں کو دیر تک جاگتے رہتے ہو اور بیماروں کی طرح ہذیان بکتے ہو اور گالیاں دیتے رہتے ہو۔

بے منطق اور کمزور افراد کا یہی طریقہ ہے کہ وہ روز روشن میں دلیری کے ساتھ منطق اور دلیل کا سہارا لینے کی بجائے رات کی تاریکی میں جب لوگ سوئے ہوتے ہیں تو اپنے بُرے مقاصد کے پیشِ نظر اور داخلی شکست کی تسکین کے لیے گالیاں بکنا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ تمھارے بُرے انجام اور تم پر اللہ کے دردناک عذاب کا سبب یہ ہے کہ نہ تو تم جرات کر کے حق کو قبول کرتے تھے۔ اور نہ انکساری سے آیاتِ الٰہی کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ اور نہ ہی پیغمبرؐ سے تمھارا طرزِ عمل منطقی اور درست تھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تم راہ حق پا لیتے۔

۱؎ اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ "بہ" کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مسجد الحرام اور حرم مکہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے تئیں خانہ کعبہ کا متولی سمجھتے ہوئے تکبر کرتے تھے۔ لیکن یہ احتمال ضعیف ہے۔ کیونکہ گذشتہ آیات میں کعبہ اور حرم کا کوئی ذکر نہیں۔ ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ ضمیر رسول اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی تم رسول اللہ اور آیات قرآن کے مقابلے میں تکبر کرتے تھے۔ یا پھر اُلٹے پاؤں جانے کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح تم تکبر اور بے اعتنائی کا اظہار کرتے تھے۔

Marfat.com

۶۸۔ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ
اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
۶۹۔ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝
۷۰۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ
اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ۝
۷۱۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ
فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ؕ
۷۲۔ اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖۗ
وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝
۷۳۔ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝
۷۴۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ
لَنٰكِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۸۔ کیا ان لوگوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا؟ یا ان کے لیے ایسی بات آئی ہے کہ جو ان کے بڑوں کے پاس نہ آئی تھی؟

Marfat.com

۶۹۔ یا پھر کیا اپنے رسول کو پہچانتے نہیں (اور اس کے ماضی کو نہیں جانتے) اس لیے اس کا انکار کرتے ہیں۔

۷۰۔ یا پھر کیا یہ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں؟ نہیں بلکہ وہ تو ان کے لیے حق لایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر کو حق ناگوار ہے۔

۷۱۔ اور اگر حق ان کی پیروی کرنے لگے تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب تباہ ہو جائے۔ لیکن ہم نے انہیں قرآن دیا ہے کہ جو یاد دہانی ہے اور ان کے لیے باعثِ شرف ہے) لیکن وہ ایسی چیز سے روگرداں ہیں۔

۷۲۔ یا پھر کیا تو اُن سے (اپنی اس دعوت کے بدلے) کوئی مزدوری چاہتا ہے؟ جبکہ تیرے لیے تو تیرے رب کا دیا ہی بہتر ہے، اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

۷۳۔ تو تو یقیناً انھیں صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا ہے۔

۷۴۔ لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ اس راہ سے منحرف ہیں۔

تفسیر

منکرین کی بہانہ سازیاں

گذشتہ آیات میں بتایا گیا تھا۔ کہ کافر لوگ پیغمبر اسلامؐ سے مُنہ موڑ لیتے تھے اور تکبر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ زیر نظر آیات میں اس سلسلے میں ان کے حیلے بہانوں کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔ ضمناً ان کی اس روگردانی کے حقیقی اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

Marfat.com

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا انہوں نے اس کلام (آیاتِ الٰہی) پر غور و فکر نہیں کیا (افلم یدبروا القول)۔

جی ہاں! اُن کی بدبختی کا پہلا سبب یہ ہے کہ وہ تیری دعوت پر غور و فکر نہیں کرتے، کیونکہ اگر وہ غور و فکر کرتے تو ان کی مشکلات حل ہو جائیں۔

مزید فرمایا گیا ہے: یا کیا اُن کی طرف ایسی بات آئی ہے۔ جو ان کے آباؤ اجداد کی طرف نہ آئی تھی (ام جاءھم مالم یأت اٰباءھم الاولین)۔

یعنی اگر توحید و قیامت پر ایمان کی دعوت اور نیکی و پاکیزگی اپنانے کی دعوت صرف تیری طرف سے ہوتی تو ممکن تھا۔ کہ وہ بہانہ کرے کہ یہ تو نئی باتیں ہیں کہ جنہیں ہم قبول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ دعوت اگر حق تھی تو اللہ نے گذشتہ لوگوں کی طرف کیوں نہ بھیجی جبکہ اس کی نگاہِ لطف تو سب انسانوں پر ہے۔

لیکن تیری دعوت کے اصول اور بنیادیں بعینہٖ وہی ہیں۔ جو تمام انبیاء کی دعوت کی تھیں۔ لہٰذا یہ تمام بہانہ سازیاں بے معنیٰ ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے: یا کیا انہوں نے رسول کو پہچانا نہیں، اس لیے انکار کرتے ہیں (ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون)۔

یعنی اگر یہ دعوت کسی مشکوک شخص کی طرف سے ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ کہتے کہ باتیں تو اس کی حق ہیں۔ لیکن وہ خود اجنبی شخص ہے۔ لہٰذا اس کی ظاہری باتوں سے فریب نہیں کھایا جا سکتا۔ لیکن یہ تیرے ماضی کو خوب جانتے ہیں تجھے "امین" کہہ کر پکارتے ہیں۔ تیری عقل و دانش اور امانت داری کے معترف ہیں، نیکر والدین اور خاندان کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بہانوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یا کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے (ام یقولون بہ جنۃ)۔

یعنی کیا ان کا کہنا ہے کہ اس کی ذات و شخصیت کو ہم اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ وہ مشکوک شخصیت نہیں ہے، کیونکہ اس کے انکار ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور خلاف معمول ہیں اور یہ اس کی دیوانگی کی دلیل ہے۔

قرآن فوراً اس بہانہ سازی کی نفی کے لیے کہتا ہے "رسول اُن کے لیے حق لے کر آیا ہے"۔ اور اس کی باتیں اس حقیقت پر شاہد ہیں (بل جاءھم بالحق)۔ خرابی یہ ہے کہ "حق انہیں ناگوار ہے" (واکثرھم للحق کارھون)۔

جی ہاں! یہ کلام حکیمانہ ہے۔ البتہ ان لوگوں کو خواہشات ہوس آلود ہیں۔ اس لیے یہ کلام ان سے ہم آہنگ نہیں لہٰذا یہ اسے جھٹلاتے ہیں اور اسے دیوانگی کی باتیں قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ حق لوگوں کے میلانات کے تابع نہیں ہوا کرتا، کیونکہ "اگر حق ان کی ہوا و ہوس کی پیروی کرتا اور عالم ہستی ان کی خواہش کے مطابق گردش کرتا تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ سب درہم برہم ہو جاتا۔ (ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السماوات والارض ومن فیھن)۔

Marfat.com

کیونکہ لوگوں کی خواہشات معیار نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے قطع نظر بہت سے مواقع پر وہ پستیوں اور برائیوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اگر عالم ہستی کے قوانین ان کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو نظام عالم تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتا۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: بلکہ ہم نے انہیں قرآن دیا ہے کہ جو تذکر اور یاد دھانی ہے۔ اللہ کی طرف توجہ کا ذریعہ ہے اور ان کے لیے شرف و آبرو کا باعث ہے۔ لیکن انہوں نے اس سے روگردانی کرلی ہے (بل اتیناھم بذکرھم فھم عن ذکرھم معرضون)۔[1]

اس سلسلہ کلام کے آخری مرحلے میں فرمایا گیا ہے: کیا حق سے فرار وہ اس بہانے سے کرتے ہیں کہ تو اُن سے کسی اُجرت کا تقاضا کرتا ہے۔ جبکہ تیرے رب کا دیا تیرے لیے بہتر ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے (ام تسئلھم خرجا فخراج ربك خیر وھو خیر الرازقین)۔[2]

اس میں شک نہیں کہ اگر ایک روحانی رہبر اپنی دعوت پر لوگوں سے مادی اُجرت کا تقاضا کرے تو اس سے بہانہ ساز لوگوں کے ہاتھ ایک بات آجاتی ہے اور ہو سکتا ہے وہ کہیں کہ ہم اس کا معاوضہ ادا نہیں کر سکتے، اس بنا پر اُس سے دُور ہو جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ الزام عائد کریں کہ یہ مادی مفادات کے حصول کے لیے تبلیغ کرتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید ایک مُنہ بولتے بیان کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ یہ دل کے اندھے حق کو قبول نہیں کرتے اور مخالفت کے لیے جو عذر بہانے تراشتے ہیں۔ سب بے بنیاد ہیں۔

مذکورہ بیان سے ایک مجموعی نتیجہ نکالتے ہُوئے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: یقیناً تو انہیں صراطِ مستقیم کی دعوت دیتا ہے (وانك لتدعوھم الی صراط مستقیم)۔

ایسی راہ مستقیم کہ جس کی نشانیاں نمایاں ہیں اور جو تھوڑے غور و فکر سے پہچانی جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم ایک ایسا فاصلہ ہے کہ جو مختصر ترین ہوتا ہے اور یہ ایک خط سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جبکہ ادھر اُدھر کے انحرافی راستے اور فاصلے بے شمار ہوتے ہیں۔

---

[1] "ذکرھم" کا مفہوم ان کی بیداری اور یاد دھانی بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر معاشرے میں ان کی عزت و شرف اور یاد کے معنیٰ میں ہو۔ البتہ ان دونوں معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور ہم نے آیت کی تفسیر میں دونوں معانی سے استفادہ کیا ہے۔

[2] "خرج" اور "خراج" "خروج" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ ہے۔ ایسی چیز جو انسان کے مال یا زرعی زمین سے خارج ہو۔ لیکن "خرج" "خراج" کی نسبت وسیع تر معنیٰ کا حامل ہے۔ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے۔
"اس کا اُلٹ "دخل" ہے لیکن عام طور پر "خراج" وہ مالیات یا کرایہ کا مال ہے۔ کہ جو زمین کے لیے معین ہوتا ہے۔

Marfat.com

بعض روایات کے مطابق "صراطِ مستقیم" سے مراد ولایتِ علی علیہ السلام ہے[1] البتہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ایسی روایات میں آیات کے بعض واضح مصادیق کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے اس کے دیگر مصادیق ومفاہیم کی نفی ہوجاتی ہے۔ مثلاً قرآن، مبدا، معاد، ایمان، تقولے، جہاد اور عدل وغیرہ بھی صراطِ مستقیم کا مصداق ہیں۔

اگلی آیت میں اس کا فطری نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً وہ اس راستے منحرف ہیں (وان الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ عن الصراط لناکبون)۔

"ناکب" "نکب" اور "نکوب" کے مادہ سے راستے سے انحراف کے معنیٰ میں ہے۔

واضح ہے کہ اس آیت میں "صراط" سے وہی مراد ہے کہ جو گذشتہ آیت میں "صراطِ مستقیم" سے ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ جو شخص اس جہان میں صراطِ مستقیم سے منحرف ہوگا۔ وہ دوسرے جہان میں بھی راہِ جنت سے بھٹک کر دوزخ کے گڑھے میں جا پڑے گا۔ کیونکہ وہاں جو کچھ بھی پیش آئے گا۔ وہ براہِ راست یہاں کے کاموں کا نتیجہ ہوگا۔

آخرت پر عدمِ ایمان اور راہِ حق سے انحراف کا باہمی تعلق یہ ہے کہ انسان جب تک قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اس میں احساسِ ذمہ داری پیدا نہیں ہوتا۔

ایک حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان اللہ جعلنا ابوابہ وصراطہ وسبیلہ والوجہ الذی یؤتی منہ، فمن عدل عن ولایتنا او فضل علینا غیرنا فانھم عن الصراط لناکبون۔

اللہ نے ہم ہادیانِ دین کو اپنی معرفت تک رسائی کے لیے دروازے، راستہ، سبیل اور جہت قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ہماری ولایت سے محروم ہو جائیں یا کسی دوسرے کو ہم پر فضیلت دے کر چن لیں۔ تو وہ صراطِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں[2]

چند اہم نکات

۱۔ حق پرستی اور خواہشات پرستی زیر بحث آیات میں خدا پرستی اور خواہشات پرستی کے تضاد کی طرف ایک پُر معنیٰ اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ۔

اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوجائے تو نہ صرف زمین اور اہل زمین بلکہ آسمان بھی درہم برہم

---

[1] تفسیر نورالثقلین، ج ۳ ص ۵۴۵۔

[2] تفسیر نورالثقلین ج ۳ ص ۵۴۹ بحوالہ اصولِ کافی۔

Marfat.com

ہو جائیں۔

اس مسئلے کا تجزیہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، کیونکہ:

(۱) اس میں شک نہیں، کہ لوگوں کی خواہشات ایک جیسی نہیں ہوتیں اور زیادہ تر ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہیں بلکہ یہاں تک کہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص کی مختلف خواہشات باہم متضاد ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اگر حق ان خواہشات کی پیروی کرے تو نتیجہ پراگندگی و تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(۲) تضادات سے قطع نظر لوگوں کی بہت سی خواہشات فساد انگیز اور برائی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اگر ان خواہشات کے مطابق نظام عالم چلانے کی کوشش کی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فتنہ و فساد اور تباہی اور بربادی ہوگا۔

(۳) انسان کی نفسانی خواہشات ہمیشہ ایک پہلو کی حامل ہوتی ہیں اور ان کی نگاہ صرف ایک زاویے پر ہوتی ہے۔ یہ خواہشات دیگر پہلوؤں سے غافل ہوتی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ فساد اور تباہی کے عوامل میں سے ایک اہم عامل یہ ہے کہ کسی چیز کے ایک ہی پہلو کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اور اس کے دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

زیرِ بحث آیت کئی حوالوں سے اس آیت سے مشابہت رکھتی ہے۔

لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا

اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ اور معبود ہوں تو ان میں فساد برپا ہو جائے (انبیاء-۲۲)

واضح ہے۔ کہ "حق" "صراطِ مستقیم" کی طرح ایک ہی ہے۔ یہ تو نفسانی خواہشات ہیں۔ جو خیالی خداؤں کی طرح بہت سی ہیں۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ حق اور نفسانی خواہشات کے تضاد و کشمکش میں کس کی پیروی کی جائے؟ خواہشات کی کہ جو زمین و آسمان اور تمام موجودات کی تباہی کا باعث ہے یا حق کی کہ جو وحدت و یکتائی اور نظم و ہم آہنگی کا سبب ہے

اس تجزیے کا نتیجہ اور اس سوال کا جواب خوب واضح ہے۔

زیرِ نظر آیات سے ہادیانِ حق کی کچھ صفات واضح ہوتی ہیں، مثلاً

۲۔ رہبر کی صفات:

○ وہ ایسے افراد ہیں کہ جو ہمیشہ نیکیوں کے حوالے پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ غیر معروف اور اجنبی سے لوگ ہوں تو اس آیت کے مصداق منافقوں کے ہاتھ بہانہ آجاتا۔

ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون۔

یا کیا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا کہ جو انکار کر رہے ہیں۔

اگر یوں ہوتا تو لوگ ان کی معروف دعوت کو اشخاص کی اجنبیت کی بنیاد پر نظر انداز کر دیتے۔

○ وہ اپنی جدوجہد کے راستے میں لوگوں کی خواہشات کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔ جبکہ آج کی دنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ لیڈر عام لوگوں کی خواہشات کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔ اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ ہادیانِ برحق ہمیشہ مکتبِ حق کی ترویج کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگوں کو یہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔

Marfat.com

○ وہ اپنی دعوت کے لیے کوئی مادی اُجرت طلب نہیں کرتے۔ مشکلوں اور محرومیوں میں وقت گزار لیتے ہیں۔ لیکن کسی پر مادی لحاظ سے انحصار نہیں کرتے، کیونکہ یہ انحصار ان کے ہاتھ پاؤں کے لیے زنجیر اور زبان و فکر کے لیے قفل بن سکتا ہے۔

۳۔ اکثریت حق کی طرف نہیں ہوتی: وہ کونسی "اکثریت" قرآن نے بہت سی آیات میں اور زیر نظر آیات میں بھی جس کی مذمت کی ہے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ آج کی دُنیا میں اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ معاشروں کی اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔

یہاں ہم ان آیات کے بارے میں بحث نہیں کرتے کہ جو زیادہ تر کفار و مشرکین اور اسی قسم کے لوگوں سے متعلق ہیں۔ ان میں "اکثر" کے ساتھ "ھم" کی ضمیر آتی ہے۔ ہم یہاں ان آیات کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ جو "اکثرالناس" کا عنوان رکھتی ہیں۔ مثلاً:

ولکن اکثرالناس لا یشکرون
لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہیں۔

(بقرۃ - ۲۴۳)

ولکن اکثرالناس لا یعلمون۔
لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(اعراف - ۱۸۷)

ولکن اکثرالناس لا یؤمنون
لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

(ھود - ۱۷)

وما اکثرالناس ولو حرصت بمؤمنین
اگرچہ تو کوشش کرے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

(یوسف - ۱۰۳)

فابٰی اکثرالناس الا کفورًا
اکثر لوگ کفران اور انکار حق کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے۔

(بنی اسرائیل - ۸۹)

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ
اگر تو رُوئے زمین کے اکثر لوگوں کی اطاعت کرے تو وہ تجھے راہ حق سے بھٹکا دیں۔

(انعام - ۱۱۶)

Marfat.com

دوسری طرف قرآن مجید میں ایسی آیات بھی ہیں کہ جو مومنین کی اکثریت کے طریقے کو ایک صحیح معیار قرار دیتی ہیں۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۱۵ میں ہے۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدٰی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم وساءت مصیرًا۔

جو شخص رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے کے علاوہ کوئی راہ اپنائے، جس طرف وہ چل رہا ہے ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے اور دوزخ میں جا پہنچائیں گے اور وہ بہت بڑا ٹھکانا ہے۔

روایات میں سے جو باہم متعارض ہوں، وہاں قانون یہ ہے کہ اس روایت کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جو آئمہ ہدٰی کے اصحاب و انصار اور پیروکاروں میں مشہور ہو، جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

ینظر الی ما کان من روایتهما عنا فی ذٰلك الذی حکما به المجمع علیه عند اصحابك فیؤخذ به من حکمنا ویترك الشاذ الذی لیس بمشهور عند اصحابك فان المجمع علیه لاریب فیه۔

جب دو قاضی اختلافِ روایات کی بنیاد پر اختلاف کریں تو دیکھنا چاہیئے کہ ان دو روایات میں سے کونسی تیرے اصحاب کے ہاں قبول کی جاتی ہے۔ وہی روایت انتخاب کرنا چاہیئے اور جو روایت اصحاب کے ہاں مشہور نہیں اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ کیونکہ مشہور روایت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔[1]

نیز نہج البلاغہ میں ہے۔

والزموا السواد الاعظم، فان ید الله مع الجماعة، وایاکم والفرقة، فان الشاذ من الناس للشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔

ہمیشہ بڑے گروہ کے ساتھ رہو۔ کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔ اور انتشار سے بچو کیونکہ اکیلا انسان شیطان کا حصہ ہے۔ جیسے اکیلی بھیڑ بھیڑیئے کا لقمہ ہے۔[2]

نہج البلاغہ میں ہے۔

والزموا ما عقد علیه حبل الجماعة

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص۷۵ (کتاب القضاء، باب ۹ از ابواب صفاتِ قاضی)

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۷

Marfat.com

جو جماعت کی رسی سے منسلک ہو اسے نہ چھوڑو۔[1]

ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ان دو طرح کی آیات و روایات میں کوئی تضاد ہے۔ دوسری طرف یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ اسلام جمہوری حکومت کے ساتھ نہیں چل سکتا، کیونکہ جمہوریت لوگوں کی کثرت آراء پر مبنی ہے۔ جبکہ قرآن اس کی شدید مذمت کرتا ہے۔

لیکن مذکورہ بالا آیات و روایات میں تھوڑا سا غور و خوض کرنے سے اور ان کا باہمی موازنہ کرنے سے حقیقی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اکثریت اگر مومن، آگاہ اور راہِ حق پر گامزن ہو تو اُن کی آراء اور نظریات محترم ہیں اور اکثر اوقات حقیقت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور ان کی پیروی کی جانا چاہیئے۔

لیکن اکثر جاہل اور ناآگاہ افراد پر مشتمل ہو، یا وہ لوگ آگاہ تو ہوں مگر خواہشاتِ نفسانی کے اسیر ہوں تو پھر عموماً ان کے نظریات منحرف ہوں گے اور قرآن کے بقول ان کی پیروی انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

ایک حقیقی اور صحیح جمہوریت کے لیے پہلے کوشش کرنا چاہیئے کہ عام لوگ باخبر اور مومن ہوں۔ اس کے بعد ہی اکثریت کی آراء اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کا معیار بن سکتے ہیں۔ ورنہ جو جمہوریت گمراہ اکثریت کے نظریات پر مبنی ہو۔ وہ معاشرے کو جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔

اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق باخبر، رشید اور باایمان اکثریت کے نظریات بھی اسی صورت میں محترم ہیں جب وہ حکم الٰہی اور کتاب و سنت کے برخلاف نہ ہوں۔

بات کہنے کی یہ ہے کہ آج معاشروں کے پاس قانون سازی اور معاشرتی امور کے لیے کثرت آراء کے کلیے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کہ وہ جس کی طرف پناہ لیں۔ انھوں نے آسمانی کتابوں اور انبیاء الٰہی کے طرزِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ناآگاہی و جہالت کے ساتھ ساتھ مفاد پرستی اور ذاتی اغراض بھی شامل ہوتی ہیں۔ لیڈر حضرات آسانی سے پراپیگنڈے کے ذریعے ایسے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ لہٰذا تعداد کی اکثریت کو معیار قرار دیا گیا ہے تاکہ کسی بھی آواز اور شور و احتجاج کو اکثریت کے نام پر خاموش کیا جا سکے۔ اگر ہم دورِ حاضر میں مختلف ملکوں پر حاکم نظاموں اور قوانین پر غور و فکر کریں تو واضح ہو گا کہ ان کی بہت سی بدبختیاں جاہل و بے علم اکثریت کی آراء کو اپنانے کی وجہ سے ہیں۔

اکثریت کی بنیاد پر ایسے ایسے گندے اور قبیح قوانین بنائے گئے ہیں۔ کہ جن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے اور آگ کے کتنے شعلے اسی ناآگاہ اکثریت کی وجہ سے بھڑکے ہیں۔ اور کیسے کیسے مظالم کی غیر مومن اکثریت نے تائید کی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۱

Marfat.com

۷۵۔ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ
لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝
۷۶۔ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا
لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝
۷۷۔ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ
اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝ع
۷۸۔ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝
۷۹۔ وَهُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ۝
۸۰۔ وَهُوَ الَّذِیْ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۵۔ اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان کی مشکلات برطرف کردیں تو (نہ صرف وہ بیدار نہیں ہوں گے بلکہ) اپنی سرکشی پر اڑ جائیں گے اور (اسی وادی میں) بھٹکتے پھریں گے۔

Marfat.com

۷۶۔ ہم نے انہیں عذاب وابتلاء میں گرفتار کیا (تاکہ وہ بیدار ہوں) لیکن وہ اپنے رب کے حضور نہ جھکے اور نہ اس کی بارگاہ میں انکساری کی۔

۷۷۔ (یہ کیفیت یونہی رہے گی) یہاں تک کہ ہم عذاب شدید کے دروازے ان پر کھول دیں اور وہ یوں گرفتارِ بلا ہوں کہ بالکل مایوس ہو جائیں۔

۷۸۔ وہ ایسی ذات ہے جس نے تمھیں کان، آنکھ اور دل (عقل) سے نوازا، لیکن تم اس کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

۷۹۔ وہ وہی ذات ہے، جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا اور پھر تم اس کی جانب لوٹائے جاؤ گے۔

۸۰۔ وہ وہی ہے کہ جو زندگی عطا کرتا ہے اور موت دیتا ہے، گردشِ لیل و نہار اس کے ہاتھ ہے، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

تفسیر

خدا مختلف طریقوں سے بیدار کرتا ہے

گذشتہ آیات میں ان حیلے بہانوں کا ذکر تھا کہ جو منکرینِ حق دعوتِ انبیاء کی مخالفت کرتے ہوئے پیش کرتے تھے۔ زیرِ نظر آیات میں اتمام حجت کے لیے اور ان کی بیداری کے لیے مختلف حوالوں سے گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کبھی ہم ان پر اپنی رحمت نازل کرتے ہیں تاکہ وہ بیدار ہو جائیں۔ لیکن "اگر ان کی مشکلات کو دور کرکے ہم پر اپنا لطف کریں۔ اور نعمتوں سے نوازیں تو ان کی خرابی اس حد تک جا پہنچی ہے تو وہ پھر بھی سرکشی پر اڑے رہتے ہیں اور اسی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں (ولو رحمنا ھم وکشفنا ما بھم من ضر للجوا فی طغیانھم یعمھون)۔

Marfat.com

اور کبھی سخت حوادث کے ذریعے انہیں ہلایا جاتا ہے، تاکہ اگر وہ رحمت و نعمت کے ذریعے بیدار نہیں ہوئے تو اس راستے سے بیدار ہو جائیں۔ لیکن اس کا بھی ان پر اثر نہیں ہوتا، کیونکہ "ہم نے انہیں گرفتار عذاب کیا ہے۔ لیکن وہ نہ تو اپنے پروردگار کے سامنے جھکے ہیں۔ اور نہ انھوں نے کسی انکساری کا اظہار کیا ہے (ولقد اخذنا ھم بالعذاب فما استکانوا لربھم وما یتضرعون)۔[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "تضرع" بنیادی طور پر "ضرع" سے "پستان کے معنی میں ہے اور "تضرع" کا معنیٰ ہے "اُس نے دودھ دوہا"۔ بعد ازاں یہ لفظ خضوع و انکساری کے ساتھ سر تسلیم خم نہیں کرنے کا مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔

یعنی ان دردناک حوادث پر بھی وہ غرور و سرکشی اور خود پرستی کو ترک نہیں کرتے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ یہ جو چند ایک روایات میں "تضرع" کا معنیٰ دُعا اور نماز کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا بیان ہوا ہے، درحقیقت یہ اس کے وسیع معنیٰ کا ایک مصداق ہے۔

بہر حال ہم ان بیدار کُن رحمتوں، نعمتوں اور سزاؤں کو جاری رکھیں گے اور وہ بھی اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی کو جاری رکھیں گے۔ "یہاں تک کہ ہم اپنے شدید عذاب کا دروازہ کھول دیں گے اور اس میں ایسے گرفتار ہوں گے کہ آخر کار بالکل مایوس ہو جائیں گے (حتیٰ اذا فتحنا علیھم بابا ذا عذاب شدید اذا ھم فیه مبلسون)۔[2]

اللہ تعالیٰ دراصل دو طرح کی سزا دیتا ہے۔ "تربیتی سزا" معاشرے کو پاک کر دینے والی سزا"

پہلی قسم کی سزا کا مقصد یہ ہے کہ گنا ہگاروں پر کچھ سختی کی جائے تاکہ انہیں اپنی ناتوانی کا احساس ہو جائے اور وہ غرور و تکبر کا راستہ ترک کر دیں۔

دوسری قسم کی سزا نا قابل اصلاح افراد کے لیے ہے۔ یہ سزا ایسے افراد کے لیے ہے جو اپنے طرز عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ انہیں اب اس نظام خلقت میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں اور وہ انسانوں کے ارتقار و کمال کی راہ میں رکاوٹ ہیں

---

[1] "استکانوا" "سکون" کے مادے سے خشوع و خضوع کے عالم میں سکون ہونے کے معنے میں ہے اس صورت میں یہ باب افتعال سے ہوگا۔ اصل میں یہ لفظ "استکنوا" تھا، کاف کی فتح کا اشباع ہوا اور وہ الف سے بدل گئی جس کے نتیجے میں "استکانوا" ہوگیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ "کون" کے مادے سے باب "استفعال" میں سے ہے، جس کا معنیٰ ہے "خشوع و خضوع کے ساتھ کسی مکان میں طلب استقرار"۔ بہر حال یہ پروردگار کے سامنے بندے کی حالت انکساری کو ظاہر کرتا ہے اور یہ جو بعض نے اسے "دُعا" کے معنیٰ میں ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دُعا کرنا خشوع و خضوع کا ایک مصداق ہے۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ لفظ "کین" (بروزن "عین") کے مادے سے باب استفعال سے ہے کیونکہ یہ مادہ خضوع کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور یہ تمام معانی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔

[2] "مبلس" "ابلاس" کے مادہ سے ہے، یہ ایسے غم و اندوہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے کہ جو کسی شدید واقعے کی بنا پر ہو اور عام طور پر انسان کو حیرت کا مجسمہ بنا دے یا ناامید و مایوس کر دے

Marfat.com

اس سزا کے ذریعے معاشرے کو ان کے وجود سے پاک کر دیا جاتا ہے۔

مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ " بابًا ذا عذاب شدید" (دردناک عذاب کا دروازہ) سے کیا مراد ہے۔ ان میں سے بہت سوں نے اس سے موت اور اس کے بعد عذاب قیامت مراد لی ہے۔ بعض دوسروں نے اسے شدید قحط کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو نبی اکرمؐ کی طرف سے نفرین کے باعث چند سال تک مشرکین کو دامن گیر رہا۔ یہاں تک کہ ان کے ہاں سے اناج بالکل ختم ہو گیا اور وہ ایسی چیزیں کھانے پر مجبور ہوئے کہ جنہیں عام حالات میں کوئی شخص کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بعض نے اسے وہ شدید عذاب سمجھا ہے۔ کہ جو جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تلواروں کی ضربوں کی صورت میں مشرکین کو لاحق ہوا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت کسی خاص گروہ کی طرف اشارہ نہ ہو بلکہ عذابِ الٰہی کے بارے میں ایک عمومی قانون بیان کر رہی ہو — جس کا آغاز رحمت ہو، پھر تربیتی سزا اور آخر کار نابود کر دینے والا عذاب۔[1]

اس بیان کے بعد قرآن ایک اور پہلو سے بات کرتا ہے۔ اب ان کے احساسِ تشکر کو ابھارنے کے لیے نعمات الٰہی کا ذکر کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا وہ ہے کہ جس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل (عقل) سے نوازا ہے۔ لیکن تم بہت کم ہی اس کا شکر بجالاتے ہو۔ (وهو الذی انشا لكم السمع والابصار والافئدة قليلا ما تشكرون)۔

کان، آنکھ اور عقل کا ذکر اس بنا پر ہے کہ پہچان اور معرفت کے لیے انسان کے پاس یہی تین ذرائع ہیں۔ حسی امور انسان عام طور پر آنکھ اور کان کے ذریعے معلوم کرتا ہے۔ جبکہ غیر حسی امور قوتِ عقل کے ذریعے معلوم کرتا ہے۔

ان دو ظاہر حواس یعنی بصارت اور سماعت کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم اس شخص کی حالت کو مدِنظر رکھیں کہ جو ان سے محروم ہے۔ اس کی دنیا کتنی محدود اور تاریک ہوتی ہے اور اس کا جہان بیداری اور آگاہی سے کس قدر تہی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان دونوں سے محروم ہونے کی وجہ سے عملی طور پر اپنے بہت سے حواس کھو بیٹھتا ہے، قوتِ گویائی ہمیشہ قوتِ سماعت کے ذریعے کام میں لائی جاتی ہے (مادر زاد بہرے ہمیشہ گونگے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان میں کوئی نقص نہیں ہوتا ہے۔)

اس طرح یہ دو حواس عالمِ محسوسات کی کلید ہیں۔ پھر عقل کی نوبت آتی ہے کہ عالمِ محسوسات اور جہانِ ماورائے طبیعت کی کلید ہے۔ علاوہ ازیں وہ امور جو پہلے دونوں حواس کے دائرے میں آتے ہیں ان کے بارے میں تجزیہ کرنے نتیجہ اخذ کرنے، جائزہ لینے اور جمع و تفریق کرنے کا کام بھی عقل کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

جو لوگ کہ شناخت و معرفت کے یہ تین ذرائع دستیاب ہونے پر شکر گزار نہیں کیا وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ ان تین

---

[1] ۔ ان آیات سے قبل آنے والی آیت — "إنّ الذین لا یؤمنون بالآخرة" اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

Marfat.com

ذرائع کی باریکیوں پراگر غور و خوض کیا جائے تو کیا یہ اس امر کے لیے کافی نہیں کہ انسان اپنے خالق سے آشنا ہو جائے۔
آنکھ اور کان کی نعمت کا ذکر زیرِ بحث آیت میں عقل سے پہلے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ماہرین کے بقول سب سے پہلے نو مولود کے کان کام شروع کرتے ہیں اور آنکھ ان سے بہت دیر بعد استعمال میں آتی ہے۔ کیونکہ رحم مادر کے تاریک ماحول سے نکلنے کے فوری بعد بچے کی آنکھیں روشنی کی شعاعوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد بچے کی آنکھیں ایک مدت تک بند رہتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ روشنی سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ جبکہ کانوں کی یہ صورت نہیں ہے، یہاں تک کہ بعض ماہرین کے نظریئے کے مطابق بچہ عالم جنین میں بھی سننے کی قدرت رکھتا ہے اور ماں کے دل کی دھڑکن سنتا ہے۔[۱]

ان تین نعمتوں کا ذکر درحقیقت ان نعمتوں کے معطی کی معرفت کے لیے ابھارتا ہے اور منعم حقیقی کی شناخت کے لیے انسان کو تحریک دیتا ہے (جیسا کہ علمائے عقائد نے شکرِ منعم کی ضرورت کو معرفتِ خدا کے عقلی طور پر واجب ہونے کی بنیاد قرار دیا ہے)۔

اگلی آیت میں اللہ کی نہایت اہم نشانی — یعنی اس خاکی زمین سے انسان کی خلقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا۔ (وھو الذی ذرأکم فی الارض)[۲]

اور چونکہ تم زمین سے پیدا ہوئے ہو۔ لہٰذا دوبارہ زمین کی طرف ہی پلٹ جاؤ گے۔ اور پھر ایک مرتبہ "تم قبروں سے اُٹھا کر اُس کی طرف محشور کیے جاؤ گے۔ (والیہ تحشرون)۔

اگر تم سوچتے کہ بے وقعت مٹی سے تمھاری خلقت ہوئی ہے تو یہ اس امر کے لیے کافی تھا کہ تم حیات عطا کرنے والے کو پہچان لیتے اور پھر تمھیں معاد بھی ممکن دکھائی دیتا۔

خلقتِ انسان کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد قرآن موت و حیات اور روز و شب کی آمد و شد کا ذکر کرتا ہے کہ جو عظیم آیات الٰہی میں سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہی ہے کہ جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور لیل و نہار کا آنا جانا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔ (وھو الذی یحی ویمیت ولہ اختلاف اللیل والنھار افلا تعقلون)۔

۱۔ شناخت کے ان تین آلات کے بارے میں گیارہویں جلد میں سورۂ نحل کی آیت ۷۸ کے ذیل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

۲۔ "ذرأکم" "ذرء" (بروزن زرع) کے مادے سے تخلیق، ایجاد اور اظہار کے معنی میں ہے۔ لیکن اگر مادہ "ذرو" (بروزن زرع) ہی ہو تو منتشر کرنے کے معنی میں ہے۔ ان دونوں مادوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری زیرِ بحث آیت پہلے مادے سے ہے (تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد صفحہ ۲۶ پر اس سلسلے میں اشتباہ ہوا ہے، اس پر ہمیں افسوس ہے قارئین کرام وہاں پر اصلاح فرمالیں)۔

Marfat.com

ان تین گزشتہ آیات میں معرفت پروردگار کے محرک سے بات شروع کی گئی ہے اور انفس و آفاق کی اہم ترین آیات کے ذکر پر بات ختم کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ابتدائے خلقت سے لے کر موت تک کے انسانی سفر اور پھر اس کی پروردگار کی طرف بازگشت کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے فرمان اور ارادے سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ موت وحیات کی خلقت کا ذکر لیل و نہار کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحن عالم ہستی میں نور و ظلمت بالکل موت وحیات کی مانند ہے۔ روشنی کی لہریں جیسے عالم ہستی میں جنبش، خوشی اور حرکت پیدا کرتی ہیں۔ اور تاریکی کے سائے میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح زندہ موجودات نورِ حیات میں اپنی حرکت شروع کرتے ہیں۔ ظلمتِ موت چھا جائے تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور ہر دو تدریجی پہلو رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بیان کیا جا چکا ہے کہ لیل و نہار کے "اختلاف" سے مراد ہو سکتا ہے ان کا آنا جانا ہو۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا "خلف" اور جانشین ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے تدریجی اختلاف اور فرق کی طرف اشارہ ہو کہ جس کے باعث سال کے چار موسم وجود میں آتے ہیں اور یہ فرق عالم نباتات میں ایک نظام دقیق کے تحت گردش حیات کی رہنمائی کرتا ہے۔

بہر حال یہ تمام مسائل معرفت الٰہی کے رہنما بن سکتے ہیں۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"افلا تعقلون"

کیا تم غور و فکر نہیں کرتے اور عقل کو بروئے کار نہیں لاتے؟

Marfat.com

۸۱- بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ○
۸۲- قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا
لَمَبْعُوثُونَ ○
۸۳- لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِنْ قَبْلُ
إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○
۸۴- قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُونَ ○
۸۵- سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○
۸۶- قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيمِ ○
۸۷- سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ○
۸۸- قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ
وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○
۸۹- سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ○
۹۰- بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ○

Marfat.com

ترجمہ

۸۱۔ انہوں نے وہی کچھ کہا، جو اُن کے پیش رو کہا کرتے تھے۔
۸۲۔ انہوں نے کہا: کیا جب ہم مر کر مٹی اور (بوسیدہ) ہڈیاں ہو جائیں گے پھر دوبارہ اُٹھیں گے؟
۸۳۔ یہی وعدہ ہم سے اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ تو گئے لوگوں کے قصّے ہیں۔
۸۴۔ کہو! بھلا یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کے ہاتھ ہے؟ بولو! اگر جانتے ہو تو۔
۸۵۔ (تمھارے جواب میں) کہتے ہیں! سب کچھ اللہ کے ہاتھ ہے، تو کہو: کیا پھر تم متوجہ نہیں ہوتے ہو؟
۸۶ کہو: کون ہے، سات آسمانوں اور عرش عظیم کا پروردگار؟
۸۷۔ وہ کہتے ہیں: یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے، تو کہو: کیا پھر تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اور اللہ سے ڈرتے نہیں ہو)؟
۸۸۔ کہو: اگر سچ کہو تو بتاؤ کہ تمام موجودات کی حکومت کس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہی ہے کہ جو بے پناہوں کو پناہ دیتا ہے اور پناہ دینے کا وہ محتاج بھی نہیں۔
۸۹۔ وہ کہتے ہیں: (یہ سب کچھ) اللہ کے ہاتھ ہے۔ تو کہو: اس کے

Marfat.com

باوجود (پھر) تم کس طرح کہتے ہو کہ تم پر جادو کیا گیا ہے۔

۹۰۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اُن کے سامنے حق پیش کر دیا ہے اور وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

تفسیر

فیصلہ تمہارا ضمیر کرے

گذشتہ آیات میں توحید پروردگار اور قیامت کے منکرین کو عالمِ ہستی اور آیات انفس و آفاق میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ زیرِ بحث آیات میں مزید فرمایا گیا ہے کہ وہ عقل و فکر کو چھوڑ کر اپنے بڑے بوڑھوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ "وہ بس وہی کہتے ہیں جو ان کے پیش رو کہتے تھے۔" (بل قالوا مثل ما قال الاولون)۔ وہ حیرت سے کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر کر مٹی اور بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ اٹھیں گے؟" (قالوا ءاذا متنا وکنا ترابا و عظاما ءانا لمبعوثون)۔[1]

ہمیں تو اس بات پر یقین نہیں آتا۔ یہ تو جھوٹے وعدے ہیں۔ ایسے وعدے ہم سے بھی ہوتے ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد سے بھی کیے جاتے رہے۔ (لقد وعدنا نحن و اٰباؤنا ھٰذا من قبل) اور یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں (ان ھٰذا الا اساطیر الاولین)۔

پھر سے خلقت ایک افسانہ ہے، حساب و کتاب بھی افسانہ ہے اور بہشت و دوزخ بھی افسانہ ہیں۔

کفار و مشرکین سب سے زیادہ قیامت کے خیال سے خوف کھاتے تھے۔ اس لیے طرح طرح کے بہانوں اور طعن و طنز سے اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھی معاد و قیامت کے بارے میں تاکیداً اور تفصیلاً گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں زیرِ بحث آیات میں تین حوالوں سے منکرین قیامت کی فضول منطق کی سرکوبی کی گئی ہے۔ ایک تو وسیع عالمِ ہستی پر اللہ کی مالکیت کے حوالے سے، دوسرا اس کی ربوبیت کے حوالے سے اور تیسرا سارے عالم پر اُس کی حاکمیت کے حوالے سے، قرآن ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے معاد پر قدرت رکھتا ہے اور اُس کی عدالت و حکمت

---

[1] "تراب" مٹی کا ذکر "عظام" (ہڈیوں) سے پہلے اس بنا پر ہے کہ مٹی کا پھر سے نئی زندگی پانا ہڈیوں کی نسبت عجیب تر ہے یا پھر اس طرف اشارہ ہے کہ ہمارے بڑے بزرگ مٹی ہو گئے ہیں اور باپ بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے ہیں۔ یا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پہلے انسان کا گوشت مٹی ہوتا ہے اور پھر ہڈیاں مٹی میں تبدیل ہوتی ہیں۔

Marfat.com

کا تقاضا ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک عالم آخرت بھی ہو۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ہر موقع پر خود مشرکین سے اعتراف کروایا گیا ہے اور انہی کی بات ان کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

کہو: زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ بتاؤ! اگر تم جانتے ہو۔ (قل لمن الارض ومن فیھا ان کنتم تعلمون)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: فطرت کی پکار اور عالم ہستی کے خالق پر اپنے اعتقاد کی بناء پر وہ کہتے ہیں، زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کی ملکیت اللہ کے ہاتھ ہے (سیقولون للہ)۔

اب تم ان سے کہو: جب ایسا ہے اور تم خود بھی اعتراف کرتے ہو تو پھر کیوں متوجہ نہیں ہوتے ہو۔ (قل افلا تذکرون)۔

اس واضح اعتراف کے باوجود موت کے بعد انسان کی زندگی کو کیوں بعید سمجھتے ہو اور اسے خدائے عظیم کی وسیع قدرت سے کیوں دُور جانتے ہیں؟ خدا پھر حکم دیتا ہے: ان سے پوچھو: سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے (قل من رب السماوات السبع ورب العرش العظیم)۔

اس سوال پر بھی وہ فطری پکار اور عالم ہستی کے خالق کے حوالے سے خدا پر اپنے اعتقاد کے باعث کہتے ہیں: یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ (سیقولون للہ)۔

جب وہ یہ صریح اقرار کرتے ہیں تو کہو: تم خود اس حقیقت کے معترف ہو، تو پھر اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں ہو اور حیاتِ نو کی طرف انسانی بازگشت کا انکار کیوں کرتے ہو (قل افلا تتقون)۔

پھر ان سے آسمانوں اور زمین کی حاکمیت کے بارے میں" سوال کرو کہ کون ہے، جس کے ہاتھ میں تمام موجودات کی حکومت ہے" (قل من بیدہ ملکوت کل شیء)۔ کون ہے جو بے سہاروں کو پناہ دیتا ہے اور جو کسی کو پناہ دینے کا محتاج بھی نہیں (وھو یجیر ولا یجار علیہ) اگر تم واقعاً ان حقائق سے آگاہ ہو (ان کنتم تعلمون)۔

وہ پھر اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملکیت، حاکمیت اور پناہ دینا اللہ ہی میں منحصر ہے (سیقولون للہ)۔

کہو: پھر تم کیونکر کہتے ہو کہ رسولؐ نے تم پر جادو کر دیا ہے اور تم مسحور ہو گئے ہو۔ (قل فانّٰی تسحرون)۔

یہ وہ حقائق ہیں کہ جن کا تم ہر مرحلے پر خود اعتراف کرتے ہو۔ اسے مالکِ ہستی جانتے ہو اور اُسے خالقِ ہستی مانتے ہو اور اُسے مدبر و مدبّر اور حاکم و پناہ گاہ شمار کرتے ہو جس ذات کی قدرت کا یہ عالم ہو اور جس کی حکومت کا دامن اتنا وسیع ہو۔ کیا وہ مٹی سے پیدا کیے ہوئے انسان کو دوبارہ مٹی بننے کے بعد لباسِ حیات پہنا کر محشور نہیں کر سکتا؟

تم حقائق سے کیوں مُنہ موڑتے ہو؟ تم رسولِ اسلام کو جادوگر یا دیوانہ کیوں کہتے ہو؟ جب کہ دل کی گہرائیوں میں تم ان حقائق کے معترف ہو۔

آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ جادو ہے نہ دیوانگی" بلکہ ہم ان کے لیے حق لے کر آئے ہیں اور اسے واضح کیا ہے، جبکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں" (بل اتیناھم بالحق وانھم لکاذبون)۔

Marfat.com

حقائق بیان کرنے میں ہماری اور ہمارے انبیائؑ کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ کوتاہی سراسر تمہاری ہے۔ کہ آنکھیں بند کیے غلط راہ پر چل پڑے ہو اور ہٹ دھرمی کے ساتھ اس راستے پر چلتے جا رہے ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ **کچھ الفاظ کے معانی** "اساطیر" "اسطورہ" کی جمع ہے۔ اہلِ لغت کے بقول یہ دراصل "سطر" کے مادہ سے "صف" کے معنی میں ہے۔ اسی لیے جو الفاظ ایک ہی صف میں آجائیں۔ انھیں "سطر" کہتے ہیں۔

"اسطورہ" ایسی سطروں اور تحریروں کو کہتے ہیں کہ جو دوسروں کی یادگار کے طور پر رہ جائیں۔ گزشتہ لوگوں کی تحریروں میں چونکہ افسانے اور خرافات موجود ہیں اس لیے عام طور پر یہ لفظ جھوٹی اور افسانوی داستانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے

قرآن حکیم میں لفظ "اساطیر" نو مرتبہ آیا ہے۔ ہر مرتبہ بے ایمان کافروں کے حوالے سے آیا ہے وہ انبیاؑ کی مخالفت کرنے کی توجیہ کے لیے استعمال کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلی جلد میں سورۂ حمد کی تفسیر میں ہم نے کہا ہے "رب" "مالک مصلح" کے معنی میں ہے۔ لہٰذا یہ لفظ ہر چیز کے مالک کے لیے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ اُس مالک کو رب کہتے ہیں کہ جو اپنی ملکیت کی اصلاح، حفاظت اور تدبیر کے درپے ہو۔ اس بنا پر بعض اوقات یہ لفظ تربیت و پرورش کرنے والے کے معنیٰ میں بھی آیا ہے۔

"ملکوت" "ملک" (بروزن "حکم") کے مادے سے حکومت و مالکیت کے معنیٰ میں ہے اور "و" اور "ت" کا اضافہ تاکید اور مبالغے کے لیے ہے۔

"عرش" اونچے پاؤں والے تخت کے معنیٰ میں ہے۔ علاوہ ازیں "چھت" انگور کی بیل والی دیوار اور جس پر بیٹھ کر معمار لوگ تعمیر کا کام کرتے ہیں۔ اُس پاڑ کو بھی عرش کہتے ہیں۔ جب یہ لفظ پروردگار کے حوالے سے استعمال ہو تو اس کا معنیٰ ہے "تمام عالم ہستی" اور "پوری کائنات" کہ جو درحقیقت اللہ کا تختِ حکومت شمار ہوتا ہے۔ لیکن کبھی یہ لفظ ماورائے عالم طبیعات کے لیے بولا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں عالم طبیعات کے لیے لفظ "کرسی" استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "وسع کرسیه السماوات والارض" (بقرہ - ۲۵۵) [1]

۲۔ **معاد پر ایمان۔ قدرتِ خدا کے حوالے سے:** آیاتِ قرآن سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ منکرین معاد کو زیادہ اس امر پر حیرت تھی کہ خاک ہونے کے بعد انسان کس طرح جی اٹھیں گے۔ اسی لیے معاد و قیامت کے بارے میں زیادہ تر آیات میں قدرتِ خدا کا ذکر ہے اور اس سلسلے میں عالم ہستی سے مختلف مثالیں اور نمونے بیان کیے گئے ہیں۔ تاکہ حیات بعد از ممات کے بارے میں ان کا تعجب ختم ہو۔

---

[1] "عرش" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ میں سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں ہم نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔

Marfat.com

زیرِ بحث آیات میں بھی تین حوالوں سے اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے زمین اور زمین پر رہنے والوں کے حوالے سے،

پھر آسمان اور عرشِ عظیم کے حوالے سے،

اور آخر میں عالمِ خلقت کی تدبیر اور کائنات کا نظام چلانے کے حوالے سے۔

اس لحاظ سے یہ تینوں ایک ہی مفہوم کا مصداق ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تینوں مطالب منکرینِ معاد کے ایک ہی نقطۂ نظر کی طرف اشارہ ہوں، مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا انکار اس بنا پر ہے کہ خاک شدہ انسان مالکیتِ الٰہی کی قلمرو سے نکل جائیں گے تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ تم خود اللہ کو زمین اور زمین کی ہر شے کا مالک سمجھتے ہو اور اگر تم کہتے ہو کہ مُردوں کو ایک قادر پروردگار ہی زندہ کر سکتا ہے تو تم خود اللہ کو آسمانوں اور عرش کا پروردگار کہہ کر پکارتے ہو اور اگر تمہارا انکار اس بنا پر ہے کہ تمہیں مُردوں کی حیاتِ نو کے بعد تدبیرِ عالم پر اعتراض ہے تو یہ بھی بے جا ہے۔ کیونکہ تم قبول کر چکے ہو۔ تمام عالمِ ہستی پر وہ قادر ہے اور تمام موجودات اُس کی پناہ میں ہیں۔ اس لحاظ سے تمہارے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

تینوں مواقع پر کفار نے "سیقولون للّٰہ" کہا اور جواب کی یہ ہم آہنگی پہلی تفسیر کو تقویت دیتی ہے۔

۳- آیات کے آخری حصّے کا فرق

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ پہلے سوال و جواب کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔

افلا تذکرون

کیا تم توجہ نہیں کرتے ہو۔

جبکہ دوسرے سوال و جواب کے آخر میں ہے۔

افلا تتقون

کیا اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟

اور تیسرے سوال و جواب کے آخر میں ہے۔

فانّٰی تسحرون

پس تم کیونکر کہتے ہو کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

درحقیقت یہ تنبیہ اور سرزنش ہے کہ جو مرحلہ بمرحلہ شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ منطقی طرزِ تعلیم کا ایک انداز یہ ہے کہ تین دلائل کے ذریعے کسی کو مغلوب کرنا ہو تو پہلے سرزنش کچھ نرم ہوتی ہے پھر کچھ شدید ہو جاتی ہے اور آخر میں زیادہ شدید انداز میں ملامت کی جاتی ہے۔

Marfat.com

۹۱۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ
مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَ
لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا
يَصِفُوْنَ ۙ
۹۲۔ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۠

ترجمہ

۹۱۔ اللہ نے ہرگز کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور کوئی دوسرا اُس کے ساتھ معبود نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا تو ان میں سے ہر خدا اپنی مخلوق کا خود نظام چلاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے درپے ہوتے (اور نظام کائنات تباہ ہو جاتا) پاک ہے اللہ اس توصیف سے کہ جو یہ کرتے ہیں۔

۹۲۔ وہ ہر پنہاں و آشکار سے آگاہ ہے۔ وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیں۔

تفسیر

شرک دنیا کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے

گزشتہ آیات میں معاد اور اللہ کی مالکیت، حاکمیت اور ربوبیت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ زیرِ نظر آیات

Marfat.com

میں نفی شرک کے مسئلے پر بات ہوئی ہے۔ ان میں مشرکین کے کچھ الخرافات کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے : اللہ نے ہرگز کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ (ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الٰہ)۔

صرف عیسائی اللہ کی اولاد کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ بلکہ مشرکین کا بھی اس طرح کا عقیدہ تھا۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا حقیقی بیٹا کہتے ہیں۔ جبکہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے۔ اور شاید عیسائیوں نے بھی یہ عقیدہ پرانے مشرکین ہی سے لیا تھا۔ بہرحال بیٹا چونکہ ذات اور حقیقت کے لحاظ سے باپ کا ایک حصّہ ہے۔ اس لیے وہ لوگ فرشتوں یا حضرت عیسیٰؑ وغیرہ کے لیے الوہیت کے ایک حصّہ کے بھی قائل تھے اور یہ واضح طور پر مظاہر شرک میں سے ہے۔

اس کے بعد نفی شرک کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اگر اللہ کا کوئی شریک ہوتا اور متعدد خدا عالم ہستی پر حکمران ہوتے تو ہر ایک اپنی خاص مخلوق کا نظام خود چلانے کے درپے ہوتا (اور یہ فطری بات ہے کہ پھر کائنات کے مختلف حصّوں کا نظام مختلف ہاتھوں میں ہوتا اور یہ بات موجودہ نظام وحدت سے ہم آہنگ نہیں ہے) (اذا لذھب کل الٰہ بما خلق)۔

علاوہ ازیں ان خداؤں میں سے " ہر ایک اپنی حکومت کو توسیع دینے کی کوشش کرتا اور دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے درپے ہوتا " اور یہ بات بھی نظامِ عالم کے درہم برہم ہوجانے کا باعث ہوتی (ولعلا بعضھم علیٰ بعض)۔

اور آیت کے آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : پاک ہے اللہ اس سے کہ جو وہ اُس کی توصیف کرتے ہیں (سبحان اللہ عمّا یصفون)۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اچھی طرح سے مشاہدہ کررہے ہیں کہ عالمِ کائنات پر ایک وسیع نظام حکم فرما ہے زمین و آسمان پر ایک جیسے قوانین کی حکمرانی ہے۔ جو قوانین انتہائی چھوٹے سے ذرّے " ایٹم " پر حکم فرما ہیں۔ وہی نظامِ شمسی اور دیگر نظاموں پر حکم فرما ہیں۔ ماہرین کے بقول اگر ایٹم کو بڑا کر لیا جائے تو وہ نظامِ شمسی کی شکل دھارلے اور اگر اس کے برعکس نظامِ شمسی کو چھوٹا کرلیا جائے۔ تو وہ ایک ایٹم کی صُورت اختیار کرلے۔

مختلف علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں نے جدید ترین آلات و وسائل کی مدد سے کائنات کی وسعتوں کا جو مطالعہ کیا ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ تمام کائنات وحدتِ نظام کی ترجمان ہے۔

دوسری طرف تعدد کا لازمہ ہمیشہ ایک قسم کا اختلاف اور تفاوت ہے۔ کیونکہ دو چیزیں اگر ہر لحاظ سے ایک ہوں تو وہ ایک چیز ہو جائیں گی۔ اور پھر دو کا کوئی مفہوم نہیں رہ جائے گا۔ لہٰذا اگر اس جہان کے لیے متعدد خدا فرض کیے جائیں۔ تو یہ تعدد مخلوقاتِ عالم اور ان پر حاکم نظام پر اثر انداز ہوگا۔ اور اس کا نتیجہ نظامِ کائنات کی عدمِ وحدت ہوگا۔

اس سے قطع نظر ہر موجود تکامل وارتقاء کا خواہاں ہے۔ مگر جو موجود ہر لحاظ سے کامل ہو اس کے لیے تکامل کا کوئی مفہوم نہیں۔ اگر ہم متعدد خدا فرض کریں اور اُن کی مختلف حکومتیں فرض کریں تو ظاہری بات ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی کمال

Marfat.com

مطلق کا مالک نہ ہوگا۔ لہٰذا فطری امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے کمال کے درپے ہوگا اور چاہے گا کہ تمام عالم ہستی کو اپنے احاطۂ اقتدار میں شامل کرے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہر ایک دوسرے پر برتری و فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ کائنات کی تباہی ہوگا۔

اس طرح سے مذکورہ بالا آیت کے دونوں جملوں میں سے ہر ایک، ایک علیحدہ منطقی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا یہ دلائل منطقی پہلو رکھتے ہیں نہ کہ اقناعی [1]

اب یہاں ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ اس صورت میں ہے۔ اگر ہم فرض کریں کہ خدا ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر وہ حکیم و آگاہ ہوں تو پھر کیا مانع ہے۔ مثلاً وہ شورائی نظام کے تحت بھی کائنات کو چلا سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہم تیرھویں جلد میں سورۂ انبیاء کی آیت ۲۲ کے ذیل میں تفصیل سے "برہان تمانع" کے موضوع کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔

اگلی آیت میں ان بے ہودہ گو مشرکین کو ایک اور جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اللہ ہر پنہاں و آشکار سے آگاہ ہے"۔ تمھیں جن کے خدا ہونے کا دعوٰے ہے۔ اگر کوئی ہوتا وہ اللہ ضرور اُن سے آگاہ ہوتا۔ جبکہ ایسا نہیں ہے (عالم الغیب والشہادۃ)۔

کیا یہ ممکن ہے کہ عالم میں کوئی اور خدا ہوتا کہ جس سے تم آگاہ ہو۔ لیکن وہ اللہ کہ جو تمھارا خالق ہے اور غیب و شہود کو جانتا ہے۔ اس سے بے خبر ہو؟

یہ بیان درحقیقت سورۂ یونس کی آیت ۱۸ سے ملتا جلتا ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے۔

قل اتنبئون اللہ بما لا یعلم فی السمٰوٰت ولا فی الارض

"کہو! کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو، جس کے وجود کا اُسے آسمان و زمین میں پتہ نہیں ہے۔"

آخری جملے میں یہ کہہ کر اُن خرافاتی خیالات پر خطِ بطلان کھینچا گیا ہے: اللہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے

---

[1] "ولعلا بعضھم علی بعض" کی علامہ طباطبائی مرحوم نے تفسیر المیزان میں ایک اور تفسیر ذکر کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم پر حاکم نظام کبھی تو ایک دوسرے کے متوازی اور عرض میں ہوتے ہیں۔ مثلاً صحرا اور دریا پر حاکم نظام اور کبھی ایک دوسرے کے تسلسل اور طول میں مثلاً نظام شمسی کلی و مجموعی اعتبار سے اور وہ نظام کہ جو کرۂ زمین پر حاکم ہے۔ زمین پر حاکم نظام شمسی کا ایک حصہ دوسری صورت میں ایک نظام کے تحت دوسرا نظام ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک الگ خدا سے وابستہ ہو تو ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ کہ جو خدا کلی نظام پر حاکم ہے۔ وہ ہر موقع پر اس خدا سے برتر ہے جو ماتحت نظام پر یا جزوی نظام پر حاکم ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں خداؤں کے کے لیے سلسلۂ مراتب کا قائل ہونا پڑے گا۔ (جیسے کسی ایک ملک میں صدر، وزیر، گورنر اور افسر کا سلسلہ ہوتا ہے اور ان کے مختلف مراتب ہوتے ہیں) جبکہ خدا کے لیے ایسا سلسلۂ مراتب قبول کرنا محال ہے۔

(تفسیر المیزان، ج ۱۵، ص ۶۶)

Marfat.com

شریک قرار دیں۔ (فتعالیٰ عما یشرکون)۔

آیت کا یہ حصہ سورہ یونس کی آیت ۱۸ کے آخری حصے سے بالکل مشابہ ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔

یہ نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں آیات ایک ہی مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

ضمنی طور پر یہ جملہ مشرکین کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ اللہ اُن کے ظاہر و پنہاں سے آگاہ ہے اور وہ ان تمام باتوں کو جانتا ہے اور موقع آنے پر وہ اپنی عدالت میں ان کا فیصلہ کرے گا۔

Marfat.com

۹۳۔ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ
۹۴۔ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○
۹۵۔ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ○
۹۶۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ
بِمَا يَصِفُوْنَ ○
۹۷۔ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ
۹۸۔ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ○

ترجمہ

۹۳۔ کہہ دو: پروردگارا! جس عذاب کی انھیں دھمکی دی گئی ہے۔ اگر مجھے تو وہ دکھائے
۹۴۔ تو اے میرے رب! (یہ عذاب نازل کرتے ہوئے) مجھے اس
ظالم قوم میں سے قرار نہ دینا۔
۹۵۔ اور ہم قادر ہیں کہ تجھے وہ کچھ دکھائیں کہ جس کا ہم نے ان کے لیے
وعدہ کیا ہے۔
۹۶۔ برائی کو بہتر طریقے سے دفع کرو (اور برائی کا جواب اچھائی سے دو)۔ جو
باتیں وہ کرتے ہیں۔ ہم اُن سے زیادہ آگاہ ہیں۔
۹۷۔ اور کہہ دو: پروردگارا! شیطانوں کے وسوسوں سے میں تیری پناہ

Marfat.com

چاہتا ہوں۔

۹۸۔ اور اے میرے رب! میں اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

تفسیر

شیطانی وسوسوں سے پناہ بخدا

گذشتہ آیات میں ہٹ دھرم کافروں اور مشرکوں کو سرزنش کی گئی ہے۔ جبکہ زیرِ نظر آیات میں روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔ لیکن سلسلہ کلام وہی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اے رسول کہہ دو: پروردگارا! وہ عذاب جس کا تونے ان سرکش لوگوں کے بارے میں وعدہ کیا ہے۔ اگر تو مجھے دکھائے (قل رب اما ترینی ما یوعدون)۔[1]

تو اے میرے رب! یہ عذاب نازل کرتے ہوئے مجھے اس ظالم قوم میں سے قرار نہ دینا (رب فلا تجعلنی فی القوم الظالمین)۔ میری دُعا ہے کہ جس وقت تیرا قطعی عذاب انھیں دامن گیر ہو تو مجھ پر احسان فرمانا اور مجھے اس کی ہلاکت انگیزیوں سے بچائے رکھنا اور میری دُعا ہے کہ اس وقت میں ان ظالموں میں نہ ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اکرمؐ کے عمل میں کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ بھی عذابِ الٰہی کی زد میں آجاتے اور اس میں بھی شک نہیں، کہ عدالت الٰہی سے جاری ہونے والے فرمانِ سزا کی زد میں ہر خشک و تر نہیں آجاتا۔ یہاں تک کہ اگر ایک عظیم مملکت میں صرف ایک شخص خدا پرست اور فرض شناس ہو تو دوسرے لوگوں کو سزا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس کو بچائے گا۔

لیکن حکمِ خدا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دُعا کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کے لیے خطرے کا الارم ہو کہ سزا کا معاملہ اس قدر یقینی ہے کہ خود رسولِ عظیم اسلام کو چاہیئے کہ وہ اپنے تئیں خدا کے سپرد کردیں اور اس سے نجات کی درخواست کریں۔

دوسرا یہ کہ یہ بات اس رسولؐ کے تمام پیروکاروں کے لیے بھی درس ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہرگز عذابِ الٰہی سے مامون نہ سمجھیں اور اپنے آپ کو ہر حالت میں اس کے سپرد کریں۔

---

[1] مندرجہ بالا آیات میں "اما" "ان" شرطیہ اور "ما" زائدہ کا مرکب ہے۔ یہاں یہ لفظ تاکید کے لیے آیا ہے اور عام طور پر اس بنا پر کہ "ان" شرطیہ فعل پر داخل ہو سکے جو کہ "نونِ تاکید" کے ساتھ ہو لفظ "ما" کا فاصلہ ہونا چاہیئے۔

Marfat.com

رہا یہ سوال کہ اس عذاب سے کون سا عذاب مراد ہے؟ تو اس سلسلے میں بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مشرکین پر آنے والا وہ دنیاوی عذاب مراد ہے کہ جو جنگ بدر میں ان کی رسواکن شکست کی صورت میں سامنے آیا۔[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورۂ مومنون مکی ہے اور ان دنوں مومنین سخت دباؤ میں تھے۔ یہ آیات ان کے لیے ایک طرح سے دل جوئی اور تسلیٔ خاطر ہیں (اس کی نظیر سورۂ یونس کی آیت ۴۶ بھی ہے)۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت دونوں مراد ہیں۔[2] البتہ پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں مزید تاکید کے لیے، دشمنوں کے ہر قسم کے شک کو دُور کرنے کے لیے اور رسول اللہؐ اور مومنین کی دل جوئی کے لیے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم یقیناً قادر ہیں کہ جس عذاب کا ان کے لیے ہم نے وعدہ کیا ہے وہ تجھے دکھائیں (وانا علی ان نریك ما نعدهم لقادرون)۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ اس تاریخ کے بعد جنگ بدر میں اور دیگر مواقع پر اللہ کی اس قدرت کے مظاہر دیکھنے میں آئے اور ظاہراً چھوٹا سا کمزور لشکر اللہ کے حکم اور قوتِ ایمان سے دشمنوں کی بڑی تعداد پر کامیاب و کامران ہوا۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کو ان لوگوں کے ساتھ حسن کریمی سے پیش آنے کے لیے کہا گیا ہے: اور ان کی برائیوں کو عفو و درگزر اور اچھائی کے ساتھ دُور کرو اور ان کی غیر پسندیدہ باتوں کا بہترین منطق کے ساتھ جواب دو (ادفع بالتی هی احسن السیئة)۔ اس سلسلے میں جلدی نہ کرو اور جان لو کہ جو کچھ باتیں وہ کرتے ہیں ہم اس سے زیادہ آگاہ ہیں (نحن اعلم بما یصفون)۔

ہم جانتے ہیں کہ ان کی ناشائستہ حرکات اور اذیت ناک باتیں تمہارے لیے پریشان کن اور تکلیف دہ ہیں۔ لیکن تمہیں نہیں چاہیئے کہ ان سختیوں اور بدگوئیوں کا ویسا ہی جواب دو تم ان کی برائی کا جواب اچھائی سے دو۔ کیونکہ یہ روش بذاتِ خود غافل اور فریب خوردہ افراد کی بیداری کے لیے نہایت موثر ہے۔

مگر اس کے باوجود اپنے تئیں اللہ کے سپرد کردو اور "کہو: اے میرے رب! میں شیطانی وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں (وقل رب اعوذ بك من همزات الشیاطین)۔

نہ صرف ان کے غافل کر دینے والے وسوسوں سے تیری پناہ کا طالب ہوں بلکہ اس سے بھی کہ وہ میرے پاس آئیں (واعوذ بك رب ان یحضرون)۔

وہ میری محفل میں بھی نہ آئیں کیونکہ ان کی موجودگی گمراہ کن اور نقصان دہ ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، المیزان، فی ظلال القرآن، رُوح المعانی اور تفسیر ابوالفتوح رازی ——— زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر کبیر از فخرالدین رازی ——— زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ "ھمزات الشّیاطین" کیا ہے؟ "ھمزات" "ھمزۃ" کی جمع ہے، جس کا معنیٰ ہے شدت کے ساتھ دفع اور تحریک۔ حرف ہمزہ کو اسی لیے ہمزہ کہتے ہیں کہ وہ گلے کے آخری حصے سے شدت کے ساتھ نکلتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "ھمز" "غمز" اور "رمز" کے ایک ہی معنی ہیں۔ البتہ "رمز" خفیف مرحلے کے لیے ہے، "غمز" شدید تر اور "ھمز" نہایت شدید مرحلے کے لیے ہے۔[1]

"شیاطین" جمع ہے اور اس کے مفہوم میں جنوں اور انسانوں میں موجود تمام پنہاں و آشکار شیطان شامل ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ امامؑ نے "قل رب اعوذ بك من ھمزات الشیاطین" کی تفسیر میں فرمایا۔

اس سے مراد وہ شیطانی وسوسے ہیں جو تیرے دل میں پڑتے ہیں۔[2]

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی طرف سے مقام عصمت کے حامل ہونے کے باوجود اس سے یہ دعا کرتے ہیں۔ تو دوسروں کی حالت واضح ہے۔ لہٰذا تمام مومنین کو چاہیئے کہ وہ اپنے مالک و مدبر پروردگار سے دعا کریں کہ وہ لحظہ بھر کے لیے بھی انہیں اپنے حال پر نہ چھوڑے۔ نہ صرف شیطانی وسوسوں سے بچائے۔ بلکہ ان کی محفلوں کو بھی شیطانی وجود سے پاک رکھے۔ راہِ حق کے تمام راہیوں کو چاہیئے کہ شیطانی وسوسوں سے ڈرتے رہیں۔ اور ہمیشہ اپنے تئیں پناہ خدا میں دیئے رکھیں۔

۲۔ برائی کا جواب بھلائی سے: سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں سے مقابلے کا ایک مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے کہ ان کے ضمیر کے اندر ایک ہیجان پیدا ہوگا اور اُن کا ضمیر ہی ان کی برائیوں پر انہیں سخت ملامت کرے گا۔ اور حق و باطل کے موازنے میں ان کا ضمیر حق کا ساتھ دے گا۔ بہت سے مواقع پر یہی امر دشمن کو مائل کر دیتا ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی سیرت اور عملی زندگی میں ہم نے بہت دیکھا ہے کہ انھوں نے ایسے افراد یا گروہوں کا جواب اچھائی کے ساتھ دیا ہے کہ جو بدترین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں سے ان پیشواؤں نے محبت کا سلوک کیا ہے اور یہی امر ان کے روحانی انقلاب اور راہِ حق پر آجانے کا باعث بنا ہے۔

قرآن نے مندرجہ بالا آیات میں اور دیگر کئی ایک مقامات پر مسلمانوں سے تقاضا کیا ہے کہ وہ برائیوں کا اس طریقے سے مقابلہ کریں۔

یہاں تک کہ سورہ "حٰمٓ السجدہ" کی آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۵۲

Marfat.com

فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔

اس کام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہایت سخت دشمن تمہارے گرم جوش دوست بن جائیں گے۔"

لیکن ــــ یہ بات بنا کہے واضح ہے کہ یہ حکم خاص مواقع کے لیے ہے۔ ایسے مواقع کہ جہاں دشمن اس سے غلط فائدہ نہ اُٹھائے اور اسے کمزوری پر محمول نہ کرے اور اس کی جرارت وجسارت میں اضافہ نہ ہو۔

نیز اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سازشوں اور شیطانی، وسوسوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔

شاید اسی بنا پر مندرجہ بالا حکم کے فوراً بعد قرآن، رسول اللہ کو حکم دیتا ہے کہ شیطانی وسوسوں اور شیطانوں کے پاس آنے سے خدا کی پناہ مانگو۔

Marfat.com

۹۹۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ
ارۡجِعُوۡنِ ۙ‏
۱۰۰۔ لَعَلِّىۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِيۡمَا تَرَكۡتُ كَلَّا ؕ
اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنۡ وَّرَآئِهِمۡ
بَرۡزَخٌ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ‏ ○

ترجمہ

۹۹۔ (وہ اسی طرح اپنی غلط روش پر گامزن رہتے ہیں) یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کو آگھیرتی ہے تو وہ کہتا ہے: میرے پروردگار مجھے واپس لوٹا دے۔

۱۰۰۔ شاید جو کچھ میں نے کوتاہی کی ہے) اس کے لیے عملِ صالح انجام دوں (تو اسے کہا جائے گا۔) ایسا نہیں ہے، یہ تو وہ بات ہے جو یہ (صرف زبان سے کہتا ہے (اور اگر اسے پلٹا دیا جائے تو بھی اس کا طرزِ عمل وہی پہلے کا سا ہوگا) اور ان کے پیچھے اس دن تک کے لیے برزخ حائل ہے۔ جس دن وہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

Marfat.com

تفسیر

ناممکن تقاضا

گذشتہ آیات میں مشرکین کی اپنے راستے پرہٹ دھرمی کا ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں آستانۂ موت پران کی دردناک کیفیت کا تذکرہ ہے۔

وہ اپنی غلط روش پر یونہی گامزن رہیں گے ، یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کو آلے (حتٰی اذا جاء احدھم الموت)۔[1]

اس وقت کہ جب وہ دیکھے گا کہ اس جہان سے اس کا رابطہ کٹ گیا ہے۔ اور اب وہ دوسرے جہان میں ہے تو غرور و غفلت کے پردے اس کی آنکھوں پر سے اُٹھ جائیں گے۔ گویا اپنا دردناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اسے یاد آئے گا کہ اس نے عمر گنوادی اور اتنا سرمایہ ضائع کر دیا۔ اسے اپنی عمرِ رفتہ کی کوتاہیاں یاد آئیں گی۔ وہ گناہ جو اس نے انجام دیئے تھے۔ اُن کا خیال آئے گا۔ اور اب ان سب کا منحوس انجام وہ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوگا۔ اس وقت وہ فریاد کرے گا اور پکارے گا: اے میرے رب مجھے واپس بھیج دے۔ (قال رب ارجعون)۔ مجھے پھر دُنیا میں لوٹا دے کہ میں اپنے کیئے کی تلافی کرسکوں اور اپنی کوتاہیوں کو دُور کرنے کے لیے عمل صالح بجا لاؤں" (لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت)۔

لیکن قانونِ آفرینش کسی نیک یا بد کو واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا اُسے جواب دیا جائے گا۔ کیا؟ واپسی؟ ہرگز نہیں (کلا)۔ یہ تو ایسی بات ہے جو وہ صرف زبان سے کہتا ہے (انھا کلمۃ ھو قائلھا)۔

یہ بات اس کے دل کی گہرائیوں سے ، ارادے اور آزادی کے ساتھ نہیں نکلی۔ یہ تو وہی بات ہے۔ جو ہر گناہگار

---

[1] "حتّٰی" درحقیقت ایک محذوف جملے کی غایت ہے کہ جو گذشتہ عبارتوں سے واضح ہوتا ہے اور وہ تقدیر میں یُوں ہے۔

انھم یستمرون علی ھذا الحال حتّٰی اذا جاء احدھم الموت۔

وہ اسی طریقے پر چلتے رہیں گے یہاں تک کہ ان میں کسی ایک کو موت آجائے۔

اور یہ مفہوم " نحن اعلم بما یصفون " سے بھی سمجھا جا سکتا ہے اور یہ جُملہ گذشتہ آیات میں بھی دو مرتبہ آیا ہے (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

اس وقت کہتا ہے۔ جب وہ سزا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور جب طوفان بلاتھم جاتا ہے۔ تو پھر وہ اپنے طرزِ عمل کو جاری رکھتا ہے۔

سورۂ انعام کی آیت ۲۸ میں بھی ایسی ہی بات فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ولو ردو لعادو الما نھوا عنہ

اگر وہ اپنی حیاتِ دنیا کی طرف لوٹ جائیں تو وہی پہلے کا سا طور طریقہ جاری رکھیں۔

آیت کے آخر میں برزخ کی اسرار آمیز زندگی کی طرف نہایت معنی خیز اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس روز وہ اُٹھائے جائیں گے۔ اُس دن تک اُن کے پیچھے برزخ حائل ہے (ومن وراۓھم برزخ الٰی یوم یبعثون)۔

چند اہم نکات

۱۔ "ربّ ارجعون" میں مخاطب کون ہے؟

یہاں لفظ "رب" "ربّی" کا مخفف ہے۔ جو کا معنیٰ ہے: میرے پروردگار۔ لہٰذا اس کا آغاز نشاندہی کرتا ہے کہ مخاطب خداوند متعال ہے۔ لیکن "ارجعون" (مجھے آپ واپس لوٹا دیں) چونکہ جمع کا صیغہ ہے۔ لہٰذا مخاطب خدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک لفظ مخاطب واحد کے لیے اور دوسرا مخاطب جمع کے لیے۔ ایسا کیوں ہے۔؟

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مخاطب خدا ہی ہے اور جمع کا صیغہ یہاں احترام و تعظیم کے طور پر ہے۔ جیسا کہ ہماری فارسی زبان میں بھی معمول ہے کہ ہم ایک مخاطب فرد کو احترام کے طور پر "شما" (آپ) کہتے ہیں۔ لیکن گذشتہ زمانوں میں عربی زبان میں اس طرح سے رائج نہیں تھا اور قرآن میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جملے کی یہ تفسیر کمزور ہے۔[1]

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ مخاطب دراصل موت کے فرشتے ہیں۔ کہ جن کے ذمے روحیں قبض کرنا ہے اور لفظ "رب" یہاں پر بارگاہ خدا میں ایک طرح کی فریاد ہے۔ ہمارے روزمرہ کی گفتگو میں یوں بہت ہوتا ہے کہ جب انسان کسی

---

[1] سورۂ قصص کی آیت ۹ میں ہے۔

"قرّۃ عین لی ولک لا تقتلوہ"

یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا تم لوگ اسے قتل کرو۔"

یہ بات فرعون کی بیوی نے اُس وقت کہی جب دریا سے بہتا ہوا، حضرت موسیٰ کا صندوق لایا گیا۔ اس میں پہلے فرعون مخاطب ہے۔ اور اس کے بعد اس کے وہ ساتھی کہ جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل پر مامور تھے (غور کیجیے گا)

Marfat.com

بحرانی کیفیت سے دو چار ہو تو پہلے بارگاہِ خدا میں فریاد کرتا ہے اور بعد میں لوگوں سے مدد طلب کرتا ہے۔ مثلاً:

یا اللہ ! یا اللہ

مجھے بچاؤ میری مدد کرو

یہ تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

۲۔ "فیما ترکت" کا مفہوم

مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ کافر لوگ موت کی چوکھٹ پر پہنچ کر خواہش کرتے ہیں کہ انھیں واپس لوٹا دیا جائے تاکہ "انھوں نے جن چیزوں کو ترک کیا ہے" ان کے بدلے عمل صالح بجالائیں۔

بعض کا نظریہ ہے۔ کہ "فیما ترکت" ان اموال کی طرف اشارہ ہے کہ جو ان کی طرف سے باقی رہ گئے ہیں۔ کیونکہ عام طور پر بھی انہیں "ترکۂ میت" کہتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث اسی مفہوم کی موید منقول ہے، آپ فرماتے ہیں۔

من منع قیراطا من الزکوٰۃ فلیس بمؤمن ولا مسلم وھو قولہ تعالیٰ رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت[1]

جو شخص زکوٰۃ کا ایک قیراط[2] نہ دے وہ مومن ہے نہ مسلمان اور اللہ کا یہ فرمان اسی بارے میں ہے (رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت)

بعض دیگر مفسرین اس سے زیادہ وسیع معانی کے قائل ہیں۔ وہ "ما ترکت" کو ان تمام اعمال صالح کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جنھیں یہ شخص چھوڑ چکا ہے۔ یعنی خداوندا! مجھے واپس بھیج دے تاکہ جو صالح اعمال میں نے ترک کیے ہیں انھیں بجالاؤں اور پہلی کوتاہیوں کی تلافی کروں۔

دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ضمناً ۔ "لعلی اعمل صالحا" (شاید عمل صالح انجام دوں) میں "لعل" (شاید) ممکن ہے۔ اس طرف اشارہ ہو کہ یہ غلط کار اور منحرف افراد اپنی آئندہ کیفیت کے بارے میں بھی مطمئن نہیں ہیں۔ اور کم و بیش جانتے ہیں کہ یہ ندامت خاص حالات کی وجہ سے ہے۔ اور موت آجانے کے باعث انھیں پیش آئی ہے۔ ورنہ اگر وہ واپس بھیج دیے جائیں تو وہی روش باقی رکھیں گے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

۳۔ "کلا" یہاں کس چیز کی نفی کرتا ہے؟

"کلا" عربی زبان میں روکنے اور دوسرے کی بات کو باطل کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کی ضد "ای" (جی ہاں) ہے

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۵۵ بحوالہ کافی،
ثواب الاعمال اور من لا یحضرہ الفقیہ

[2] قیراط کا وزن جَو کے چار دانوں کے برابر ہوتا ہے۔

Marfat.com

کہ جو تصدیق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "کلا" دنیاوی زندگی کی طرف واپسی کے کافروں کے تقاضے کی نفی ہے۔ یعنی واپسی کا راستہ بند ہے اور کسی طرف بھی اب تمہارا دنیاوی زندگی کی طرف لوٹ کے جانا ممکن نہیں۔

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ ان کے اس دعوے کی نفی ہے۔ کہ اگر ہم دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو اپنی گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کریں گے۔ اللہ کہتا ہے کہ یہ ایک بے بنیاد اور کھوکھلا دعوٰے ہے اور اگر یہ پلٹ جائیں تو وہی پہلے کا سا طرزِ عمل جاری رکھیں گے۔

البتہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ یہ لفظ دونوں باتوں کی نفی کے لیے ہو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیرِ بحث آیت میں یہ تقاضا اگرچہ مشرکین کی طرف سے کیا گیا ہے اور انہی کو جواب دیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ امر مسلم ہے کہ یہ امر انہی سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام گناہگاروں، ظالموں اور غلط کاروں کی یہی خواہش ہوگی جب وہ موت کو اپنے آستانے پر دیکھیں گے تو انہیں اپنا دردناک انجام نظر آئے گا۔ وہ اپنے گزشتہ کردار پر پشیمان ہوں گے اور واپسی کا تقاضا کریں گے۔ لیکن ان کی یہ درخواست ٹھکرا دی جائے گی۔

۴۔ عالم برزخ کیا ہے؟

عالم برزخ کیا ہے، کہاں ہے اور دُنیا و آخرت کے درمیان اس قسم کے جہان کی کیا دلیل ہے؟ نیز کیا برزخ سب کے لیے ہے یا کچھ معین لوگوں کے لیے؟ اور اس عالم میں مومنین صالحین، کفار اور گناہگاروں کی کیا کیفیت ہوگی؟

عالم برزخ کے بارے میں اس قسم کے سوالات اُبھرتے ہیں اور آیات و روایات میں ان پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے ضروری ہے کہ یہ تفسیر جس قدر اجازت دیتی ہے۔ ہم ان سوالات کا جواب دیں۔

"برزخ" کا بنیادی معنٰے ہے ایسی چیز کہ جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو۔ بعد ازاں ہر اس چیز کو "برزخ" کہا جانے لگا کہ جو دو چیزوں کے درمیان ہو۔ اسی لیے دُنیا و آخرت کے درمیانی عالم کو "برزخ" کہا جاتا ہے۔

اسی جہان کو عالم قبر اور عالم ارواح بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں متعدد ایسی قرآنی آیات موجود ہیں کہ جن میں سے کچھ ظاہری طور پر اس عالم کی موجودگی پر دلالت کرتی ہیں اور بعض صراحتًا یہ مفہوم دیتی ہیں۔

زیرِ بحث آیت:

ومن ورائھم برزخ الٰی یوم یبعثون۔

ان کے پھر جی اُٹھنے کے دن تک ان پیچھے برزخ حائل ہے۔

یہ آیت عالمِ برزخ کے بارے میں بالکل ظاہری مفہوم رکھتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہاں برزخ کا معنٰی "اس دُنیا کی طرف واپسی میں رکاوٹ" کیا ہے۔ لیکن یہ معنٰی بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ "الٰی یوم یبعثون" (مبعوث ہونے اور قبروں سے اُٹھنے کے دن تک) اس بات کی دلیل ہے کہ یہ برزخ دنیا اور آخرت کے درمیان ہے نہ کہ انسان اور دُنیا کے درمیان۔

Marfat.com

جو آیات صراحتاً اس قسم کے جہاں ثابت کرتی ہیں وہ ہیں کہ جو شہدار کی زندگی سے مربوط ہیں۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون۔

ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ جو لوگ راہِ خدا میں مارے گئے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، وہ تو زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے رزق پاتے ہیں۔

(آل عمران - ۱۶۹)

یہاں تو رُوئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔ جب کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۴ میں تمام مومنین سے خطاب کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون۔

اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مردہ نہ کہو۔ وہ تو زندہ ہیں۔ تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔

نہ صرف شہدار جیسے بلند مقام مومنین کے لیے عالم برزخ موجود ہے۔ بلکہ فرعون اور اس کے حواریوں جیسے سرکشوں کے لیے عالم برزخ کا ہونا صراحت سے سُورۂ مومن کی آیت ۴۶ میں آیا ہے۔

النار یعرضون علیھا غدوًّا وعشیًّا ویوم تقوم الساعۃ ادخلوا اٰل فرعون اشد العذاب۔

(فرعون اور اس کے ساتھی) ہر صبح وشام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کردو۔

البتہ اس سلسلے میں مفسرین نے اور بھی کئی ایک آیات ذکر کی ہیں کہ جو اتنی صراحت سے عالم برزخ کو ثابت نہیں کرتیں جتنی کہ مذکورہ بالا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ صرف زیرِ بحث آیت ایسی ہے کہ جس میں عالم برزخ کا ذکر عمومی حوالے سے ہے۔ دیگر آیات میں خصوصی حوالے سے ذکر ہے۔ مثلاً شہدار کے بارے میں یا آلِ فرعون کے بارے میں۔ لیکن واضح ہے کہ مسئلہ صرف آلِ فرعون سے متعلق نہیں، کیونکہ ان جیسے اور بھی بہت سے لوگ دُنیا میں ہیں۔ اور اسی طرح معاملہ صرف شہدار سے مخصوص نہیں کیونکہ قرآن مجید میں اور بھی لوگوں کو شہداء کے ہم پلہ شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۶۹ میں انبیاءؑ و صدیقینؑ شہدا اور صالحین کو ایک صف میں شمار کیا گیا ہے۔

فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین۔

عالم برزخ سب کے لیے ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں ہم انشاء اللہ اس بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے

رہا روایات کا معاملہ تو اس بارے میں شیعہ اور سُنی کتب میں بہت زیادہ روایات موجود ہیں۔ روایات میں

Marfat.com

اس دور کے لیے مختلف تعبیرات ہیں۔ کہیں اسے عالم برزخ کہا گیا ہے، کہیں عالم قبر اور کہیں عالم ارواح۔ اس ضمن میں روایات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم ذیل میں چند ایک روایات پیش کرتے ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار میں موجود ہے۔ حضرت علی علیہ السلام جنگِ صفین سے لوٹے تھے۔ واپسی پر کوفہ کے قبرستان کے پاس سے گزرے۔ یہ قبرستان شہر کے دروازے سے باہر تھا۔ آپ نے قبروں کی طرف رُخ کیا اور فرمایا۔

یا اھل الدیار الموحشة والمحال المقفرة والقبور المظلمة: یا اھل التربة! یا اھل الغربة! یا اھل الوحدة! یا اھل الوحشة! انتم لنا فرط سابق ونحن لکم تبع لاحق، اما الدور فقد سکنت، واما الازواج فقد نکحت واما الاموال فقد قسمت هٰذا خبر ما عندنا فما خبر ما عندکم؟

ثم التفت الی اصحابه فقال: اما لو اذن لهم فی الکلام لاخبروکم ان خیر الزاد التقوی۔

اے وحشت کے گھروں، خالی مکانوں اور تاریک قبروں میں رہنے والو! اے خاک نشینو! اے مسافرو! اے تنہائی میں رہنے والو! اے اہل وحشت! تم اس راستے پر ہم سے پہلے چلے گئے ہو۔ ہم بھی تم سے آملیں گے اگر تم دنیا کی خبر پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ تمھارے گھروں میں دوسرے آبسے ہیں، تمھاری بیویاں اوروں سے بیاہی گئی ہیں۔ اور تمھارے مال تقسیم ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کی خبر ہے۔ اب کہو تمھارے ہاں کی کیا خبر ہے؟

پھر آپؑ اپنے اصحاب کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: اگر انہیں بات کرنے کی اجازت ملے تو یقیناً تمھیں بتائیں کہ اس سفر کے لیے بہترین زادِ راہ تقوٰی ہے۔[1]

واضح ہے کہ ان سب باتوں کو مجاز اور کنائے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ سب اس حقیقت کی خبر دیتی ہیں۔ کہ موت کے بعد ایک طرح کی برزخی زندگی ہے اور اس دور میں بھی انسان سمجھتا ہے اور ادراک رکھتا ہے اور اگر اسے بات کرنے کی اجازت دی جائے تو وہ بات بھی کرے۔

۲۔ ایک اور حدیث اصبغ بن نباتہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ اصبغ کہتے ہیں۔

ایک روز حضرت علیؑ شہر کوفہ سے باہر نکلے اور "عزی" (نجف) کے مقام کے قریب آئے ہم آپ تک پہنچے تو دیکھا کہ آپ زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ قنبر نے کہا: یا امیر المومنینؑ! کیا آپؑ اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنی عبا آپؑ کے پاؤں کے نیچے بچھا دوں؟

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصارہ نمبر ۱۳۰۔

Marfat.com

آپؑ نے فرمایا: نہیں، یہ ایسی جگہ ہے کہ جس میں مومنین کی مٹی موجود ہے اور تیرا یہ کام ان کے لیے باعث زحمت ہے۔
میں نے عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! میں نے مومن کی مٹی والی بات تو سمجھ لی ہے کہ وہ کیا ہے لیکن ان کے لیے باعثِ زحمت ہونے کا کیا معنی ہے؟
آپؑ نے فرمایا۔
یا بن نباتہ لو کشف لکم لرأیتم ارواح المؤمنین فی ھٰذا الظھر حلقًا، یتزاورون ویتحدثون، ان فی ھٰذا الظھر روح کل مؤمن وبوادی برھوت نسمۃ کل کافر۔
اے ابن نباتہ! اگر تمھاری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے جائیں۔ تو تم لوگ مومنین کی روحوں کو دیکھو کہ وہ حلقے بنائے بیٹھی ہیں، ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہیں۔ یہ مومنین کی جگہ ہے اور وادیٔ برہوت میں کافروں کی روحیں ہیں [1]
۳۔ ایک اور حدیث میں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا۔
ان القبر اما روضۃ من ریاض الجنۃ، او حفرۃ من حفر النار۔
قبر جنت کے باغوں میں ایک باغ ہے۔ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ [2]
۴۔ ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپؑ نے فرمایا:
البرزخ القبر، وھو الثواب والعقاب بین الدنیا والاٰخرۃ ..... واللہ ما نخاف علیکم الا البرزخ۔
برزخ وہی عالمِ قبر ہے کہ جو دُنیا و آخرت کے درمیان ثواب اور عذاب کا دور ہے۔ خدا کی قسم ہمیں تمھارے بارے میں صرف عالمِ برزخ کا خوف ہے۔ [3]
۵۔ ایک اور حدیث کہ جو کتاب کافی میں منقول ہے۔ اس میں اس جملے کے بعد ہے کہ راوی نے امام علیہ السلام

---

[1] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۴۳
[2] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۵۵۳
[3] تفسیر نور الثقلین ج ۲ ص ۵۵۳

Marfat.com

سے پوچھا۔

وما البرزخ؟

برزخ کیا ہے ؟

تو امامؑ نے فرمایا۔

القبر منذ حین موته الی یوم القیامة۔

یہ وہی عالم قبر ہے۔ وقت موت سے لے کر قیامت تک۔ [1]

۶۔ ایک اور حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

ایک شخص نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا: بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعداز موت مومنین کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے سینے میں ہوتی ہیں اور یہ پرندے عرش الٰہی کے گرد محو پرواز رہتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

لا، المؤمن اکرم علی الله من ان یجعل روحه فی حوصلة طیر ولکن فی ابدان کابدانهم۔

نہیں ایسا نہیں ہے۔ مومن بارگاہِ الٰہی میں اس سے زیادہ باوقار ہے کہ اس کی رُوح کسی پرندے کے سینے میں بند کر دی جائے۔ مومنین کی روحیں ان کے بدنوں میں ہوتی ہیں اور وہ ان کے انہی بدنوں کی طرح ہیں۔ [2]

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ برزخی بدن ایک خاص قسم ہے کہ جو کئی پہلوؤں سے اس مادی جسم کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن ایک قسم کے تجرد برزخی کا حامل ہے۔

۷۔ کافی میں ایک اور حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ سے مومنین کی ارواح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا۔

فی حجرات فی الجنة یأکلون من طعامها ویشربون من شرابها ویقولون ربنا اقم لنا الساعة وانجز لنا ما وعدتنا۔

وہ جنت کے حجروں میں رہتے ہیں، بہشت کے کھانے کھاتے ہیں اور اسی کے مشروبات پیتے ہیں اور کہتے ہیں، پروردگارا! ہمارے لیے جلدی قیامت قائم فرما اور جو وعدے ہم سے کیے ہیں انہیں پورا فرما۔ [3]

---

[1] تفسیر نورالثقلین ج ۲ ص ۵۵۴

[2] بحارالانوار ج ۶ ص ۲۶۸ بحوالہ کافی

[3] بحارالانوار ج ۶ ص ۲۶۹

Marfat.com

۸۔ اسی کتاب میں اسی امام بزرگوارؑ سے ایک اور حدیث بھی منقول ہے۔ فرمایا۔

جس وقت کوئی مومن دنیا سے جاتا ہے تو مومنین کی روحیں اسے گھیر لیتی ہیں۔ اور دنیا میں زندہ یا مر جانے والوں کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ اگر وہ کہے کہ فلاں شخص دنیا سے چلا گیا ہے اور وہ انہیں اپنے پاس موجود نہ پائیں تو کہتی ہیں۔ کہ یقیناً وہ سقوط کر گیا ہے (یعنی جہنم میں جا پہنچا ہے)[1]

واضح ہے کہ ان روایات میں جنت و دوزخ سے مراد عالم برزخ کی جنت و دوزخ نہ کہ عالم قیامت کی کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں روایات بہت زیادہ ہیں۔ ان روایات کو مختلف ابواب میں جمع کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض ابواب کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

- بہت سی روایات ہیں کہ جن میں فشار قبر اور عذاب قبر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
- ایسی روایات بھی ہیں کہ جو ارواح کے اپنے گھر والوں سے ملنے اور ان کی حالت دیکھنے سے متعلق گفتگو کرتی ہیں۔
- وہ روایات بھی ہیں کہ جن میں واقعہ معراج کے ضمن میں پیغمبر اسلامؐ کی انبیاء و رسلؑ کی روحوں سے ملاقات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔
- ایسی روایات بھی ہیں کہ جن میں بتایا گیا ہے کہ انسان اس جہان میں جو اچھے برے کام کرتا ہے۔ موت کے بعد ان کا نتیجہ اس تک پہنچتا ہے۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایات ہیں[2]

برزخ اور عالمِ ارواح سے ارتباط

اگر چہ ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ جو عالمِ ارواح سے ارتباط کا غلط دعوٰی کرتے ہیں۔ یا ایسے ہی تصورات میں گرفتار ہیں۔ لیکن تحقیقات کے مطابق یہ امر درجۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ عالم ارواح سے ارتباط ممکن ہے۔ اور بعض آگاہ اور اہلِ علم افراد نے واقعاً ارواح سے رابطہ پیدا کر کے کچھ حقائق معلوم کیے ہیں۔

یہ امر بذاتِ خود عالم برزخ کی حقیقت اور اثبات کے لیے ایک واضح دلیل ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ عالمِ دنیا اور جسم کی موت کے بعد اور قیامِ آخرت سے پہلے ایک اور عالم وجود رکھتا ہے۔[3]

---

[1] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۶۹

[2] مرحوم سید عبداللہ شبر نے کتاب "تسلیۃ الفواد فی بیان الموت والمعاد" میں ایسی تمام روایات کو جمع کیا ہے

[3] ارتباط ارواح کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "عود ارواح و ارتباط با ارواح" اور کتاب "جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

اسی طرح وہ عقلی دلائل کہ جو فنائے جسم کے بعد بقائے رُوح اور تجردِ رُوح کے بارے میں ہیں، عالمِ برزخ کے اثبات کے لیے ایک اور برہان ہیں۔ (غور کیجیئے گا)

عالمِ برزخ کا ایک خاکہ

اگر تفصیلات سے قطع نظر کرلیں۔ تو علمائے اسلام کے درمیان عالمِ برزخ میں عذاب و نعمت کے مسئلے پر اتفاق نظر آتا ہے۔ چند ایک افراد کہ جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کے علاوہ تمام شیعہ سنی علماء اس پر متفق ہیں۔ اس اتفاق کی دلیل بھی واضح ہے۔ کیونکہ عالمِ برزخ اور اس میں نعمت و عذاب کے موجود ہونے کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں صراحت موجود ہے۔

شہداء کے بارے میں قرآن بالصراحت کہتا ہے۔

"یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ اللہ کی راہ میں جان دینے والے مردہ ہیں۔ وہ تو زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں سے رزق پاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے۔ اس سے خوش ہیں اور اپنے پسماندگان کو بشارت دیتے ہیں کہ ہمیں یہاں کوئی غم نہیں۔ (آلِ عمران - ۱۶۹)

نہ صرف یہ نیک انسان نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ بلکہ بدترین سرکش اور مجرم بھی عذاب میں مبتلا ہیں۔ جیسا کہ ہم بعد از موت قبل قیامت آلِ فرعون کے معذب ہونے کے بارے میں اشارہ کر چکے ہیں۔

(سورۂ مومن - آیت ۴۶)

اور اس سلسلے میں روایات بھی حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ لہٰذا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ عالمِ برزخ ہے یا نہیں۔ اہم معاملہ یہ ہے کہ ہم معلوم کریں کہ حیاتِ برزخ کس قسم کی ہے۔ اس سلسلے میں روایات میں برزخ کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان میں زیادہ واضح یہ ہے:

اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد انسانی رُوح ایک لطیف جسم میں چلی جاتی ہے۔ یہ جسم اس کثیف مادے کے بہت سے عوارضات سے محفوظ ہے۔ لیکن چونکہ ہر لحاظ سے اسی دنیاوی جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس لیے اسے "قالبِ مثالی" یا "جسمِ مثالی" کہتے ہیں۔ یہ جسم نہ تو پوری طرح مجرد ہے اور نہ ہی پوری طرح مادی بلکہ ایک قسم کے "تجردِ برزخی" کا حامل ہے۔

بعض محققین نے اسے عالمِ خواب میں رُوح کی کیفیت سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں نعمتیں پا کر سچ مچ اسے لذت محسوس ہو یا ہولناک مناظر دیکھ کر اسے تکلیف پہنچے۔ جیسا کہ ہمارے اس مادی جسم پر بھی ایسے خوابوں کا ردِ عمل ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہولناک خواب دیکھے تو وہ چیختا ہے، پیچ و تاب کھاتا ہے اور اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔

یہاں تک کہ بعض کا نظریہ ہے کہ عالمِ خواب میں واقعاً رُوح قالبِ مثالی کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ بعض کا نظریہ

Marfat.com

تو اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ یہ کہ قوی ارواح حالتِ بیداری میں بھی تجردِ برزخی حاصل کر سکتی ہیں۔ یعنی جسم مادی سے جُدا ہو کر اپنی مرضی سے یا مقناطیسی خوابوں کے ذریعے اسی قالبِ مثالی میں دُنیا کی سیر کر سکتی ہیں۔ اور مسائل سے آگاہ ہو سکتی ہیں۔ [1]

بعض نے تو یہ بھی تصریح کی ہے کہ قالبِ مثالی ہر انسان کے باطن میں موجود ہے۔ البتہ موت کے وقت اور حیاتِ برزخ کے آغاز میں اس سے جُدا ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے، کبھی کبھی مادی زندگی میں بھی اس کا انسان سے جدا ہونا ممکن ہے۔

اب اگر ہم قالبِ مثالی کے لیے یہ تمام باتیں قبول نہ بھی کریں، تب بھی اصل مسئلے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بہت سی روایات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور عقلی اعتبار سے بھی اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جسمِ مثالی کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ تناسخ پر اعتقاد ہے۔ کیونکہ تناسخ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک ہی رُوح مختلف جسموں میں منتقل ہو جائے۔ لیکن جو کچھ ہم سطور بالا میں جسمِ مثالی کے بارے میں کہہ چکے ہیں۔ اس سے اس اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شیخ بہائی مرحوم نے بہت واضح جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وہ تناسخ کہ جس کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ یہ ہے کہ اس بدن سے نکل کر رُوح اسی دُنیا میں کسی دوسرے بدن میں منتقل ہو جائے۔ جبکہ عالمِ برزخ میں قیامت تک کے لیے جسمِ مثالی سے رُوح کا تعلق اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ جسمِ مثالی سے رُوح پھر حکمِ خُدا سے پہلے والے جسم میں لوٹ آئے گی۔ اس کا نظریۂ تناسخ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تناسخ کا شدت سے اس لیے انکار کرتے ہیں۔ اور اس کے معتقد کو کافر سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ ارواح کے ازلی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں۔ کہ وہ ہمیشہ ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اور وہ لوگ دوسرے جہان میں معادِ جسمانی کے بالکل مُنکر ہیں۔ [2]

جیسا کہ بعض نے کہا ہے کہ قالبِ مثالی اسی بدنِ مادی کے باطن میں ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر مسئلہ تناسخ کا جواب اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس لحاظ سے روح اپنے قالب سے دوسرے قالب کی طرف منتقل نہیں ہوتی، بلکہ اپنے

---

[1] بحار الانوار میں اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ مجلسی مرحوم تصریح کرتے ہیں۔

"بہت سی روایات میں برزخی حالت کو عالمِ خواب کے مشابہ قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ ممکن ہے، قوی اور بلند مرتبہ نفوس متعدد اجسامِ مثالی کے حامل ہوں۔ اس طریقے سے وہ روایات توجیہ و تاویل کی محتاج نہیں رہتیں کہ جن میں ہے کہ ہر شخص کی جان کنی کے وقت آئمہ اُس کے پاس آتے ہیں۔

(بحار الانوار، ج ۶ ص ۲۷۱)

[2] بحار الانوار ج ۶ ص ۲۷۷

Marfat.com

ایک قالب کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنے دوسرے قالب کے ساتھ حیاتِ برزخ جاری و ساری رکھتی ہے۔

ایک سوال یہاں باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن مجید کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے لیے عالم برزخ نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۂ رُوم کی آیت ۵۵ اور ۵۶ میں ہے کہ کچھ مجرمین قیامت برپا ہونے کے بعد قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم گھڑی بھر سے زیادہ عالم برزخ میں نہیں رہے لیکن آگاہ مومنین انھیں فوراً کہیں گے کہ تم بحکم خدا روزِ قیامت تک ایک طویل مدت کے لیے ٹھہرے رہے ہو اور اب یوم قیامت آگیا ہے۔

متعدد روایات میں اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لوگ تین قسم کے ہیں۔

۱۔ خالص مومن

۲۔ خالص کافر

۳۔ درمیانے اور کمزور عقیدوں کے لوگ۔

ان روایات کے مطابق عالم برزخ پہلے اور دوسرے گروہ کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ تیسرا گروہ برزخ کا زمانہ ایک طرح کی بے خبری کی کیفیت میں طے کرے گا۔ (ان روایات سے زیادہ آگاہی کے لیے بحار الانوار جلد ۶ میں احوالِ برزخ و قبر کی بحث کی طرف رجوع کریں)

Marfat.com

۱۰۱۔ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ○
۱۰۲۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○
۱۰۳۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ○
۱۰۴۔ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِیْهَا كٰلِحُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ جس وقت صور پھونکا جائے گا تو ان کے درمیان کسی قسم کا نسب نہیں ہوگا۔ اور وہ ایک دوسرے سے مدد نہیں مانگیں گے۔ (چونکہ کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔)

۱۰۲۔ جن لوگوں کے (اعمال کے) ترازو وزنی ہیں، وہی کامیاب ہیں۔

۱۰۳۔ اور جن کے (اعمال کے) ترازو ہلکے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے وجود کو خسارے میں ڈال دیا ہے۔ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

۱۰۴۔ آگ کے جلا ڈالنے والے شعلے تلوار کی طرح ان کے چہروں پر پڑیں گے۔

Marfat.com

اور جہنّم میں ان کے چہرے سکڑے ہُوئے ہوں گے۔

تفسیر

بدکرداروں کی سزا کا ایک گوشہ

گذشتہ آیات میں عالم برزخ کے بارے میں گفتگو تھی اب زیرِ بحث آیات میں قیامت اور اُس جہان میں مجرموں کی حالت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جب صُور پھونکا جائے گا تو ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی نسب باقی نہیں رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ (فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون۔

ہم جانتے ھیں، کہ آیاتِ قرآنی کے مطابق دو مرتبہ صُور پھونکا جائے گا۔ ایک مرتبہ اس عالم کے ختم ہونے کے وقت اس وقت آسمانوں اور زمین کے سب رہنے والے مرجائیں اور موت پُورے عالم پر چھا جائے گی۔ جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو مردے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور انسان نئی زندگی پائیں گے۔ پھر ان کے حساب وکتاب اور جزا وسزا کا دَور شروع ہوگا۔

"نفخ فی الصور" کا معنٰے ہے "بگل بجانا" لیکن اس کی ایک خاص تفسیر اور مفہوم ہے کہ جو ہم انشاء اللہ سورۂ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

بہرحال زیرِ بحث آیت قیامت کی دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتی ہے پہلی یہ ہے کہ اُس دن تمام نسب بے کار ہوجائیں گے۔ کیونکہ اس جہان میں موجود رشتہ داری کے نظام کے باعث بہت سے مجرم سزاؤں سے بچ جاتے ہیں۔ اسی طرح لوگ اپنی مشکلات کے حل کے لیے رشتہ داروں سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن روزِ قیامت انسان ہوگا اور اُس کے اعمال۔ یہاں تک کہ سگا بھائی بیٹا اور باپ بھی اس کے کام نہ آسکے گا اور اس کی سزا کوئی اپنے ذمہ نہ لے سکے گا۔

دوسری یہ کہ وحشت کا یہ عالم ہوگا کہ حساب اور عذابِ الٰہی کے خوف کی شدت سے لوگ ایک دوسرے سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے۔

اس روز ماں اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی۔ بھائی بھائی کو فراموش کردے گا۔ سب مست دکھائی دیں گے لیکن مست نہیں ہوں گے۔ عذابِ خدا بہت شدید ہے۔

جیسا کہ ہم نے سورۂ حج کی ابتدا میں پڑھا ہے:

یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع

Marfat.com

کلّ ذات حمل حملها وترى الناس سكارى وما هم بسكارى
ولٰکن عذاب اللّٰہ شدید۔

اس روز تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی ہر عورت (وحشت کے مارے) اپنے شیر خوار کو بھول جائے گی۔ (خوف کے مارے) حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے اور (گھبراہٹ میں) لوگ مستی میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ مستی میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی شدید ہے (کہ جس کے باعث لوگ بدحواس ہو رہے ہوں گے)

"ولا یتسائلون" کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مدد کا تقاضا نہیں کریں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوگا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ نفیِ سوال سے مراد یہ ہے۔ کہ لوگ نسب کے بارے میں پوچھیں گے بھی نہیں اور یہ "فلا انساب بینھم" کی تاکید ہے۔

البتہ پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے اس جملے میں یہ تمام مفاہیم جمع ہوں۔

یہاں مفسرین کا ایک مشہور سوال بھی سامنے آتا ہے کہ متعدد قرآنی آیات سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے۔ کہ روزِ قیامت لوگ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ جیسا کہ سورۂ صافات کی آیت ۲۷ میں ہے کہ جب مجرمین دوزخ کی چوکھٹ پر ہوں گے تو،

واقبل بعضھم علٰی بعض یتساءلون۔

ایک دوسرے کی طرف رُخ کر کے (سرزنش آمیز) سوالات کریں گے۔

نیز اسی سورت کی آیت ۵۰ اہلِ بہشت کے متعلق کہتی ہے کہ وہ بہشت میں ٹھہرتے وقت اپنے اُن دنیا کے دوستوں کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے کہ جو جادۂ حق سے انحراف کے باعث دوزخ میں چلے گئے ہوں گے۔

ارشاد ہوتا ہے: فاقبل بعضھم علٰی بعض یتساءلون۔

اس کی نظیر سورۂ فاطر کی آیت ۲۵ میں بھی ہے۔

تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیرِ بحث آیت تو کہتی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے جبکہ مذکورہ بالا آیات سوال کرنے کا ذکر کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ آیتیں آپس میں کیسے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اگر ہم ان آیات کے معانی و مفاہیم پر کچھ غور و خوض کریں تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ایک دوسرے سے سوال کرنے کا ذکر جن آیات میں آیا ہے۔ ان میں جنت میں جا پہنچنے یا جہنم کی دہلیز پر پہنچ جانے کے موقع کی بات کی گئی ہے۔ جبکہ سوال کی نفی قیامت کے ابتدائی مراحل سے مربوط ہے کہ جب وحشت و اضطراب کا یہ عالم ہوگا کہ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی اور دوسرے کی کوئی خبر نہ ہوگی۔

بالفاظِ دیگر قیامت کے کئی مرحلے ہیں اور ہر مرحلے کا اپنا الگ پروگرام ہے۔ بعض اوقات مختلف مراحل کی وجہ سے

Marfat.com

اس قسم کے سوالات پیش آتے ہیں۔

قیام قیامت کے بعد پہلا مرحلہ اعمال کے وزن کا ہے۔ اس روز کے لیے معین ایک خاص میزان کے ذریعے انسان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ کچھ لوگوں کے اعمال بہت وزنی ہوں گے کہ جو ترازو کا پلڑا جھکا دیں گے۔ انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کہ میزان میں جن کے اعمال کا وزن بھاری ہو گا۔ وہ فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں۔ (فمن ثقلت موازینہ فاولٓئک ھم المفلحون)۔

"موازین" "میزان" کی جمع ہے کہ جس کے ذریعے اعمال تولے جائیں گے۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہاں کوئی دو پلڑوں والا ایسا ترازو نصب ہو گا۔ کہ جس سے مادی چیزوں کو تولا جاتا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی مناسب ذریعے سے انسانی اعمال کی قدر وقیمت لگائی جائے گی۔

دوسرے لفظوں میں "میزان" کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ناپ تول کے تمام ذرائع شامل ہیں۔ جیسا کہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز انسانوں کے اعمال کے ناپ تول کی میزان بلکہ خود انسانوں کی میزان عظیم پیشوا اور وہ انسان ہوں گے کہ جو ماڈل اور نمونہ ہیں۔ ایک حدیث میں ہے۔

امیرالمؤمنین والائمۃ من ذریتہ ھم الموازین۔

امیرالمومنین علیؑ اور ان کی ذریت میں سے جو امام ہیں وہی ناپ تول کے لیے میزان ہیں۔[1]

لہٰذا انسانوں اور ان کے اعمال کا موازنہ اُس روز عظیم انبیاء اور ان کے اوصیاء کے ساتھ کیا جائے گا اور اس موازنے سے واضح ہو جائے گا۔ کہ لوگوں کے اعمال ان سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں۔

اسی سے صاحبِ وزن اور بے وزن، قیمتی اور بے قیمت افراد اور اعمال کا فرق واضح ہو گا۔

ضمناً "موازین" کو جمع کی صورت میں ذکر کرنے کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ جو عظیم پیشوا میزان اور معیار ہیں۔ وہ متعدد ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ عظیم انبیاء، آئمہ اور اللہ کے خاص بندے اپنی زندگی کے حالات کے لحاظ سے ایک جہت سے یا کئی پہلوؤں سے نمونہ اور ماڈل تھے۔ اس طرح سے ان میں سے ہر ایک اسی حوالے سے میزان ہو گا۔

رہے وہ افراد کہ جن کا پلڑا ایمان اور عمل صالح سے خالی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنا سرمایۂ وجود گنوا بیٹھے ہیں اور جنہوں نے نقصان اٹھایا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے۔ (ومن خفت موازینہ فاولٓئک الذین خسروا انفسھم فی جھنم خالدون)۔

"خسروا انفسھم" (انھوں نے خود اپنے وجود کا نقصان کیا ہے) یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ دنیا کے اس بازارِ تجارت میں اپنی ہستی اور وجود کا عظیم سرمایہ گنوا بیٹھے ہیں۔ اور اس کے بدلے وہ کوئی قیمتی چیز بھی حاصل

---

[1] بحارالانوار ج ، صـ ۲۵۱ (طبع جدید)

Marfat.com

نہیں کرپائے انہیں جو دردناک عذاب ہوگا اگلی آیت میں اس کے ایک حصّے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ آگ جلاڈالنے والے شعلے کی تلوار کی مانند ان کے چہروں پر لگیں گے (تلفح وجوههم النار)۔ اور جہنم میں ان کی پریشانی اور عذاب کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ ان کے چہرے سکڑے ہوئے ہوں گے (وھم فیھا کالحون)

"تلفح" "لفح" (بروزن "فتح") کے مادہ سے دراصل "تلوار کی ضرب" کے معنے میں ہے اور چونکہ آگ کے شعلے، سورج کی شدید تیز روشنی اور بادِ سموم تلوار کی مانند انسان کے چہرے پر پڑتی ہیں۔ لہٰذا بطور کنایہ یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"کالح" "کلوح" (بروزن "غروب") کے مادے سے چہرے کے سکڑنے کے معنی میں ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ آگ کے تیز شعلوں کے باعث ان کے مُنہ سکڑ جائیں گے اور مُنہ کُھلے کے کُھلے رہ جائیں گے۔ [1]

چند اہم نکات

۱۔ **جس روز سب رشتہ داریاں ختم ہوجائیں گی:** انسانوں کی مادی زندگی کی حدود میں جو مفاہیم کارفرما ہیں۔ اُس جہان میں زیادہ تر ختم ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک خاندان اور قبیلے کا تعلق بھی ہے۔ اس دُنیا میں یہ تعلق بہت سی مشکلات کے حل کا ذریعہ بنتا ہے اور بعض اوقات یہ تعلق خود ایک ایسا نظام بن جاتا ہے کہ معاشرے کے تمام نظاموں پر حاکم ہو جاتا ہے۔

لیکن آخرت میں زندگی کی قدریں ایمان اور عمل صالح سے ہم آہنگ ہوگی۔ وہاں فلاں قبیلہ اور فلاں گروہ کا مسئلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں تو ایک خاندان کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مشکلات سے نجات دلاتے ہیں۔ مگر قیامت میں ایسا نہ ہوگا۔ وہاں نہ کثرتِ مال کوئی فائدہ پہنچا سکے گی۔ اور نہ اولاد کسی کام آسکے گی جیسا کہ ارشادِ ربّ العزّت ہے۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون الّا من اتی الله بقلب سلیم۔

اس روز نہ مال فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔ نجات تو صرف اسے حاصل ہو گی۔ کہ جو بارگاہِ الٰہی میں قلبِ سلیم لے کر حاضر ہوگا۔ (شعراء - ۸۸، ۸۹)

یہاں تک کہ اگر یہ نسب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک جا پہنچے۔ تب بھی یہی قانون نافذ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمّہ ھُدیٰ کی تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں۔ بنی ہاشم کے بعض نہایت قریبی افراد کو ان کے عدم ایمان یا اسلام کے حقیقی راستے سے انحراف کی وجہ سے دھتکار دیا گیا اور ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ اگرچہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

---

[1] تفسیر قرطبی، تفسیر فخرالرازی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المیزان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

کل حسب ونسب منقطع یوم القیامۃ الّا حسبی ونسبی

روزِ قیامت میرے حسب[1] ونسب کے سوا تمام حسب ونسب منقطع ہوجائیں گے۔[2]

لیکن المیزان میں مرحوم علامہ سید محمد حسین طباطبائی رضوان اللہ علیہ کے بقول ایسا لگتا ہے کہ یہ وہی حدیث ہے جسے اہلِ سُنّت کے محدثین نے اپنی کُتب میں کبھی عبداللہ بن عمرؓ، کبھی خود عمر ابنِ خطاب اور کبھی دیگر اصحاب کے حوالے سے روایت کیا ہے جبکہ زیرِ بحث آیت بالکل ظاہری اور عمومی مفہوم رکھتی ہے۔ اور روزِ قیامت تمام انساب کے منقطع ہو جانے کی بات کرتی ہے۔ نیز قرآن حکیم سے جو اصول معلوم ہوتا ہے اور بے ایمان منحرف لوگوں سے رسول اللہؐ کے برتاؤ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اس لحاظ سے تمام انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث مناقب ابن شہر آشوب میں طاؤس یمانی کی وساطت سے منقول ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

خلق اللّٰہ الجنۃ لمن اطاع واحسن ولو کان عبداً حبشیاً، وخلق النار لمن عصاہ ولو کان ولداً قرشیاً۔

اللہ نے بہشت اُس کے لیے پیدا کی ہے کہ جو اس کے حکم کی اطاعت کرے۔ اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو اور جہنم اُس نے اُس شخص کے لیے پیدا کی ہے کہ جو اس کی نافرمانی کرے۔ اگرچہ وہ قریشی ہی کیوں نہ ہو۔[3]

البتہ جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ سادات اور رسول اکرمؐ کی باتقوےٰ اولاد کے خاص احترام کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ احترام خود ذاتِ پیغمبرؐ اور اسلام کا احترام ہے اور جو روایات سادات کی فضیلت اور مقام ومنزلت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی ظاہراً اسی مفہوم کی حامل ہیں۔

۲۔ "اصمعی" کی ہلا دینے والی داستان: مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصمعی کی وہ داستان لکھی جائے کہ غزالی نے "بحر المحبۃ" میں نقل کیا ہے۔ یہ داستان گزشتہ باتوں کی شاہد بھی ہے، اور اس میں متعدد دیگر لطیف نکات بھی ہیں۔

"اصمعی" کہتا ہے:

میں مکہ میں تھا۔ ایک چاندرات تھی۔ میں خانۂ خدا کے گرد طواف کر رہا تھا۔ ایک بڑی دلنشیں اور

---

[1] لغت کے لحاظ سے "حسب" اُس اعزاز وافتخار کے معنی میں ہے کہ جو کسی انسان کے بزرگوں اور آباؤ اجداد کو حاصل ہو۔ بعض نے اس کا معنیٰ خود انسان کی اپنی عادت اور اخلاق بھی بیان کیا ہے۔ لیکن یہاں پہلا معنی ہی مراد ہے (کتاب "لسان العرب" میں مادہ "حسب" کی طرف رجوع کریں۔)

[2] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔ [3] مناقب ابن شہر آشوب (طبق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صـ ۵۶۴)۔

Marfat.com

غم انگیز آواز سُن کر میں متوجہ ہُوا۔ میں اُس آواز والے کو تلاش کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک خوبصورت اور خوش قامت جوان پڑی۔ نیکی کے آثار اُس سے نمایاں تھے۔ اور اُس نے خانہ کعبہ کا غلاف تھام رکھا تھا اور اس طرح سے مناجات کر رہا تھا۔

یا سیدی ومولای نامت العیون وغابت النجوم، وانت ملك حی قیوم، لا تأخذك سنة ولا نوم، غلقت الملوك ابوابها واقامت علیها حراسها وحجابها وقد خلی کل حبیب بحبیبه، وبابك مفتوح للسائلین، فها انا سائلك ببابك، مذنب فقیر، خاطئ مسکین، جئتك ارجو رحمتك یارحیم، وان تنظر الی بلطفك یاکریم۔

اے میرے سردار ! اے میرے مولا ! بندوں کی آنکھیں خواب غفلت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ آسمان کے تارے ایک ایک کرکے افق مغرب میں اُترتے جاتے ہیں۔ اور آنکھوں سے اوجھل ہوتے جاتے ہیں۔ تو خدائے حیّ و قیوم ہے، نہ تجھے نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ تیرے دامنِ کبریائی کو چھُو پاتی ہے۔ شب کی اس تاریکی میں، جبکہ بادشاہوں نے اپنے محلات کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور دربان ان پر پہرہ دے رہے ہیں۔ اور سب دوست اپنے دوستوں سے محو خلوت ہیں۔ ایسے میں ایک ہی گھر ہے، جس کا دروازہ سائلوں کے لیے کھُلا ہے۔ اور وہ تیرے گھر کا دروازہ ہے۔

اس وقت میں تیرے دروازے پر آیا ہوں۔ خطا کار اور حاجت مند ہوں۔ اے رحیم تجھ سے رحمت کی امید باندھے میں آگیا ہُوں۔ اے کریم تیرے لطف و کرم کی نظر چاہتا ہوں۔

پھر وہ جوان یہ اشعار پڑھنے لگا۔

یا من یجیب دعاء المضطر فی الظلم
یا کاشف الکرب والبلوی مع السقم
قد نام وفدك حول البیت وانتبهوا
وعین جودك یا قیوم لم تنم
ان کان جودك لا یرجوا الاذو اشرف
فمن یجود علی العاصین بالنعم
هب لی بجودك فضل العفو عن شرف
یا من اشار الیه الخلق فی الحرم

⊙ اے وہ کہ جو شب کی تاریکیوں میں مصیبت زدوں کی دُعا قبول کرتا ہے۔ ۱

Marfat.com

اے وہ کہ جو دُکھ درد اور رنج و بلا کو دُور کرتا ہے!

- تیرے گھر کے گرد تیرے مہمان سوتے بھی ہیں اور جاگتے بھی ہیں۔
لیکن اے قیوم! تیرے جود و سخا کی آنکھ کبھی خواب آلود نہیں ہوتی۔
- اگر تیرے جُود و احسان کی امید صرف ان کے لیے ہوتی، جو کہ تیری بارگاہ میں باشرف ہیں، تو گنا ہگار کس کے دروازے پر جاتے اور کس سے بخشش کی امید رکھتے۔
- اپنے جود و کرم سے مجھے شرف یاب کر
اے وہ ذات کہ مخلوق حرم میں جس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد اس جوان نے آسمان کی طرف سر بلند کیا اور اس طرح اپنی مناجات جاری رکھیں:

الٰهی سيدی و مولای! ان اطعتك بعلمی و معرفتی فلك الحمد والمنة علی وان عصيتك بجهلی فلك الحجة علی۔

میرے معبود! میرے سردار! میرے مولا! اگر میں نے علم و معرفت کی بناء پر تیری اطاعت کی ہے تو حمد و ثنا تیرے لیے ہی زیبندہ ہے اور میں تیرا مرہونِ منت ہوں۔ اور اگر نادانی کے باعث میں نے تیری نافرمانی کی ہے تو تیری حجت میرے خلاف مکمل ہے۔

پھر آسمان کی طرف سر بلند کیا اور بلند آواز سے کہا:

یاالٰهی وسيدی ومولای ماطابت الدنيا الا بذكرك، وماطابت العقبى الا بعفوك، وماطابت الايام الا بطاعتك، وماطابت القلوب الا بمحبتك وماطابت النعيم الا بمغفرتك۔

اے میرے خدا! اے میرے آقا! اے میرے مولا! دُنیا تیرے ذکر کے بغیر پاکیزہ نہیں ہے اور آخرت تیرے عفو کے بغیر شائستہ نہیں ہے، ایام زندگی تیری اطاعت کے بغیر بے قیمت ہیں، دل تیری محبت کے بغیر آلودہ ہیں اور نعمتیں تیری بخشش کے بغیر ناگوار ہیں۔

اصمعی کہتا ہے:

اس جوان نے مناجات کا سلسلہ یونہی جاری رکھا۔ کبھی اُس نے ہلا دینے والے اور دل گداز اشعار پڑھے اور کبھی اسی طرح اللہ کو پکارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

میں اس کے قریب گیا۔ اس کے چہرے کے نور نے مجھے خیرہ کر دیا۔ چاند کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو متوجہ ہوا کہ وہ تو زین العابدین علی ابن الحسین امام سجاد

Marfat.com

(علیہ السلام ہیں)

میں نے ان کا سر اپنے دامن میں رکھا۔ میں ضبط نہ کر سکا، ان کی اس حالت پر میں خوب رویا۔ میرے اشکوں کا ایک قطرہ ان کے چہرے پر جا گرا۔ انھیں ہوش آیا۔ تو آنکھ کھولی اور فرمایا:

من الذی اشغلنی عن ذکر مولای ؟

کون ہے کہ جو میرے مولا کے ذکر میں حائل ہوا ہے ؟

میں نے عرض کیا میں اصمعی ہوں۔۔ اے میرے سید و آقا !

یہ کیسا گریہ اور کیسا اضطراب ؟ آپ تو خاندانِ نبوت ہیں، معدنِ رسالت ہیں۔ کیا آیتِ تطہیر آپ کے حق میں نازل نہیں ہوئی ؟ کیا خداوندِ عالم نے آپ کے بارے میں نہیں فرمایا ؟

انما یرید الله لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔

(بس اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ اے اہل بیت ! خدا تم سے رجس و ناپاکی دور رکھے اور تمھیں اس طرح سے پاک رکھے جیسے پاک رکھنے کا حق ہے)۔

امامؑ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: اے اصمعی !

ھیھات ! ھیھات ! اللہ نے جنت اطاعت کرنے والوں کے لیے خلق فرمائی ہے۔ چاہے وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہوں۔ اور جہنم نافرمانوں کے لیے بنائی ہے چاہے وہ سردارِ قریش ہی کیوں نہ ہوں۔ کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا اور اللہ کی گفتگو نہیں سنی کہ:

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون ۔۔۔۔۔

"جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت آپہنچے گی تو سارے نسب ختم ہو جائیں گے، کوئی کسی سے سوال نہ کرے گا۔ صرف اعمال ہی پر دارومدار ہو گا۔

اصمعی کہتا ہے:

میں نے یہ دیکھا، تو وہاں سے اٹھا۔ آپ کو وہاں چھوڑا اور خود ایک طرف کو چل پڑا۔ [1]

۳۔ سزا اور گناہ میں مناسبت: ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ کہ قیامت میں بلکہ اس جہان میں بھی عذابِ الٰہی انجام کردہ گناہوں کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جرم کچھ ہو اور سزا اس کے حسب حال نہ ہو۔

---

[1] بحار المحبتہ از غزالی ص ۱۴۱ تا ۴۴ (کچھ تلخیص کے ساتھ)

Marfat.com

زیرِ نظر آیات میں ہے کہ مجرموں کے چہرے جہنم کے شدید شعلوں سے اس طرح سے جلیں گے کہ سکڑ جائیں گے اور مُنہ کھلے کے کھلے رہ جائیں گے۔ یہ سزا سبک اور ہلکے وزن والے بے قیمت و بے ایمان لوگوں کے لیے ذکر ہوئی ہے۔ اگر توجہ کی جائے تو یہ وہی لوگ ہوں گے کہ آیاتِ الٰہی سُن کر جن کے ماتھوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنا مُنہ سکیڑ لیتے ہیں۔ اور کبھی وہ آیاتِ الٰہی سُن کر مذاق اڑاتے ہیں۔ اور استہزار کرتے ہیں۔ اس بات سے ان کے اعمال کی اس سزا سے مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

۱۰۵۔ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِىْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ○
۱۰۶ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا
قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ○
۱۰۷۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ○
۱۰۸۔ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ○
۱۰۹۔ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِىْ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الرّٰحِمِيْنَ ○
۱۱۰۔ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ
ذِكْرِىْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ○
۱۱۱۔ اِنِّىْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ
الْفَآئِزُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۵۔ کیا میری آیتیں تمہارے سامنے نہ پڑھی جاتی تھیں۔ جبکہ تم ان کی تکذیب کرتے تھے۔

Marfat.com

۱۰۶۔ وہ کہیں گے: پروردگارا! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔

۱۰۷۔ پروردگارا! ہمیں اس سے باہر لے جا، اگر پھر ہم نے ایسا کیا تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے۔ (اور عذاب کے مستحق ہوں گے)۔

۱۰۸۔ (اللہ) کہے گا: دور ہو جاؤ جہنم میں، اور مجھ سے بات نہ کرو۔

۱۰۹۔ (بھول گئے ہو) میرے بندوں میں سے ایک گروہ تھا جو کہا کرتا تھا! اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ہیں ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

۱۱۰۔ لیکن تم نے ان کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ تم میری یاد سے غافل ہو گئے اور تم ان پر ہنستے تھے۔

۱۱۱۔ مگر آج میں نے انھیں ان کے صبر و استقامت کی بنا پر جزا دی ہے اور وہ کامیاب ہیں۔

تفسیر

مجھ سے بات نہ کرو

گذشتہ آیات میں اہل جہنم کی سخت سزا کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں اُن سے پروردگار کی کچھ گفتگو بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالے عتاب آمیز لہجے میں اُن سے کہتا ہے، کیا میری آیات تمھارے سامنے پڑھی نہ جاتی تھیں۔ جبکہ تم ان کی تکذیب کرتے تھے (الم تکن اٰیاتی تتلٰی علیکم فکنتم بھا تکذبون)[1]۔

---

[1] اس جملے میں درحقیقت کچھ الفاظ محذوف ہیں اور تقدیر میں یہ جملہ یوں تھا۔ (یقول اللہ تعالٰی الم تکن . . . .)

Marfat.com

کیا میں نے کافی واضح آیات اور دلائل اپنے پیغمبروں کے ذریعے تمہارے لیے نہ بھیجے تھے۔ کیا میں نے تم پر حجت تمام نہ کردی تھی۔ لیکن تم نے ہمیشہ انکار اور تکذیب کی راہ اپنائی۔

"تتلی" اور "تکذبون" دونوں فعل مضارع ہیں اور تسلسل پر دلالت کرتے ہیں، ان الفاظ سے خاص طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیہم ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہوتی اور وہ مسلسل ان کی تکذیب کرتے رہے۔

اس سوال کے جواب میں وہ اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جی ہاں! ایسا ہی ہے اے ہمارے پروردگار! لیکن ہماری بدبختی ہم پر غالب آئی اور ہم گمراہ لوگ تھے (قالوا ربنا غلبت علینا شقوتنا وکنا قوما ضالین)۔

"شقوۃ" اور "شقاوۃ" "سعادۃ" کی ضد ہے اور ابتلا، سزا اور مصیبت کے اسباب فراہم ہونے کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو دامن گیر ہونے والی آفت اور مصیبت کو "شقاوۃ" کہتے ہیں۔ جب کہ "سعادت" نعمت اور نیکی کے اسباب فراہم ہونے کے معنیٰ میں ہے۔ بہر حال شقاوت اور سعادت دونوں ہمارے ہی اعمال، نیتوں اور گفتار کے نتیجے کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ عقیدہ ایک تصور کے سوا کچھ نہیں کہ خوش بختی و بدبختی انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ تمام نبیوں، راہنماؤں اور انسانیت کے معلموں کی دعوت اور مساعی کے خلاف ہے۔ یہ عقیدہ ذمہ داریوں سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ یہ تصور درحقیقت غلط کاموں اور تباہ کاریوں کی توجیہ کے لیے بنایا گیا ہے۔ یا جہالت کی توجیہ کے لیے گھڑا گیا ہے۔

اسی بنیاد پر دوزخی گناہ گار صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ خدا کی طرف سے اتمام حجت ہو گیا تھا۔ لیکن ہم نے اپنے ہاتھوں اپنی بدبختی کے وسائل فراہم کیے اور ہم اعتراف کرتے ہیں۔ کہ ہم گمراہ لوگ تھے۔

شاید یہ اعتراف کر کے وہ اللہ کی رحمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ساتھ ہی کہتے ہیں: "پروردگارا! ہمیں اس آگ سے باہر نکال" اور پھر دنیا کی طرف بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل انجام دے سکیں (ربنا اخرجنا منھا)۔

اگر ہم وہی پہلے سے طرزِ عمل کا مظاہرہ کریں تو پھر ہم یقیناً ظالم ہوں گے اور تیری بخشش کے لائق نہیں ہوں گے۔ (فان عدنا فانا ظالمون)۔

وہ یہ گفتگو ایسے کریں گے۔ کہ گویا وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ دارِ آخرت دارِ جزا ہے نہ کہ دارِ عمل اور دُنیا کی طرف لوٹ کر جانا ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پوری قاطعیت سے جواب دیتا ہے: دُور ہو جاؤ، یونہی جہنم میں رہو۔ چپ رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو (قال اخسئوا فیھا ولا تکلمون)۔

"اخسئوا" فعل امر ہے۔ عام طور پر یہ لفظ کُتے کو دھتکارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لہٰذا اگر انسان کے لیے استعمال ہو تو اس کی پستی اور سزا کے مستحق ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس دھتکارنے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا تم بھول گئے ہو کہ میرے کچھ خاص

Marfat.com

بندے کہتے تھے : پروردگارا ! ہم ایمان لائے ہیں ، ہمیں بخش دے ، ہم پر رحم کر اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ (انہ کان فریق من عبادی یقولون ربنا اٰمنا فاغفرلنا وارحمنا وانت خیر الراحمین)۔

لیکن تم نے ان کا مذاق اڑایا اور اس معاملے میں اتنی ہٹ دھرمی کی کہ اس تمسخربازی نے تمھیں یادِ خدا سے بالکل غافل کردیا (فاتخذتموھم سخریًّا حتّٰی انسوکم ذکری)۔

تم مسلسل ان پر ہنستے رہے اور ان کی باتوں، ان کے عقائد اور ان کے طرز عمل پر مسکراتے رہے (وکنتم منھم تضحکون)۔

لیکن آج ۔ اُن کے صبر و استقامت کے باعث، تمھارے تمسخر کے مقابلے میں پامردی کی وجہ سے اور الٰہی پروگراموں پر بغیر ڈگمگائے قائم رہنے کے سبب ہم نے انھیں جزا دی ہے اور وہ کامیاب و کامران ہیں۔ (انی جزیتھم الیوم بما صبروا انھم ھم الفائزون)۔

لیکن تم تو آج بدترین انجام اور دردناک ترین عذاب میں گرفتار ہو اور کوئی تمہاری فریاد کو نہیں پہنچتا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ تم اسی سزا کے مستحق ہو۔

گویا ان آخری چار آیتوں میں اہلِ جہنم کی بدبختی کا اور اہلِ بہشت کی کامیابی کی اصل وجہ صراحت سے بیان کردی گئی ہے۔

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جنہوں نے اپنی بدبختی اور گمراہی کے اسباب اپنے ہاتھوں فراہم کیے ہیں یہ لوگ حق کے طرف داروں کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے پاکیزہ عقائد کی تحقیر کرتے تھے۔ لہٰذا اس انجام کو پہنچے ہیں کہ وہ اس خطاب کے بھی لائق نہیں کہ جو ایک انسان کو کیا جاتا ہے۔ جی ہاں ! انہوں نے مومنین کی تحقیر کی تھی۔ لہٰذا اُنہیں تحقیر و تذلیل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جنہوں نے مغرور، خودپسند اور بے منطق دشمنوں کے مقابلے میں راہِ خدا میں مسلسل پامردی، صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا لہٰذا انھوں نے بارگاہ الٰہی میں سب سے بڑی کامیابی حاصل کرلی۔

Marfat.com

۱۱۲۔ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝

۱۱۳۔ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّينَ ۝

۱۱۴۔ قٰلَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

۱۱۵۔ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝

۱۱۶۔ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ۝

ترجمہ

۱۱۲۔ (خدا) کہے گا: تم زمین میں کتنے برس رہے ہو؟

۱۱۳۔ وہ جواب میں کہیں گے: ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ ہم ٹھہرے ہیں، شمار کرنے والوں سے پوچھ لے۔

۱۱۴۔ وہ کہے گا (ہاں) تم تھوڑی ہی دیر ٹھہرے ہو، کاش تم یہ جان لیتے۔

۱۱۵۔ لیکن کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔

۱۱۶۔ پس (اس سے کہ تمھیں بے کار پیدا کرے) بزرگ و برتر وہ خدا کہ جو فرماں

Marfat.com

روائے حق ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عرش کریم کا پروردگار ہے۔

تفسیر

اس دُنیا کی عمر تھوڑی ہے

گذشتہ آیات میں اہلِ جہنم کی سزا کا کچھ ذکر تھا۔ زیرِ نظر آیات میں ایک اور قسم کی سزا کا ذکر ہے۔ یہ نفسیاتی سزا، خدا کی طرف سرزنش کی صورت میں ہے۔ فرمایا گیا ہے: اس روز اللہ انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہے گا۔ کہ تم زمین پر کتنے سال رہے ہو۔ (قال کم لبثتم فی الارض عدد سنین)۔

اس آیت میں لفظ "الارض" کی موجودگی اور دیگر قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ ایام آخرت کا موازنہ کرتے ہوئے دُنیا میں ان کی عُمر کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں عالم برزخ میں ان کی مُدتِ قیام کے بارے میں سوال مراد لیا ہے۔ یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے اگرچہ بعض دوسری آیات میں اس سلسلے میں کچھ شواہد ملتے ہیں۔ [1]

---

[1] سورۂ رُوم کی آیت ۵۵ اور ۵۶ میں ہے:

ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعة کذلک کانوا یؤفکون وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب اللہ الی یوم البعث فھذا یوم البعث ولکنکم کنتم لا تعلمون۔

جب قیامت برپا ہوگی تو مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک ساعت سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ جی ہاں! وہ اسی طرح دنیا میں بھی جھوٹ بولا کرتے تھے۔ لیکن جو اہلِ علم و ایمان ہیں وہ اُن سے کہیں گے: تمھارے وہاں ٹھہرنے کی مدت کتابِ الٰہی میں ثبت ہے اور تم روزِ قیامت تک وہاں ٹھہرے ہو اور اب قیامت آن پہنچی ہے اور قبروں سے اُٹھنے کا دن ہے، مگر تم جانتے نہ تھے۔

آیت نشاندہی کرتی ہے کہ اس میں برزخ میں ٹھہرنے کے بارے میں سوال و جواب ہو رہا ہے اور اگر اسے زیرِ بحث آیات کے لیے قرینہ قرار دیں، تو یہاں کا مفہوم بھی برزخ میں ٹھہرنا ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، زیرِ بحث آیات میں ایسے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

لیکن اس موازنے میں انھیں دنیاوی زندگی اس قدر کم دکھائی دے گی کہ وہ جواب میں کہیں گے ہم تو صرف ایک دن یا دن کا ایک حصہ ہی دنیا میں ٹھہرے ہیں۔" (قالوا لبثنا یوما او بعض یوم)۔

درحقیقت دنیا کی لمبی عمریں بھی حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں ایک زودگزر لحظے کی مانند ہیں۔ کیونکہ وہاں کی نعمتیں بھی جاودانی ہیں اور سزائیں بھی لامحدود۔

اپنی بات پر زور دینے کے لیے یا زیادہ دقیق جواب کے طور پر مزید کہیں گے: خداوندا! اُن سے پوچھ لے کہ جو اچھی طرح حساب وکتاب کر سکتے ہیں اور اعداد وشمار کا ایک دوسرے سے موازنہ کر سکتے ہیں (فسئل العادین)۔

ہوسکتا ہے "عادین" (شمار کرنے والے) سے مراد فرشتے ہوں کہ جو انسانی عُمر اور اعمال کا بہت باریک بینی سے اور تفصیلی حساب رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس حساب کو ہر شخص سے بہتر جانتے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ سرزنش کے طور پر فرمائے گا: جی ہاں! تم دُنیا میں بہت کم مدت ہی ٹھہرے ہو۔ اگر تم جان لیتے (قال ان لبثتم الا قلیلا لو انکم کنتم تعلمون)۔

واقعاً وہ اسی روز اس حقیقت کو سمجھ سکیں گے کہ دنیاوی زندگی حیاتِ اخروی کے مقابلے میں ایک دن یا ایک گھڑی سے زیادہ نہیں لیکن جب وہ اس جہان میں تھے۔ تو ان کی فکر ونظر پر غفلت وغرور کے ایسے پردے پڑے تھے کہ وہ دُنیا کو جاودانی اور آخرت کا خواب وخیال یا ادھار کا وعدہ خیال کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جی ہاں! اگر تم اس حقیقت کو دنیا ہی میں پا لیتے کہ جسے آخرت میں پاؤ گے تو اسی دُنیا میں تم بامعرفت ہو جاتے۔ [1]

اگلی آیت میں ان لوگوں سے ایک اور بہت مؤثر سبق آموز اور بیدار کُن حوالے سے بات کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے: کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے (افحسبتم انما خلقناکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون)۔

اس مؤثر اور پُر معنی جُملے میں قیامت، حساب وکتاب اور جزائے اعمال کے لیے ایک مضبوط دلیل پیش کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر سچ مچ قیامت نہیں ہے تو دنیاوی زندگی عبث اور فضول ہے۔ کیونکہ اس جہان کی زندگی۔ اپنی تمام تر مشکلات کے ساتھ اور اس کے لیے خدا کی طرف سے بنائے گئے، تمام پروگراموں اور پورے نظام کے ساتھ ——

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) زیادہ قوی قرائن موجود ہیں کہ جو نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں سوال وجواب دنیا میں ٹھہرنے سے مربوط ہے۔

[1] جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس کے مطابق اس آیت میں "لو" شرطیہ ہے اور ایک جُملہ مقدر ہے اور مجموعی طور پر جُملہ یوں بنتا ہے۔

لو انکم کنتم تعلمون، علمتم انکم ما لبثتم الا قلیلا۔

لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "لو" یہاں پر "لیت" کے معنی میں ہے۔ اس لحاظ سے جُملے کا یہ معنی ہوگا۔

"اے کاش! تم اس نکتہ کو دُنیا میں جان لیتے۔"

Marfat.com

اگر صرف انہی چند دنوں کے لیے ہو تو بہت ہی فضول اور بے معنی ہے۔ اس سلسلے میں "چند اہم نکات" کے زیر عنوان ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔

نیز خلقت کا عبث نہ ہونا چونکہ اہم بات ہے اور اس کے لیے محکم دلیل کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: وہ اللہ کہ جو فرمان روائے حق ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عرش کریم کا پروردگار ہے اور وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس عالم ہستی کو بے کار پیدا کرتا۔ (فتعالی اللہ الملک الحق لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم)۔

درحقیقت فضول اور بے مقصد کام تو وہ کرتا ہے کہ جو جاہل، ناتواں یا ذاتی طور پر باطل اور فضول ہو لیکن وہ خدا کہ جس میں کمال کی تمام تر صفات جمع ہوں ایسا نہیں کر سکتا۔ "اللہ" وہ خدا ہے کہ جو تمام عالم ہستی کا فرماں روا اور مالک ہے۔ (الملک)

وہ خدا کہ جو حق ہے اور حق کے سوا جس سے کوئی چیز صادر نہیں ہوتی۔ (الحق)
کیسے ممکن ہے کہ اُس کی خلقت بے مقصد و عبث ہو۔

اور اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ کوئی اُسے مقصد تک پہنچنے سے باز رکھ سکتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ "لا الٰہ الا ھو" اس خیال کی نفی ہے کوئی اور اس کے سوا خدا ہے ہی نہیں کہ جو اُس کی راہ میں حائل ہو سکے اور "رب العرش الکریم" کہ کر ربوبیت خدا کے لیے ایک اور تاکید کی گئی ہے۔ اس کا مفہوم ہے "مالکِ مصلح" اور یہ جُملہ عالم ہستی کے بامقصد ہونے کو مزید مشخص کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ لفظ اللہ کہ جو خود خدا کی تمام صفاتِ کمال کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ ذکر کرنے کے علاوہ اس آیت میں اس کی چار صفات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۱- خدا کی مالکیت و حاکمیّت
۲- اس کے وجود کی حقانیّت
۳- اس کا لاشریک ہونا اور
۴- اس کا مقام ربوبیت۔

اور یہ تمام صفات اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ کوئی کام بے مقصد نہیں کرتا اور اُس نے دنیا اور انسانوں کو فضول و عبث پیدا نہیں کیا۔

جیسا کہ ہم قبل ازیں کہہ چکے ہیں کہ "عرش" تمام جہانِ ہستی کی طرف اشارہ ہے کہ جو درحقیقت حکومت الٰہی کے ماتحت ہے (کیونکہ باعتبارِ لغت "عرش" بلند پایوں والے تخت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ خصوصاً صاحبِ اقتدار کے تختِ حکومت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہ تعبیر یہاں حکومتِ الٰہی کی قلم رو کی طرف اشارہ ہے)

قرآن مجید میں لفظ "عرش" کا مفہوم کیا ہے؟ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۶ میں سورہ

Marfat.com

اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں رجوع کیجیے۔

اب یہ سوال رہ گیا کہ "عرش" کی صفت "کریم" کیوں ذکر ہوئی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل لفظ "کریم" کا معنیٰ ہے شریف، فائدہ مند، عمدہ اور اچھا اور عرشِ الٰہی چونکہ ان صفات کا حامل ہے۔ اس لیے اسے "کریم" کہا گیا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ لفظ "کریم" ہمیشہ کسی عاقل وجود مثلاً خدا اور انسانوں کے لیے ہی استعمال نہیں، بلکہ عربی زبان میں اس کے علاوہ بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

چنانچہ سورۂ حج کی آیت ۵۰ میں صالح مومنین کے بارے میں بولا جاتا ہے۔

لهم مغفرة ورزق کریم

ان کے لیے مغفرت اور رزقِ کریم (پُربرکت روزی) ہے۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے۔ یہ صفت، کم اہم نیکوں اور خوبیوں کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ نہایت اہم مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

موت زندگی کا خاتمہ نہیں

ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کی بحث میں ایک دوسرے عالم کے وجود کے لیے ایک دلیل خود اسی عالم کے نظام کا مطالعہ ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ "نشاۃِ اولیٰ" گواہی دیتی ہے کہ اس کے بعد "نشاۃِ اُخریٰ" بھی ہے۔

یہاں ہم اس سلسلے میں کچھ مزید وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں، جہاں خلقت بہت عظیم بھی ہے اور منظم بھی، ہر لحاظ سے یہ عالم نہایت پُرشکوہ اور تعجب انگیز ہے۔ اس کائنات کے اسرار اس قدر ہیں کہ عظیم سائنسدان اور دانش ور معترف ہیں کہ انسان کی تمام معلومات ایک ضخیم کتاب کے مقابلے میں ایک چھوٹے سے صفحے کی مانند ہیں۔ بلکہ اس کائنات کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ درحقیقت اس کتاب کی الف ب ہے۔

اس عالم کی ہر ایک عظیم گلیکسی کئی ارب ستاروں پر مشتمل ہے اور ان کہکشاؤں کی تعداد اور ایک دوسرے سے فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ روشنی کی رفتار کی بنیاد پر بھی اس کا حساب بہت مشکل ہے، جبکہ روشنی کی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔

اس جہان کی ایک چھوٹی سے چھوٹی اکائی کی ساخت میں جو نظم اور شعور استعمال ہوا ہے۔ وہی ہے کہ اس جہان کی کسی عظیم اکائی میں نظر آتا ہے۔ انسان کو ہم اس کائنات کے کامل ترین موجود کے طور پر پہچانتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ انسان اس جہان کا شاہکار ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں۔ جسے عالمِ ہستی کا شاہکار سمجھا گیا ہے۔ یعنی انسان اپنی اس مختصر سی عمر میں کس قسم کی پریشانیوں اور مشکلات میں پڑا ہوتا ہے۔ ابھی بچپن گزر نہیں پاتا کہ جوانی کا طوفانی اور ہیجان انگیز دور آپہنچتا ہے اور ابھی جوانی کی بہار قدم

Marfat.com

جما نہیں پاتی کہ بڑھاپے کا قابلِ رحم دور آ پہنچتا ہے۔

کیا یہ بات قابلِ یقین ہے کہ اتنی بڑی کائنات اور اس کا شاہکار یہ انسان، بس اسی دور کے لیے ہو، بس یہی مقصد ہو کہ یہ انسان اس عالم میں رنج و تکلیف کے یہ تین دور گزارے، کھائے، پیئے، لباس پہنے، سوئے جاگے اور پھر ختم ہو جائے اور سب کچھ اپنے انجام کو پہنچ جائے؟

اگر سچ مچ ایسا ہی ہو تو کیا یہ خلقت مہمل اور فضول نہیں ہے۔ کیا کوئی عاقل اس سارے نظام اور اتنی عظیم کائنات کو اس معمولی سے ہدف کے لیے قائم کر سکتا ہے۔

فرض کریں کئی ملین سال انسان اس دُنیا میں باقی رہے اور کئی نسلیں یکے بعد دیگرے آئیں اور جائیں، سائنسی علوم اس قدر ترقی کریں۔ کہ انسان کو بہترین غذا، لباس، مکان اور دیگر نہایت اعلیٰ سہولیات حاصل ہو جائیں ـــ لیکن کیا یہ کھانا، پینا، پہننا، سونا اور جاگنا اتنی قدر و قیمت رکھتا ہے کہ اس کے لیے ایسی کائنات پیدا کی جائے؟

لہٰذا اگر اس عظیم کائنات ہی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے، یہ دنیا ایک زیادہ وسیع دنیا کے لیے ایک تمہید ہے۔ ایسی وسیع دنیا کہ جو جاودانی و دائمی ہے۔ ایسے عالم کا وجود ہی ہماری زندگی کو کوئی مفہوم عطا کر سکتا ہے اور اسے فضول ہونے سے بچا سکتا ہے۔

لہٰذا کوئی عجیب بات نہیں اگر مادہ پرست فلسفی کہ جو قیامت اور دوسرے جہان پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اس عالم کو بے مقصد سمجھیں اور واقعاً اگر ہم بھی ایسے عالم پر ایمان نہ رکھتے ہوتے تو ہم بھی اُن کے ہم آواز ہوتے ـ ہم کہتے ہیں کہ اگر موت ہی انسان کا انجام اور خاتمہ ہوتا تو خلقتِ عالم بے مقصد ہوتی۔ اسی لیے سورۂ واقعہ کی آیت ۶۲ میں ہے۔

ولقد علمتم النشاۃ الاولیٰ فلولا تذکرون

تم نے اس نشاۃ الاولیٰ اور عالم کے اس دورِ اول کو دیکھا تو کیوں متوجہ نہیں ہوتے ہو اور اس کے بعد کے عالم پر ایمان نہیں لاتے ہو۔

Marfat.com

۱۱۷۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ○

۱۱۸۔ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۱۷۔ اور جو شخص خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے گا۔ یقیناً اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہ ہوگی۔ اس کا حساب تمھارے رب کے پاس ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ کافر کامیاب نہ ہوں گے۔

۱۱۸۔ اور کہہ دے: پروردگارا! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر کہ تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر

کامیاب اور ناکام

گذشتہ آیتوں میں معاد اور صفاتِ الٰہی کے بارے میں گفتگو تھی۔

اب زیرِ بحث پہلی آیت میں توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی گئی ہے اور مبدا و معاد کا ذکر کر کے جاری بحث کو مکمل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو شخص خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود کے طور پر پکارتا ہے۔ یقیناً اس کے پاس اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہے (ومن یدع مع اللہ الٰہًا اٰخر لا برھان لہ بہٖ فانما حسابہ عند

Marfat.com

ربہ) ؎۱

جی ہاں! مشرکین کا گذارہ صرف دعوے پر ہے ۔ بڑوں کی اندھی تقلید یا ایسی ہی فضول و بے بنیاد باتیں اُن کا سہارا ہیں ۔ اِن واضح دلائل کے باوجود وہ معاد کا انکار کرتے ہیں ۔ لیکن شرک کو باوجود کوئی دلیل نہ ہونے کے قبول کیے ہوئے ہیں ۔ یقیناً خداوند عالم ایسے لوگوں سے حساب ضرور لے گا کہ جنہوں نے حکمِ عقل کو ٹھکرا دیا ہے اور جان بوجھ کر شرک کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہیں ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : کافر لوگ کامیاب نہیں ہوں گے ۔" اور ان کا انجام اس خدائی حساب سے ہی واضح ہو جائے گا ۔ (انہ لا یفلح الکافرون) ۔

کیا عمدہ ہے کہ اس سُورت کا آغاز " قد افلح المؤمنون " سے ہوا ہے ۔ اور اسی کی بحث " لا یفلح الکافرون " پر ختم ہو رہی ہے اور یہ ہے مومنین اور کافرین کی زندگی کی اوّل تا آخر منظر کشی ۔

اس سورۂ شریفہ کی آخری آیت میں رُوئے سخن پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے ایک عمومی نتیجہ کے طور پر ارشاد ہوتا ہے ۔ کہہ دے : پروردگارا ! مجھے بخش دے ، مجھ پر رحم کر اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے (وقل رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین) ۔

اب جب کہ ایک گروہ شرک کی بے راہ روی میں سرگرداں ہے اور ایک جماعت ظلم و ستم میں گرفتار ہے تو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے ، اپنے تئیں اس کے لطف و کرم کی پناہ میں دے دے اور اس سے بخشش طلب کر ۔

یقینی بات ہے کہ خطاب اگرچہ پیغمبرِ اکرمؐ سے ہے ، مگر یہ حکم مومنین کے لیے ہیں ۔

ایک روایت میں ہے ۔

اس سورت کی ابتدار اور انتہاء عرش الٰہی کے خزانوں میں سے ہے ۔ جو شخص اس کی ابتدائی تین آیتوں پر عمل کرے گا اور آخری چار آیتوں سے نصیحت حاصل کرے گا وہ اہلِ نجات و فلاح میں سے ہوگا ۔ ؎۲

بعید نہیں کہ پہلی تینوں آیتوں سے مراد " قد افلح المؤمنون " کے بعد آنے والی آیات ہوں کہ جن میں سے ایک نماز میں خشوع کی دعوت دیتی ہے ، دوسری ہر قسم کے بے ہودہ کام سے پرہیز کی طرف بلاتی ہے ۔ اور تیسری

؎۱ بعض مفسرین " یدع مع اللہ " میں جو شرط ہے ۔ " فانما حسابہ عند ربہ " کو اس کی جزار سمجھتے ہیں اور لابرھان لہ بہ کو شرط و جزا کے درمیان جملۂ معترضہ قرار دیتے ہیں ۔ لیکن بعض دیگر مفسرین " لابرھان لہ بہ " کو جزائے شرط سمجھتے ہیں " انما حسابہ " کو تفریع قرار دیتے ہیں ۔ لیکن یہ احتمال عربی زبان کے قواعد سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ کیونکہ ایسے مواقع پر جزار پر " فا " ہونا چاہیئے ۔ یعنی " لا برھان لہ " ہونا چاہیئے ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جُملہ صفت یا حال ہے ۔

لیکن ۔ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ اگرچہ معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے ۔

؎۲ تفسیر فخر الدین رازی ، زیر بحث آیات کے ذیل میں ۔

Marfat.com

ادائے زکوٰۃ پر ابھارتی ہے۔ ان میں سے ایک انسان کا خدا سے رابطہ قائم کرتی ہے، دوسری اسے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرتی ہے اور تیسری اس کا تعلق مخلوقِ خدا سے استوار کرتی ہے۔ نیز ممکن ہے آخری چار آیتوں سے آیت ۱۱۵ کے بعد کی آیات مراد ہوں کہ جن میں کائنات کے فضول نہ ہونے کا ذکر ہے، معاد قیامت کا تذکرہ ہے، توحید کا ذکر ہے اور پھر انقطاع الی اللہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

بارِ الٰہا! ان مومنین کے صدقے کہ جن سے تو نے اس سورۃ میں کامیابی کا وعدہ کیا ہے کہ جن کے سردار رسول اللہ اور ان کے اہل بیتؑ ہیں، ہمیں ان کی صف میں سے قرار دے اور فلاح کا نام ہمارے نام بھی لکھ دے۔

خداوندا! ہم پر اپنی مغفرت و رحمت نازل فرما کہ تو ارحم الراحمین ہے۔

پروردگارا! ہم سب کی عاقبت بخیر فرما اور ہر قسم کی لغزش و انحراف سے محفوظ رکھ۔

انک علیٰ کل شیءٍ قدیر

سورۂ مومنون اختتام کو پہنچی

۲۵ محرم الحرام ۱۴۰۲ - کی شب

Marfat.com

سورۂ نور

مدینہ میں نازل ہوئی

اس میں ۶۴ آیتیں ہیں

Marfat.com

سورۂ نور کی فضیلت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من قرء سورة نور اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد کل مؤمنة ومؤمن فیما مضٰی و فیما بقی۔

جو شخص سورۂ نور کو پڑھے (اور اس کے مطالب و احکام کو اپنی زندگی پر منطبق کرے) اللہ اُسے تمام گزشتہ و آئندہ مومنات اور مومنین کی تعداد کے برابر دس نیکیاں بطور اجر دے گا۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

حصنوا اموالکم و فروجکم بتلاوة سورة نور وحصنوا بها نساءکم، فان من ادمن قرأتها فی کل یوم او فی کل لیلة لم یزن احد من اهل بیته ابداً حتی یموت

سورہ نور کی تلاوت کے ذریعے اپنا مال تلف ہونے سے بچاؤ، اپنا دامن بے عفتی سے آلودہ ہونے سے محفوظ رکھو اور اپنی خواتین کو اس کے احکام کے زیر سایہ انحرافات سے بچاؤ کیونکہ جو شخص ہر روز یا ہر شب ہمیشہ اس کی تلاوت کرے گا اس کے خاندان میں سے کوئی شخص آخر عمر تک خلاف عفت کام میں مبتلا نہیں ہوگا[1]۔

اگر ہم سورہ نور کے مضامین پر توجہ رکھیں تو دیکھیں گے کہ وہ طرح طرح کے موثر طریقوں سے راہِ عفت سے انحراف کے عوامل کے خلاف جہاد کرتی ہے۔ اسی سے مندرجہ بالا حدیث کا اصلی نکتہ اور عملی مفہوم واضح ہوتا ہے۔

سورۂ نور کے مضامین

اس سورت کو درحقیقت پاکدامنی وعفت کی اور جنسی بے راہ رویوں کے خلاف جہاد کی سورت قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں معاشرے کو جنسی انحرافات سے پاک رکھنے کے مختلف طریقوں کے بارے میں، مختلف حوالوں سے گفتگو کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں اس کے مضامین کو مندرجہ ذیل مختلف مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا مرحلہ: یہ مرحلہ زانی عورت اور زانی مرد کی سزا کے بارے میں ہے۔ یہ سزا اس سورت کی دوسری آیت میں بڑی قطعی اور حتمی صورت میں ذکر کی گئی ہے۔

دوسرا مرحلہ: اس مرحلے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس شدید حد کو جاری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اسلام کے قضائی قوانین اور اصولوں کے لحاظ سے اس سزا کے اجراء کے لیے نہایت سخت شرائط معین کی گئی ہیں۔ کوئی غیر مرد کسی عورت پر زنا کا الزام

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص۵۶۸ بحوالہ "ثواب الاعمال" از شیخ صدوق اور تفسیر مجمع البیان اسی سورت کے ذیل میں۔

Marfat.com

لگائے تو اُس کے لیے چار گواہوں کی شرط ہے اور اگر مرد اپنی بیوی پر الزام لگائے تو اس کے لیے "لعان" کا قانون ہے جس کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے اور اسلامی عدالت میں اپنے اس الزام کو ثابت نہ کر سکے تو خود اسے سخت سزا بھگتنا پڑے گی (اور یہ سزا حد زنا کے پانچ میں سے چار حصوں کے برابر ہوگی) یہ اس لیے ہے تاکہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کسی پر الزام لگا کر اسے آسانی سے اسلامی سزا دلوا سکتا ہے بلکہ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر وہ ثابت نہ کر سکا تو اس کے برعکس خود وہ مستوجب سزا ہوگا۔

اسی مناسبت سے "افک" کا مشہور واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بیوی پر تہمت کا ہے قرآن نے اس واقعے کو بڑی شدت سے ذکر کیا ہے تاکہ یہ امر پوری طرح واضح ہو جائے کہ پاکباز افراد پر الزام لگانا اور اسے شہرت دینا کتنا بڑا گناہ ہے۔

تیسرا مرحلہ: اس مرحلے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام صرف گناہ گار کو سزا دے دینے پر قناعت نہیں کر لیتا بلکہ جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے کئی طرح کے اقدامات کرتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کو دونوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے آنکھیں نہ لڑائیں۔ اسی سلسلے میں عورتوں کے لیے پردے کا تفصیلی حکم بیان کیا گیا ہے کیونکہ باہم آنکھیں لڑانا اور بے پردگی جنسی انحرافات کے اہم عامل ہیں اور جب تک ان دونوں کا خاتمہ نہ ہو جائے بے حیائی اور بے عفتی معاشرے سے ختم نہیں ہو سکتی۔

چوتھا مرحلہ: اس مرحلے میں عفت کے منافی اعمال سے بچنے کے لیے شادی بیاہ کا آسان حکم صادر کیا گیا ہے تاکہ شرعی طریقے سے انسان کی جنسی ضروریات پوری کر کے اسے غیر شرعی طریقوں سے بچایا جائے۔

پانچواں مرحلہ: اس مرحلے میں اسی حوالے سے کچھ آدابِ معاشرت بیان کیے گئے ہیں اور ماں باپ کے حوالے سے اولاد کے لیے کچھ تربیتی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ خاص اوقات میں کہ جب احتمال ہوتا ہے کہ میاں بیوی باہم خلوت میں ہوں گے، اولاد سے کہا گیا ہے کہ اجازت لیے بغیر ان کے کمرے میں داخل نہ ہوں تاکہ ان کی فکر انحراف کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی مناسبت سے خانگی زندگی کے بارے میں کچھ دیگر آداب کا بھی ذکر ہے اگرچہ وہ جنسی مسائل سے مربوط نہیں ہیں۔

چھٹا مرحلہ: اس مرحلے میں توحید اور مبدا، ومعاد سے متعلق کچھ مسائل کا ذکر ہے نیز رسول اللہؐ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا ذکر ہے کیونکہ تمام عملی واخلاقی احکام کی جڑ یہی مبداء ومعاد اور حقانیتِ نبوت پر ایمان ہے اور جب تک یہ جڑ نہ ہو شاخ وبرگ اور پھل پھول پیدا نہیں ہو سکتے۔

ضمنی طور پر ایمان وعملِ صالح سے مربوط گفتگو کی مناسبت سے نیک کردار مومنین کی عالمی حکومت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اور اسلام کے کچھ دیگر احکام کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ اس طرح سے یہ سورت مجموعی طور پر ایک جامع اور کامل پروگرام پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ سُوۡرَۃٌ اَنۡزَلۡنٰہَا وَ فَرَضۡنٰہَا وَ اَنۡزَلۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ○

۲۔ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّ لَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَ لۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

۳۔ اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم اللہ کے نام سے

۱۔ یہ وہ سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے اور واجب کیا ہے اور اس میں ہم نے آیاتِ بینات نازل کی ہیں کہ شاید تم سبق لو۔

۲۔ زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور دینِ خدا کے معاملے میں ہرگز ترس (اور جھوٹی محبت) تمہیں دامن گیر نہ ہو اور ان دونوں کی سزا کے وقت کچھ مومنین کو مشاہدے کے لیے ہونا چاہیئے۔

۳۔ زانی مرد صرف زانی یا مشرک عورت سے نکاح کرتا ہے اور زانی عورت صرف زانی یا مشرک مرد سے نکاح کرتی ہے اور یہ کام مومنین پر حرام کیا گیا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

زانی مرد اور زانی عورت کی سزا

ہم جانتے ہیں کہ آیتِ نور کی وجہ سے اس سورت کا نام سورۂ نور ہے اور یہ آیت نہایت جاذبِ نظر ہے لیکن اس سے قطع نظر اس سورہ کے مضامین و مطالب ایک خاص نورانیت کے حامل ہیں۔ یہ سورت انسانوں کو، انسان کے خاندانوں کو اور عورت و مرد کو پاکدامنی کا نور عطا کرتی ہے، زبان و کلام کو تقوٰی و صداقت کا نور بخشتی ہے، دلوں کو نورِ توحید و خدا پرستی اور قیامت پر ایمان سے منور کرتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نورانی درس دیتی ہے۔

اس سورت کی پہلی آیت درحقیقت اس کے تمام مطالب کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ وہ سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا اور واجب کیا اور اس میں ہم نے آیاتِ بینات نازل کیں کہ شاید تم نصیحت حاصل کرو (سورة انزلناها وفرضناها وانزلنا فیها اٰیات بینات لعلکم تذکرون)۔

"سورہ"، "سور" کے مادہ سے، کسی عمارت کی بلندی کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ ان بلند دیواروں کے معنی میں استعمال ہونے لگا جو گزشتہ زمانے میں حملہ آوروں سے محفوظ رہنے کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ یہ دیواریں چونکہ شہر کو بیرونی علاقے سے جُدا کر دیتی تھیں اس لیے رفتہ رفتہ یہ لفظ کسی چیز کے ٹکڑے اور حصّے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح قرآن کے ایک ایسے ٹکڑے اور حصّے کو بھی "سورۃ" کہا جاتا ہے کہ جو باقی ماندہ سے جُدا ہوتا ہے۔

بعض اہلِ لغت نے بھی کہا ہے کہ "سورۃ" خوبصورت اور بلند عمارت کو کہا جاتا ہے اور ایک عظیم عمارت کے مختلف حصّوں کو بھی "سورۃ" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن کے مختلف حصّوں کو جو ایک دوسرے سے جُدا ہیں، پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے[1]

بہرحال یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس سورت کے تمام مطالب بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں چاہے وہ عقائد ہوں، آدابِ معاشرت ہوں یا احکام ہوں۔

خصوصاً یہاں لفظ "فرضناها" (ہم نے اسے فرض قرار دیا ہے) استعمال کیا گیا ہے اور "فرض" کا معنٰی یقین اور "قطع" ہے۔ اس لفظ سے بھی مذکورہ امر پر تاکید ہوتی ہے۔

"اٰیات بینات" کی تعبیر ہو سکتا ہے توحید، مبداء و معاد اور نبوت جیسے حقائق کی طرف اشارہ ہو کہ جن کا ذکر اس سورت میں آیا ہے جبکہ "فرضنا" ان احکام و قوانین کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک لفظ عقائد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا احکام کی طرف۔

"لعلکم تذکرون" (شاید تم نصیحت حاصل کرو) ——— یہ جملہ ایک بار پھر اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ اسلام کے تمام

---

[1] لسان العرب ج ۴ ، مادہ "سور"

Marfat.com

سچے عقائد اور عملی پروگراموں کی جڑ انسانی فطرت کے اندر موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر ایک قسم کا " تذکر " اور یاد دہانی ہے۔

اس عمومی اور کلی بیان کے بعد زانی عورت اور زانی مرد کے بارے میں پہلا قطعی اور حتمی قانون بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ (الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائة جلدة)۔

مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس خدائی حد کا اجراء کرتے ہوئے تمہیں ہرگز ترس نہیں آنا چاہیئے، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو (ولا تأخذکم بھما رأفة فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاٰخر)۔

اس خدائی سزا سے مکمل نتیجہ حاصل کرنے کے لیے آیت کے اختتام پر ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مومنین کا ایک گروہ حد جاری ہوتے وقت مشاہدے کے لیے موجود ہونا چاہیئے (ولیشھد عذابھما طائفة من المؤمنین)۔

یہ آیت دراصل ان تین احکام پر مشتمل ہے:

(۱) زانی عورتوں اور زانی مردوں کی سزا (زنا سے مراد اس مرد اور عورت کا آپس میں جنسی ملاپ ہے کہ جو آپس میں شادی شدہ نہیں کہ جس کے لیے کوئی شرعی جواز موجود نہیں)۔

(۲) اس امر کی تاکید کہ اس سزا کے اجراء کے لیے ہرگز ترس اور بے محل نرمی کے احساسات نہیں ہوتے چاہئیں کیونکہ ایسے ترس اور نرمی کا نتیجہ معاشرے کی آلودگی اور ترویج گناہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ البتہ ایسے احساسات کو ختم کرنے کے لیے قرآن نے اللہ اور روز جزا پر ایمان کا ذکر کیا ہے کیونکہ مبداء و معاد پر ایمان کی علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کے فرمان کے سامنے کاملاً سر تسلیم خم کرلے۔ خدائے حکیم پر ایمان لانا اس امر کا سبب بنتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کے ہر حکم کا کوئی فلسفہ ہے اور اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ بلاوجہ نہیں ہے جبکہ معاد پر ایمان رکھنا سبب بنتا ہے کہ انسان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اپنی غلطیوں کا جواب دینا ہوگا۔

اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک عمدہ حدیث نقل کی گئی ہے اس کی طرف توجہ ضروری ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

یؤتی بوال نقص من الحد سوطاً فیقال لہ لم فعلت ذاك؟

فیقول: رحمة لعبادك،

فیقال لہ: انت ارحم بھم منی؟

فیؤمر بہ الی النار، ویؤتی بمن زاد سوطاً،

فیقال لہ: لم فعلت ذلك؟

فیقول: لینتھوا عن معاصیك!

فیقول: انت احکم بہ منی؟

Marfat.com

فیؤمر بہ الی النار

روز قیامت اس حاکم اور قاضی کو جس نے کسی خدائی حد میں سے کم کیا ہو گا میدان محشر میں پیش کیا جائے گا

اور اُس سے کہا جائے گا: تو نے ایسا کیوں کیا؟

وہ کہے گا، تیرے بندوں پر رحم اور مہربانی کرتے ہوئے۔

پروردگار اُس سے کہے گا: کیا تو اُن کے لیے مجھ سے زیادہ مہربان تھا؟

اس کے ساتھ ہی حکم ہو گا کہ اسے آتش دوزخ میں ڈال دو۔

اس کے بعد ایک اور کو لایا جائے گا جس نے خدائی حد سے ایک تازیانہ زیادہ کیا ہو گا۔

اس سے کہا جائے گا: تو نے ایسا کیوں کیا؟

وہ جواب میں کہے گا، تاکہ تیرے بندے تیری نافرمانی سے رُک جائیں۔

اللہ فرمائے گا: کیا تو مجھ سے زیادہ آگاہ اور حکیم تھا؟

پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے بھی آتش جہنم میں لے جاؤ۔[1]

(۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ حد جاری کرتے ہوئے کچھ مومنین موجود ہوں کیونکہ اس سزا کا صرف یہ مقصد نہیں کہ گنہگار کو عبرت حاصل ہو بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی سزا دوسروں کے لیے بھی درس عبرت ہو۔

انسانی معاشرے کی تشکیل اور بناوٹ سے یہ بات عیاں ہے کہ اخلاقی برائیاں صرف ایک شخص ہی میں موجود نہیں رہتیں بلکہ معاشرے کی طرف بھی سرایت کرتی ہیں لہٰذا معاشرے کی تطہیر کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح گناہ برملا ہوا ہے سزا بھی برملا ہو۔

اس گفتگو سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ اسلام ایک شخص کی عزت دوسروں کے سامنے برباد ہونے کی اجازت کیوں دیتا ہے کیونکہ جب تک گناہ واضح نہ ہو اور مسئلہ اسلامی عدالت تک نہ پہنچے اللہ کہ جو "ستار العیوب" ہے پردہ دری پر راضی نہیں ہے لیکن جرم ثابت ہو جانے، راز کھل جانے معاشرے کے آلودہ ہو جانے اور گناہ کو معمولی چیز سمجھے جانے کے بعد سزا اسی صورت میں ملنا چاہیئے کہ گناہ کے منفی اثرات مٹ جائیں اور گناہ کی برائی کا احساس اسی طرح لوٹ آئے۔

اصولی طور پر ایک صحیح و سالم معاشرے میں قانون کی خلاف ورزی کو بہت اہم سمجھا جانا چاہیئے۔ مسلم ہے کہ اگر خلاف ورزی کا تکرار ہو تو اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور اس کی اہمیت کا احساس تبھی اجاگر ہو گا اگر خلاف ورزی کرنے والوں کو کھلے بندوں سزا دی جائے۔

یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ بعض لوگوں کی نظر میں بدنی سزا سے زیادہ اہم ان کی حیثیت و آبرو ہے اور سزا کا کھلے بندوں ہونا ہی ان کی سرکش ہوا و ہوس کے راستے میں بند باندھ دے گا۔

زیر بحث آیت میں چونکہ زانی عورت اور زانی مرد کے بارے میں گفتگو کی جارہی ہے اس لیے اسی مناسبت سے ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی عورتوں سے شادی کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر، از فخر الدین رازی، ج ۲۳ ص ۱۴۸

Marfat.com

تیسری آیت میں اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرک عورت کے شادی نہیں کرتا جیسا کہ زانی عورت سوائے زانی یا مشرک مرد کے کسی سے بیاہ نہیں کرتی (الزانی لاینکح الا زانیة او مشرکة والزانیة لاینکحها الا زان او مشرك)۔ اور یہ کام مومنین پر حرام کیا گیا ہے (وحرم ذٰلك علی المؤمنین)۔

یہ آیت ایک حکم الٰہی بیان کرتی ہے یا یہ ایک خارجی معاملے کی خبر ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ آیت صرف ایک عینی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ آلودہ دامن افراد ہمیشہ ناپاک افراد کے پیچھے ہی جاتے ہیں اور بقول سے

ع کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

لیکن باایمان اور پاکباز افراد ہرگز آلودہ دامن اور ناپاک افراد کو جیون ساتھی بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور انہیں اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں۔

آیت کا ظاہری مفہوم اسی تفسیر کا شاہد ہے کیونکہ آیت "جملہ خبریہ" کی صورت میں ہے۔

البتہ بعض دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ایک خدائی اور شرعی حکم بیان کر رہی ہے اور خصوصیت سے اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان زانی عورتوں اور مردوں سے شادی بیاہ سے اجتناب کریں کیونکہ جسمانی بیماریوں کی طرح عموماً اخلاقی بیماریاں بھی متعدی ہوتی ہیں اور ایک سے دوسرے میں سرایت کر جاتی ہیں جبکہ اس سے قطع نظر ایسے رشتے پاکدامن افراد کے لیے ننگ و عار کا بھی باعث ہیں۔ علاوہ ازیں ایسی اولاد جو مشکوک اور داغدار دامنوں میں پرورش پاتے اس کا مستقبل محفوظ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بناء پر اسلام نے ایسے رشتوں سے منع کیا ہے۔

اس تفسیر کے لیے یہ جملہ شاہد ہے:

وحرم ذٰلك علی المؤمنین

اس میں حرام قرار دیے جانے کی تعبیر موجود ہے۔

اس تفسیر کے لیے دوسرا شاہد وہ بہت سی روایات ہیں جو اس سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مطابق یہ آیت ایک حکم بیان کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض عظیم مفسرین نے اس آیت کے لیے یہ شان نزول بھی لکھی ہے:

> ام مہزول دورِ جاہلیت میں ایک مشہور بدکار عورت تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی علامت اور پہچان کے طور پر اپنے گھر کے دروازے پر ایک جھنڈا بھی گاڑ رکھا تھا۔ ایک مسلمان نے اُس سے شادی کرنے کے لیے رسول اللہ سے اجازت چاہی تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں اس کے تقاضے کا جواب دیا گیا۔[1]

ایک اور حدیث امام باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں نیز تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔

Marfat.com

یہ آیت ان مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہے کہ جو رسول اللہؐ کے زمانے میں زنا سے آلودہ تھے۔ اللہ نے مسلمانوں کو ان سے شادی بیاہ کرنے سے منع کیا نیز یہ حکم آج بھی باقی ہے کہ جو شخص اس عمل کی انجام دہی میں مشہور ہو اس پر اللہ کی حد جاری ہونا چاہیئے اس سے اس وقت تک شادی بیاہ نہیں ہونا چاہیئے جب تک اس کی توبہ ثابت نہ ہو جائے[1]

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ بہت سے احکام "جملہ خبریہ" کی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور ضروری نہیں کہ احکام الٰہی ہمیشہ "امر" اور "نہی" کے جملوں کی صورت میں ہوں۔

ضمناً توجہ رہے کہ مشرکین کا زانیوں پر عطف مطلب کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہے کیونکہ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ زانی جب اس کام کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ایمان سے دور ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مؤمن فانہ اذا فعل ذٰلک خلع عنہ الایمان کخلع القمیص۔

جب کوئی زانی اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور اسی طرح جب کوئی چور چوری کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا کیونکہ اس فعل کے ارتکاب کے وقت اس کے سینے سے ایمان نکال لیا جاتا ہے جیسے لباس بدن سے اتارا جاتا ہے[2]

چند اہم نکات:

۱۔ **وہ مواقع جہاں زانی کی سزا "موت" ہے:** مذکورہ بالا آیت میں زنا کی حد سے متعلق ایک عام حکم ہے۔ زنا کے بارے میں بعض استثنائی احکام بھی ہیں مثلاً شادی شدہ عورت یا مرد کا زنا کرنا ثابت ہو جانے کی صورت میں اس کی سزا "موت" ہے۔ محصن یا شادی شدہ مرد سے مراد یہ ہے کہ وہ عورت رکھتا ہو اور عورت سے قربت اس کے اختیار میں بھی ہو۔ محصنہ یا شادی شدہ عورت سے مراد وہ شوہر دار عورت ہے جس کا مرد اس کے پاس رہتا ہو، جب بھی کسی کے لیے جنسی تسکین کی شرعی اور قانونی سہولت موجود ہو اگر وہ زنا کا مرتکب ہو تو اس کو سزائے موت دی جائے گی۔ اس حکم کے نفاذ کی جملہ شرائط اور تفصیلات فقہی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں اس کے علاوہ اپنی محرم اور دوسری عورتوں کیساتھ زنا کی سزا بھی موت ہے اسی طرح زنا بالجبر کی سزا بھی موت ہے۔

البتہ بعض حالات ایسے بھی ہیں جن میں کوڑے، جلاوطنی اور دوسری سزاؤں کا حکم سنایا جاتا ہے۔ ان کی تفصیلات فقہی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ [2] اصول کافی ج ۲ ص ۲۶ (مطبعہ اسلامیہ ۱۳۸۸ھ) (جیسا کہ تفسیر نور الثقلین ج ۳ میں ص ۵۷۱ پر درج ہے)۔

Marfat.com

۲۔ زانی عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟ اس میں شک نہیں کہ فحاشی اور بے حیائی ہر شخص کے لیے باعث ذلت و رسوائی ہے مگر عورتوں کی طرف سے اس قبیح فعل کا ارتکاب زیادہ ذلت آمیز ہے کیونکہ وہ حیا، شرم اور پردہ داری کی زیادہ حامل ہیں اور باوجود اس کے ان کا دامن عفت کو چاک کر دینا شدید بغاوت و سرکشی کی علامت ہے۔

اس کے علاوہ اس فعل کا انجام گرچہ دونوں کے لیے برا ہے مگر عورتوں کے لیے زیادہ رسواکن اور عبرتناک ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زنا کے سلسلے میں اکثر تحریک انہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اکثر مواقع پر اس کا اصلی محرک وہی ہوتی ہیں یہ اسباب مجموعی طور پر اس آیت میں مرد سے پہلے عورت کے ذکر کا سبب بنے ہیں۔ مگر صاحبان ایمان اور پاک دامن خواتین وحضرات کا معاملہ ان سے بالکل الگ تھلگ ہے۔

۳۔ سزا لوگوں کی موجودگی میں کیوں؟ زیر بحث آیت کہ جو امر کی صورت میں ہے حد جاری ہوتے وقت کچھ مومنین کو موجودگی کو واجب قرار دیتی ہے لیکن کسے بغیر واضح ہے کہ قرآن نے سزا کے لیے اسے شرط قرار نہیں دیا کہ سزا عام لوگوں کے سامنے ہو بلکہ حالات اور مصلحت کے لحاظ سے تین یا اس سے زیادہ افراد کی موجودگی کافی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قاضی اس امر کا فیصلہ کرے کہ حد جاری کرتے ہوئے کتنے افراد کی موجودگی ضروری ہے[1]

اس حکم کا فلسفہ بھی واضح ہے کیونکہ:

اولاً۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ سزا سب کے لیے درس عبرت اور معاشرے کی تطہیر کا سبب ہے۔

ثانیاً۔ مجرم کی شرمساری اسے آئندہ ارتکاب جرم سے روکے گی۔

ثالثاً۔ جب حد کچھ افراد کے سامنے جاری ہوگی تو قاضی یا حد جاری کرنے والوں پر کسی سازش، رشوت لینے، کوئی ترجیح دینے یا شکنجہ دینے وغیرہ کا الزام نہیں آسکے گا۔

رابعاً۔ حد جاری ہوتے وقت کچھ لوگوں کی موجودگی افراط اور زیادتی سے اجتناب کا باعث ہوگی۔

خامساً۔ ممکن ہے حد جاری ہونے کے بعد مجرم قاضی اور حد جاری کرتے والوں کے بارے میں غلط پراپیگنڈا کرے اور جھوٹے الزامات لگائے۔ اگر اس موقع پر کچھ لوگ موجود ہوں گے تو وہ حقیقت حال واضح کر کے اس کی تخریبی سرگرمیوں کو روک سکیں گے۔

اس کے علاوہ اور بھی فوائد ہو سکتے ہیں۔

۴۔ اس سے پہلے زانی کے لیے کیا سزا تھی؟ سورہ نساء کی آیت ۱۵ اور ۱۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ نور میں زانی اور بدکار مردوں اور عورتوں کے بارے میں حکم نازل ہونے سے پہلے شادی شدہ عورتوں کے لیے اس گناہ پر عمر قید کی سزا تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفاھن الموت

انہیں گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے۔

---

[1] بعض فقہاء کے نزدیک اجرائے حد کے وقت کچھ مومنین کا موجود ہونا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے حالانکہ ظاہر امر وجوب ہے نہ کہ استحباب۔

Marfat.com

لیکن غیر شادی شدہ کی صورت میں سزا اذیت کی صورت میں تھی :

فاذوھما

ان دونوں کو اذیت دو۔

لیکن اس اذیت کی مقدار معین نہ تھی جبکہ زیر بحث آیت میں ایک سو کوڑے سزا مقرر کر دی گئی ہے۔ لہٰذا زیر بحث آیت میں محصنہ کے بارے میں سزائے موت کا حکم عمر قید کی جگہ پر ہے اور سو کوڑوں کا حکم اذیت کی حد معین کرنے کے لیے ہے۔

(مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد میں سورہ نساء کی آیت ۱۵ اور ۱۶ کی تفسیر دیکھیے۔)

۵۔ اجرائے حد میں کمی بیشی ممنوع ہے: اس میں شک نہیں کہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ کسی بے گناہ شخص کو سزا نہ ملے اور احکام الٰہی جہاں تک اجازت دیتے ہیں عفو و درگزر سے کام لیا جائے لیکن ثبوت جرم کے بعد سزا پر حتمی طور پر عمل کیا جانا چاہیئے اور بے حقیقت احساسات وجذبات سے پرہیز کیا جانا چاہیئے کہ جو نظم معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہیں زیر بحث آیت میں اس کے لیے خاص طور پر "فی دین اللہ" کے الفاظ آئے ہیں یعنی جب حکم خدا کا ہے تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی رحم میں خداوند رحمان ورحیم سے بڑھ جائے۔

آیت میں ترس کھانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اکثر لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور ایسے موقع پر احساسات ترحم کے غلبے کا امکان زیادہ ہوتا ہے لیکن اس امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ سختی کے حامی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں یہ لوگ بھی حکم الٰہی کے راستے سے منحرف ہوتے ہیں اور انہیں بھی اپنے جذبات پر قابو پانا چاہیئے اور خدا سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے لیے بھی شدید سزا ہے۔

۶۔ زانی کے ساتھ شادی بیاہ کی حرمت کی شرائط: ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ زانی مرد اور زانی عورت سے شادی بیاہ حرام ہے البتہ اسلامی روایات میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکم ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں ہے جو اس کام کے لیے مشہور ہوں اور انہوں نے توبہ نہ کی ہو۔ لہٰذا اگر کوئی اس عمل کے ساتھ مشہور نہ ہو یا اس نے اپنے گزشتہ اعمال سے کنارہ کشی اختیار کر کے پاکیزہ اور باعفت زندگی گزارنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہو اور اس کی توبہ کے عملی آثار دکھائی دیں تو پھر اس سے شادی بیاہ میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے اس صورت میں وہ زانی یا زانیہ کا مصداق نہیں رہتے اور گویا ایک حالت تھی جو ختم ہو گئی ہے لیکن پہلی صورت میں ممانعت ہے اور آیت کی شان نزول بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

ایک معتبر حدیث کے مطابق مشہور فقیہ زرارہ نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

"الزانی لا ینکح الا زانیة ......" اس آیت کی کیا تفسیر ہے؟

امام نے فرمایا:

ھن نساء مشھورات بالزنا و رجال مشھورون بالزنا ، قد شھروا بالزنا وعرفوا به ، والناس الیوم بذلك المنزل ، فمن اقیم علیه حد الزنا ، او شھر بالزنا ، لم ینبغ لاحد ان ینا کحه حتی یعرف منه توبته

Marfat.com

یہ آیت ان عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو زنا میں مشہور تھے اور اس قبیح عمل کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ آج بھی اسی طرح ہیں۔ جس شخص پر زنا کی حد جاری ہو یا جس کی شہرت اس بُرے عمل کے حوالے سے ہو وہ اس لائق نہیں کہ کوئی اس سے شادی کرے جب تک کہ اس کی توبہ ثابت و ظاہر نہ ہو جائے۔[1]

یہی مضمون دیگر روایات میں بھی موجود ہے۔

۷۔ **حرمتِ زنا کا فلسفہ:** ہم نہیں سمجھتے کہ کسی شخص پر اس فعل کے بُرے اور منحوس نتائج مخفی ہوں کہ جو فرد اور معاشرے پر مترتب ہوتے ہیں لیکن اس ضمن میں تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

اس قبیح عمل کا وجود اور پھیلاؤ بلاشبہ خاندانی نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس سے باپ اور بیٹے کا تعلق مبہم اور تاریک ہو جاتا ہے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ جو بچے نسب اور نسل کی پہچان سے محروم ہوں وہ خطرناک مجرم بن جاتے ہیں اور معاشرے میں جرائم کے اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

یہ شرمناک عمل ہوس پرستوں کے درمیان طرح طرح کے جھگڑے پیدا کرتا ہے۔

علاوہ ازیں اس سے کئی طرح کی نفسیاتی اور مخلوط بیماریاں پیدا ہوتی ہیں کہ جن کے بُرے اور منحوس نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

بچوں کا قتل، اسقاطِ حمل اور اس قسم کے دوسرے جرائم اسی عمل کے قبیح نتائج میں سے ہیں۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۲ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳۲ کی تفسیر دیکھیے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۴ ص ۳۳۵

Marfat.com

۴۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ○

۵۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۴۔ اور وہ لوگ کہ جو پاکدامن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں اور پھر اپنے دعوٰی کے ثبوت کے لیے چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو کہ وہ فاسق ہیں۔

۵۔ مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح و تلافی کریں تو خدا غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

تہمت کی سزا

گزشتہ آیات میں زانی مرد اور زانی عورت کے لیے سخت سزا بیان کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے خود غرض اور بے تقوٰی افراد اس سے غلط فائدہ اُٹھائیں اور پاکدامن افراد پر تہمت لگانا شروع کر دیں اس لیے زانیوں کے لیے شدید سزا بیان کرنے کے ساتھ ہی سوئے استفادہ کرنے والوں اور تہمت لگانے والوں کے لیے سخت سزا بیان کی گئی ہے تاکہ ایسے افراد کے ہاتھوں پاکدامن گھرانوں کی حیثیت اور احترام محفوظ رہے اور کوئی شخص کسی کی عزت و آبرو کو زائل کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ارشاد ہوتا ہے: جو افراد پاک دامن عورتوں پر منافیٔ عفت عمل کا الزام لگاتے ہیں انہیں چاہیئے کہ اس دعوے کے ثبوت کے لیے چار (عادل) گواہ پیش کریں اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو ان میں سے ہر ایک کو اسّی کوڑے لگاؤ (والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة)۔

Marfat.com

یہ سخت سزا بیان کرنے کے بعد قرآن دو احکام کا اضافہ کرتا ہے۔

اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو (ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدًا)۔

اور وہ فاسق ہیں (واولئک ھم الفاسقون)۔

اس طرح سے ایسے افراد کے لیے نہ صرف سخت سزا مقرر کی گئی ہے بلکہ انہیں گواہی دینے کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا ہے اور ان کی ہر بات کو بے وقعت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ تاکہ پاکدامن افراد کا وقار مجروح نہ کرسکیں۔ علاوہ ازیں قرآن نے ان کے ماتھے پر فسق کی علامت بھی لگا دی ہے اور معاشرے میں انہیں ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔

پاک دامن افراد کی عزت و وقار کے تحفظ کے لیے ایسا سخت اقدام صرف یہیں پر نہیں ہے بلکہ بہت سی دیگر اسلامی تعلیمات میں بھی موجود ہے۔ ان تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں باایمان اور پاک دامن عورت اور مرد کا عزت و وقار کس قدر اہم ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں:

اذا اتھم المؤمن اخاہ انماث الایمان من قلبہ کما ینماث الملح فی الماء

اگر کوئی مومن اپنے مومن بھائی پر کسی ایسی چیز کا الزام لگائے کہ جو اس میں نہیں ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح سے گھل جاتا ہے جیسے پانی نمک میں۔[1]

لیکن اسلام کسی پر واپسی کی راہ بند نہیں کرتا بلکہ ہر موقع پر گناہگاروں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنا آلودہ دامن پاک کریں اور گزشتہ خطاؤں کی تلافی کریں للذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا: مگر وہ لوگ جو بعد ازاں توبہ کرلیں اور اصلاح و تلافی کرلیں تو خدا انہیں معاف کر دیتا ہے کیونکہ اللہ غفور و رحیم ہے (الا الذین تابوا من بعد ذٰلک واصلحوا فان اللہ غفور رحیم)۔

کیا یہ استثناء صرف "اولئک ھم الفاسقون" کے لیے یا "ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدًا" کے لیے بھی ہے ——— اس سلسلے میں مفسرین اور علماء کی آرا مختلف ہیں یہ استثناء اگر دونوں جملوں کی طرف لوٹے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی توبہ بھی مقبول ہے اور ہر لحاظ سے فسق کا حکم بھی اُن سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

لیکن اگر یہ استثناء صرف آخری جملے کی طرف لوٹے تو اب وہ فاسق شمار تو نہیں ہوں گے لیکن ان کی گواہی آخرِ عمر تک قابلِ اعتبار نہیں ہوگی۔

البتہ اصولِ فقہ میں جو قواعد تسلیم کیے جا چکے ہیں ان کے مطابق جو استثناء دو یا چند جملوں کے بعد آئے اُس کا تعلق صرف آخری جملے سے ہوتا ہے لیکن اگر کچھ ایسے قرائن موجود ہوں کہ جو بتائیں کہ اس کا تعلق پہلے جملوں سے بھی ہے تو پھر بات دوسری ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث آیت میں اس قسم کا قرینہ موجود ہے کیونکہ اگر توبہ کے ذریعے فسق کا حکم اُٹھ جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ گواہی قابلِ قبول نہ رہے کیونکہ شہادت کی عدم قبولیت فسق کی وجہ سے تھی۔ اب جب شخص نے توبہ کرلی ہے اور نئے سرے سے اُس نے ملکۂ عدالت حاصل کرلیا ہے تو فسق اس سے دُور ہوگیا ہے۔

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۲۶۹ باب التھمۃ و سوء الظن

Marfat.com

اہل بیت علیہم السلام سے متعدد روایات ایسی منقول ہیں کہ جو اسی مفہوم پر زور دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ امام صادق علیہ السلام اس تصریح کے بعد کہ جنہوں نے توبہ کر لی ہے ان افراد کی شہادت قابلِ قبول ہے، سوال کرنے والے شخص سے پوچھتے ہیں:

جو فقہاء تمہارے قریب رہتے ہیں وہ کیا کہتے ہیں؟

اُس نے عرض کیا:

وہ کہتے ہیں ان کی توبہ اللہ اور اس کے درمیان تو قبول ہوگی لیکن ان کی شہادت ہمیشہ کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

امامؑ فرماتے ہیں:

بئس ما قالوا کان ابی یقول اذا تاب ولم یعلم منه الاخیر جازت شهادته

انہوں نے بہت بُری بات کہی ہے، میرے والد فرمایا کرتے تھے: جو شخص توبہ کر لے اور پھر اُس سے خیر اور اچھائی کے سوا کچھ نہ دیکھا جائے تو اس کی شہادت قبول ہے[1]

متعدد دیگر روایات بھی اسی طرح کی وسائل الشیعہ کے اس باب میں موجود ہیں جس سے ہم نے مذکورہ بالا حدیث درج کی ہے یہ سب روایات ہم آہنگ ہیں، سوائے ایک روایت کے اور اسے بھی تقیہ پر محمول کیا گیا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "لاتقبلوا لهم شهادة ابداً" میں لفظ "ابداً" حکم کی عمومیت کی دلیل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہر عمومیت میں استثناء خصوصاً "متصل" کا استثناء ہو سکتا ہے اس بناء پر یہ محض اشتباہ ہے کہ "ابداً" کی تعبیر توبہ سے مانع ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت میں "رمی" کا کیا معنی ہے؟ "رمی" دراصل تیر، پتھر یا کوئی ایسی ہی چیز پھینکنے کے معنی میں ہے۔ فطری سی بات ہے کہ بہت سے مواقع پر ایسی چیز تکلیف پہنچاتی ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ کنائے کے طور پر الزام دینے، گالیاں بکنے اور غلط نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ باتیں بھی دوسرے کو تیر کی طرح مجروح کر دیتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں اور اسی طرح آئندہ آیات میں یہ لفظ مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً یہ نہیں فرمایا:

والذین یرمون المحصنات بالزنا

جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں۔

کیونکہ "یرمون" کے مفہوم میں، خصوصاً کلام میں موجود قرائن کے حوالے سے لفظ زنا موجود ہے نیز اس مقام پر جبکہ پاکدامن عورتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، یہ لفظ استعمال نہ کرنا ایک طرح کا احترام اور ادب شمار ہوتا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸، کتاب الشہادات باب ۳۶ ص۲۸۳

Marfat.com

۲۔ چار گواہ کیوں؟ ہم جانتے کہ اسلام میں حقوق اور جرائم ثابت کرنے کے لیے عموماً دو عادل گواہ کافی ہیں یہاں تک کہ کسی انسان کے قتل کا جرم ثابت کرنے کے لیے دو عادل گواہ کافی ہیں لیکن زنا کا الزام ثابت کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ چار گواہ ضروری قرار دیے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس مقام پر گواہ اس لیے زیادہ رکھے گئے ہوں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کے الزامات بے محابا لگاتے ہیں اور سوئے ظن سے یا بغیر اس کے لوگوں کی عزت و وقار مجروح کرتے ہیں اسلام نے اس طرز عمل کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی یہ سختی لوگوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے ہے جبکہ دیگر مسائل یہاں تک کہ کسی کے قتل کے بارے میں بھی لوگ اس طرح کی بے سروپا باتیں نہیں کرتے۔

اس سے قطع نظر در حقیقت قتلِ نفس کا مجرم ایک شخص ہے جبکہ زنا کے مسئلے میں دو افراد کے لیے اثباتِ جُرم ہوتا ہے لہٰذا اگر ہر ایک کے لیے دو گواہ درکار ہوں تو کل چار گواہ ہو جائیں گے۔

یہی بات امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی آئی ہے۔ اہل سنّت کے مشہور فقیہ ابو حنیفہ کا کہنا ہے:

> میں نے امام صادق سے پوچھا زنا زیادہ سنگین گناہ ہے یا قتل تو امام نے فرمایا: قتل
>
> میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر قتل نفس کے لیے دو گواہ کیوں کافی ہیں جبکہ زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہ ضروری ہیں۔
>
> تو امام نے فرمایا: تم اس مسئلے میں کیا کہتے ہو؟
>
> ابو حنیفہ کے پاس کوئی واضح جواب نہ تھا۔
>
> امام نے فرمایا: یہ اس بناء پر ہے کہ زنا کے مسئلے میں دو حدیں ہیں۔ ایک حد مرد پر جاری ہوتی ہے اور دوسری عورت پر لہٰذا چار گواہوں کی ضرورت ہے جبکہ قتل نفس میں صرف ایک حد ہے جو قاتل پر جاری ہوتی ہے[1]

البتہ بعض مواقع ایسے بھی ہیں کہ جن میں زنا کے مسئلے میں صرف ایک حد جاری ہوتی ہے (مثلاً زنا بالجبر وغیرہ)۔ لیکن یہ معاملہ استثنائی پہلو رکھتا ہے۔ معمول یہی ہے کہ زنا طرفین کی رضامندی سے صورت پذیر ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر احکام کا فلسفہ غالب اکثریت پر مبنی ہوتا ہے۔

۳۔ قبولیتِ توبہ کی اہم شرط: ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ توبہ صرف یہ نہیں کہ انسان گزشتہ گناہ پر استغفار کرے یا نادم ہو۔ یہاں تک کہ صرف آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ بھی توبہ نہیں ہے بلکہ توبہ میں یہ سب امور شامل ہیں اور ان کے علاوہ ضروری ہے کہ گناہگار گناہ کی تلافی کے درپے ہو۔

اگر کسی نے واقعاً کسی پاکدامن عورت یا مرد کی عزت و وقار کو تہمت کے ذریعے داغدار کیا ہے تو اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے اسے چاہیئے کہ ان تمام افراد کے سامنے اپنی باتوں کی تکذیب کرے جنہوں نے اس سے وہ تہمت سُنی ہے۔ دوسرے لفظوں

---

[1] نورالثقلین ج ۳ ص۵۷۴

Marfat.com

میں ان کی حیثیت و عزت بحال کرے۔

لفظ "تابوا" کے بعد "واصلحوا" کا آنا اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد کو اپنے گناہ سے توبہ کرکے اس خرابی کی اصلاح بھی کرنا چاہیے جس کے وہ مرتکب ہوئے ہیں۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک شخص برسرِعام (یا مطبوعات و نشریات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے) کسی شخص پر جھوٹی تہمت لگائے اور اس کے بعد خلوت میں جاکر استغفار کرے اور بارگاہِ الٰہی سے معافی چاہے ـــــ اللہ تعالیٰ اس قسم کی توبہ ہرگز قبول نہیں کرے گا۔

اسی لیے چند احادیث میں آئمہ اسلام سے منقول ہے کہ اُن سے پوچھا گیا:

جو لوگ کسی کی عزت و ناموس پر تہمت لگاتے ہیں کیا حدِ شرعی کے اجراء اور توبہ کے بعد ان کی شہادت قابلِ قبول ہے؟

فرمایا: جی ہاں

اور جب سوال ہوا کہ ایسا شخص کس طرح سے توبہ کرے تو فرمایا:

امام (یا قاضی) کے پاس آئے اور کہے میں نے فلاں شخص پر تہمت لگائی ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں میں نے کہا ہے اب اس سے توبہ کرتا ہوں[1]

۴۔ **احکامِ قذف**: ہمارے ہاں کتابِ حدود میں ایک باب "حدِ قذف" کے عنوان سے ہے۔

"قذف" (بروزن حذف) لغت کے اعتبار سے دور کی جگہ کی طرف چھلانگ لگانے اور پھینکنے کے معنی میں ہے لیکن ایسے مواقع پر "رمی" کسی کی عزت پر تہمت لگانے کے مفہوم میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے اور دوسرے لفظوں میں فحش کلامی اور گالیاں دینے کے معنی میں ہے۔

اگر قذف صریح لفظ کے ساتھ ہو اگرچہ کسی بھی زبان اور شکل میں ہو اس کی حد اَسّی کوڑے ہے اور اگر صراحت سے نہ ہو تو پھر اس کے لیے تعزیر ہے (تعزیر ایسے گناہوں کے لیے ہوتی ہے جن کی حد شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ حاکم شرع کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مجرم کی خصوصیات، جرم کی کیفیت اور دیگر حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک خاص حد تک سزا مقرر کرے)۔

یہاں تک کہ اگر کوئی شخص متعدد افراد پر تہمت لگائے اور انہیں گالی دے اور ان میں ہر ایک کی طرف اس گناہ کی نسبت دے تو ہر ایک نسبت کے مقابلے میں اس پر حدِ قذف جاری ہوگی لیکن یک مرتبہ مجموعی طور پر ان پر تہمت لگاتے اور وہ بھی باہم اکٹھے ہوکر اس کی سزا کا مطالبہ کریں تو اس پر ایک حد جاری ہوگی لیکن اگر وہ الگ الگ دعویٰ دائر کریں تو ہر ایک کے مقابلے میں اس پر ایک حد جاری ہوگی۔

یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ اگر کسی پر تہمت لگائی جائے اور وہ فوت ہو جائے تو اس کے وارث دعویٰ دائر کر سکتے ہیں اور حد جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ حکم چونکہ ایک شخص کے حق کے ساتھ مربوط ہے اس لیے اگر صاحبِ حق مجرم کو معاف

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۰ ص ۲۹۳ (ابواب الشہادات، باب ۳۶ حدیث ۴۔

Marfat.com

کردے تو پھر اس کی حد ساقط ہو جائے گی لیکن اگر اس جرم کا اس قدر تکرار ہو کہ معاشرے کی عزت و وقار خطرے میں پڑ جائے تو پھر صورت اور ہو گی۔

اگر دو افراد ایک دوسرے پر تہمتِ ناموس لگائیں تو اس صورت میں دونوں سے حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن قاضی کے حکم سے دونوں پر تعزیر جاری ہو گی۔ لہٰذا کسی مسلمان کو حق نہیں کہ گالی کا جواب گالی سے دے بلکہ صرف قاضی کے ذریعے حق حاصل کرسکتا ہے اور گالی دینے والے کے لیے سزا کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

بہرحال اس اسلامی حکم کا مقصد اولاً انسانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت ہے اور ثانیاً بہت سے ایسے سماجی اور اخلاقی مفاسد کی روک تھام ہے کہ جو اس کام سے معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر برے اور فاسد افراد کو کھلی چھٹی مل جائے کہ وہ ہر کسی کو گالیاں دیں اور تہمتیں لگائیں اور پھر انہیں کوئی سزا نہ ملے تو لوگوں کی آبرو اور ناموس ہمیشہ معرضِ خطر میں رہے گی۔ یہاں تک کہ ان تہمتوں کے باعث بیوی اور شوہر کا ایک دوسرے سے اعتماد اُٹھ جائے گا اور باپ کو اعتبار نہیں رہے گا کہ اُس کا بیٹا اس کی جائز اولاد ہے۔ مختصر یہ کہ گھرانے کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور اس طرح پورا معاشرہ بدگمانی اور عدم اعتبار کی کیفیت سے دوچار ہو جائے گا۔ غلط پراپیگنڈے اور تہمت تراشیوں کا بازار گرم ہو گا اور پاک ذہن اور پاک فکر داغدار ہو کر رہ جائے گی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں سخت اور ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے — وہی سختی جو اسلام نے ایسے بدزبان اور آلودہ دھن افراد کے لیے روا رکھی ہے۔

ہاں ہاں — ایسے افراد کو ایک بدی، تہمت اور گالی پر اسّی کوڑے کھانے چاہئیں تاکہ وہ لوگوں کی عزت و آبرو سے نہ کھیل سکیں۔

Marfat.com

۶۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ
فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○
۷۔ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○
۸۔ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ
الْكٰذِبِيْنَ ○
۹۔ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○
۱۰۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۶۔ جو لوگ اپنی بیویوں پر (منافیٔ عفت عمل کا) الزام لگاتے ہیں اور اپنے علاوہ ان کے پاس کوئی گواہ نہیں تو ان میں سے ہر ایک اللہ کے نام کی چار شہادتیں دے کہ وہ سچوں میں سے ہے۔

۷۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر جھوٹوں میں سے ہو۔

۸۔ وہ عورت بھی اپنے تئیں (زنا کی) سزا سے بچا سکتی ہے اگر چار مرتبہ اللہ کو شاہد قرار دے کہ (عورت پر اس الزام میں) وہ مرد جھوٹا ہے۔

۹۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس پر خدا کا غضب ہو اگر وہ مرد سچوں میں سے ہے۔

۱۰۔ اور اگر خدا کا فضل اور رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی ـــــ اور یہ کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور حکیم ہے (تو تم میں سے بہت سے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتے)۔

Marfat.com

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے کہ:

(انصار کے سردار) سعد بن عبادہ رسول اللہ ؐ کی خدمت میں موجود تھے۔ کچھ اور اصحاب بھی بیٹھے تھے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس منافیِ عفت عمل کی نسبت کسی کی طرف دینے کی سزا عدم ثبوت پر اسّی کوڑے ہے تو اگر میں اپنے گھر میں داخل ہوں، اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ ایک فاسق شخص میری بیوی کے ساتھ مشغولِ بدکاری ہے تو اگر میں اُسے اسی عالم میں چھوڑ کر چار گواہ ڈھونڈنے چلا جاؤں تو واپسی تک وہ اپنا کام کر چکا ہوگا اور اگر قتل کردوں تو گواہ کے بغیر کوئی میری بات قبول نہیں کرے گا اور مجھ سے قاتل کے طور پر قصاص لیا جائے گا جبکہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ بیان کروں تو میری پشت پر اسی کوڑے لگیں گے۔

رسول اکرم ؐ نے اس گفتگو سے حکمِ الٰہی پر ایک طرح کا اعتراض محسوس کیا۔ آپ نے انصار کی طرف رُخ کرکے شکوے کے انداز میں فرمایا: کیا تم نے سُنا کہ تمہارے سردار نے کیا کہا ہے۔

وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہنے لگے: یارسول اللہ! اسے سرزنش نہ کیجیے۔ وہ ایک غیور آدمی ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ شدتِ غیرت کی بناء پر ہے۔

سعد بن عبادہ نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ یہ حکمِ الٰہی ہے اور حق ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی بنیاد پر تعجب ہوتا ہے (اور میں اپنے ذہن میں اس سوال کو حل نہیں کرسکا)۔

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: حکمِ خدا یہی ہے۔

انہوں نے بھی عرض کی: صدق اللہ ورسولہ (اللہ اور اُس کے رسول ؐ نے سچ کہا)۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سعد کا چچازاد بھائی ہلال بن امیہ دروازے سے داخل ہوا۔ اُس نے رات کے وقت ایک فاسق شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ شکایت کے لیے رسول اللہ ؐ کی خدمت میں آیا تھا۔

اُس نے صراحت سے کہا میں نے اپنی آنکھ سے یہ کچھ دیکھا ہے اور اپنے کان سے ان کی آواز سنی ہے۔

رسول اللہ اتنے ناراحت ہوئے کہ خشگی کے آثار چہرۂ مبارک پر نمایاں ہوگئے۔

ہلال نے عرض کی: میں آپ کے چہرے پر ناراضی کے آثار دیکھ رہا ہوں لیکن قسم بخدا میں سچ کہہ رہا ہوں اور میں نے کچھ بھی جھوٹ نہیں کہا مجھے امید ہے کہ اللہ اس مشکل کو خود حل فرمادے گا۔

Marfat.com

بہرحال رسولؐ اللہ نے ارادہ کیا کہ ہلال پر حدِ قذف جاری کریں کیونکہ اس کے پاس اپنے دعویٰ پر گواہ موجود نہ تھے۔

اس موقع پر انصار ایک دوسرے سے کہتے تھے دیکھا ! وہی سعد بن عبادہ والی بات پوری ہوگئی تو کیا سچ مچ رسولؐ اللہ ہلال کو تازیانے لگائیں گے اور اس کی گواہی رد کردیں گے۔

اس موقع پر رسولؐ اللہ پر وحی نازل ہوئی اور اس کے آثار آنحضرتؐ کے چہرے پر ظاہر ہوئے سب خاموش تھے کہ دیکھیں کہ اللہ کی طرف سے کیا نیا پیغام آیا ہے۔

اس وقت مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں[1]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کے حل کے لیے مسلمانوں کو ایک دقیق راہ بتائی کہ جس کی تفصیل آپ ذیل میں پڑھیں گے۔

تفسیر

بیوی پر تہمت لگانے کی سزا

جیسا کہ شانِ نزول سے ظاہر ہے زیرِ نظر آیات حدِ قذف پر تبصرے کے طور پر ایک استثنائی حکم بیان کر رہی ہیں کہ اگر شوہر اپنی بیوی پر منافیٔ عفت عمل کا الزام عائد کرے اور کہے کہ میں نے اسے غیر مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں دیکھا ہے تو اس پر اسی کوڑے کی حدِ قذف جاری نہیں ہوگی لیکن اس کا دعویٰ بغیر دلیل و شاہد کے قبول بھی نہیں کیا جائے گا کیوں اس میں سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال ہے۔

یہاں قرآن نے اس مسئلے کا ایسا حل پیش کیا ہے کہ جو بہترین بھی ہے اور عادلانہ بھی اور وہ یہ کہ شوہر اپنے دعوے میں سچا ہونے کے لیے چار مرتبہ گواہی دے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہیں اور اپنے علاوہ ان کے پاس کوئی گواہ نہیں تو دعویٰ کرنے والوں میں سے ہر شخص چار مرتبہ اللہ کے نام کی شہادت دے کہ وہ سچوں میں سے ہے (والذین یرمون ازواجهم ولم یکن لهم شهداء الا انفسهم فشهادة احدهم اربع شهادات بالله انه لمن الصادقین)۔

اور پانچویں دفعہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو (والخامسة ان لعنة الله علیه ان کان من الکاذبین)۔

یعنی شوہر اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے اور حدِ قذف سے بچنے کے لیے چار مرتبہ یہ جملہ کہے:

اشهد بالله انی لمن الصادقین فیما رمیتها به من الزنا

میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس عورت پر جو الزام لگایا ہے اس میں میں سچا ہوں۔

لعنة الله علی ان کنت من الکاذبین

---

[1] تفسیر مجمع البیان، فی ظلال، نور الثقلین اور المیزان (کچھ فرق کے ساتھ)

Marfat.com

اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت

یہاں عورت کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مرد کے الزام کی نفی نہ کرے اور اس کی بات کی تصدیق کر دے تو جیسا کہ بعد کی آیات میں آئے گا اس کے لیے حدِ زنا ثابت ہو جائے گی۔

دوسرا راستہ زنا کی سزا سے بچنے کا ہے اور وہ یہ کہ وہ چار مرتبہ اللہ کو گواہ قرار دے کر کہے کہ اس مرد نے غلط الزام لگایا ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے (ویدرء عنھا العذاب ان تشھد اربع شھادات باللہ انہ لمن الکاذبین)۔

اور پانچویں مرتبہ کہے: اس پر خدا کا غضب ہو اگر مرد اس الزام میں سچا ہے (والخامسۃ ان غضب اللہ علیھا ان کان من الصادقین)۔

یعنی مرد نے جو پانچ مرتبہ اس عورت کے خلاف گواہی دی ہے وہ عورت بھی پانچ مرتبہ اس کی نفی کرے۔ پہلے چار مرتبہ یوں کہے:

اشھد باللہ انہ لمن الکاذبین فیما رمانی بہ من الزنا

میں خدا کو گواہ بناتی ہوں کہ اس نے میری طرف جو نسبت دی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے۔

اور پانچویں دفعہ یہ کہے:

ان غضب اللہ علی ان کان من الصادقین

اگر وہ سچ کہتا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں جو لفظ "لعن" آیا ہے اس کی مناسبت سے اس سارے عمل کو "لعان" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس عمل سے چار نتیجے مرتب ہوں گے:

(۱) صیغہ طلاق کی ضرورت کے بغیر ہی فوراً میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔

(۲) یہ عورت اور مرد ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔ یعنی نئے سرے سے ان کی شادی کا امکان ختم ہو جائے گا۔

(۳) قذف کی حد مرد سے اور زنا کی حد عورت سے اٹھ جائے گی (لیکن اگر ان میں سے مرد یہ کام نہ کرے تو اس پر قذف کی حد جاری ہوگی اور عورت یہ کلمات نہ کہے تو اس پر زنا کی حد جاری ہوگی)۔

(۴) اس واقع کے نتیجے میں جو بچہ پیدا ہوگا وہ اس مرد کا نہیں سمجھا جائے گا یعنی اس سے منسوب نہیں ہوگا البتہ عورت سے منسوب رہے گا۔

البتہ ان احکام کی تفصیلات زیرِ بحث آیات میں نہیں آئیں۔ فقط آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے: اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی اور وہ توبہ قبول کرنے والا اور حکیم نہ ہوتا تو بہت سے لوگ تباہ ہو جاتے یا سخت سزاؤں میں مبتلا ہو جاتے (ولولا فضل اللہ علیکم و رحمتہ وان اللہ تواب حکیم)۔

یہ آیت درحقیقت مندرجہ احکام پر تاکید کے طور پر ایک اجمالی اشارہ ہے کیونکہ یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ "لعان"

Marfat.com

کا عمل اللہ کا ایک فضل وکرم ہے اور وہ اس سلسلے میں میاں بیوی کے ایک مشکل معاملے کو صحیح طریقے سے حل کر دیتا ہے۔

ایک طرف تو وہ شوہر کو مجبور نہیں کرتا کہ اگر اس نے اپنی بیوی کو بدکاری کے عالم میں دیکھا ہے تو وہ خاموش رہے اور فریادرسی کے لیے حاکم شرع کے پاس نہ آئے اور دوسری طرف عورت کو صرف اس الزام پر زنائے محصنہ کی حد جاری نہیں کر دیتا بلکہ اسے صفائی کا حق دیتا ہے جبکہ تیسری طرف شوہر کے لیے ضروری قرار نہیں دیتا کہ اگر اس نے کوئی ایسا کام دیکھا ہے تو لازماً چار گواہ ڈھونڈے اور اس المناک راز کو عریاں کرے اور چوتھی طرف اس عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتا ہے کیونکہ اب وہ مل جل کر زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہے۔ یہاں تک کہ انہیں آئندہ بھی ایک دوسرے سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اگر الزام سچا ہو تو وہ نفسیاتی طور پر اس ازدواجی زندگی کو جاری نہیں رکھ سکتے اور اگر جھوٹا الزام ہو تو عورت کے جذبات اس طرح سے مجروح ہو چکے ہوں گے کہ اب اس کے لیے مشکل ہوگا کہ وہ یہ زندگی جاری رکھ سکے کیونکہ اس عمل سے نہ صرف سرد مہری پیدا ہو جائے گی بلکہ عداوت شروع ہو جائے گی اور پانچویں رُخ سے اس معاملے میں بچے کے بارے میں بھی ذمہ داری واضح کر دی گئی ہے۔

یہ ہے بندوں پر اللہ کا فضل ورحمت اور اس کا تواب وحکیم ہونا ——— وہ اللہ کہ جس نے اس مسئلے کے نہایت باریک اور عادلانہ حل کی راہ کھول دی ہے اور اگر ہم صحیح طرح سے غور کریں تو چار گواہوں کے لزوم کا اصل حکم بھی کاملاً ختم نہیں ہوا بلکہ مرد اور عورت جو چار چار مرتبہ شہادت دیتے ہیں ان میں سے ہر شہادت ایک گواہ کا قائم مقام ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ حکم قذف صرف بیوی اور شوہر کے لیے کیوں مخصوص ہے؟ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیوی اور شوہر کو کیا خصوصیت حاصل ہے کہ الزام کے موقع پر اُن کے لیے یہ استثنائی حکم صادر ہوا ہے۔

اس سوال کا ایک جواب تو آیت کی شانِ نزول سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مرد اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھے تو اس کے لیے ممکن نہیں کہ خاموش رہے۔ اس کی غیرت کیونکر اجازت دے سکتی ہے کہ اپنے حریم ناموس میں ایسے تجاوز پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کرے۔ جبکہ وہ قاضی کے پاس جا کر داد و فریاد کرے گا تو فوراً اس پر حدِ قذف جاری ہو جائے گی کیونکہ قاضی کو کیا معلوم کہ وہ سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ نیز اگر وہ چار گواہ تلاش کرنا چاہے تو یہ بھی ہتکِ عزت ہے علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ گواہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ معاملہ ہی ختم ہو جائے۔

اس مسئلے کا ایک رُخ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیر لوگ تو بہت جلد ایک دوسرے پر الزام دھر دیتے ہیں لیکن میاں بیوی بہت کم ایک دوسرے پر الزام عائد کرتے ہیں۔ اسی بناء پر غیر لوگ ہوں تو چار گواہ ضروری ہیں ورنہ حدِ قذف جاری ہوگی لیکن میاں بیوی کے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا حکم مذکور انہیں کے لیے مخصوص ہے۔

۲۔ "لعان" ایک مخصوص عمل ہے: آیات کی تفسیر میں جو وضاحت ہو چکی ہے اس سے ہم یہاں تک پہنچے ہیں جو مرد اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ چار دفعہ اللہ کو شاہد قرار دے کر کہے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ دراصل اپنے اپنے مقام پر ان میں سے ہر شہادت ایک گواہ کی قائم مقام ہے اور پانچویں مرتبہ وہ مزید تاکید کے لیے کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ

Marfat.com

کی لعنت ہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان احکام و قوانین کے اجراء کا تعلق عموماً ایک اسلامی ماحول اور مذہبی فضا سے ہے اور جب کوئی یہ دیکھے گا کہ اسے حاکمِ اسلامی کے سامنے اس طرح سے قطعی طور پر اللہ کو گواہی کے لیے بلانا ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجنا ہے تو اکثر اوقات وہ غلط اقدام سے بچے گا اور یہی چیز جھوٹے الزامات کے راستے میں دیوار بن جاتی ہے۔

یہ بات تو مرد کے بارے میں تھی باقی رہا یہ کہ عورت اپنی صفائی کے لیے چار مرتبہ اللہ کو گواہ قرار دیتی ہے تو یہ مرد اور عورت میں برابری برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ نیز عورت پر چونکہ الزام عائد کیا گیا ہے اس لیے وہ پانچویں مرحلے میں مرد کی عبارت سے زیادہ شدید الفاظ میں اپنا دفاع کرے گی اور جھوٹی ہونے کی صورت میں وہ اپنے لیے غضبِ خدا خریدے گی۔

اور ہم جانتے ہیں کہ لعنت سے مراد رحمتِ خدا سے دوری ہے لیکن غضب لعنت سے کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ غضب اور سزا و عذاب لازم و ملزوم ہیں کہ جو رحمت سے دوری سے بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ "مغضوب علیہم" ضالین سے بدتر ہیں جبکہ مسلّم ہے کہ "ضالین" رحمتِ خدا سے دُور ہیں۔

۲۔ آیت میں جملۂ شرطیہ کی جزائے محذوف: زیرِ بحث آخری آیت جملۂ شرطیہ کی شکل میں ہے کہ جس کی جزا ذکر نہیں ہوئی صرف اسی قدر فرمایا گیا ہے:

اگر خدا کا فضل و رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ وہ توّاب و حکیم نہ ہوتا

لیکن یہ نہیں فرمایا گیا کہ پھر کیا ہوتا؟

کلام کے قرائن کی طرف توجہ کریں تو اس شرط کی جزا واضح ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حذف اور خاموشی ایک مطلب کو زیادہ اہمیت دے دیتی ہے اور انسان کے ذہن میں بہت سے احتمالات پیدا کر دیتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک اس گفتگو کو ایک نیا مفہوم دیتا ہے۔

مثلاً یہاں ممکن ہے شرط کی جزاء یہ ہو کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تمہارے کاموں سے پردہ اٹھا دیتا تمہارے راز ظاہر ہو جاتے اور تم ذلیل و رسوا ہو جاتے۔

یا ہو سکتا ہے شرط کی جزاء یہ ہو کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو تو وہ تمہیں فوراً ہی عذاب دیتا اور ہلاک کر دیتا۔

یا ہو سکتا ہے شرط کی جزاء یہ ہو کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تم انسانوں کیلئے ایسے بچے تلے قوانین مقرر نہ کرتا۔

درحقیقت شرط کی جزاء کا یہ محذوف ہونا سننے والے کے ذہن کو ان تمام امور کی طرف متوجہ کر دیتا ہے[1]

---

[1] تفسیر المیزان میں ایک نہایت جامع جواب شرط نقل کیا گیا ہے۔ اس میں اور بھی کئی تفسیریں آ جاتی ہیں۔ بہرحال اس کے مطابق تقدیر کلام اس طرح ہے:

لولا ما انعم اللہ علیکم من نعمۃ الدین و توبتہ لمذنبیکم و تشریع الشرایع لنظم امور حیاتکم،

لزمتکم الشقوۃ، و اھلکتکم المعصیۃ و الخطیئۃ، و اختل نظام حیاتکم بالجھالۃ

اگر نعمتِ دین کی صورت میں، قبولیتِ توبہ کی صورت میں اور نظامِ زندگی چلانے کے لیے قوانین کی صورت میں اللہ کا تم پر انعام نہ ہوتا تو بدبختی تمہارے لیے لازم ہو جاتی اور معصیت و خطا تمہیں مار ڈالتی اور جہالت کے باعث تمہارا نظامِ حیات درہم برہم ہو جاتا۔

Marfat.com

۱۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ
بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ
وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○
۱۲۔ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ
خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ○
۱۳۔ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ
فَاُولٰۗىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○
۱۴۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ
فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○
۱۵۔ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ
وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ڰ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ○
۱۶۔ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ڰ
سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۱۔ اتنی بڑی تہمت لگانے والا تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ تھا لیکن یہ خیال نہ کرو کہ یہ ماجرا تمہارے لیے برا تھا بلکہ اس میں تمہارے لیے خیر ہے۔ جس کسی نے اس میں جس قدر حصہ لیا اس قدر گناہ اس کے ذمے ہے اور جس نے اس کا بڑا حصہ اپنے ذمے لیا اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔

Marfat.com

۱۲۔ جس وقت تم نے یہ (تہمت والی) بات سنی تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ نیک گمان کیوں نہیں کیا، تم نے کیوں نہیں کہا کہ یہ بہت بڑا اور واضح جھوٹ ہے۔

۱۳۔ ان لوگوں نے چار گواہ کیوں پیش نہیں کیے، اب جب کہ وہ گواہ پیش نہیں کر سکے تو اللہ کے نزدیک وہ جھوٹے ہیں۔

۱۴۔ اور اگر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تمہارے اس خود کردہ گناہ پر تمہیں سخت عذاب پہنچتا۔

۱۵۔ وہ وقت یاد کرو جب تم اتنے بڑے جھوٹ کے پیچھے چل پڑے اور تمہاری ایک زبان سے یہ جھوٹ دوسری زبان تک پہنچتا چلا گیا اور تم اپنے منہ سے ایسی بات کہتے رہے جس کا تمہیں یقین نہیں تھا اور تم اسے ایک معمولی سا مسئلہ سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔

۱۶۔ تم نے اسے سن کر یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم یہ بات کریں، خداوندا! تو منزہ ہے یہ تو عظیم بہتان ہے۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات کے لیے دو شانِ نزول نقل ہوئی ہیں۔

پہلی شانِ نزول جو زیادہ مشہور ہے اہل سنت کی کتب تفاسیر میں نقل ہوئی۔ شیعہ تفاسیر میں بھی بالواسطہ طور پر یہ شانِ نزول نقل ہوئی ہے۔ یہ شانِ نزول زوجہ رسولؐ حضرت عائشہ سے منقول ہے وہ کہتی ہیں:

رسولؐ اللہ جب کسی سفر پر جانے لگتے تو اپنی ازواج کے لیے قرعہ ڈالتے قرعہ جس کے نام نکلتا اُسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک جنگ[1] کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا۔ میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئی۔ اس وقت پردے کی آیت نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے میں ایک محمل سوار تھی۔ جنگ ختم

---

[1] جنگ بنی المصطلق، پانچ ہجری۔

Marfat.com

ہوئی اور ہم واپس چل پڑے ۔ مدینے کے قریب پہنچے تو رات ہوگئی ۔ میں رفع حاجت کے لیے لشکرگاہ سے کچھ دُور چلی گئی ۔ جب واپس آئی تو میری نظر پڑی کہ مینی منکوں والا میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے ۔ میں اسے ڈھونڈنے نکل گئی اور مجھے دیر ہوگئی ۔ واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ لشکر چلا گیا ہے ۔ وہ میرا محمل بھی اونٹ پر رکھ کر لے گئے ۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس میں موجود ہوں کیونکہ ان دنوں غذا کی کمی کے باعث عورتیں ہلکی پھلکی تھیں علاوہ ازیں میری عمر بھی کم تھی ۔ بہر حال میں وہاں تن تنہا رہ گئی ۔ میں نے سوچا کہ جب گھر پہنچیں گے اور مجھے نہیں پائیں گے تو میری تلاش میں نکلیں گے ۔ رات میں نے اسی بیابان میں بسر کی ۔ اتفاق کی بات ہے کہ لشکر اسلام کا ایک فرد "صفوان" بھی لشکرگاہ سے دُور رہ گیا تھا ۔ وہ بھی رات اسی بیابان میں تھا ۔ دن چڑھا تو دُور سے اُس نے مجھے دیکھا تو قریب آیا ۔ اُس نے مجھے پہچان لیا اُس نے " انا للہ و انا الیہ راجعون " کہا ۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہ کہا ۔ اُس نے اپنا اونٹ بٹھایا اور میں اس پر سوار ہوگئی ۔ اُس نے ناقہ کی مہار پکڑلی اور چلتا رہا یہاں تک کہ ہم لشکرگاہ میں پہنچ گئے ۔

یہ منظر دیکھا تو کچھ لوگ میرے بارے میں پراپیگنڈا کرنے لگے اور اپنے آپ کو عذاب الٰہی میں گرفتار کر کے) ہلاکت میں ڈالنے لگے ۔ اس تہمت طرازی میں عبداللہ بن ابی سلول نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔

ہم مدینہ میں پہنچے اور یہ پراپیگنڈا شہر میں پھیل گیا جبکہ مجھے اس کی کوئی خبر نہ تھی ۔

اس دوران میں میں بیمار ہوگئی ۔ رسول اللہؐ مجھے دیکھنے کے لیے تو آئے لیکن مجھے وہ پہلے سی مہربانی دکھائی نہ دیتی ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے ۔ میری صحت اچھی ہوگئی ۔ باہر نکلی تو رفتہ رفتہ مجھے اپنی قریب کی عورتوں سے منافقین کے پراپیگنڈے کا پتہ چلا تو میں سخت بیمار ہوگئی ۔

رسول اللہؐ مجھے دیکھنے کے لیے آئے تو میں نے آپ سے اپنے باپ کے گھر جانے کی اجازت چاہی ۔

جب میں اپنے باپ کے گھر آئی تو میں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں ۔ انہوں نے کہا : غم نہ کرو ، جن عورتوں کو امتیاز حاصل ہے اور دوسرے ان سے حسد کرتے ہیں ، ان کے بارے میں بہت کچھ باتیں ہوتی رہتی ہیں ۔

اس موقع پر رسول اللہؐ نے علیؑ بن ابی طالبؑ اور اسامہ بن زیدؓ سے مشورہ کیا کہ ان باتوں کے بارے میں میں کیا کروں ۔

اسامہؓ نے کہا : یا رسول اللہؐ ! وہ آپ کی زوجہ ہیں ۔ ہم نے اُن سے بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا لہٰذا لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہ کریں ۔

Marfat.com

لیکن علیؑ نے کہا: اللہ نے آپ پر کوئی سختی نہیں کی۔ ان کے علاوہ بھی بہت بیویاں ہیں۔ آپؐ ان کی کنیز سے اس کے بارے میں تحقیق کر لیجئے۔

رسول اللہؐ نے میری کنیز کو بلایا اور اس سے پوچھا: کیا تو نے عائشہ کے بارے میں کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو شک و شبہ پیدا کرے کنیز نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں نے ان سے کوئی غلط کام نہیں دیکھا۔

اس وقت رسول اللہؐ نے ارادہ کیا کہ یہ باتیں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ آپ منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:

اے مسلمانو! اگر کوئی شخص (آپؐ کا اشارہ عبداللہ بن ابی سلول کی طرف تھا) مجھے میری اس بیوی کے معاملے میں رنج پہنچائے جس سے میں نے پاکیزگی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تو اگر میں اسے سزا دوں تو مجھے معذور سمجھنا اور اگر کسی ایسے شخص پر تہمت لگائی جائے کہ جس سے میں نے ہرگز کوئی برائی نہیں دیکھی، تو مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

سعد بن معاذ انصاری کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: آپ حق رکھتے ہیں، اگر وہ شخص قبیلۂ اوس سے ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا (سعد بن معاذ قبیلۂ اوس کے سردار تھے) اور اس کا تعلق قبیلۂ خزرج کے ہمارے بھائیوں سے ہے تو آپ حکم دیجئے تاکہ ہم اس پر عمل کریں۔

سعد بن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار تھے وہ ایک صالح شخص تھے لیکن اس موقع پر انہیں قومی تعصب نے آگھیرا (عبداللہ بن ابی سلول جس نے یہ جھوٹا پراپیگنڈا کیا تھا اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا)۔ سعد بن عبادہ نے سعد بن معاذ کی طرف رُخ کیا اور کہا: تو جھوٹ کہتا ہے۔ اگر وہ ہمارے قبیلے سے ہوا تو ایسے شخص کو قتل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

اسید بن حضیر سعد بن معاذ کا چچا زاد تھا۔ اُس نے سعد بن عبادہ کی طرف رُخ کیا اور کہا: تو غلط کہتا ہے واللہ ہم ایسے شخص کو قتل کرکے رہیں گے، تو منافق ہے اور منافقوں کی حمایت کرتا ہے۔

کوئی کسر نہ رہ گئی تھی کہ اوس و خزرج باہم دست و گریباں ہو جائیں اور ان کے درمیان جنگ چھڑ جائے جبکہ رسول اللہؐ منبر پر بیٹھے تھے۔ آخر کار آنحضرتؐ نے انہیں خاموش کیا۔

معاملہ اسی طرح رہا۔ میں بہت غمزدہ تھی۔ ایک مہینہ گزر گیا کہ رسول اللہ میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔

میں جانتی تھی کہ میرا دامن پاک ہے اور آخر کار اللہ اس بات کو واضح کرے گا۔

بالآخر ایک روز رسول اللہؐ میرے پاس آئے۔ آپ بہت خوش تھے۔ آپ نے آتے ہی یہ فرمایا: تجھے خوش خبری ہو کہ اللہ نے تجھے اس الزام سے بری قرار دیا ہے۔

اس موقع پر ان الذین جاءو بالافك ...... کی تمام آیات نازل ہوئیں۔

Marfat.com

اور ان آیات کے نزول کے بعد ان سب افراد پر حدِ قذف جاری کی گئی جنہوں نے یہ جھوٹ پھیلایا تھا۔[1]

ایک اور شانِ نزول جو پہلی شانِ نزول کے ساتھ بعض کتب میں مذکور ہے، کچھ اس طرح ہے:

رسول اللہؐ کی زوجہ عائشہ نے آپ کی زوجہ ماریہ قبطیہ پر تہمت لگائی کیونکہ ماریہ قبطیہ کا رسول اللہؐ سے ایک بیٹا تھا۔ ابراہیم ان کا نام تھا۔ وہ دنیا سے چل بسے تو رسول اللہؐ شدید غمگین ہوئے۔

عائشہ نے کہا، آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں، وہ تو درحقیقت آپ کا بیٹا ہی نہ تھا وہ تو جریح قبطی کا بیٹا تھا۔

آنحضرت نے یہ بات سنی تو حضرت علیؑ کو جریح کے قتل پر مامور کیا کہ جو اس قسم کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔

جب علیؑ برہنہ شمشیر لیے جریح کی تلاش میں نکلے تو اُس کی آپ پر نظر پڑی۔ اس نے علیؑ کے چہرے پر آثارِ غضب دیکھے تو بھاگ کھڑا ہوا اور کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔

جب اس نے محسوس کیا کہ ہو سکتا ہے علیؑ اس تک آپہنچیں تو اُس نے درخت سے چھلانگ لگادی۔ اس اثنا میں اس کا لباس اوپر ہو گیا تو معلوم ہوا کہ اُس کا تو آلۂ تناسل بالکل ہے ہی نہیں۔

علیؑ رسول اللہؐ کی خدمت میں واپس آئے اور عرض کی: آپ کے حکم پر قطعی طور پر عمل کروں یا تحقیق کروں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، تحقیق کرلو۔

اس پر علیؑ نے وہ واقعہ رسول اللہؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ اس پر پیغمبرِ خداؐ اللہ کا شکر بجالائے اور فرمایا، اُس اللہ کا شکر ہے جس نے بدی اور آلودگی کو ہمارے دامن سے دُور رکھا۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔[2]

---

[1] جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے یہی روایت تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اکثر کتب تفاسیر میں موجود ہے۔ ہم نے اسے کچھ اختصار سے ذکر کیا ہے۔

[2] تفسیر المیزان، نور الثقلین اور صافی ـــــ تلخیص کے ساتھ۔

Marfat.com

شانِ نزول کے بارے میں تحقیق

پہلی شانِ نزول جیساکہ ہم نے کہا ہے بہت سی اسلامی کتب میں موجود ہے لیکن اس میں کئی ایک مبہم نقاط موجود ہیں مثلاً

(۱) اس حدیث میں الفاظ کے اختلاف کے باوجود یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ اس پراپیگنڈا کے زیر اثر آ گئے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اس سلسلے میں مشورے اور بات چیت کے لیے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک میٹنگ کی بلکہ عائشہ سے بھی اپنا رویہ تبدیل کرلیا اور طویل عرصے تک ان سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی اور اسی طرح دیگر کئی ایک ایسے اقدامات کیے کہ جو اس امر کی حکایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس پراپیگنڈا کو بہت حد تک قبول کرلیا تھا۔ یہ امر نہ فقط آپؐ کے مقامِ عصمت کے خلاف ہے بلکہ ایک عام با ایمان ثابت قدم مسلمان کو بھی اس قسم کے بے دلیل پراپیگنڈا کا اثر قبول نہیں کرنا چاہیے اور اگر فکری طور پر کوئی اس سے متاثر ہو بھی تو عملاً اس کی وجہ سے اپنا طرزِ عمل نہیں بدلنا چاہیے اور اسے تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ ایک معصوم کہ جس کا مقام اور قدر و منزلت واضح ہے۔

اگلی آیتوں میں اس پراپیگنڈا کا اثر قبول کرنے والے مومنین کو شدید سرزنش کی گئی ہے کہ انہوں نے چار گواہوں کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔ کیا باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ شدید عتاب اور سرزنش پیغمبر اکرمؐ کے لیے بھی ہو؟ یہ ایک اہم اعتراض ہے کہ جو کم از کم اس شانِ نزول کے بارے میں شک ضرور پیدا کرتا ہے۔

(۲) ظاہر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قذف سے مربوط حکم واقعۂ افک سے پہلے نازل ہوا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے باوجود رسول اللہؐ نے عبداللہ بن ابی سلول اور دیگران لوگوں پر اسی دن خدائی حد کیوں جاری نہ کی کہ جنہوں نے یہ تہمت لگائی تھی (البتہ اگر آیۂ قذف اور واقعۂ افک سے مربوط آیتیں اکٹھی نازل ہوئی ہوں تو پھر یہ اعتراض ختم ہوجائیگا لیکن پہلا اعتراض اسی شدت سے باقی رہے گا)[1]

رہی دوسری شانِ نزول کی بات تو اسے قبول کرنا تو اور بھی مشکل ہے کیونکہ :

اولاً اس شانِ نزول کے مطابق یہ تہمت صرف ایک خاتون نے لگائی تھی جبکہ آیات صراحت کے ساتھ کہتی ہیں کہ یہ متعدد افراد کا کام تھا اور انہوں نے مل کر یہ پراپیگنڈا کیا تھا اور بات پورے ماحول میں پھیل گئی تھی۔ اسی لیے ان مسلمانوں پر عتاب و سرزنش کے لیے جو ضمیریں استعمال ہوئی ہیں سب جمع کی ہیں اور یہ امر دوسری شانِ نزول سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

ثانیاً یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اگر یہ تہمت حضرت عائشہ نے لگائی تھی اور بعد ازاں معاملہ اس کے برخلاف ثابت ہوگیا تو پھر رسول اللہؐ نے ان پر حدِ تہمت کیوں جاری نہیں کی؟

ثالثاً کیونکر ممکن ہے کہ صرف ایک عورت کی گواہی پر رسول اللہؐ کسی ملزم کے قتل کا حکم صادر فرمادیں جبکہ سوکنوں میں رقابت و حسد تو معمول کی چیز ہے۔ یہ امر تقاضا کرتا تھا کہ آپؐ کو اس الزام میں حق و عدالت سے انحراف کا احتمال پیدا ہوتا یا کم از کم یہ احتمال

---

[1] المیزان ج ۱۵ ص ۱۱۱

Marfat.com

پیدا ہوتا کہ ہوسکتا ہے اسے اشتباہ ہوا ہو۔

بہرحال ہمارے لیے جو کچھ اہم ہے وہ یہ شانِ نزول نہیں۔ اہم یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ مجموعی طور پر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت ایک بے گناہ شخص پر کچھ لوگوں نے بدکاری کا الزام لگایا تھا اور یہ پراپیگنڈا معاشرے میں پھیل چکا تھا۔ نیز آیت میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص پر تہمت لگائی گئی تھی کہ جو اُس معاشرے میں خاص اہمیت کا حامل تھا اور منافقین کہ جو ظاہراً مسلمانوں میں شامل تھے اس سے غلط مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ آیات نازل ہوئیں اور بے مثال قاطعیت کے ساتھ اس حادثے کا مقابلہ کیا۔ ان آیات نے بدزبان منحرفین اور سیاہ دل منافقین کی سازشوں کو بُری طرح سے ناکام بنادیا۔

واضح ہے کہ شانِ نزول کچھ بھی ہو ان آیات کے مفہوم کو زمان و مکان میں منحصر نہیں کیا جاسکتا اور ان کا حکم ہر معاشرے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد اب ہم تفسیر آیات کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ہم دیکھیں کہ قرآن نے کیسی فصاحت و بلاغت سے اس واقعے کو باریکیوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ مسئلہ حل ہوگیا اور سچ جھوٹ میں فرق نمایاں ہوگیا۔

تفسیر

ایک بہت بڑی تہمت

زیرِ نظر پہلی آیت واقعہ بیان کیے بغیر کہتی ہے: جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا وہ تم ہی میں سے تھے (ان الذین جاءوا بالافك عصبة منكم)۔

بلاغت کے فنون میں سے ایک یہ ہے کہ زیادہ جملوں کو حذف کرکے ایسے الفاظ پر اکتفاء کیا جاتا ہے کہ جو ضروری مفہوم پر دلالت کرتے ہوں۔

لفظ "إفك" (بروزن "فکر")، بقولِ راغب ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس کی اصلی و طبیعی حالت بدل جائے۔ مثلاً اپنے اصلی راستے سے ہٹ جانے والی مخالف ہواؤں کو "مؤتفكة" کہتے ہیں۔ بعدازاں حق سے منحرف اور خلافِ واقعہ ہر گفتگو کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اسی لحاظ سے جھوٹ، تہمت اور بہتان کو بھی "افك" کہا جاتا ہے۔

مجمع البیان میں مرحوم علامہ طبرسی نے کہا ہے کہ ہر جھوٹ کو "افک" نہیں کہتے بلکہ ایسے بڑے جھوٹ کو کہتے ہیں کہ جو معاملے کی اصل صورت ہی بدل دے۔ اس لحاظ سے لفظ "افک" بذاتِ خود تہمت کے اس واقعے کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

لفظ "عصبة" (بروزن "غصة") دراصل "عصب" کے مادے سے ان خاص ریشوں اور رگوں کے معنی میں ہے کہ جو انسانی اعضاء کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ مجموعی طور پر انہیں "اعصاب" کہتے ہیں۔ بعدازاں یہ لفظ اس گروہ اور جمعیت کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ

Marfat.com

جس کے افراد باہم متحد و مربوط ہوں، آپس میں ہم فکر بھی ہوں اور ہم کار بھی۔ خصوصیت سے اس لفظ کا استعمال نشاندہی کرتا ہے کہ واقعۂ افک کا منصوبہ بنانے والے باہم بہت قریب اور مربوط تھے اور انہوں نے اس کے لیے بہت مضبوط جال بُنا تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ عموماً دس تا چالیس افراد کے گروہ کے لیے استعمال ہوتا ہے[1]

بہرحال اس جملے کے بعد قرآن اُن مومنین کی دلجوئی کرتا ہے کہ جو ایک پاکدامن شخص پر یہ تہمت لگنے کی وجہ سے شدید ناراحت تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ گمان نہ کرو کہ یہ واقعہ تمہارے لیے بُرا ہے بلکہ یہ تمہارے لیے باعثِ خیر ہے (لا تحسبوہ شرًّا لکم بل ھو خیر لکم)۔ کیونکہ اس واقع نے شکست خوردہ دشمنوں اور کوردل منافقوں کے ارادوں سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اس نے ان بدسیرت خوش نما افراد کو رُسوا کر دیا ہے۔ نیز یہ بات کتنی اچھی ہے کہ ایک امتحان کی وجہ سے وہ لوگ روسیاہ ہو کر سامنے آجائیں کہ جو دل میں کھوٹ رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو یہ لوگ پہچانے ہی نہ جاتے اور آئندہ کبھی زیادہ خطرناک ضرب لگاتے۔

اس واقعے نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ پراپیگنڈا کرنے والے کی پیروی بہت نقصان دہ ہے لہٰذا اُنہیں چاہیے کہ ایسے طرزِ عمل کے خلاف قیام کریں۔

اس واقعے نے ایک درس مسلمانوں کو یہ بھی دیا کہ واقعات کے صرف ظاہر پر نظر نہ رکھیں کیونکہ بعض اوقات ظاہراً اچھے نہ لگنے والے واقعات باطنی طور پر بہت باعثِ خیر ہوتے ہیں۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ "لکم" کی ضمیر استعمال کر کے اس واقعے میں تمام مسلمانوں کو شریک گردانا گیا ہے اور دراصل ہے بھی ایسا ہی کیونکہ معاشرتی اور اجتماعی حوالے سے مسلمان ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ غموں اور خوشیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

اس آیت کے بعد دو نکتوں کی طرف مزید اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جن لوگوں نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے ان میں سے ہر ایک کے لیے جوابدہی اور سزا کا ایک حصہ ہے (لکل امرء منھم ما اکتسب من الاثم)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس گناہ کی ایک بھاری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جو اس کے بانی اور منصوبہ ساز ہیں اور ان کی اس ذمہ داری کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے کے سر کوئی ذمہ داری نہیں آتی بلکہ جو کوئی بھی جس قدر اس کام میں شریک ہے اتنی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے: جس کا اس گناہ میں بڑا حصہ ہے اُس پر عذاب بھی بڑا ہوگا (والذی تولّٰی کبرہ منھم لہ عذاب عظیم)۔

مفسرین نے کہا ہے کہ یہ شخص عبداللہ بن ابی سلول تھا۔ یہ شخص اصحابِ افک کا سرغنہ تھا۔ بعض دیگر مفسرین نے مسطح بن اثاثہ اور حسان بن ثابت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔

بہرحال جو شخص اس واقع کا زیادہ محرک تھا جس نے اس آگ کا پہلا شعلہ بھڑکایا تھا اور ان لوگوں کا لیڈر تھا اُس کا گناہ بڑا ہونے کی مناسبت سے اس کی سزا بھی بہت زیادہ ہے۔ بعید نہیں کہ لفظ تولّٰی یعنی "جو اس کا رہبر بنا" اس واقعے کی رہبری کی طرف

---

[1] تفسیر روح المعانی میں یہ معنی کتاب "صحاح" کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

Marfat.com

اشارہ ہوا۔

اس کے بعد روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف ہے کہ جو اس واقعے میں دھوکے میں آ گئے۔ چند ایک آیات میں ان کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت تم نے یہ تہمت سنی تو مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے بارے میں اچھا گمان کیوں نہیں کیا (لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرًا)۔ یعنی جب تم نے مومن افراد کے بارے میں منافقین کی باتیں سنیں تو دوسرے مومنین کے بارے میں حسن ظن سے کام کیوں نہ لیا کہ جو تمہارے لیے خود تمہی جیسے ہیں۔

اور کیوں نہیں کہا کہ یہ ایک بڑا اور سفید جھوٹ ہے (و قالوا ھٰذا افك مبین)۔ جبکہ تم تو ان منافقین کا بڑا اور رسوا کن ماضی جانتے تھے اور تم تو ان افراد کی پاک دامنی سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ جن پر بہتان لگایا جا رہا تھا۔ مخلف قرآن کی بنا پر تمہیں تو اطمینان تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے تم تو ان سازشوں سے واقف تھے کہ جو دشمن پیغمبر اکرمؐ کے خلاف کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس قسم کا جھوٹا پراپیگنڈا اس کر تمہارا خاموش رہنا لائق ملامت ہے۔ اس طرح تو تم شعوری یا لاشعوری طور پر اس الزام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن گئے ہو

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ آیت نے یہ نہیں کہ جس پر تہمت لگائی گئی تھی تمہیں اس کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہیے تھا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہیں اپنے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین کا وجود ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے اور سب کے سب گویا ایک ہی وجود ہیں۔ اگر کسی ایک پر تہمت لگے تو گویا سب پر لگی ہے اور اگر کسی ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو باقی حصے قرار سے نہیں رہ سکتے اور جس طرح کسی ایک شخص پر تہمت لگے تو وہ اس کے دفاع کی کوشش کرتا ہے اسی طرح اُس کے دینی بھائی بہنوں کو بھی اس کا دفاع کرنا چاہیے۔[1]

قرآن نے ایسے دیگر مواقع پر بھی لفظ "انفس" استعمال کیا ہے۔ سورہ حجرات کی آیت ۱۱ میں ہے:

و لا تلمزوا انفسکم

اپنے آپ کی غیبت نہ کرو۔

نیز یہ جو باایمان مردوں اور عورتوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان ایک ایسی صفت ہے کہ جو بدگمانیوں کو روک سکتی ہے۔

یہاں تک تو اخلاقی اور روحانی پہلو سے سرزنش کی گئی تھی اور متوجہ کیا گیا تھا کہ کسی لحاظ سے بھی مناسب نہ تھا کہ ایسی بُری تہمت پر مومنین خاموش رہتے یا کور دل سازشیوں کے آلۂ کار بنتے۔ اس کے بعد فیصلے اور حکم کا مرحلہ آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہ انہیں چار گواہ پیش کرنے کے لیے کیوں نہ کہا گیا (لولا جاءو علیه باربعة شھدا ء)۔

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور تقدیر یوں تھی:

ظن المؤمنون والمؤمنات بانفس بعضھم خیرًا

مومن مرد اور عورتیں اپنے بعض افراد کے بارے میں اچھا گمان کریں۔

یہ احتمال معقول معلوم نہیں ہوتا اور اس سے تو کلام کی لطافت و بلاغت ہی جاتی رہتی ہے۔

Marfat.com

اب جبکہ وہ گواہ پیش نہیں کر سکے تو اللہ کے نزدیک وہ جھوٹے ہیں۔ (فاذلم یأتوا بالشهداء فاولئك عند الله هم الكاذبون)۔

اس مواخذہ اور سرزنش سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار گواہوں کی شہادت اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں حدِ قذف کا حکم آیات افک سے پہلے نازل ہو چکا تھا۔

رہا یہ سوال کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حد جاری کیوں نہ کی، تو اس کا جواب واضح ہے کہ جب تک لوگ ساتھ نہ دیں اس طرح کا اقدام ممکن نہیں کیونکہ بعض اوقات قبائلی تعصب آڑے آ جاتا ہے اور بعض احکام وقتی طور پر ہی سہی نافذ نہیں ہو پاتے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس واقعے میں بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔

آخر میں مجموعی طور پر فرمایا گیا ہے: اگر اللہ کا فضل اور رحمت دنیا و آخرت میں تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تمہیں اس کام کے باعث کہ جس میں تم داخل ہو گئے تھے عذابِ عظیم دامن گیر ہوتا (ولولا فضل الله عليكم ورحمته في الدنيا والآخرة لمسكم فيما افضتم فيه عذاب عظيم)۔

"افضتم" "افاضة" کے مادہ سے زیادہ پانی نکلنے کے معنی میں ہے نیز کبھی یہ لفظ پانی میں داخل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اس تعبیر سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ مذکورہ تہمت کی شہرت اس قدر ہو گئی تھی کہ گویا مومنین اس کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

اگلی آیت درحقیقت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ وہ اتنے بڑے گناہ میں کیسے سادگی کے ساتھ اور آرام سے جا پڑے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو کہ جب تم اس بڑے جھوٹ کے استقبال کے لیے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کی زبان سے یہ پراپیگنڈا اڑائے لیے جا رہے تھے (اذ تلقونه بالسنتكم)۔ اور اپنے منہ سے تم ایسی باتیں کرتے تھے کہ جن کے بارے میں تمہیں علم و یقین نہ تھا (و تقولون بافواهكم ماليس لكم به علم)۔ اور تمہیں یہ گمان تھا کہ یہ معمولی سا معاملہ ہے حالانکہ خدا کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے (و تحسبونه هينا و هو عند الله عظيم)۔

آیت دراصل ان کے تین عظیم گناہوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

پہلا۔ اس پراپیگنڈا کا استقبال کرنا اور اسے ایک دوسرے کی زبان سے لینا۔ (پراپیگنڈا کو قبول کرنا)۔

دوسرا۔ اس پراپیگنڈا کو ہوا دینا جبکہ وہ اس کے بارے میں علم و یقین نہ رکھتے تھے اور اسے دوسروں تک پہنچانا (پراپیگنڈا کی کسی تحقیق کے بغیر تشہیر کرنا)۔

تیسرا۔ اس عمل کو معمولی سمجھنا حالانکہ اس کا تعلق نہ فقط دو مسلمانوں کی عزت و آبرو اور مقام و منزلت سے تھا بلکہ اس کی زد اسلامی معاشرے کی حیثیت و آبرو پر بھی پڑتی تھی (پراپیگنڈا کو معمولی سمجھنا اور اسے شغل کے طور پر لینا)۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس موقع پر لفظ "بالسنتكم" (تمہاری زبانیں) اور بافواهكم (تمہارے منہ) استعمال کیے گئے ہیں جبکہ تمام باتیں زبان اور منہ ہی سے کی جاتی ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تم نے اس پراپیگنڈا کو قبول کرنے میں دلیل کا مطالبہ کیا اور نہ پھیلانے میں دلیل کا سہارا لیا۔ زبان اور منہ کی ہوائی باتوں کو ہی تم اڑاتے رہے۔

یہ واقعہ بہت اہم تھا مگر بعض مسلمانوں نے اسے معمولی سمجھ لیا تھا۔ اس لیے ایک مرتبہ پھر انہیں سرزنش کا زوردار تازیانہ لگایا گیا

Marfat.com

ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب تم نے اتنا بڑا جھوٹ سُنا تو یہ کیوں نہیں کہا کہ ہمیں اجازت نہیں ہے کہ ہم اس کے بارے میں گفتگو کریں (کیونکہ یہ ایک بے دلیل تہمت ہے) اے پروردگار! تو پاک ہے، یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے (ولو لا اذ سمعتموہ قلتم ما یکون لنا ان نتکلم بھذا سبحانک ھذا بھتان عظیم)۔

درحقیقت پہلے تو انہیں اس لیے ملامت کی گئی تھی کہ جن پر تہمت لگائی گئی تھی انہیں حسن ظن کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھا لیکن اب فرمایا گیا ہے حسنِ ظن کے علاوہ تمہیں نہیں چاہیے تھا کہ اس تہمت کے بارے میں لب کشائی کرتے چہ جائیکہ تم اس کی تشہیر کرنے لگ جاؤ۔ چاہیے تھا کہ اتنی بڑی تہمت پر تم تعجب کرتے اور پروردگار کی پاکیزگی کو یاد کرتے اور ایسی تہمت کی تشہیر کی آلودگی سے خدا کی پناہ چاہتے۔ مگر افسوس کہ تم بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ اس کے فریب سے گزر گئے اور بغیر سوچے سمجھے پراپیگنڈا باز منافقین کے آلۂ کار بن گئے۔

تہمت بازی کے گناہ کی اہمیت، اس کے اسباب اس کے سدِباب کے طریقے کے بارے میں اور اسی طرح کے دیگر موضوعات پر ہم انشاء اللہ آئندہ آیات کے ذیل میں بات کریں گے۔

Marfat.com

۱۷۔ یَعِظُکُمُ اللّٰہُ اَنۡ تَعُوۡدُوۡا لِمِثۡلِہٖۤ اَبَدًا اِنۡ کُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِیۡنَ ۚ○
۱۸۔ وَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ○
۱۹۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ
وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○
۲۰۔ وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ وَ اَنَّ اللّٰہَ
رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ○

ترجمہ

۱۷۔ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو ہرگز ایسے کام کا تکرار نہ کرنا۔

۱۸۔ اور اللہ اپنی آیتیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

۱۹۔ جو لوگ اہل ایمان میں برائیوں کی اشاعت چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

۲۰۔ اور اگر اللہ کا فضل و رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتا اور یہ خدا مہربان اور رحیم (اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہیں سخت سزا دیتا)۔

تفسیر

برائیوں کی اشاعت ممنوع ہے: زیر نظر آیات میں پھر واقعۂ افک کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ ان

Marfat.com

میں غلط پراپیگنڈا کرنے اور نیک افراد پر خلافِ ناموس تہمت لگانے کے برے اور سنگین انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ قرآن متعدد بار ضروری سمجھتا ہے کہ مختلف مؤثر طریقوں سے اس مسئلے کا جائزہ لے اور اس کے بارے میں ایسی سخت بازپرس کرے اور محکم طریقے سے بات کرے کہ آئندہ مسلمانوں کے معاشرے میں ایسے کام کا تکرار نہ ہو۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر (خدا اور روزِ جزا پر) ایمان رکھتے ہو تو ایسے کام کا ہرگز تکرار نہ کرنا (یعظکم اللہ ان تعودوا لمثلہ ابدًا ان کنتم مؤمنین) [1]

یعنی ایمان کی نشانی یہ ہے کہ انسان بڑے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے اور اگر کوئی بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ بے ایمانی کی نشانی ہے یا پھر کمزور ایمان کی۔ یہ جملہ درحقیقت توبہ کے ایک پہلو اور حصے کی نشاندہی کر رہا ہے کیونکہ گزشتہ گناہ پر پشیمانی ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ آئندہ گناہ کا تکرار نہ کرنے کا پختہ عزم کیا جائے تاکہ توبہ ہمہ گیر ہو جائے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے، یہ باتیں معمولی نہیں ہیں بلکہ تمہاری سرنوشت کے لیے حقائق ہیں کہ جو بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ تم سے بیان کیے گئے ہیں اور یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہیں (و یبین اللہ لکم الاٰیات واللہ علیم حکیم)۔ وہ اپنے علم و آگاہی کی بناء پر تمہارے اعمال کی تمام تفصیلات سے باخبر ہے یا دوسرے لفظوں میں اپنے علم کے مطابق وہ تمہاری احتیاجات اور تمہارے خیر و شر کے عوامل سے آگاہ ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اپنے احکام کو ان سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

اس کے بعد بات کا رُخ کچھ تبدیل کیا گیا ہے۔ اب ایک شخصی واقعے سے آگے بڑھ کر ایک عمومی اور جامع قانون کی صورت میں بات کی گئی ہے تاکہ مسئلے پر کچھ اور زور دیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے، جو لوگ اہلِ ایمان میں برائیاں شائع کرنا پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے (ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین اٰمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاٰخرۃ)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا کہ جو لوگ برائیوں کو شائع کریں بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ایسا کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ جملہ درحقیقت اس سلسلے میں انتہائی تاکید کا غماز ہے۔

کہیں یہ تصور نہ کیا جائے کہ یہ تاکید اس بنا پر ہے کہ تہمت زوجۂ رسولؐ یا اس پائے کی کسی شخصیت پر لگائی گئی تھی بلکہ کسی بھی باایمان شخص کے بارے میں ایسا معاملہ درپیش ہو یہ تاکید اس کے بارے میں صادق آئے گی کیونکہ یہ مسئلہ شخصی یا انفرادی پہلو نہیں رکھتا اگرچہ ممکن ہے کہ کسی موقع کی مناسبت سے اس میں دوسرے پہلوؤں کا بھی اضافہ ہو جائے۔

ضمناً توجہ رہے کہ فحشاء اور برائیوں کی اشاعت فقط یہی نہیں باایمان مرد یا عورت پر لگائی گئی جھوٹی تہمت کی تشہیر کی

---

[1] اس جملے کا درحقیقت ایک لفظ مقدر ہے اور وہ ہے "لا" جملہ یوں ہوگا

یعظکم اللہ ان لا تعودوا لمثلہ ابدًا

او اگر یہ لفظ مقدر نہ مانیں تو پھر "یعظکم" کا لفظ "ینھاکم" کے معنی میں ہونا چاہیئے خدا تمہیں ایسے کام کے تکرار سے منع کرتا ہے۔

Marfat.com

جائے اور ان پر بدکاری کا الزام لگایا جائے۔ یہ تو اس کا ایک مصداق ہے۔ بلکہ یہ تعبیر تو بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے اور اس میں ہر قسم کی برائیوں اور گناہوں کی ترویج و اشاعت اور اس میں مدد دینا شامل ہے۔ البتہ قرآن مجید میں عموماً لفظ "فحشاء" یا "فاحشہ" جنسی انحرافات اور بدکاریوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے لغوی مفہوم کے اعتبار سے "فحش" "فحشاء" اور "فاحشہ" ہر ایسے کام کو کہتے ہیں کہ جس میں بہت زیادہ برائی اور قباحت پائی جائے۔ کبھی کبھار قرآن مجید میں بھی یہ لفظ وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش

جو لوگ گناہانِ کبیرہ اور قبیح اعمال سے بچتے ہیں۔ (شوریٰ - ۳۷)

اس سے زیر بحث آیت کے مفہوم کی وسعت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ دنیا میں بھی ان کے لیے المناک عذاب ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے اس سے شرعی حدود و تعزیرات، معاشرتی ردعمل اور انفرادی سطح پر برے نتائج مراد ہوں اور یہ ان اعمال کے وہ نتائج ہیں کہ جو ارتکاب کرنے والوں کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے لوگ حقِ شہادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور رسوائی الگ ہوتی ہے۔

رہا آخرت کا دردناک عذاب ــــ تو وہ رحمتِ خدا سے دُوری، غضبِ الٰہی اور آتشِ جہنم ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور خدا جانتا ہے جبکہ تم نہیں جانتے (واللہ یعلم وانتم لا تعلمون)۔

اللہ تعالیٰ ــــ برائیوں کی اشاعت کے منحوس نتائج اور دنیا و آخرت میں اس کے ہولناک انجام سے اچھی طرح آگاہ ہے لیکن تم اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے باخبر نہیں ہو۔

وہ جانتا ہے کہ اس گناہ کی چاہت کن لوگوں کے دل میں ہے ــــ جو لوگ پُرفریب ناموں کے پس پردہ یہ بُرے عمل انجام دیتے ہیں وہ انہیں پہچانتا ہے لیکن تم نہ جانتے ہو اور نہ پہچانتے ہو اور وہ جانتا ہے کہ ان بُرے اور قبیح کاموں کو روکنے کے لیے کس طرح کے احکام نازل کرے۔ واقعہ افک، اشاعتِ فحشاء سے ممانعت اور پاکدامن اہل ایمان پر تہمت بازی سے روکنے کے سلسلے کی آخری آیت میں ایک بار پھر تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اگر فضل و رحمتِ الٰہی تمہارے شامل حال نہ ہوتی اور اللہ تم پر رحیم و مہربان نہ ہوتا تو تمہیں اسی دنیا میں ایسی دردناک سزا دیتا کہ جس سے تمہاری زندگی تاریک اور برباد ہو کر رہ جاتی (ولو لا فضل اللہ علیکم ورحمتہ وان اللہ رءوف رحیم)[1]

---

[1] اس جملے کی نظیر گزشتہ آیات میں بھی ہے۔ اس میں ایک محذوف ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے:

لولا فضل اللہ علیکم ۔۔۔۔ لمسکم فیما افضتم فیہ عذاب عظیم ٥

اگر فضل و رحمت الٰہی تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو جس راہ میں تم چل نکلے ہو اس پر تمہیں عذابِ عظیم آ پکڑتا۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ "فحشاء" کی اشاعت سے کیا مراد ہے؟: انسان کے معاشرتی وجود ہے۔ یہ معاشرہ انسان کے لیے ایک طرح سے اس کے گھر کی مانند ہے۔ اس کی حُرمت اور احترام اس کے اپنے گھر کی حُرمت اور احترام کی طرح ہے۔ معاشرے کی پاکیزگی اس کی اپنی پاکیزگی کے لیے مددگار ہے اور معاشرے کی آلودگی اس کی اپنی آلودگی کی طرح ہے۔ اس اصول کی وجہ سے اسلام نے ہر اس کام کی شدید مخالفت کی ہے کہ جو معاشرے کو غلیظ یا زہر آلود کرنے کا سبب بنے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے غیبت کی شدید مخالفت کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غیبت چھپے ہوئے عیوب کو آشکار کرتی ہے اور اس سے معاشرے کا احترام مجروح ہوتا ہے۔ عیب پوشی کے حکم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ گناہ معاشرے میں نہ پھیل جائے۔ اسلام کے احکام کی نظر میں کھلے بندوں گناہ کی اہمیت مخفی گناہ سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے فرمایا:

المذیع بالسیئة مخذول والمستتر بالسیئة مغفور لہ

جو شخص گناہ کی تشہیر کرے وہ مردود ہے اور جو گناہ کو مخفی رکھے اس کے لیے اللہ کی مغفرت ہے۔[۱]

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ زیر بحث آیات میں برائیوں کو پھیلانے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور اس عمل پر شدید ڈانٹ ڈپٹ کی گئی ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔

اصولی طور پر گناہ آگ کی مانند ہے۔ اگر معاشرے میں کسی جگہ یہ بھڑک اُٹھے تو اسے بجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے یا کم از کم یہ کوشش برتی چاہیئے کہ یہ پھیلنے نہ پائے ورنہ یہ ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے، اور پھر اس پر کنٹرول کرنا کسی کے بس میں نہیں رہے گا۔ اگر لوگوں کی نظر میں گناہ ایک بڑی چیز ہو تو یہ امر بذاتِ خود گناہوں کے راستے میں ایک بڑی دیوار کی مانند ہے لیکن گناہوں اور برائیوں کی نشر و اشاعت اس دیوار کو گرا دیتی ہے اور لوگ گناہوں کو معمولی سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من اذاع فاحشة كان كمبتدئها

بُرے کام کی تشہیر کرنے والا اس کی ابتداء کرنے والے کے برابر ہے۔[۲]

ایک اور روایت میں ہے کہ:

ایک شخص امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی خدمت میں آیا۔ اُس نے عرض کیا: میں آپ پر قربان، لوگ میرے ایک دینی بھائی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اُس نے ایک ایسا کام انجام دیا ہے کہ جسے میں ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے خود اُس سے پوچھا تو اس نے انکار کیا جبکہ متعدد موثق افراد نے اُس

۱۔ اصول کافی، ج ۲، باب ستر الذنوب

۲۔ 〃 〃 باب التعبیر

Marfat.com

کے بارے میں یہ بات بتائی ہے، میرے لیے کیا حکم ہے؟

امام[ع] نے فرمایا:

كذب سمعك وبصرك عن اخيك و ان شهد عندك خمسون قسامه و قال لك قول فصدقه وكذبهم، ولا تذيعن عليه شيئًا تشينه به و تهدم به مروته، فتكون من الذين قال الله عزوجل ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة في الذين اٰمنوا لهم عذاب اليم في الدنيا و الاٰخرة.

اپنے مومن اور مسلمان بھائی کے مقابلے میں اپنے کان اور آنکھ کو جھٹلا دو۔ یہاں تک کہ اگر پچاس آدمی بھی آکر قسم کھا کر کہیں اُس نے فلاں کام کیا ہے جبکہ وہ کہے کہ میں نے نہیں کیا تو اس بھائی کی تصدیق کرو اور اُن کی بات ہرگز قبول نہ کرو۔ جو چیز ننگ و رسوائی کا باعث ہو اور اس کی شخصیت کو ختم کر دے اسے معاشرے میں نہ پھیلاؤ ورنہ تم اُن لوگوں میں سے شمار ہو گے کہ جن کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

جو لوگ مومنین کی برائیاں معاشرے میں پھیلانا پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے[1] [2]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ برائیوں کے پھیلاؤ کی مختلف صورتیں ہیں۔

- کبھی جھوٹ اور بہتان کو ہوا دی جاتی ہے اور ہر کسی کو بتایا جاتا ہے۔
- کبھی ایسے مراکز کی بنیاد رکھی جاتی ہے کہ جو برائیاں پھیلنے کا سبب بنتے ہیں۔
- کبھی گناہ کے اسباب فراہم کر کے یا لوگوں کو ترغیب دے کر گناہ پھیلایا جاتا ہے۔
- کبھی بے شرمی اور بے حیائی عام کر کے اور برسرِ عام ارتکابِ گناہ کر کے بُرائی پھیلائی جاتی ہے۔

یہ سب برائیاں پھیلانے کے طریقے ہیں اور اشاعتِ فحشاء کے مصداق ہیں کیونکہ اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۲۔ غلط پراپیگنڈا ـــــــ ایک بلا: سازشی عناصر کا نفسیاتی جنگ کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ وہ جعلی باتیں گھڑتے ہیں اور پھر اُن کا خوب پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ جو لوگ سامنے آکے مقابلے کی ہمت نہ رکھتے ہوں تو یہ ہتھکنڈا اختیار کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کی فکر کو مسموم کرتے ہیں۔ انہیں اپنی طرف مشغول رکھنے کے لیے پراپیگنڈا کا سہارا لیتے ہیں اور لوگوں کی توجہ حساس اور ضروری

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۵۸۲ بحوالہ کتاب ثواب الاعمال۔

[2] اس مسئلے کے کچھ استثنائی پہلو بھی ہیں۔ مثلاً عدالت میں شہادت دینا یا ایسے مواقع کہ جہاں نہی عن المنکر کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہ جائے کہ کسی شخص کا بُرا کام فاش کر دیا جائے۔

Marfat.com

مسائل سے ہٹا دیتے ہیں۔
نیک اور پاک لوگوں کی عزت و وقار کو مجروح کرنے اور عوام کو اُن سے دُور کرنے کے لیے پراپیگنڈا اور کردار کشی ایک تباہ کن ہتھیار ہے۔
زیر بحث آیات کی مشہور شان نزول کے مطابق منافقین نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت و وقار کو داغدار کرنے کے جعلی پراپیگنڈا کا بزدلانہ طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے کسی موقع سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کی ایک زوجہ کی پاکدامنی کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس سے ایک اچھی خاصی مدت تک مسلمانوں کے اذہان پریشان رہے۔ یہاں تک کہ ثابت قدم اور سچے مومنین بھی سخت اذیت میں تھے۔ پھر خدا کی وحی ان کی مدد کے لیے آئی اور ایسا پراپیگنڈا کرنے والے منافقوں کی خوب خبر لی کہ جو سب کے لیے باعثِ عبرت بن گئی۔
جن معاشروں میں سیاسی گھٹن ہو وہاں پراپیگنڈا کا ہتھیار بہت مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں سے انتقام لینے، کردار کشی کرنے، اعتماد کی فضا خراب کرنے اور بنیادی مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے پراپیگنڈا کا سہارا لیا جاتا ہے۔
یہ بات کافی نہیں کہ ہم ایسے پراپیگنڈا کے محرکات سے آگاہ ہوں بلکہ اہم تر یہ ہے کہ عوام کو ایسا پراپیگنڈا کرنے والوں کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے اور انہیں اپنے ہاتھوں اپنی نابودی سے روکا جائے اور انہیں سمجھایا جائے کہ ایسی بات جہاں سُنیں وہیں دفن کر دیں ورنہ دشمن کی خوشنودی اور کامیابی کا باعث بن جائیں گے اور اس کے علاوہ دنیا و آخرت میں عذابِ الیم کا مزہ بھی چکھنا ہوگا جیسا کہ زیر بحث آیات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔
۳۔ گناہ کو معمولی سمجھنا: زیر بحث آیات میں جہاں برائیاں پھیلانے جیسے گناہ کی مذمت کی گئی ہے وہاں اس گناہ کو معمولی سمجھنے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ واقعاً گناہ کو معمولی اور چھوٹا سمجھنا بذاتِ خود ایک گناہ ہے۔ جو شخص گناہ کرتا ہے۔ پھر اُسے یہ خیال ستاتا ہے کہ اس سے بہت برا کام ہو گیا اور وہ اپنے کام پر ناراحت ہوتا ہے۔ ایسا شخص ہی توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن جو شخص اپنے گناہ کو معمولی سمجھتا ہے اور اسے اہمیت نہیں دیتا یہاں تک کہ کہہ گزرتا ہے: کیا ہوا اگر میں نے یہ گناہ کیا ہے؟
اس شخص نے بہت خطرناک راستہ اختیار کر لیا ہے اور اس خیال کے باعث وہ گویا مسلسل گناہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ اسی بناء پر ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اشد الذنوب ما استهان به صاحبه

سب سے بڑا گناہ وہ ہے کہ جسے انجام دینے والا معمولی سمجھے[1]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۳۴۸

Marfat.com

۲۱۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ
وَمَنْ یَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ فَاِنَّہٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ
وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَا
زَکٰی مِنْکُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ
یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○
۲۲۔ وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَۃِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی
الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۪ۖ وَ
لْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ ؕ
وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○
۲۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ
لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۪ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۙ○
۲۴۔ یَّوْمَ تَشْھَدُ عَلَیْھِمْ اَلْسِنَتُھُمْ وَاَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ
بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○
۲۵۔ یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْھِمُ اللّٰہُ دِیْنَھُمُ الْحَقَّ وَیَعْلَمُوْنَ
اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ ○

ترجمہ

۲۱۔ اے ایمان والو! شیطان کی پیروی نہ کرو۔ جو شخص شیطان کے نقشِ قدم پر چلتا ہے (وہ اُسے

Marfat.com

گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ) وہ اسے بدکاری اور بُرائی کا حکم دیتا ہے۔ اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی ہرگز پاک نہ ہوتا لیکن اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۲۔ جو لوگ (مالی) برتری اور وسعت رکھتے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھالیں کہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور راہِ خدا کے مہاجروں کی مدد نہ کریں گے۔ ان سے درگزر اور صرفِ نظر کرنا چاہیے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم سے درگزر کرے اور اللہ تو غفور و رحیم ہے۔

۲۳۔ جو لوگ پاکدامن اور (ہر قسم کے گناہ سے) بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں رحمتِ الٰہی سے دُور ہیں اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے۔

۲۴۔ اُس روز کہ جب ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے ان اعمال کے باعث ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

۲۵۔ اس روز اللہ ان کی وہ سزا انہیں بے کم و کاست دے گا کہ جس کے وہ مستحق ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ حقِ مبین ہے۔

تفسیر

جزا و سزا احساب و استحقاق کے مطابق ہوگی

صراحتاً تو یہ آیات واقعۂ افک کے بارے میں نہیں ہیں تاہم انہیں اسی بحث کا تتمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں تمام مومنین کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ بعض اوقات شیطانی افکار و اعمال تدریجی طور پر غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوجاتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں ان پر کنٹرول نہ کیا جائے تو پھر انسان اس وقت متوجہ ہوتا ہے جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب گناہوں اور بدکاریوں کے وسوسوں کی ابتداء ہی ہو تو اُن کا مقابلہ کرنا چاہیے تاکہ وہ وسعت اختیار نہ کرجائیں۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں روئے سخن مومنین کی طرف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے والے ایمان لانے والو! شیطان کے نقشِ قدم پر مت

Marfat.com

چلو کر جو کوئی بھی اس کی پیروی کرے گا وہ گمراہی، بدکاری اور نافرمانی کی طرف کھنچتا چلا جائے گا کیونکہ شیطان بدکاری و برائی کی دعوت دیتا ہے (یاایھا الذین اٰمنوا لا تتبعوا خطوات الشیطان ومن یتبع خطوات الشیطان فانہ یأمر بالفحشاء والمنکر)[1]

"شیطان" اپنے وسیع ترمعنی میں سرموذی، تباہ کار، ویران گر اور ضرر رساں وجود کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں اس لفظ کو اگر اس معنی میں لیا جائے تو پوری زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے اس تنبیہ کی وسعت واضح ہو جائے گی۔ ایک پاکباز مومن کبھی بھی یک دم برائی کی آغوش میں نہیں جا پڑتا بلکہ قدم بقدم جاتا ہے ۔ مثلاً

پہلا قدم آلودۂ گناہ افراد سے ملنا جلنا اور ان سے دوستی۔

دوسرا قدم ان کی محفلوں میں شرکت۔

تیسرا قدم گناہ کے بارے میں سوچنے لگنا۔

چوتھا قدم مشکوک و مشتبہ کام کرنے لگنا۔

پانچواں قدم گناہانِ صغیرہ کا ارتکاب۔

اور آخرکار بدترین گناہوں کا ارتکاب۔

بالکل ایسے جیسے انسان اپنی باگ ڈور کسی گناہ گار مجرم کے حوالے کر دے جو قدم بقدم اسے ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے تاکہ انسان اس میں گر کر فنا ہو جائے ۔ جی ہاں! یہ ہیں "خطوت الشیطان"[2]

اس کے بعد راہ ہدایت کی طرف انسانوں کی رہبری کی عظیم نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر فضل و رحمتِ الٰہی تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہوتا مگر اللہ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور خدا تو سننے والا اور جاننے والا ہے (ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ ما زکی منکم من احد ابدًا ولکن اللہ یزکی من یشاء واللہ سمیع علیم)۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کا فضل و رحمت ہی ہے کہ جو انسانوں کی برائیوں، انحرافوں اور گناہوں سے نجات کا سبب ہے۔ کیونکہ ایک تو اُس نے انسان کو نعمتِ عقل سے نوازا ہے اور پھر رسول بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ یہ احکام بھی بطریق وحی نازل فرمائے ہیں علاوہ ازیں اُس کی خاص توفیقات اور غیبی امداد بھی ہے کہ جو اہل اور مستحق انسانوں کے شامل حال ہوتی ہے ۔ یہ سب پاکیزگی اور تزکیہ کے نہایت اہم عامل ہیں۔

---

[1] "ومن یتبع خطوات الشیطان فانہ یأمر بالفحشاء" یہ جملہ درحقیقت محذوف رکھتا ہے (جزائے شرط) اور اس کی تقدیر یوں ہے:

(ومن یتبع خطوات الشیطان ارتکب الفحشاء والمنکر فانہ یأمر بھما

جو شخص بھی شیطان کی پیروی کرے گا وہ بدکاریوں اور برائیوں کا مرتکب ہوگا کیونکہ وہ انہی چیزوں کا حکم دیتا ہے

(روح المعانی، ج ۱۸، ص ۱۱۳، زیر بحث آیات کے ذیل میں)

توجہ رہے کہ "فانہ یامر بالفحشاء والمنکر" جزائے شرط نہیں ہو سکتا۔

[2] "فحشاء" اور "منکر" کے درمیان فرق کے سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی گیارہویں جلد میں سورہ نحل کی آیت ۹۰ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

جیسا کہ ہم نے بار ہا کہا ہے "من یشاء" کا مطلب بلاوجہ اور بے بنیاد ارادہ نہیں ہے بلکہ جب تک بندوں کی طرف سے کوشش نہ ہو تب تک اللہ کی طرف سے ہدایت و نعمت صورت پذیر نہیں ہوتی۔ جو شخص اس راہ کا طالب ہوتا ہے، اس راستے پر قدم رکھتا ہے اور جہاد کرتا ہے اللہ بھی اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے، اسے شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ــ اللہ کا فضل و رحمت کبھی تشریعی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی تکوینی صورت میں۔ تشریعی صورت میں اس طرح سے کہ وہ انبیاء کو مبعوث کرتا ہے، آسمانی کتابیں نازل کرتا ہے، احکام بیان کرتا ہے اور انذار و بشارت کی حکمت اختیار کرتا ہے جبکہ روحانی اور غیبی امداد اس کے فضل و رحمت کا تکوینی طریقہ ہے۔

"من یشاء" سے یوں لگتا ہے کہ زیرِ بحث آیات کا اشارہ دوسرے طریقے کی طرف ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "زکوٰۃ" اور "تزکیۃ" دراصل نشوونما پانے کے معنی میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ پاک ہونے اور پاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے دونوں معانی کی بازگشت ایک ہی بنیادی مفہوم کی طرف ہو کیونکہ جب تک کوئی چیز موانع، رکاوٹوں، رذائل اور خرابیوں سے پاک نہیں ہوتی اس کے لیے نشوونما اور رشد و ارتقاء ممکن ہی نہیں۔

بعض مفسرین نے زیرِ بحث دوسری آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے کہ جس سے اس آیت کا گزشتہ آیات سے تعلق واضح ہوتا ہے۔ مذکورہ شانِ نزول کچھ یوں ہے:

> یہ آیت چند صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جنہوں نے واقعۂ افک کے بعد قسم کھائی تھی کہ جو لوگ اس واقع میں ملوث تھے اور اس عظیم تہمت کو پھیلانے میں سرگرم تھے ان میں سے کسی کی مالی امداد نہیں کریں گے۔ اور ان میں سے کسی سے ہمدردی نہ کریں گے۔
>
> اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اس شدتِ عمل سے سختی سے روک دیا گیا اور عفو و درگزر کا حکم دیا گیا۔

یہ شانِ نزول قرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس اور ضحاک کے حوالے سے نقل کی ہے نیز مرحوم طبرسی نے اسے ابن عباس اور دیگر افراد سے نقل کیا ہے اور یہ شانِ نزول عمومی پہلو رکھتی ہے۔ لیکن کچھ اہلِ سنت مفسرین کا اصرار ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ واقعہ افک کے بعد انہوں نے مسطح بن اثاثہ کی مالی امداد بند کر دی تھی۔ مسطح ان کی خالہ یا بہن کا بیٹا تھا۔ لیکن آیت میں تمام جمع کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ جمع کے یہ صیغے نشان دہی کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے اس واقعے کے بعد اس واقعے کے مجرمین کی مالی امداد بند کر دی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے انہیں اس کام سے منع کیا۔ بہرحال ہم جانتے ہیں کہ آیاتِ قرآن شانِ نزول ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان کا دامن وسیع ہے اور ان کا یہ پیغام قیامت تک کے مومنین کے لیے ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے مواقع پر احساسات و جذبات کی اس شدت میں گرفتار نہ ہوں اور گنہ گاروں کی لغزشوں اور غلطیوں پر ایسے سخت فیصلے نہ کریں۔

اس شانِ نزول کی طرف توجہ کے ساتھ ساتھ ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں:

قرآن کہتا ہے: جو لوگ مالی لحاظ سے خوشحال ہیں وہ یہ قسم نہ کھالیں (اور یہ فیصلہ نہ کریں) کہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور

Marfat.com

راہِ خدا کے مہاجروں کی امداد نہیں کریں گے (ولا یأتل اولوا الفضل منکم والسعة ان یؤتوا اولی القربی والمساکین و المهاجرین فی سبیل الله)

اس آیت کے الفاظ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس واقعے میں ملوث بعض افراد راہِ خدا میں ہجرت کرنے والے بھی تھے کہ جو منافقین کے دھوکے میں آگئے اور ان کے سابقہ کارنامے کی وجہ سے اللہ نے اجازت نہ دی کہ انہیں اسلامی معاشرے سے دھتکار دیا جائے اور ان کے استحقاق سے بڑھ کر اُن کے خلاف فیصلہ کیا جائے۔

ضمناً لفظ "یأتل" "الیة" (بروزن "عطیه") کے مادے سے قسم کھانے کے معنی میں ہے یا پھر "الو" (بروزن "دلو") کے مادے سے کوتاہی کرنے اور ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا پہلے معنی کے اعتبار سے اس آیت میں ایسی امداد روکنے کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے [1]

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس عمل میں کوتاہی اور اسے ترک کرنے سے ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو ایسے نیک کام جاری رکھنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہیں معاف کر دینا چاہیئے اور چشم پوشی کرنا چاہیے (ولیعفوا ولیصفحوا)۔

کیا تمہیں پسند نہیں کہ اللہ تم سے درگزر کرے۔ (الا تحبون ان یغفر الله لکم)۔

تو جیسے تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہاری لغزشیں معاف کرے ایسے ہی دوسروں کی کوتاہیوں سے بھی صرفِ نظر کر لیا کرو۔

اور اللہ تو غفور و رحیم ہے (والله غفور رحیم)۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ایسے تند و تیز لہجے میں واقعہ افک کے ذمہ داروں کی مذمت کی گئی ہے جبکہ دوسری طرف افراط پسند افراد کو حد سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور ایسے تین جملوں کے ذریعے ان کے احساسات و جذبات کو کنٹرول کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے وسیع تر اور جاذب تر ہے۔

پہلے عفو و درگزر کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ کیا تم خود نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے پس تم بھی بخش دو۔

اور آخر میں اللہ کی دو صفات غفور و رحیم کا ذکر کرکے تاکید مزید کی گئی ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حکم خدا سے بڑھ کر تمہاری تپش نہیں ہو سکتی۔ اللہ کہ جو اس حکم کا اصلی مالک ہے وہ غفور و رحیم ہے۔ وہ حکم دیتا ہے کہ امداد نہ روکو۔ اب تم کیا کہتے ہو۔

اس میں شک نہیں کہ جو مسلمان واقعۂ افک میں ملوث ہو گئے تھے وہ تمام اس کی سازش میں شریک نہ تھے صرف چند مسلمان نما منافقین اس کے بانی تھے اور زیادہ تر مسلمان ان کے دھوکے میں آکر ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب

---

[1] اس صورت میں لفظ "لا" "کو" "یؤتوا" سے مقدر ماننا جائے گا اور تقدیر یوں ہوگی: ولا یأتل.... ان لا یؤتوا

Marfat.com

ذمہ دار اور گنہ گار تھے تاہم ان دونوں گروہوں کے درمیان بہت فرق تھا۔ لہٰذا سب سے ایک جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال ان آیات میں آج اور کل کے مسلمانوں کے لیے بہت بڑا درس ہے کہ اگر کچھ لوگ گناہ و لغزش کا شکار ہو جائیں تو نہیں سزا دیتے ہوئے حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں اسلامی معاشرے سے دھتکار کر باہر نہیں نکال دینا چاہیئے اور نہ امداد کے دروازے ان پر بند کر دینے چاہئیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دشمنوں کے دامن میں جا گریں اور ان کی صف میں جا شامل ہوں۔

یہ آیات درحقیقت اسلام کی قوتِ جاذبہ اور قوتِ دافعہ کے اعتدال کی عکاسی کرتی ہیں۔ آیات ائک پہلے مرحلے میں تو لوگوں کی ناموس پر تہمت لگانے والوں کے لیے سخت سزا کو بیان کرتی ہیں اور اس طرح دافعہ کی عظیم قوت کا مظہر ہیں اور دوسرے مرحلے میں عفو و درگزر اور اللہ کے غفور و رحیم ہونے کا تذکرہ ہے اس مقام پر قوت جاذبہ کا مظہر ہیں۔

اس کے بعد پھر قذف کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور موضوع پھر پاکدامن عورتوں کی ناموس پر تہمت لگانے کی طرف لوٹتا ہے۔ قطعی اور اٹل فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ پاکدامن اور ہر گناہ سے بے خبر مومن عورتوں پر ناروا تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں رحمتِ الٰہی سے دور ہیں اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے (ان الذین یرمون المحصنات الغافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والأخرة ولهم عذاب عظیم)۔

اس آیت میں دراصل عورتوں کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر صفت اس ظلم کی اہمیت پر ایک دلیل ہے کہ جو ان پر تہمت لگا کر کیا گیا ہے۔

"محصنات" ——— پاکدامن عورتیں

"غافلات" ——— ہر قسم کے گناہ سے دُور ——— اور

"مؤمنات" ——— باایمان عورتیں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی پاکباز عورتوں کی طرف ناروا نسبتیں دینا کس قدر ظالمانہ اور بزدلانہ فعل ہے اور عذاب عظیم کا باعث ہے [1]

ضمناً یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ "غافلات" ایک جاذب نظر اور عمدہ تعبیر ہے کہ جو ان کی ہر قسم سے انحراف اور بے عفتی سے انتہائی پاکیزگی کی غماز ہے۔ یعنی وہ جنسی قباحتوں سے اس قدر بے اعتنا ہیں کہ گویا انہیں ان کی خبر تک نہیں کیونکہ بعض اوقات گناہوں کے بارے میں انسان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اصلاً ان کا تصور تک اس کی فکر و نظر سے نکل جاتا ہے اور ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ گویا ایسا کوئی عمل وجود ہی نہیں رکھتا اور یہ تقویٰ کا اعلیٰ مرحلہ ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "غافلات" سے مراد ایسی عورتیں ہیں کہ جنہیں خبر بھی نہیں کہ ان پر ایسی ناروا تہمتیں لگائی گئی ہیں لہٰذا وہ اپنا دفاع تک نہیں کر سکتیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو زیر بحث آیت ایک نئے مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ گویا یہ ایک اور

---

[1] المیزان، زیر بحث آیات کے ذیل میں، ج ۱۵ ص ۱۲۲

Marfat.com

طرح کی تہمت ہے۔ جبکہ گزشتہ آیات میں ایسے تہمت لگانے والوں کا ذکر تھا کہ جو جانے پہچانے تھے اور انہیں سزا دی گئی تھی لیکن اب یہاں ان تہمت ساز افراد کے بارے میں گفتگو ہے کہ جنہوں نے مخفی طور پر یہ حرکت کی اور اپنے آپ کو حد شرعی سے بچائے رکھا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اس عمل پر وہ ہمیشہ اللہ کی سزا سے بچے رہیں گے بلکہ خدا اس دنیا میں بھی انہیں اپنی رحمت سے دُور رکھے گا اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

یہ آیت اگرچہ واقعہ افک کے بعد آئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس واقعے سے غیر مربوط بھی نہیں لیکن یہ بھی ان تمام آیات کی طرح ہے کہ جو خاص مواقع پر نازل ہوئیں مگر ان کا مفہوم عمومی ہوتا ہے۔ یہ آیتیں معین موقع کے لیے مختص نہیں ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ تفسیر کبیر میں فخر رازی نے اور بعض دیگر مفسرین نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ اس آیت کے مفہوم کو ازواجِ پیغمبرؐ پر تہمت لگانے کے ساتھ محدود سمجھا جائے اور اس گناہ کو سرحدِ کفر میں قرار دیا جائے۔ اس آیت میں جو لفظ "لعن" آیا ہے اسے انہوں نے اپنے اس دعویٰ کے لیے دلیل قرار دیا ہے۔

حالانکہ تہمت لگانا اگرچہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر یہ تہمت ازواج پیغمبرؐ پر لگائی جائے تو یہ گناہ کہیں بڑا ہو جاتا ہے تاہم تنہا یہ گناہ موجبِ کفر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعے میں ملوث افراد کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وہ سلوک نہیں کیا کہ جو مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے بلکہ بعد والی آیتوں میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ان پر حد سے زیادہ سختی کرنے سے منع فرمایا گیا اور اگر کفر کا مسئلہ ہوتا تو یہ بات اس سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

رہی بات "لعن" (لعنت) کی۔ تو اس سے مراد رحمتِ خدا سے دُوری ہے کہ جو کافروں اور گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں پر صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہی آیات میں کہ جو حدِ قذف کے بارے میں گزری ہیں "لعان" سے مربوط احکام میں دو مرتبہ جھوٹ بولنے والوں کے لیے "لعن" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مشہور حدیث ہے کہ:

لعن اللہ فی الخمر عشر طوائف ------

شراب کے بارے میں اللہ نے دس گروہوں پر لعنت کی ہے۔

اگلی آیت میں تہمت لگانے والوں کی بارگاہ الٰہی میں کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس روز اُن پر عذابِ عظیم ہوگا کہ جس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے خلاف گواہی دیں گے (یوم تشھد علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم بما کانوا یعملون)۔

وہ نہیں چاہیں گے مگر اُن کی زبان حرکت میں آجائے گی اور حقائق بیان کرے گی۔ جب قطعی دلائل و شواہد سامنے آجائیں گے تو یہ مجرم نہ چاہتے ہوئے بھی صراحت سے اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے اور خود تمام کاموں کو فاش کردیں گے اس لیے کہ انہیں انکار کی کوئی گنجائش سجھائی نہ دے گی۔

اُن کے ہاتھ پاؤں بھی بول لیں گے۔ یہاں تک کہ قرآنی آیات کے مطابق ان کے بدن کا چمڑا بھی کلام کرے گا۔ گویا یہ عالم ہو گا

Marfat.com

جیسے انسان کی ساری آوازیں ٹیپ پر ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ اس کی ساری زندگی کے گناہوں کی فلم بن چکی ہے ـــــ جی ہاں ـــــ وہ دن کہ جسے "یوم البروز" کہتے ہیں ـــــ جو تمام بھیدوں کے آشکار ہو جانے کا دن ہے ـــــ اس روز یہ سب کچھ آشکار ہو جائے گا۔

بعض قرآنی آیات میں روز قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ،

الیوم نختم علی افواھھم و تکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون

آج ہم ان کی زبان پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ پاؤں ہم سے گفتگو کریں گے کہ جن کے ذریعے یہ کام کرتے ہیں۔ (یٰس ـ ۶۵)

ایسی آیات زیر بحث آیات کے منافی نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے تو زبان خاموش ہو جائے اور باقی اعضاء گواہی دیں اور جب ہاتھ پاؤں کی گواہی سے حقائق آشکار ہو جائیں تو پھر زبان کو اذن کلام مل جائے اور پھر جو کچھ کہنا ہو وہ کہے اور گناہوں کا اعتراف کرے۔

* * * * *

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس دن خدا انہیں بے کم و کاست ان کی حقیقی جزا انہیں دے گا (یومئذ یوفیھم اللہ دینھم الحق)۔

اور اس دن وہ جان لیں گے کہ اللہ حق مبین ہے (و یعلمون ان اللہ ھو الحق المبین)۔

اگر آج ـــــ اس دنیا میں انہیں پروردگار کی حقانیت کے بارے میں کوئی شک ہے یا آج لوگوں کو گمراہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں تو اس دن اس کی عظمت، قدرت اور حقانیت کی نشانیاں اتنی واضح ہوں گی کہ سخت ترین ہٹ دھرم افراد بھی اعتراف پر مجبور ہو جائیں گے۔

Marfat.com

۲۶۔ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۟

ترجمہ

۲۶۔ خبیث و ناپاک عورتیں خبیث و ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور خبیث و ناپاک مرد بھی خبیث و ناپاک عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد بھی پاکیزہ عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ان ناروا تہمتوں سے منزّہ و مبراء ہے کہ جو ان پر لگائی جاتی ہیں اور ان کے لیے (اللہ کی) مغفرت و بخشش اور رزقِ کریم ہے۔

تفسیر

"کند ہم جنس باہم جنس پرواز"

یہ آیت بھی درحقیقت آیاتِ افک اور اس سے پہلے کی آیات کا تسلسل ہے اور انہی کے مفاہیم پر ایک اور تاکید ہے۔ اس میں جہان خلقت میں رائج ایک فطری نظام کا بیان ہے کہ شریعت بھی جس سے ہم آہنگ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: خبیث و ناپاک عورتیں خبیث و ناپاک مردوں کے لیے ہیں جیسا کہ خبیث و ناپاک مردوں کا تعلق خبیث و ناپاک عورتوں سے ہے (الخبیثات للخبیثین و الخبیثون للخبیثات)۔

اور اس کے مدِمقابل بھی "طیب و پاک عورتیں طیب و پاک مردوں کے لیے ہیں جیسا کہ طیب و پاک مردوں کا تعلق طیب و پاک عورتوں سے ہے (والطیبات للطیبین و الطیبون للطیبات)۔

اور آیت کے آخر میں دوسرے گروہ کے بارے میں مزید فرمایا گیا ہے: وہ ان ناروا تہمتوں سے مبرا ہیں کہ جو ان پر لگائی جاتی ہیں (اولئک مبرءون مما یقولون)۔

اور اسی بنا پر اللہ کی مغفرت اور اسی طرح پرارزش رزق ان کے انتظار میں ہے (لھم مغفرۃ و رزق کریم)۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ "خبیثات" اور "خبیثون" کون ہیں؟ زیر بحث آیت میں "خبیثات" اور "خبیثین" نیز "طیبات" اور "طیبین" سے کون مراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف بیانات ہیں، مثلاً

(۱) کبھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ناپاک باتیں، تہمت، افتراء اور جھوٹ ہے کہ جن کا تعلق غلط کار اور گندے افراد کے ساتھ ہے اور اس کے برعکس پاکیزہ باتیں پاک و باتقویٰ افراد کے لیے ہیں۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ "خبیثات" "سیئات" کے معنی میں ہے یعنی اس سے مراد مطلق بُرے اور ناپسندیدہ کام ہیں کہ جو ناپاک مرد بجالاتے ہیں اس کے برعکس حسنات پاک لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۳) بعض کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "خبیثات" اور "خبیثون" آلودہ دامن عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ ہے اور اس کے برعکس "طیبات" اور "طیبون" پاکدامن عورتوں اور مردوں کی طرف اشارہ ہے۔ ظاہراً بھی آیت سے یہی مراد ہے کیونکہ ایسے قرائن موجود ہیں کہ جو اس آخری معنی کی تائید کرتے ہیں، مثلاً

(ا) یہ آیات، آیاتِ افک کے بعد آئی ہیں اور اسی طرح اس آیت سے پہلے یہ آیت بھی گزر چکی ہے:

الزانی لاینکح الا زانیة اومشرکة والزانیة لاینکحھا الازان اومشرك وحرم ذٰلك علی المؤمنین

اور یہی تیسری تفسیر ان آیات کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

(ب) اس آیت میں یہ جملہ:

اولئك مبرءون مما یقولون

پاکدامن مردوں اور عورتوں پر جو ناروا تہمتیں لگائی جاتی ہیں وہ اس سے پاک و منزّہ ہیں۔

یہ جملہ بھی مذکورہ بالا تیسری تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

(ج) اصولی طور پر قرینۂ مقابلہ اس بات کی نشانی ہے کہ "خبیثات" سے مراد حقیقی جمع مؤنث ہے اور ناپاک عورتوں کی طرف اشارہ ہے چونکہ اس کے مقابلے میں "خبیثون" ہے کہ جو حقیقی جمع مذکر ہے۔

(د) ان سب باتوں سے قطع نظر امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ:

یہ آیت بھی "الزانی لاینکح الازانیة او مشرکة" کی طرح ہے کیونکہ کچھ ایسے لوگ تھے کہ جنہوں نے بُری عورتوں سے شادی کا ارادہ کر رکھا تھا تو اللہ نے انہیں اس کام سے منع کیا اور اسے ناپسند فرمایا[1]

(ہ) روایاتِ کتاب نکاح میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات آئمہؑ کے اصحاب "خبیثات" سے شادی کے بارے

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

میں سوال کرتے تو انہیں ایسا کرنے سے منع کیا جاتا۔ یہ امر نشان دہی کرتا ہے کہ "خبیثات" ناپاک عورتوں کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ناپاک باتوں اور ناپاک اعمال کی طرف[1]

اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ خبیث یا طیب ہونے سے صرف عفت و ناموس کا پہلو مراد ہے یا ہر قسم کی فکری، عملی اور زبانی ناپاکی یا پاکیزگی ان کے مفہوم میں داخل ہے؟

اگر اس سلسلے کی آیات و روایات کے سیاق و سباق کو نظر میں رکھا جائے تو اس زیر بحث آیت کا مفہوم محدود ہونا چاہیئے یعنی یہاں عفت و ناموس کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن بعض ایسی روایات بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر خبیث و طیب کا وسیع معنی ہے اور اس کا مفہوم جنسی آلودگی اور پاکیزگی میں منحصر نہیں ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر بعید نہیں کہ پہلا مفہوم آیت کا خاص معنی ہو لیکن ملاک، فلسفہ اور علت کے لحاظ سے اسے عمومیت اور وسعت دی جا سکتی ہو۔

دوسرے لفظوں میں یہ آیت ہے تو عمومی بیان کے لیے لیکن زیر بحث مسئلے کے اعتبار سے جنسی امور میں آلودگی اور پاکیزگی کی بات کرتی ہے (غور کیجیئے گا)۔

۲- یہ حکم تکوینی ہے یا تشریعی؟ اس میں شک نہیں کہ "نوری صرف نوریوں کے طالب ہیں" "اور ناری صرف ناریوں کی طرف کھنچتے ہیں" نیز فارسی مثل مشہور ہے۔

ع کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

اسی طرح عربی مثل بھی مشہور ہے کہ:

السنخیة علة الانضمام

یہ سب ضرب الامثال سنتِ تکوینی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو آسمان و زمین میں کائنات و موجودات کے ذرے ذرے پر محیط ہے۔

بہر حال ہر جگہ ہم نوع اپنے ہم نوع کی طرف کھنچتا ہے اور ہر گروہ اپنے ہم مزاج کے ساتھ مخلص ہے۔ لیکن یہ حقیقت اس سے مانع نہیں کہ زیر بحث آیت "الزانیة لاینکحھا الا زان او مشرک" کی طرح ایک شرعی حکم کی طرف اشارہ ہو کہ بُری عورتوں کے ساتھ کم از کم ایسے مواقع پر ممنوع ہے کہ جب وہ بدکاری میں مشہور و معروف ہوں۔

ویسے بھی کیا سب شرعی احکام کی بنیاد تکوینی نہیں ہے اور کیا شریعت اور تکوین آپس میں ہم آہنگ نہیں ہیں؟ یقیناً ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر دیکھئے۔

۳- ایک سوال کا جواب: یہاں ایک سوال پیش آتا ہے کہ تاریخ میں اور خود اپنی زندگی میں ہم نے ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ جو اس قانون کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ مثال کے طور پر خود قرآن میں آیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں بُری تھیں اور انہوں نے ان انبیاء کرامؑ سے خیانت کی تھی (سورہ تحریم - ۱۰)

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۳۳۷ باب ۱۴ از ابواب "مایحرم بالمصاھرة و نحوھا"

Marfat.com

جبکہ اس کے مقابلے میں فرعون کی بیوی باایمان اور پاک دامن خاتون تھی کہ جو اس بے ایمان طاغوت کے چنگل میں گرفتار تھی۔
(تحریم - ۱۱)

ہادیانِ اسلام کے بارے میں بھی ایسے کئی نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ایک بات تو یہ پیش نظر ہے کہ ہر عمومی قانون کے استثنائی پہلو بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان دو نکات کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے:

(۱) آیت کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اصولی طور پر خباثت سے مراد جنسی لحاظ سے ناپاکی ہے اور "طیب" ہونا اس کی ضد ہے۔ اس طرح سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ انبیاءؑ اور ائمہؑ کی ازواج میں سے ہرگز کوئی بھی جنسی اعتبار سے بے راہ رو نہ تھی۔ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کے واقعے میں خیانت سے مراد یہ ہے کہ وہ کافروں کے فائدے میں جاسوسی کرتی تھیں اور یہاں عفت و ناموس کے معاملے میں خیانت مراد نہیں ہے۔

اصولی طور پر یہ عیب قابلِ نفرت عیوب میں شمار ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انبیاء کی ذاتی زندگی کو ایسے اوصاف سے پاک ہونا چاہیئے کہ جو لوگوں کی نفرت کا باعث بنیں تاکہ مقصدِ نبوت کہ جو لوگوں کو دینِ خدا کی طرف جذب کرنا ہے، کو نقصان نہ پہنچے۔

(۲) علاوہ ازیں انبیاء کرامؑ اور ائمہ طاہرینؑ کی بیویاں ابتداء میں کافر اور بے ایمان تک نہ تھیں۔ بعض اوقات وہ بعثتِ نبوت کے بعد گمراہ ہو جاتی تھیں اور یقیناً ان انبیاءؑ کے پہلے کے سے روابط ایسی بیویوں کے ساتھ جاری نہ رہتے تھے۔

فرعون کی بیوی کا بھی ایسا ہی مسئلہ ہے۔ جب اس کی فرعون کے ساتھ شادی ہوئی تھی اس وقت وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان نہیں لائی تھی۔ اصولاً تو حضرت موسیٰؑ ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث برسالت ہوئے تو وہ ایمان لے آئی۔ البتہ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ فرعون کے ساتھ اپنی زندگی کو جاری رکھتی۔ لیکن حمایتِ حق میں اُس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور انجام کار یہ باایمان خاتون شہادت کی منزل سے ہمکنار ہوئی۔

Marfat.com

۲۷۔ يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوا وَ تُسَلِّمُوا عَلٰٓى اَهْلِهَا ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

۲۸۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ○

۲۹۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۔ اے ایمان والو! اپنے گھر کے سوا دوسرے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہونا اور اس گھر والوں کو سلام بھی کرنا۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے شاید کہ تم توجہ کرو۔

۲۸۔ اور اگر اس گھر میں کسی کو نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہونا جب تک کہ تمہیں اجازت نہ ملے اور اگر کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس آجانا کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے۔

۲۹۔ جن گھروں میں کسی کی رہائش نہ ہو اور وہاں تمہارا مال و اسباب پڑا ہو وہاں تمہارے داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے یا چھپاتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

بغیر اجازت لوگوں کے گھروں میں نہ جاؤ

ان آیات میں اسلام کے چند ایک معاشرتی آداب و احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان کا عفت و پاکدامنی کی حفاظت سے بھی قریبی تعلق ہے۔

ان آیات میں دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے اور داخل ہونے کی اجازت لینے کے آداب بیان ہوتے ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہونا اور اس گھر والوں کو سلام بھی کرنا اور قبل ازیں اپنی آمد کی انہیں اطلاع دینا اور داخل ہونے کیلئے اجازت حاصل کرنا (یاایھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتّٰی تستأنسوا و تسلموا علی اھلھا)۔

یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ شاید تم توجہ دو (ذٰلکم خیر لکم لعلکم تذکرون)۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں لفظ "تستأنسوا" استعمال ہوا ہے نہ کہ "تستأذنوا" کیونکہ دوسرے لفظ میں صرف اجازت لینے کا مفہوم ہے جبکہ پہلا لفظ مادہ "انس" سے لیا گیا ہے۔ اس سے ایسی اجازت لینا مراد ہے کہ جس میں لطف و محبت، اور صداقت پنہاں ہو۔ یعنی مؤدبانہ طریقے سے اور بغیر کسی درشتی و سختی کے اجازت لی جائے۔

اس لحاظ سے اگر اس جملے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سے آداب اشارتاً بیان کر دیے گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شور نہ مچاؤ، دروازہ زور زور سے کھٹکھٹاؤ اور تکلیف دہ خشک الفاظ کے ساتھ اجازت نہ لو اور جب اجازت مل جائے تو بغیر سلام کیے اندر نہ جاؤ۔ ایسا سلام کہ جو صلح و سلامتی اور دوستی و محبت کا پیغامبر ہو۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ حکم جس میں انسانی احساسات کا پہلو نمایاں ہے کے ساتھ ساتھ دو جملے مزید آئے ہیں ایک "ذٰلکم خیر لکم" اور دوسرا "لعلکم تذکرون" یہ جملے اس امر کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے احکام انسانی احساسات اور عقل و شعور کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود ہیں اور اگر انسان ان پر تھوڑا سا غور و فکر کرے تو متوجہ ہوگا کہ اس کی بھلائی انہی احکام پر عمل پیرا ہوتے میں ہے۔

اگلی آیت میں ایک اور جملے کے اضافے سے اس حکم کی تکمیل کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اگر دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں ہے تو پھر اس میں مت جاؤ جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے (فان لم تجدوا فیھا احداً فلا تدخلوھا حتّٰی یؤذن لکم)۔

ہو سکتا ہے اس سے یہ مراد ہو کہ بعض اوقات گھر میں کچھ افراد تو ہوتے ہیں لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا کہ جو صاحبِ اختیار اور گھر کا مالک ہو اور اجازت دے سکے۔ تو ایسی صورت میں تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ اس گھر میں داخل ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ گھر میں تو کوئی موجود نہ ہو لیکن صاحبِ خانہ ہمسایوں کے ہاں یا قریب ہی کہیں ہو اور وہ تمہاری یا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنے تو آجائے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ اس موقع پر تم داخل ہونے کا حق رکھتے ہو۔ بہرحال اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتے۔

Marfat.com

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو اس بات کو قبول کرتے ہوئے واپس چلے جاؤ کہ یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے (وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا هو ازکیٰ لکم)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تمہیں واپس چلے جانے کے لیے کہا جائے تو تمہیں اس جواب پر ہرگز پریشان اور ناراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات صاحب خانہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اس کے لیے تم سے ملنا پریشانی اور زحمت کا باعث ہوتا ہے یا اس کی اور اس کے گھر کی ایسی حالت نہیں ہوتی کہ وہ مہمان کو گھر بلا سکے۔

بعض لوگوں کو نفی میں جواب ملے تو وہ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ دروازے کے سوراخوں سے دیکھتے ہیں، کان لگا کر اندر کی آوازیں سنتے ہیں یا کسی ذریعے سے اس گھر کے راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں اسی بات کے پیش نظر قرآن مزید کہتا ہے، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے آگاہ ہے (و الله بما تعملون علیم)۔

مسائل کے حل کی معقول صورت پیدا کرنے کے لیے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی استثنائی پہلو ہوتا ہے۔ اس لیے مزید فرمایا گیا ہے: جن گھروں میں کوئی نہ رہتا ہو اور ان میں تمہارا مال و اسباب پڑا ہو تو پھر ان میں داخل ہونے میں تم پر کوئی گناہ نہیں (لیس علیکم جناح ان تدخلوا بیوتًا غیر مسکونة فیها متاع لکم)۔ یہ بھی اضافہ فرمایا گیا ہے: اور جو کچھ تو ظاہر کرتے یا چھپاتے ہو اللہ اسے جانتا ہے (و الله یعلم ما تبدون و ما تکتمون)۔

شاید یہ اس طرف اشارہ ہو کہ بعض افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جو اس رعایت سے ناجائز فائدہ اُٹھائیں اور غیر رہائشی گھروں میں داخل ہو کر چیزوں کی ٹوہ لگاتے پھریں یا رہائشی گھروں میں اس بہانے سے چلے جائیں کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہاں کوئی رہتا ہے لیکن اللہ ان تمام امور سے آگاہ ہے اور غلط فائدہ اٹھانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ گھر کی چار دیواری کا تحفظ اور آزادی: اس میں شک نہیں کہ انسانی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ اسی وجہ سے انسان دو قسم کی زندگی کا حامل ہے۔ ایک خصوصی زندگی اور دوسری عمومی زندگی۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں اور ہر ایک کے لیے کچھ آداب و قوانین ہیں۔

اجتماعی ماحول میں انسان مجبور ہے کہ اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرے اور اپنی آمد و رفت میں تحمل کرے۔ لیکن واضح ہے کہ شب و روز وہ اپنے تئیں ان پابندیوں میں جکڑے نہیں رکھ سکتا۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ شب و روز میں کچھ مدت آزاد رہے آرام کرے اپنے گھر والوں اور اولاد سے نجی گفتگو کرے اور جتنا ممکن ہو سکے اس آزادی سے فائدہ اُٹھائے۔ اسی لیے وہ ایک اپنا گھر چاہتا ہے اور اس میں پناہ لیتا ہے۔ کچھ دیر اپنے گھر کے دروازے دوسروں پر بند کر کے اپنی زندگی کو معاشرے سے جُدا کر لیتا ہے۔ اور ایسی بہت سی پابندیاں کہ جنہیں معاشرے میں قبول کرنے کے لیے وہ مجبور ہوتا ہے اُن سے گھر میں آزاد ہو جاتا ہے۔

اب اس آزاد ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے واضح ہے کہ انسان کے لیے کچھ تحفظ اور آزادی درکار ہے۔ اگر ہر شخص کو آزادی ہو تو وہ آئے اور گھر میں داخل ہو جائے تو پھر گھر میں آزادی اور آرام و سکون کا مفہوم ختم ہو جائے گا اور وہ کوچہ و بازار کے ماحول میں بدل

Marfat.com

جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے درمیان اس سلسلے میں ہمیشہ کچھ خاص قوانین و آداب موجود رہے ہیں اور دنیا کے تمام قوانین میں لوگوں کے گھروں میں ان کی اجازت کے بغیر داخل ہونا ممنوع ہے اور اس کے لیے سزا تک مقرر ہے۔ یہاں تک کہ جہاں تحفظ، امن اور دوسرے حوالوں سے ضروری ہو کہ بلا اجازت داخل ہوا جائے وہاں بھی محدود و معین طریقے ہیں اور ادارے ہیں کہ جو یہ اجازت دینے کا حق رکھتے ہیں۔

اسلام میں بھی اس سلسلے میں تاکیدی حکم موجود ہے اور اس سلسلے میں جیسے حکیمانہ آداب اسلام میں موجود ہیں ان کی نظیر بہت کم نظر آتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ؐ کے ایک صحابی ابو سعید نے آپؐ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی اور دروازے کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اجازت لیتے وقت دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہوا کرو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب کبھی کسی کے گھر کے دروازے پر آتے تو سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے بلکہ دائیں یا بائیں طرف ہو کر کھڑے ہوتے تھے اور "السلام علیکم" کہہ کر اجازت چاہتے تھے کیونکہ اس زمانے میں ابھی گھر کے دروازے پر پردہ لٹکانے کا معمول نہ تھا۔[1]

روایات میں یہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی اپنے ماں باپ کے گھر یا اپنے بیٹے کے گھر بھی جانا چاہے تو پہلے اجازت لے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! جب میں اپنی ماں کے گھر جانے لگوں تو کیا وہاں بھی اجازت لوں؟

فرمایا: ہاں۔

اُس نے عرض کیا: میرے علاوہ میری ماں کا کوئی خدمت گزار بھی نہیں ہے تو کیا پھر بھی اجازت لوں؟

فرمایا:

اتحب ان تراها عريانة

کیا تو پسند کرتا ہے کہ تو اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟

اُس نے عرض کیا: نہیں

تو پھر فرمایا:

فاستأذن عليها

جب ایسا ہے تو پھر اُس سے اجازت لے لیا کر۔[2]

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۳، صفحہ ۱۹۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ صفحہ ۵۸۶

Marfat.com

ایک اور روایت میں ہے:

ایک مرتبہ پیغمبر اکرمؐ اپنی دختر نیک اختر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر گئے۔ پہلے دروازے پر آکر دروازے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تھوڑا سا پیچھے ہٹایا۔ پھر فرمایا: السلام علیکم۔

جناب فاطمہؑ نے اپنے والد گرامیؐ کے سلام کا جواب دیا۔

پھر آپؐ نے فرمایا: کیا اجازت ہے کہ اندر آجاؤں؟

عرض کیا: تشریف لایئے یا رسول اللہؐ

رسول اللہؐ نے فرمایا: جو میرے ساتھ ہے کیا اُسے بھی اجازت ہے کہ اندر آجائے۔

فاطمہؑ نے عرض کیا: میرے سر پر چادر نہیں ہے۔

پھر گئیں اور چادر لی اور جب باپردہ ہوگئیں تو رسول اللہؐ نے پھر سلام کیا۔

فاطمہؑ نے جواب سلام دیا۔

رسول اللہؐ نے پھر اپنے لیے داخل ہونے کی اجازت چاہی جب انہوں نے اجازت دی تو پھر آپؐ نے اپنے ساتھ جابر بن عبداللہ کے لیے اجازت لی[1]

اس حدیث سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کہ جو تمام مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ اور ماڈل ہیں ان نکات کا کس قدر باریک بینی سے خیال رکھتے تھے۔

بعض روایات میں یہاں تک ہے کہ تین مرتبہ اجازت لینی چاہیے۔

پہلی مرتبہ اس طرح سے کہ گھر والے سُن لیں۔

دوسری مرتبہ وہ اپنے آپ کو آمادہ کرلیں۔

پھر تیسری مرتبہ اجازت طلب کی جائے۔ گھر والے چاہیں تو اجازت دیں اور چاہیں تو نہ دیں[2]

بعض نے تو یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ ان تین اجازتوں کے درمیان کچھ وقت کا فاصلہ ہونا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات صاحبِ خانہ کے بدن پر مناسب لباس نہیں ہوتا اور کبھی وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس حالت میں کوئی اسے دیکھے کبھی کمرے کی حالت درہم برہم ہوتی ہے اور کبھی کوئی راز کا ایسا معاملہ ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ گھر سے باہر کسی کو پتہ چلے لہٰذا اسے وقت دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے آپ کو آمادہ کرے اور اگر وہ اجازت نہ دے تو بغیر تھوڑے سے بھی ملال کے واپس چلے جانا چاہیئے۔

۲۔ غیر رہائشی گھروں سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسی عمارتیں مراد ہیں کہ جو عمومی ہوں۔ مثلاً کارواں سرائے، مہمان خانے، حمام وغیرہ۔ یہ مضمون امام صادق علیہ السلام سے

---

[1] نور الثقلین، ج ۳، ص ۵۸۸

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۱۶۱، ابواب مقدمات النکاح، باب ۱۲۳

Marfat.com

مروی ایک حدیث میں بالصراحت آیا ہے۔[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اس سے مراد خرابے اور کھنڈرات ہیں کہ جن میں کوئی نہ رہتا ہو اور جو چاہتا ہو اس میں داخل ہو جاتا ہو۔ یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ کوئی شخص بھی اپنا مال واسباب ایسی جگہ نہیں رکھ سکتا۔

بعض دیگر مفسرین نے اسے تاجروں کے ایسے اسٹوروں، گوداموں اور دوکانوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جن میں لوگوں کا مال بطورِ امانت رکھا جاتا ہے اور ہر صاحبِ مال حق رکھتا ہے کہ وہ اپنا مال واسباب لینے کے لیے ان میں داخل ہو جائے۔ یہ تفسیر بھی آیت کے ظاہری مفہوم سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے ایسے گھر مراد ہوں کہ جہاں کوئی نہیں رہتا۔ ایسے گھر میں کسی نے اپنا مال بطورِ امانت رکھا ہو اور گھر کے مالک سے اس نے آنے جانے اور مال اٹھانے کی عمومی اجازت لے لی ہو۔

ان میں سے بعض تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں لیکن پہلی تفسیر آیت کے مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

اس بیان سے ضمناً یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انسان صرف اس بنیاد پر کسی کا گھر بلا اجازت نہیں کھول سکتا کہ اس کا کچھ مال و اسباب اس میں پڑا ہوا ہے چاہے اس میں اس وقت کوئی بھی موجود نہ ہو۔

۳۔ بلا اجازت لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کی سزا: فقہ و حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر لوگوں کے گھروں میں تانک جھانک کرے اور عورتوں کے چہرے یا برہنہ بدن کی طرف دیکھے تو پہلی مرتبہ اس گھر والے اُسے منع کر سکتے ہیں۔ اگر وہ نہ رُکے تو پھر پتھر مار کر اسے دُور کریں اور اگر وہ پھر بھی نہ ٹلے تو پھر آلاتِ قتل سے اپنی اور اپنی آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں اور اگر اس جھگڑے میں وہ شخص مارا جائے تو اُس کا خون رائیگاں ہے۔ البتہ اس کام میں مختلف مرحلوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے یعنی اگر آسان طریقے سے معاملہ حل ہو سکتا ہو تو سخت طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۴، ص ۱۶۱

Marfat.com

۳۰۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا
فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا
يَصْنَعُوْنَ ○

۳۱۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ
يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ
وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ
اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِىْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِىْۤ اَخَوٰتِهِنَّ
اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ
غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ
يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ
لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ
جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

ترجمہ

۳۰۔ مومنین سے کہہ دو، اپنی آنکھوں کو (نامحرموں کو دیکھنے سے) بند رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی

Marfat.com

حفاظت کریں۔ یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے آگاہ ہے۔

٣١۔ اور باایمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو (نگاہِ ہوس آلود سے) بند رکھیں اور اپنا دامن محفوظ رکھیں اور سوائے اس حصے کے کہ جو ظاہر ہے اپنے بناؤ سنگھار کو آشکار نہ کریں اور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینے پر ڈالیں (تاکہ اس سے گردن اور سینہ چھپ جائے)۔ نیز اپنے شوہروں، اپنے آباؤ اجداد، اپنے شوہروں کے آباؤ اجداد، اپنے بیٹوں، اپنے شوہروں کے بیٹوں، اپنے بھائیوں، اپنے بھائیوں کے بیٹوں، اپنی بہنوں کے بیٹوں، اپنی ہم مذہب عورتوں، اپنی مملوک عورتوں اور کنیزوں، کسی عورت کی طرف میلان نہ رکھنے والے مردوں یا ان بچوں کے، جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ نہ ہوں، کے علاوہ کسی کے سامنے اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں۔ وہ اس طرح سے زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ اُن کی چھپی ہوئی زینت ظاہر ہو جائے (اور پازیبوں کی جھنکار لوگوں کو سنائی دے) اور سب اللہ کی طرف لوٹ آؤ تاکہ فلاح پا جاؤ۔

شانِ نزول

زیر نظر پہلی آیت کے بارے میں کتاب کافی میں امام باقر علیہ السلام سے یہ شانِ نزول نقل ہوئی ہے:

انصار میں سے ایک نوجوان کا راہ چلتے ہوئے ایک عورت سے سامنا ہوا۔ اس زمانے میں عورتیں اپنی چادر کانوں کے پیچھے رکھتی تھیں (ظاہری بات ہے کہ اس طرح گردن اور سینے کی کچھ مقدار نمایاں ہو جاتی تھی)، اس نوجوان کی نظر اُس عورت کے چہرے پر پڑی تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ عورت پاس سے گزر گئی مگر یہ جوان ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ قدم بھی اُٹھا رہا تھا اور اس کی طرف دیکھے بھی جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ مڑ مڑ کر عورت کی طرف بھی دیکھے جاتا تھا اچانک اس کا چہرہ ایک دیوار پر لگا کہ جس میں ہڈی کی نوک یا شیشے کا ٹکڑا باہر نکلا ہوا تھا چہرہ اس پر جا لگا۔ عورت دور چلی گئی تو نوجوان کو ہوش آیا۔ اُس نے دیکھا کہ خون اس کے چہرے سے جاری ہے اور اس کے لباس اور سینے پر گر رہا ہے (اُسے بہت افسوس ہوا)۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ بخدا میں رسول اللہؐ کے پاس جاتا ہوں اور یہ ماجرا اُن سے کہتا ہوں جس وقت رسولِ خداؐ کی نگاہ اُس

Marfat.com

پر پڑی تو فرمایا: تجھے کیا ہوا؟
اس جوان نے آپؐ سے وہ تمام واقعہ بیان کیا۔ اُس وقت وحیِ خدا کا قاصد جبریل نازل ہوا اور یہ آیت پہنچائی:

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم۔۔۔۔[1]

تفسیر

بے پردگی اور بے حیائی کے خلاف اقدام

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ یہ سورت عفت و پاکدامنی کا درس لیے ہوئے ہے۔ اس میں جنسی بے راہ روی کے خلاف اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے مباحث واضح طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

زیر بحث آیات میں غیر محرم کی طرف نگاہ کرنے، ہوسناک نگاہوں سے دیکھنے اور پردے کے بارے میں احکام بیان کیے گئے ہیں۔ ان آیات کا خلافِ ناموس تہمتیں لگانے کی بحث سے ربط کسی سے مخفی نہیں ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: مومنین سے کہہ دو کہ (نامحرموں کی طرف سے اور ہر اس چیز سے کہ جن پر نظر ڈالنا حرام ہے) اپنی آنکھیں بند رکھیں اور اپنے دامن کی حفاظت کریں (قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم)۔

"یغضوا" "غض" (بروزن "خز") کے مادہ سے دراصل کم کرنے اور نقصان کے معنی میں ہے۔ بہت سے مواقع پر یہ لفظ آواز کو کم اور آہستہ کرنے اور نگاہیں کم یا نیچی کرنے کیلئے بولا جاتا ہے لہٰذا آیت یہ نہیں کہتی کہ مومنین اپنی آنکھیں بند کرلیں بلکہ کہتی ہے کہ وہ اپنی نگاہیں کم اور نیچی کرلیں۔ یہ لطیف تعبیر ہے کبھی وقت کسی مرد کا کسی نامحرم عورت سے سامنا ہو تو اگر وہ آنکھیں بند کرلے تو اس کے چلنا اور دوسرے کام کرنا ممکن نہ رہے لیکن اگر نظریں اس عورت کے چہرے اور بدن سے ہٹالے اور نگاہیں نیچی کرلے تو گویا اس نے اپنی نگاہ میں کمی کردی ہے اور وہ منظر کہ جو اس کے لیے دیکھنا ممنوع ہے، اُسے اُس نے اپنی نگاہوں کی پہنچ سے بالکل حذف کر دیا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ کس چیز سے آنکھیں بند کریں (اصلاح کی زبان میں فعل کے متعلق کو حذف کر دیا گیا ہے) تاکہ یہ حکم عمومیت پیدا کرے یعنی اُن تمام چیزوں کے دیکھنے سے آنکھیں بند کرلیں کہ جن کی طرف نگاہ کرنا حرام ہے۔

لیکن سیاق و سباق ــ بالخصوص اگلی آیت کی طرف دیکھنے سے معاملہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اگلی آیت میں پردے کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ لہٰذا یہاں مراد نامحرم عورتوں کی طرف نگاہ کرنا ہے۔ مذکورہ بالا شانِ نزول بھی اسی مفہوم کی مؤید ہے[2]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ١۴ ص ١٣٩، تفسیر نور الثقلین، المیزان اور روح المعانی (کچھ فرق کے ساتھ) زیر بحث آیت کے ذیل میں

[2] "یغضوا من ابصارھم" میں لفظ "من" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اسے "تبعیض" کے لیے، بعض نے "زائدہ" اور بعض نے "ابتدائیہ" سمجھا ہے۔ لیکن ظاہراً پہلا معنی ہی صحیح ہے۔

Marfat.com

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے چہرے میں کھو کر نہ رہ جائیں کیونکہ اس سے تو یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ اس ارادے کے بغیر نگاہیں کرنا جائز ہے۔ درحقیقت اس سے مراد یہ ہے کہ عام طور پر دیکھتے ہوئے انسان کی نظر ایک وسیع حصے پر پڑتی ہے اگر ایسے میں اس کی نگاہ کسی نامحرم عورت پر جا پڑے تو چاہیے کہ اس کی طرف نہ دیکھے اور اس کی طرف سے آنکھیں بند کرے البتہ اپنے راستے اور اونچ نیچ پر نظر رکھے۔ یہ جو "غض" کا معنیٰ کیا گیا ہے اس سے یہی مراد ہے (غور کیجیئے گا)۔

زیر بحث آیت میں دوسرا حکم حفظِ فروج کے بارے میں ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے "فرج" بنیادی طور پر شگاف اور دو چیزوں کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں لیکن اس قسم کے مواقع پر کنایتاً شرمگاہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ہم نے اس کے کنائی معنی کے لیے لفظ "دامان" انتخاب کیا ہے۔

جیسا کہ روایات میں آیا ہے حفظِ فرج سے مراد اسے دوسروں کی نظروں سے چھپانا ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

کل اٰیة فی القراٰن فیها ذکر الفروج فهی من الزنا الا هٰذه الاٰیة فانها من النظر

قرآن کی ہر آیت کہ جس میں حفظِ فرج کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے وہاں مراد زنا سے محفوظ رہنا ہے

مگر اس آیت میں اس سے مراد دوسروں کی نگاہ سے محفوظ رکھنا ہے [1]

بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اس کام سے کیوں منع کیا ہے کہ جو خواہشاتِ دل کا تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ان کے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے (ذٰلك ازكٰى لهم)۔

اس کے بعد ان لوگوں کو خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ جو جان بوجھ کر نامحرم عورتوں پر ہوس آلود نگاہیں ڈالتے ہیں اور پھر اسے غیر اختیاری قرار دے دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے یقینی طور پر آگاہ ہے۔ (ان الله خبير بما يصنعون)۔

اگلی آیت میں اس سلسلے میں عورتوں کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے۔ پہلے تو وہ ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں جو مردوں کی ذمہ داریوں جیسی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: باایمان عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی آنکھیں بند رکھیں (اور نامحرم مردوں کی طرف دیکھنے سے بچیں) اور اپنے دامن کی حفاظت کریں (وقل للمؤمنات يغضضن من ابصارهن ويحفظن فروجهن)۔

گویا جیسے مردوں پر ہوس آلود نگاہوں سے عورتوں کی طرف دیکھنا حرام ہے اسی طرح عورتوں پر بھی حرام ہے۔ اسی طرح دوسروں سے اپنی شرمگاہ کو چھپانا جیسے مردوں کے لیے ضروری ہے اسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے۔

اس کے بعد تین جملوں میں مسئلہ حجاب کا ذکر ہے اور حجاب کا مسئلہ خصوصیت سے عورتوں سے متعلق ہے۔ ان تین جملوں

---

[1] نور الثقلین ج ۳، ص۵۸۸ و ص۵۸۹ بحوالہ اصولِ کافی اور تفسیر علی بن ابراہیم

Marfat.com

کو ہم ذیل میں دیکھتے ہیں:

۱- انہیں نہیں چاہیئے کہ اپنا بناؤ سنگھار دکھاتی پھریں سوائے اتنی مقدار کے کہ جتنی فطری طور پر ظاہر ہو جاتی ہے (ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا)

جس زینت کا چھپانا عورتوں کے لیے ضروری ہے اور جس کے اظہار کی اجازت دی گئی ہے اس کے مصداق کے بارے میں مفسرین میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

بعض نے زینتِ پنہاں کو عورت کی فطری زینت (اُس کے خوبصورت بدن) کے معنی میں لیا ہے جبکہ لفظ "زینت" اس معنی میں بہت ہی کم بولا جاتا ہے۔

بعض دوسروں نے اسے مقامِ زینت کے معنی میں لیا ہے کیونکہ خود زینت مثلاً گوشوارہ، دست بند اور بازو بند وغیرہ کو ظاہر کرنے میں کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کی ممانعت کی جائے۔ ظاہر کرنے کی ممانعت تو مقامِ زینت کے ساتھ مربوط ہے یعنی کان، گردن، ہاتھ اور بازو۔

کچھ مفسرین نے اسے زینت کی چیزوں کے معنی میں لیا ہے البتہ جس وقت وہ بدن پر ہوں۔ واضح ہے کہ ایسی زینت آشکار ہوگی تو ساتھ بدن کا وہ حصّہ بھی ظاہر ہوگا کہ جس پر زینت موجود ہے۔

آخری دو تفاسیر نتیجے کے اعتبار سے یکساں ہیں اگرچہ مسئلہ مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

حق یہ ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم پہلے سے کیے گئے فیصلے کے بغیر اور اس کے ظاہری مفہوم کے مطابق اس کی تفسیر کریں اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے مذکورہ بالا تیسرا معنی ہی درست ہے۔

لہٰذا عورتوں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ زینتیں اور بناؤ سنگھار کہ جو عموماً چھپا ہوتا ہے اُسے ظاہر کریں اگرچہ بدن نہ بھی ظاہر ہو۔ اس لحاظ سے عام چادر یا برقعے کے نیچے جو زینت آمیز لباس ہوتا ہے اُسے ظاہر کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ قرآن نے ایسی زینتوں کے اظہار سے منع کیا ہے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے جو متعدد روایات نقل ہوئی ہیں اُن میں یہی معنی نظر آتا ہے۔ ان کے مطابق زینت باطن سے مراد گلوبند، بازوبند اور پازیب ہے۔[1]

متعدد روایات میں زینتِ ظاہر سے انگوٹھی اور سُرمہ وغیرہ مراد لیا گیا ہے۔ ان روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھپی ہوئی زینتوں سے بھی زیورات اور بناؤ سنگھار کی وہ چیزیں ہی مراد ہیں کہ جو عموماً چھپی ہوئی ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

۲- اس آیت میں عورتوں کو دوسرا حکم یہ دیا گیا ہے، اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے سینوں پر ڈال لیں (ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن)۔

"خمر" "خمار" (بروزن "حجاب") کی جمع ہے بنیادی طور پر یہ لفظ پردے اور چھپانے والی چیز کے معنی میں

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، زیر بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

ہے لیکن عام طور پر اس چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس سے عورتیں اپنا سر چھپاتی ہیں (دوپٹہ یا چادر وغیرہ)۔
"جیوب" "جیب" (بروزن "غیب") کی جمع ہے جس کا معنی ہے گریبان۔ بعض اوقات یہ لفظ سینے کے اوپر والے حصے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔
اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے عورتیں اپنے دوپٹوں اور چادروں کے آنچل شانوں پر یا سر کے پچھلی طرف ڈالتی تھیں۔ اس طرح سے ان کی گردن اور سینے کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ عورتیں اپنی چادر اپنے گریبان کے اوپر ڈال لیں تاکہ گردن اور سینے کا دکھائی دینے والا حصہ چھپ جائے (مذکورہ شانِ نزول سے بھی یہی معنی معلوم ہوتا ہے)۔
۳۔ تیسرے حکم میں ان افراد کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جن کے سامنے عورتیں پردہ ہٹا سکتی ہیں اور چھپی ہوئی زینت کو ظاہر کر سکتی ہیں ——
بات یوں شروع ہوتی ہے: عورتیں اپنی زینت اور سنگھار ظاہر نہ کریں (ولا یبدین زینتھن) —— سوائے ان بارہ مواقع پر:

۱۔ اپنے شوہروں کے لیے (الا لبعولتھن)۔
۲۔ اپنے آباؤ اجداد کے سامنے (او اٰبائھن)۔
۳۔ اپنے شوہروں کے آباؤ اجداد کے سامنے (او اٰباء بعولتھن)۔
۴۔ اپنے بیٹوں کے سامنے (او ابنائھن)۔
۵۔ اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے (او ابناء بعولتھن)۔
۶۔ اپنے بھائیوں کے سامنے (او اخوانھن)۔
۷۔ اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے (او بنی اخوانھن)۔
۸۔ اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے (او بنی اخواتھن)۔
۹۔ اپنی ہم مذہب عورتوں کے سامنے (او نسائھن)۔
۱۰۔ اپنی مملوک کنیزوں کے سامنے (او ما ملکت ایمانھن)۔
۱۱۔ ان زیردست مردوں کے سامنے کہ جو کوئی رغبت نہ رکھتے ہوں (او التابعین غیر اولی الاربة من الرجال)۔
۱۲۔ یا اُن چھوٹے بچوں کے سامنے کہ جو ابھی عورتوں کے پوشیدہ امور کی تمیز نہیں رکھتے (او الطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء)۔

۴۔ آخر میں چوتھا حکم اس طرح بیان کیا گیا ہے: راہ چلتے اپنے پاؤں زمین پر یوں مار کر نہ چلیں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت ظاہر ہو جائے (ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن)۔
وہ اپنی عفت و پاک دامنی کا پاس کریں اور ایسے کام نہ کریں کہ جن سے مردوں کے جذبات کو انگیخت ملتی ہو۔ کہیں البانہ

Marfat.com

ہو کہ وہ جادۂ عفت سے بھٹک جائیں۔ اس سلسلے میں اتنی احتیاط سے کام لیں کہ پازیب کی آواز بھی غیر مردوں کو سُنائی نہ دے۔ یہ حکم اس امر کا مظہر ہے کہ اسلام اپنے احکام میں انتہائی باریک بینی سے کام لیتا ہے۔

آخر میں تمام مومنین کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورت خدا کی طرف لوٹ آنے کی اور توبہ کی دعوت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اے ایمان والو! سب خدا کی طرف لوٹ آؤ تاکہ فلاح پا جاؤ (و توبوا الی اللہ جمیعًا ایھا المؤمنون لعلکم تفلحون)۔

اگر اس سلسلے میں گزشتہ زندگی میں تم نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس وقت جبکہ تمہارے سامنے اسلامی احکام واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں اپنی خطاؤں سے توبہ کرو اور نجات و فلاح کے لیے بارگاہِ الٰہی کا رُخ کرو کیونکہ نجات و فلاح صرف اس کے دروازے سے ملتی ہے اور تمہارے راستے میں لغزش کے بہت خطرناک مقامات ہیں کہ جن سے نجات اُس کے لطف کے بغیر ممکن نہیں۔ اپنے آپ کو اسی کے سپرد کر دو۔

یہ بجا ہے کہ ان احکام کے نزول سے پہلے ان کے بارے میں گناہ کا کوئی مفہوم نہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ جنسی امور سے متعلق بہت سارے مسائل عقلی پہلو رکھتے ہیں اصطلاح کی زبان میں ایسے عقلی مسلمات کو "مستقلات عقلیہ" کہتے ہیں اور یہ وہ مسلمات ہیں کہ جن میں حکمِ عقل ہی ذمہ داری کے لیے کافی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ پردے کا فلسفہ: اس میں شک نہیں کہ ہمارے زمانے میں کہ جسے عریانی اور جنسی آزادی کا زمانہ کہتے ہیں بعض لوگوں کو ہمارا پردے کی بات کرنا سخت ناگوار گزرتا ہے۔ یہ وہی مغرب زدہ بے لگام افراد ہیں کہ جو عورتوں کو زمانے کی آزادی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ کبھی یہ لوگ پردے کو گزشتہ زمانے کی کہانی قرار دیتے ہیں لیکن ان بے لگام آزادیوں نے بے حساب مشکلات اور قباحتوں کو جنم دیا ہے اور روز افزوں مصائب پیدا کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ پردے کی بات سننے والے کان بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

البتہ اسلامی اور مذہبی ماحول میں —— خصوصاً ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد بہت سے مسائل حل ہو گئے ہیں اور اس قسم کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیے گئے ہیں لیکن پھر بھی موضوع کی اہمیت تقاضا کرتی ہے کہ اس مسئلے پر ذرا کھل کر بات کی جائے۔

انتہائی معذرت کے ساتھ —— سوال یہ ہے کہ کیا عورتوں کے بارے میں آزادی ہونی چاہیئے کہ سمع، بصر اور لمس کے حوالے سے رسوائے اختلاطِ جنسی کے، سب مرد اُن سے فائدہ اُٹھائیں اور وہ تمام مردوں کے اختیار میں ہوں یا یہ امور ان کے شوہروں کے ساتھ مخصوص ہوں۔

بحث یہ ہے کہ کیا عورتیں ایک ختم نہ ہونے والے مقابلے میں اپنا تن بدن دکھاتی رہیں، تحریکِ شہوات کے کام آتی رہیں اور ناپاک مردوں کی ہوس پرستی میں گرفتار رہیں یا پھر یہ باتیں معاشرے سے ختم ہو جائیں اور ان کا تعلق بیوی اور شوہر کی گھریلو زندگی سے مخصوص ہو جائے —— اسلام دوسرے طرزِ عمل کا حامی ہے اور اسلام کے اس پروگرام کے لیے پردہ ایک اہم عنصر ہے —— جبکہ

Marfat.com

اہل مغرب اور مغرب زدہ ہوس باز پہلے طرز عمل کے حامی ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ جنسی لذت سمعی حوالے سے ہو یا بصری حوالے سے یا پھر لمس کے ذریعے ـــــ سب بیوی شوہر کے ساتھ مخصوص ہیں اور اگر کچھ اس کے علاوہ ہو تو گناہ اور معاشرے کی ناپاکی کا سبب ہے۔ جیسا کہ زیر بحث آیات میں ہے کہ :

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَـهُـمْ

یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔

پردے کا فلسفہ کوئی راز کی بات نہیں ـــــ کیونکہ :

(۱) عورتوں کی بے پردگی، عریانی اور آرائش مردوں کے لیے ـــ بالخصوص جوانوں کے لیے جنسی تحریک کا باعث ہے اور اگر یہ بے حیائی جاری رہے تو یہ تحریک بھی دائمی ہوگی ـــــ ایسی تحریک کہ جو مردوں کے اعصاب کو شکستہ کر کے رکھ دے گی۔ اس سے اعصابی بیماریاں پیدا ہوں گی۔ یہ کیفیت طبیعت میں ہیجان اور نفسیاتی امراض کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

لیکن آخر انسان کے اعصاب کس قدر ہیجان کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ کیا تمام ماہرین نفسیات نہیں کہتے ہیں کہ مستقل جنسی ہیجان بیماری کا سبب ہے۔

خاص طور پر اس مسئلے کی طرف توجہ رہے کہ انسانی جبلت میں جنسی قوت بہت قوی، پہلو دار اور گہری ہے۔ انسانی تاریخ میں اس نے ہولناک حوادث، جرائم اور مظالم کو جنم دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے کہا ہے کہ کوئی اہم حادثہ تاریخ بشر میں ایسا نہیں ملے گا کہ جس میں عورت کا دخل نہ ہو۔ کیا ایسی قوت و جبلت کو عریانی و فحاشی کے ذریعے ابھارنا اور ہوا دینا آگ سے کھیلنے کے مترادف نہیں ہے؟ کیا یہ عاقلانہ کام ہے؟

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی روحیں پر سکون ہوں، اعصاب صحیح و سالم ہوں، آنکھ اور کان پاکیزہ ہوں ـــــ اور اس کے لیے پردہ ناگزیر ہے۔

(۲) قطعی اور مستند اعداد و شمار سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ عریانی میں اضافے کی وجہ سے دنیا میں طلاق اور ازدواجی زندگی میں علیحدگی کا تناسب بڑھتا چلا جا رہا ہے چونکہ "جو کچھ آنکھ دیکھے دل اسے یاد رکھتا ہے"۔ اور جب ہوا و ہوس کی آگ سرکش ہو جائے اور آنکھ ہر روز نئے نظارے دیکھے تو دل ہر روز کسی نئے محبوب کے پیچھے جاتا ہے اور پہلے کو الوداع کہہ دیتا ہے۔

لیکن جس ماحول میں پردہ ہے (اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر اسلامی شرائط کی بھی پاسداری ہوتی ہے) وہاں بیوی اور شوہر کا ایک دوسرے سے تعلق ہوتا ہے۔ ان کے احساسات، جذبات اور محبتیں ایک دوسرے سے مربوط اور مخصوص ہوتی ہیں ـــ جبکہ عریانی کے آزاد بازار میں کہ جہاں عورت مشترکہ ساز و سامان کی حیثیت رکھتی ہے وہاں ازدواجی عہد و پیمان کا تقدس کوئی مفہوم نہیں رکھتا، وہاں گھرانے تار عنکبوت کی طرح تیزی سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور بچے بے سہارا ہو کر سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

(۳) فحاشی کا پھیلاؤ اور ناجائز اولاد کی کثرت بے پردگی کے دردناک ترین نتائج میں سے ہیں اور یہ بات اس قدر آشکار ہے کہ ہمارے خیال میں اعداد و شمار کی محتاج نہیں ہے اور اس کی وجوہ خصوصاً مغربی معاشروں میں پورے طور پر نمایاں ہیں بلکہ اس قدر عیاں ہیں کہ بیان کی ضرورت نہیں۔

Marfat.com

ہم یہ نہیں کہتے کہ فحاشی اور ناجائز بچوں کا اصلی عامل بے پردگی ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس میں بے شرم استعمار اور تباہ کن سیاسی مقاصد کار فرما نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک عامل بے پردگی اور عریانی ہے۔

اگر اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے تو اس مسئلے کے خطرناک پہلو زیادہ واضح ہو جاتے ہیں کہ فحاشی اور اس سے بھی بڑھ کر ناجائز بچے انسانی معاشروں میں جرائم کا سرچشمہ تھے اور ہیں۔

اعداد و شمار کے مطابق انگلستان میں ہر سال پانچ لاکھ ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ انگلستان کے محققین اور دانشوروں نے اس سلسلے میں ملک کے ارباب بسط و کشاد کو اس مسئلے کے سنگین خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ ان دانشوروں کے مطابق اخلاقی و مذہبی لحاظ سے نہیں بلکہ اس ناجائز اولاد کا وجود معاشرے کے امن و امان کے لیے شدید خطرہ بن چکا ہے یہاں تک کہ جرائم کی بہت سی فائلوں میں انہی کا نام ہوتا ہے۔

اس بات سے ہم اس مسئلے کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ فحاشی و بدکاری کا مسئلہ اُن لوگوں کے لیے بھی شدید کرب انگیز ہو چکا ہے کہ جو مذہب و اخلاق کی کسی اہمیت کے قائل نہیں۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو انسانی معاشرے میں جنسی بے راہ روی کے پھیلنے کا موجب ہو وہ امن و امان کے لیے خطرہ شمار ہوگی اور ہر لحاظ سے اس کے نتائج معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوں گے۔

تربیتی امور کے محققین کا مطالعہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جن تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ہے اور جن مراکز میں عورت اور مرد مل کر کام کرتے ہیں اور ان کا میل جول آزاد ہے وہاں کام کی رفتار اور معیار کم ہے اور احساس ذمہ داری بھی کم ہے۔

(۴) بے پردگی اور عریانی عورت کے مقام کے زوال کا بھی باعث ہے۔ اگر معاشرہ عورت کو عریاں بدن دیکھنا چاہے گا تو فطری بات ہے کہ ہر روز اُس سے آرائش کا تقاضا بڑھتا جائے گا اور اس کی نمائش میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جب عورت جنسی کشش کی بناء پر ساز و سامان کی تشہیر کا ذریعہ بن جائے گی، انتظار گاہوں میں دل بہلاوا ہو جائے گی اور سیاحوں کو متوجہ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی تو معاشرے میں اس کی حیثیت ایک کھلونے یا بے قیمت مال و اسباب تک گر جائے گی اور اس کے شایانِ شان انسانی اقدار فراموش ہو جائیں گی اور اس کا اعزاز و افتخار صرف اس کی جوانی، زیبائش اور نمائش تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اس طرح سے وہ چند ناپاک فریب کار انسان نما درندوں کی سرکش ہوا و ہوس پوری کرنے کے ذریعے میں بدل جائے گی۔

ایسے معاشرے میں ایک عورت اپنی اخلاقی خصوصیات، علم و آگہی اور بصیرت کے مظاہرے کیسے کر سکتی ہے اور کوئی بلند مقام کیسے حاصل کر سکتی ہے؟

واقعاً یہ بات تکلیف دہ ہے کہ مغربی اور مغرب زدہ ممالک میں عورت کا مقام کس قدر گر چکا ہے۔ خود ہمارے ملک ایران میں انقلاب سے پہلے یہ حالت تھی کہ نام شہرت، دولت اور حیثیت ان چند ناپاک اور بے لگام عورتوں کے لیے تھی کہ جو "فنکارہ" اور آرٹسٹ کے نام سے مشہور تھیں۔ جہاں وہ قدم رکھتی تھیں اُس گندے ماحول کے ذمہ دار اُن کے لیے آنکھیں بچھاتے اور انہیں خوش آمدید کہتے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ایران میں وہ بساط لپیٹ دی گئی اور عورت اپنے اس دور سے نکل آئی ہے جس میں اُسے رسوا کر دیا گیا تھا اور وہ فرنگی کھلونے اور بے مول ساز و سامان بن کر رہ گئی تھی۔ اب اس نے اپنا مقام و وقار دوبارہ حاصل کر لیا ہے اور اپنے آپ کو

Marfat.com

پردے سے ڈھانپ لیا ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ گوشہ نشین ہوگئی ہے بلکہ معاشرے کے تمام مفید اور اصلاحی کاموں میں حتیٰ کہ میدان جنگ میں اسی اسلامی پردے کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

پردے کے مخالفین کے اعتراضات

اب ہم کچھ ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں کہ جو پردے کے مخالفین پیش کرتے ہیں:

(۱) اس بنیادی اعتراض پر پردے کے سب معترضین کا اتفاق ہے کہ عورتیں معاشرے کا نصف حصّہ ہیں لیکن پردہ معاشرے کی اتنی بڑی آبادی کو گوشہ نشین بنا کر رکھ دیتا ہے اور اس طرح سے انہیں فکری، تمدنی اور ثقافتی لحاظ سے پیچھے دھکیل کر پس ماندہ کر دیتا ہے خصوصاً اس اقتصادی دوڑ کے زمانے میں فعال انسانی قوتوں کی ضرورت زیادہ ہے لیکن پردے کی صورت میں اس اقتصادی دوڑ میں عورتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جبکہ ثقافتی اور سماجی مراکز میں بھی اُن کی جگہ اس طرح خالی رہے گی۔ اس طرح سے عورتیں معاشرے کا غیر پیداواری حصّہ بن کر ایک بوجھ بن جائیں گی۔

لیکن ——— یہ اعتراض کرنے والے چند امور سے بالکل غافل ہیں یا جان بوجھ کر تغافل برتتے ہیں۔ کیونکہ،

اوّلاً کون کہتا ہے کہ اسلامی پردہ عورت کو گوشہ نشین بنا دیتا ہے اور اسے معاشرے کے منظر سے دور پھینک دیتا ہے گزشتہ زمانے میں شاید ضروری تھا کہ اس سلسلے میں ہم استدلال پیش کریں لیکن آج انقلابِ اسلامی کے بعد تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم خود دیکھتے ہیں کہ عورتیں گروہ در گروہ اسلامی پردے کے اندر ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ دفتروں، کارخانوں، سیاسی مظاہروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ہسپتال اور مراکز صحت میں خصوصاً جنگ کے زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے اور اسی طرح میدان ثقافت میں اور تعلیمی اداروں میں یہاں تک کہ دشمن سے جنگ کے میدان میں ہر کہیں عورتیں موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ——— یہ کیفیت ان تمام اعتراضات کا دندان شکن جواب ہے۔ انقلاب سے پہلے اگر ہم "امکان" پر بات کرتے تھے تو آج اس کا "وقوع" اور "موجودگی" ہمارے سامنے ہے اور فلاسفہ نے کہا ہے کہ کسی شے کے امکان کی بہترین دلیل اس کا وقوع ہے۔ اور یہ آج ایسا آشکار ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

ثانیاً کیا گھر کو چلانا، بچوں کی تربیت کرکے انہیں آبرومند بنانا اور ایسے انسان تیار کرنا کہ جو آئندہ اپنے توانا بازوؤں سے معاشرے کے عظیم پہیوں کو چلا سکیں کوئی کام نہیں؟

جو لوگ عورت کی اس عظیم خدمت کو مثبت کام شمار نہیں کرتے وہ اس امر سے بے خبر ہیں کہ ایک خاندان ایک صحیح و سالم اور آباد و متحرک معاشرے کی تعمیر میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔

وہ خیال کرتے ہیں کہ بس یہی صحیح راستہ ہے کہ ہمارے مرد اور عورتیں مغربی مَردوں اور عورتوں کی طرح صبح سویرے گھر سے نکلیں بچوں کو پرورش گاہوں کے سپرد کریں یا گھر میں چھوڑ کر دروازے بند کر جائیں اور خود دفتر یا کارخانے کی طرف روانہ ہو جائیں اور اُن اَن کھلی کلیوں کو اسی عمر سے قید خانے کا تلخ ذائقہ چکھنے کے لیے چھوڑ جائیں۔

یہ لوگ اس امر سے غافل ہیں کہ یہ عمل بچوں کی شخصیت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس طرح سے بے روح انسانی احساسات

Marfat.com

سے عاری بچے پروان چڑھتے ہیں کہ جو معاشرے کے لیے بوجھ ہی نہیں بلکہ اس کے مستقبل کے لیے خطرہ بھی ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ پردہ ہاتھ پاؤں کو باندھ دینے والا لباس ہے اور بھاگ دوڑ اور کام کاج میں بالخصوص جدید مشینی دور میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ایک عورت آخر اپنی حفاظت کرے، اپنی چادر سنبھالے، بچے کو سنبھالے یا اپنا کام کاج کرے؟

لیکن یہ اعتراض کرنے والے ایک نکتے سے غافل ہیں اور وہ یہ کہ پردہ ہمیشہ چادر اور بُرقعے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایسا لباس جو پورے جسم کو ڈھانپ دے وہی پردہ ہے۔ اگر چادر سے ہو تو کیا ہی بہتر اور جہاں چادر سے نہ ہو تو مکمل پہناوے پر قناعت ہو جائے گی۔

ہماری کسان اور دیہاتی عورتیں کاشت اور کٹائی کا کام کرتی ہیں۔ دھان کے کھیتوں میں اُن کا کام کچھ زیادہ ہی مشکل ہوتا ہے انہوں نے یہ اہم اور مشکل کام اسلامی پردے کے ساتھ انجام دے کر ان اعتراضات کا جواب دے دیا ہے اور اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ ایک دیہاتی عورت اسلامی پردے کے ساتھ بعض اوقات مردوں سے بھی زیادہ اور بہتر کام کرتی ہے اور اس کام میں اس کا پردہ ہرگز رکاوٹ نہیں بنتا۔

(۳) ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ پردہ عورتوں اور مردوں کے درمیان حائل ہو کر مردوں کو زیادہ حریص بنا دیتا ہے۔ اس سے اُن کے حرص کی آگ بجھنے کی بجائے اور بھڑک اُٹھتی ہے کیونکہ:

الانسان حریص علی ما منع

جس چیز سے انسان کو روکا جائے اُس پر زیادہ حریص ہوتا ہے۔

اس سوال کا جواب یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس مغالطے کا جواب ہمارے آج کا ایرانی معاشرہ ہے۔ آج پردہ بلا استثناء ہمارے تمام معاشرے میں اور تقریباً تمام مراکز میں موجود ہے۔ اس دَور کا مقابلہ سابقہ شہنشاہی طاغوتی دَور سے کیا جا سکتا ہے جبکہ اُس زمانے میں عورتوں سے پردہ زبردستی اتروایا گیا تھا۔

اُس زمانے میں ہر گلی کوچہ مرکزِ گناہ تھا۔ گھرانوں اور خاندانوں کی عجیب بے لگام زندگی تھی۔ طلاق معاشرے میں انتہائی زیادہ ہو چکی تھی۔ ناجائز بچوں کی شرح پیدائش بہت بڑھ چکی تھی اور اسی طرح کی ہزار ہا بدبختیاں تھیں۔

ہم نہیں کہتے کہ ان میں سے ہر چیز بنیاد سے بالکل اُکھڑ گئی ہے لیکن بلاشبہ ان بدبختوں میں بہت زیادہ کمی آئی ہے اور اس اعتبار سے سلامتی ہمارے معاشرے میں لوٹ آئی ہے اور انشاء اللہ اگر حالات اسی صورت پر رہے اور بچی کھچی تباہیاں بھی ختم ہو گئیں تو ہمارا معاشرہ خاندانوں کی پاکیزگی اور عورت کی قدر و منزلت کے تحفظ کے لحاظ سے منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔

۲۔ چہرے اور ہاتھوں کا استثناء: اس سلسلے میں کہ کیا چہرے اور کلائیوں سے نیچے ہاتھوں کے لیے بھی پردے کا حکم ہے یا نہیں ـــ اس سلسلے میں فقہا میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس پر بہت بحث کی گئی ہے۔

بہت سے فقہاء کا نظریہ ہے کہ منہ اور ہاتھوں کا چھپانا پردے کے حکم سے مستثنیٰ ہے جب کہ بعض کا فتویٰ ہے کہ

Marfat.com

ان کا چھپانا بھی واجب ہے یا کم از کم احتیاط کے مطابق ہے۔ البتہ جو فقہا ان دونوں کا چھپانا واجب نہیں سمجھتے وہ بھی یہ شرط لگاتے ہیں کہ جب ان کا نہ چھپانا گناہ و انحراف کا سبب بنتا ہو تو ان کا چھپانا واجب ہے۔

زیر بحث آیت میں اس استثناء کے قرائن موجود ہیں کہ جن سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً:

(ا) زیر بحث آیت میں زینتِ ظاہر کو مستثنیٰ کیا گیا ہے چاہے یہ مقامِ زینت کے معنی میں ہو یا خود زینت کے معنی میں۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ چہرہ اور دونوں ہاتھوں کا چھپانا واجب نہیں ہے۔

(ب) زیر بحث آیت میں چادر کا ایک پلو گریبان پر ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام سر، گردن اور سینہ چھپایا جائے۔ اس میں مُنہ کے چھپانے کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ یہ ہمارے بیان کردہ مفہوم کی تائید کے لیے ایک اور قرینہ ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جیسا کہ شانِ نزول میں بھی ہم نے بیان کیا ہے کہ اُس زمانے میں عرب عورتیں دوپٹہ یا چادر اوڑھا کرتی تھیں۔ اس کے آنچل وہ دوش پر اور پس گردن ڈال لیتی تھیں۔ اس طرح سے چادر اُن کے کانوں کے پیچھے ہوتی تھی سر اور گردن کی پشت کا حصہ چھپا ہوتا تھا لیکن گلے کے نیچے کا کچھ حصہ اور سینے کا کچھ حصہ جو گریبان کے اُوپر ہوتا تھا وہ نمایاں رہتا تھا۔ اسلام آیا تو اُس نے اس کیفیت کی اصلاح کی۔ اسلام نے حکم دیا کہ عورتیں چادر کا پلو کان کے نیچے یا سر کے پیچھے سے آگے لے آئیں اور اسے گریبان اور سینے کے اُوپر ڈالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چہرہ کھلا رہ گیا اور باقی سب کچھ چھپ گیا۔

(ج) کتبِ حدیث میں اس سلسلے میں بہت سی روایات موجود ہیں کہ جو ہمارے دعویٰ پر زندہ دلیل ہیں[1] اگرچہ ان کی معارض روایات بھی ہیں مگر ان میں اس حد تک صراحت نہیں ہے۔

ایسی دونوں طرح کی روایات کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ جن روایات میں چہرہ اور ہاتھ چھپانے کی بات ہے انہیں مستحب حکم سمجھا جائے یا اس حکم کو ان مواقع کے لیے سمجھا جائے کہ جہاں گناہ، بُرائی اور انحراف کا اندیشہ ہو۔

تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں عورتیں عموماً چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی تھیں (اس مسئلے کی روایات پر نیز اس کے مختلف فقہی پہلوؤں پر تفصیلی بحث کے لیے کتب فقہ کا باب نکاح دیکھیے)۔

ہم ایک مرتبہ پھر تاکید کرتے ہیں کہ چہرے اور ہاتھوں کے کھلے رہنے کی اجازت اس صورت میں ہے جب ایسا کرنا سوئے استفادہ اور انحراف کا سبب نہ بنے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے پردے سے استثنیٰ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز ہے کہ دوسرے رگ جان بوجھ کر دیکھتے رہیں بلکہ درحقیقت یہ عورتوں کے لیے امورِ زندگی میں سہولت کی خاطر ہے۔

۲۔ "نسائهن" سے کون مراد ہیں؟ جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں پڑھا ہے کہ ذواں گروہ جس کے سامنے عورت کو زینت ظاہر کرنے کی اجازت دی گئی ان عورتوں کا ہے جنہیں "نسائهن" (ان کی عورتیں) کہا گیا ہے۔

---

[1] کتاب وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۱۴۵ باب ۱۰۹ از ابواب مقدمات نکاح۔

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمان عورتوں کے سامنے اپنا پردہ اتار سکتی ہیں لیکن غیر مسلم عورتوں کے سامنے انہیں اسلامی پردے میں جانا چاہیئے۔ اس حکم کا فلسفہ جیسا کہ روایات میں آیا ہے یہ ہے کہ ممکن ہے وہ عورتیں واپس جاکر مسلمان عورتوں کے بارے میں جو کچھ انھوں نے دیکھا اس کی تعریف اپنے شوہروں کے سامنے کریں اور یہ بات مسلمان عورتوں کے حق میں درست نہیں ہے۔

کتاب "من لا یحضر" میں ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لاینبغی للمرأة ان تنکشف بین یدی الیھودیة والنصرانیة، فانھن یصفن ذٰلک لازواجھن

مناسب نہیں ہے کہ مسلمان عورت کسی یہودی اور عیسائی عورت کے سامنے عریاں ہو کیونکہ جو کچھ وہ دیکھیں گی اپنے شوہروں سے بیان کریں گی[1]

۴۔ "او ما ملکت ایمانھن" کی تفسیر: ظاہری الفاظ کے اعتبار سے یہ جملہ وسیع مفہوم رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ عورت اپنے غلام و مملوک کے سامنے بے پردہ آسکتی ہے لیکن بعض احادیث میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اس سے مراد کنیزوں کے سامنے بے پردہ آنا ہے، چاہے وہ غیر مسلم ہی ہوں اور اس کے مفہوم میں غلام شامل نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لاینظر العبد الی شعر مولاته

غلام اپنی آقا عورت کے بال نہیں دیکھ سکتا[2]

البتہ کچھ روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے اس لفظ کی عمومیت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ عمومیت خلافِ احتیاط ہے۔

۵۔ "اولی الاربة من الرجال" کی تفسیر: "اربہ" بنیادی طور پر "ارب" (بروزن "عرب") مفردات میں بقول راغب شدتِ احتیاج کے معنی میں ہے کہ جسے پورا کرنے کے لیے انسان کوشش کرتا ہے اور کبھی یہ لفظ مطلق حاجت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اور "اولی الاربة من الرجال" سے یہاں ایسے مرد مراد ہیں کہ جو جنسی خواہش اور بیوی کی ضرورت رکھتے ہوں۔ لہٰذا "غیر اولی الاربة من الرجال" سے ایسے مرد مراد ہیں کہ جو یہ میلان اور خواہش نہ رکھتے ہوں۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ بعض اس سے وہ بوڑھے افراد مراد لیتے ہیں کہ جن کے جنسی جذبات ختم ہو چکے ہوں۔ جیسے "القواعد من النساء" (ایسی عورتیں جو شادی کے قابل نہیں رہ گئی ہوتیں اور اس لحاظ سے بیٹھ چکی ہوتی ہیں)۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے خسرے اور خواجہ سرا مراد ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۹۳، بحوالہ "من لا یحضرہ الفقیہ"

[2] وسائل الشیعہ ب ۱۲۴ از مقدمات نکاح، حدیث ۸

Marfat.com

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے افراد ہیں کہ جو آلۂ تناسل نہیں رکھتے۔

لیکن جس معنی پر زیادہ افراد کا اتفاق ہے اور جو امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے چند معتبر احادیث میں نقل ہوا ہے یہ ہے کہ اس سے مراد ایسے بے سمجھ مرد ہیں کہ جو ہرگز احساسِ جنسی نہیں رکھتے اور عام طور پر اُن سے آسان سے کام لیے جاتے ہیں آیت میں "التابعین" کی تعبیر بھی اسی معنی کو تقویت دیتی ہے۔[1]

البتہ چونکہ یہ وصف یعنی جنسی میلان نہ ہونا بعض بوڑھے افراد پر بھی صادق آتا ہے لہٰذا بعید نہیں کہ آیت کے مفہوم میں ایسے بوڑھے افراد بھی شامل ہوں۔ ایک حدیث میں امام کاظم علیہ السلام نے بھی ایسے بوڑھوں کو اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔

لیکن بہرحال آیت کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے مرد محرموں کی طرح ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ ایسے افراد سے سر، ہاتھ یا بازو کا کچھ حصہ یا جسم کا کوئی ایسا حصہ چھپانا واجب نہیں ہے۔

۶۔ کون سے بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں؟ ہم پڑھ چکے ہیں کہ بارہواں گروہ جس سے پردہ کرنا واجب نہیں ہے وہ بچے ہیں کہ جنہیں ابھی تک جنسی امور کی تمیز نہیں۔ "لم یظھروا" کا معنی کبھی "لم یطلعوا" (آگاہی نہیں رکھتے) کیا گیا ہے اور کبھی "لم یقدروا" (طاقت نہیں رکھتے) کیا گیا ہے کیونکہ یہ مادہ ان دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی یہ مادہ دونوں مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ کہف کی آیت ۲۰ میں ہے:

ان یظھروا علیکم یرجموکم

اگر اہلِ شہر کو تمہاری موجودگی کا پتہ چل گیا تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

نیز سورہ توبہ کی آیت ۸ میں ہے:

کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ

تم عہد و پیمان توڑنے والوں سے کیسے جنگ نہیں کرتے ہو حالانکہ اگر وہ تم پر قدرت حاصل کر لیں تو نہ رشتہ داری کا لحاظ رکھیں اور نہ عہد و پیمان کا۔

بہرحال زیرِ بحث آیت میں نتیجے کے لحاظ سے ان دونوں معانی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مراد ایسے بچے ہیں کہ جو جنسی احساس نہ ہونے کی بناء پر نہ توانائی رکھتے ہیں اور نہ آگاہی۔ لہٰذا ایسے بچے کہ جو اس عمر کو پہنچ گئے ہیں کہ ان میں یہ میلان اور توانائی پیدا ہو چکی ہے مسلمان عورتوں کو اُن سے پردہ کرنا چاہیے۔

۷۔ چچا اور ماموں کو محارم میں کیوں شمار نہیں کیا گیا؟ اس آیت سے جو سوالات اُبھرتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے چچا اور ماموں کو محارم کی فہرست میں شمار نہیں کیا گیا حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ بھی محرم ہیں اور اُن سے بھی پردہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جواہر الکلام ج ۲۹ ص ۹۴ کے بعد اور اسی طرح وسائل الشیعہ باب ۱۱۱ از ابواب نکاح (ج ۱۴ ص ۱۴۵) اور اسی طرح تہذیب ج ، ص ۴۶۸ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ قرآن اپنے مطالب کو نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک لفظ بھی اضافی استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ بھتیجے اور بھانجے کو مستثنیٰ قرار دینا نشاندہی کرتا ہے کہ پھوپھی، خالہ اور ممانی بھی محرم ہیں۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ عورت کا چچا اور پھوپھا اور ماموں بھی اس کے محرم ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ محرم ہونے کے دو پہلو ہیں۔ لہٰذا ایک پہلو سے جب بھانجے اور بھتیجے محرم ہیں تو فطری سی بات ہے کہ دوسرے پہلو سے اُن کے باپ بھی محرم ہوں گے (غور کیجئے گا)۔

۸۔ جنسی جذبات کو تحریک دینے والے تمام عوامل ممنوع ہیں: زیر بحث آیت کے حوالے سے آخری گفتگو اس مسئلے کے بارے میں ہے کہ آیت کے آخر میں آیا ہے کہ عورتیں راہ چلتے ہوئے اس طرح سے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ اُن کی پازیبوں کی جھنکار سُنائی دے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام عفت و پاکدامنی کے مسئلے میں اس قدر حساس ہے اس قسم کے کام کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بطریق اولیٰ اسلام اُن تمام عوامل کی ممانعت کرتا ہے کہ جوانوں کے جنسی جذبات کو اُبھاریں مثلاً عریاں و فحش تصویروں کی اشاعت، گمراہ کن لٹریچر اور جنسی فلمیں اور ایسی داستانیں وغیرہ کی نشر و اشاعت کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلام اُن تمام چیزوں کا مخالف ہے کہ جو نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو گمراہی، بدکاری اور گناہ کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اسلام خریداری کے مراکز اور بازاروں کو ان چیزوں سے پاک کر دینا چاہتا ہے۔

Marfat.com

۳۲۔ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَ
اِمَآئِکُمْ ؕ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ وَ
اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○
۳۳۔ وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغْنِیَھُمُ
اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ
اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْرًا ۖ وَّاٰتُوْھُمْ
مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ ؕ وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ
اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ؕ وَمَنْ یُّکْرِھْھُّنَّ
فَاِنَّ اللّٰہَ مِنْ بَعْدِ اِکْرَاھِھِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○
۳۴۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ
خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ وَمَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ ع

ترجمہ

۳۲۔ غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کردو اور اسی طرح اپنے نیک غلاموں اور کنیزوں کو بھی بیاہ دو، اگر وہ تنگ دست ہوئے تو اللہ اپنے فضل سے انھیں غنی کردے گا، اللہ بہت صاحبِ وسعت اور علیم ہے۔

۳۳۔ اور جن کے پاس شادی کرنے کا موقع اور ذریعہ نہیں انھیں عفت و پاکدامنی اپنانا چاہیے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں بھی غنی کردے اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت (آزادی کے لیے ایک خاص قرارداد) کی درخواست کریں تو ان سے مکاتبت کرلو اگر تم ان میں رشد اور بھلائی محسوس کرو (اور یہ سمجھو کہ آزادی کے بعد وہ استقلال کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے) اور اللہ نے تمھیں جو مال دیا ہے

Marfat.com

اس میں سے کچھ انھیں دے دو اور متاعِ دنیا کے لیے اپنی کنیزوں کو عصمت فروشی پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہتی ہیں اور جو کوئی انھیں اس کام پر مجبور کرے (پھر اس پر پشیمان ہو) تو اس جبر کے بعد اللہ غفور رحیم ہے (لہٰذا توبہ کرو اور اس شرمناک عمل کو ہمیشہ کے لیے ترک کردو)۔

۳۴۔ ہم نے تمھاری طرف کچھ آیات بھیجی ہیں کہ جو بہت سے حقائق واضح کرتی ہیں اور وہ ان لوگوں کی خبریں ہیں کہ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہیں۔

تفسیر

آسان شادی بیاہ کی ترغیب

اس سورہ کے آغاز سے لے کر یہاں تک جنسی آلودگیوں سے بچنے کے لیے مختلف طریقوں سے نہایت جچے تُلے انداز میں گفتگو کی گئی ہے ان میں سے ہر طریقہ اور حکم ان برائیوں کو روکنے کے لیے اپنے مقام پر مؤثر ہے۔ زیرِ بحث آیات میں ایک اور اہم حوالے سے فحاشی اور برائی کا قلع قمع کرنے کے لیے اقدام کیا گیا اور وہ شادی بیاہ کا سادہ، آسان اور بے ریا طریقہ۔ یہ بات مسلّم ہے کہ بدکاری اور فحاشی کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ صحیح اور جائز طریقے سے انسان کی فطری ضرورت کو پورا کیا جائے۔

لہٰذا زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کر دو اور اسی طرح نیک غلاموں اور کنیزوں کی بھی (وانکحوا الایامٰی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم)۔

"ایامٰی" "ایم" (بروزن "قیم") کی جمع ہے۔ بنیادی طور پر تو یہ لفظ بے شوہر عورت کے معنی میں تھا لیکن بعد ازاں اس مرد کے لیے بھی استعمال ہونے لگا کہ جو بیوی کے بغیر ہو۔ اس لحاظ سے تمام مجرّد عورتیں اور مرد اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں چاہے وہ کنوارے ہوں یا نہ ہوں۔

یہاں لفظ "انکحوا" (ان کا نکاح کرو) استعمال کیا گیا ہے حالانکہ شادی ایک اختیاری کام ہے اور طرفین کی رغبت و رضامندی سے وابستہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کی شادی کے لیے راہ ہموار کرو، احتیاج کی صورت میں مالی امداد کرو، مناسب رشتے کی تلاش میں مدد دو اور ایسے مردوں اور عورتوں کو شادی پر آمادہ کرو۔ خلاصہ یہ کہ معاملات اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرو، کیونکہ ایسے کام عموماً دوسروں کی وساطت کے بغیر انجام نہیں پاتے۔ مختصر یہ کہ آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی مدد شامل ہے۔

بلاشبہ تعاون کے بارے میں اسلام کا بنیادی اصول تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان تمام امور میں ایک دوسرے کی مدد کریں لیکن شادی بیاہ کے بارے میں تعاون کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

Marfat.com

اس مسئلے کی اس قدر اہمیت ہے کہ ایک حدیث میں امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

افضل الشفاعات ان تشفع بین اثنین فی نکاح حتی یجمع اللہ بینھما

بہترین تعاون یہ ہے کہ تو دو افراد کے درمیان شادی کے لیے ملاپ کردے یہاں تک کہ معاملہ تکمیل کو پہنچ جائے[1]

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم بن جعفر (علیہما السلام) سے مروی ہے کہ :۔

ثلاثۃ یستظلون بظل عرش اللہ یوم القیمۃ، یوم لا ظل الا ظلہ، رجل زوج اخاہ المسلم او اخدمہ، او کتم لہ سرًا۔

قیامت کے دن کہ جب عرشِ الٰہی کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا تین گروہ اس کے سایے میں ہوں گے۔ ایک وہ کہ جو اپنے مسلمان بھائی کی شادی کے لیے وسائل فراہم کرے گا اور دوسرا وہ کہ جو خدمت کی ضرورت کے وقت اسے خدمت گار مہیا کرے گا اور تیسرا وہ کہ جو اپنے مسلمان بھائی کے راز کو چھپائے رکھے گا[2]

ایک حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے :۔

کان لہ بکل خطوۃ خطاھا، او بکل کلمۃ تکلم بھا فی ذٰلک، عمل سنۃ قیام لیلھا وصیام نہارھا

جتنے قدم بھی (کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی بہن کی شادی کی) راہ میں اٹھائے گا اور جتنے لفظ بھی اس مقصد کے لیے ادا کرے گا ہر ایک کے بدلے اسے اس ایک سال کی عبادت کا ثواب ملے گا کہ جس میں رات بھر عبادت کے لیے قیام کیا گیا ہو اور دن کو روزہ رکھا گیا ہو[3]

عموماً شادی نہ کرنے اور اس سے بھاگنے کے لیے تنگ دستی اور غربت کا عذر پیش کیا جاتا ہے اس لیے قرآن اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے "غربت کی وجہ سے پریشان نہ ہونا اور ان کی شادی کی کوشش کرنا کیونکہ اگر وہ تنگدست ہوئے تو اللہ اپنے فضل کے ذریعے انھیں بے نیاز کردے گا" (ان یکونوا فقرآء یغنھم اللہ من فضلہ)۔

اور اللہ ایسے کام پر قادر ہے کیونکہ وہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور علیم ہے (واللہ سمیع علیم) اس کی

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ صفحہ ۲۷ (باب ۱۲ از ابواب مقدمات نکاح)

[2] ایضاً

[3] ایضاً

Marfat.com

قدرت اتنی وسیع ہے کہ عالم ہستی پر محیط ہے اور اس کا علم اتنا وسیع ہے کہ وہ تمام نیتوں سے آگاہ ہے جو پاکدامنی کی حفاظت کے لیے شادی کرتے ہیں ان کی نیتوں کو خوب جانتا ہے اور وہ ان سب پر اپنا فضل و کرم کرے گا۔

اس سلسلے میں ایک واضح تجزیہ اور متعدد روایات ہم بحث کے آخر میں پیش کریں گے۔

* * *

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ انسان خود بھی پوری کوشش کرتا ہے اور دوسرے بھی پوری سعی کرتے ہیں لیکن پھر بھی شادی نہیں ہو پاتی اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ محروم رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مرحلے پر کچھ لوگ یہ گمان کرنے لگیں کہ اب ان کیلیے جنسی آلودگی جائز ہے اور ضرورت اس کا تقاضا کرتی ہے لہذا ساتھ ہی اگلی آیت میں پاکیزگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: اور وہ کہ جو شادی نہیں کر پاتے اور ان کے لیے وسیلہ نہیں بن جاتا انھیں عفت و پاکدامنی اختیار کرنا چاہیے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل کے ذریعے انھیں بے نیاز کردے (ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحًا حتّٰی یغنیھم اللہ من فضلہ)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس بحرانی مسئلے میں اور خدائی آزمائش کے دور میں برائی کے لیے تیار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو معذور سمجھنے لگو کیونکہ ایسا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ اس موقع پر ایمان اور تقویٰ کی قوت کام آنا چاہیے۔

* * *

جہاں بھی غلاموں اور کنیزوں کے بارے میں گفتگو ہو، موقع کی مناسبت سے اسلام ان کی آزادی کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے لہذا یہاں بھی ان کی شادی کی بات آئی تو ساتھ ہی "مکاتبت" کے طریقے سے ان کی آزادی کا ذکر بھی آگیا ہے۔

مکاتبت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک قرارداد کے ذریعے غلام کام کرتے ہیں اور قسط وار اپنے مالک کو رقم فراہم کرتے ہیں اور اس طرح آزاد ہو جاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: جو غلام آزادی کے لیے تم سے مکاتبت کا تقاضا کرتے ہیں ان کے ساتھ معاہدہ طے کرلو۔ اگر ان میں تم رشد اور بھلائی محسوس کرو۔ (والذین یبتغون الکتاب مما ملکت ایمانکم فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرًا)۔

"علمتم فیھم خیرًا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دیکھو کہ اس معاہدے کے لیے ان میں کافی رشد و ہدایت موجود ہے اور پھر وہ اس پر عمل درآمد کی طاقت بھی رکھتے ہوں اور معاہدے کے مطابق مال ادا کرکے آزادی کی زندگی گزار سکنے کے اہل ہوں اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے اور یہ کام مجموعی طور پر ان کے حق میں نقصان دہ ہو اور نتیجۃً وہ معاشرے کے لیے بوجھ بن رہے ہوں تو پھر یہ معاملہ کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھو کہ جب ان میں یہ صلاحیت اور طاقت ہو۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ یہ اقساط ادا کرتے ہوئے غلاموں کو زیادہ زحمت و مشقت نہ ہو، قرآن حکیم حکم دیتا ہے: جو مال اللہ نے تمھیں دیا ہے اس میں سے کچھ انھیں دو (واٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتاکم)۔

جو مال غلاموں کو دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے کون سا مال مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے

Marfat.com

زیادہ تر کہتے ہیں کہ مراد زکوٰۃ کا ایک حصّہ ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں آیا ہے انھیں دیا جائے تاکہ وہ اپنا قرض ادا کرسکیں اور آزاد ہوجائیں۔

بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ غلام کا مالک چند قسطیں اسے بخش دے یا اگر لے چکا ہے تو اسے واپس کر دے تاکہ وہ غلامی سے نجات کے لیے زیادہ توانائی حاصل کرلے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ چونکہ کام کے آغاز میں غلام اس قابل نہ ہوگا کہ مال مہیا کرسکے لہٰذا اخراجات میں اس کی مدد کرنا چاہیے اور کچھ سرمایہ انھیں دینا چاہیے تاکہ وہ کوئی کام کاج شروع کرسکیں، اپنا نظام بھی چلا سکیں اور اپنے قرض کی اقساط بھی ادا کرسکیں۔

البتہ مذکورہ تینوں تفاسیر باہم ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کہ تمام مفہوم آیت میں جمع ہوں۔ حقیقی مقصد یہ ہے کہ مسلمان ان مستضعف و محروم افراد کی کچھ اس طرح سے مدد کریں کہ یہ جتنا جلدی ممکن ہوسکے غلامی سے نجات پالیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السّلام نے فرمایا:۔

تضع عنه من نجومه التی لم تکن ترید ان تنقصه، ولا تزید فوق ما فی نفسك

جس چیز کے لینے کا واقعتاً تیرا خیال ہو تخفیف تجھے اس میں سے کرنا چاہیے[1]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض لوگ شرعی حیلے بناتے ہیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ ہم نے قرآن کی اس آیت پر عمل کرتے ہوئے اپنے غلاموں کی مدد کی ہے وہ پہلے ہی سے مکاتبت کی رقم جتنی انھیں لینا ہوتی اس سے زیادہ لکھ لیتے تھے تاکہ تخفیف کرتے وقت زیادہ لکھی ہوئی رقم چھوڑ دیں۔ امام صادق علیہ السّلام دراصل اس طرزِ عمل سے منع فرما رہے ہیں۔

بعض لوگ اپنے مملوکوں سے ایک نہایت ہی قبیح کام لیتے تھے۔ زیر بحث آیت کے آخر میں اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: دنیا کے زودگزر مال کی خاطر اپنی کنیزوں کو عصمت فروشی پر مجبور نہ کرو، جبکہ وہ پاک و پاکیزہ رہنا چاہتی ہیں (ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنًا لتبتغوا عرض الحیٰوۃ الدنیا)۔

اس جملے کی تفسیر میں بعض مفسرین نے لکھا ہے:۔

عبداللہ بن ابی کے پاس چھ کنیزیں تھیں، وہ مال کمانے کے لیے انھیں جسم فروشی پر مجبور کرتا تھا جس وقت (اس سورہ میں) اسلام نے منافیِ عفت عمل کی مخالفت کی اور انھیں ختم کرنے کے لیے اقدام کیا تو وہ کنیزیں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس مسئلے کی شکایت کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کام سے منع کیا گیا۔[2]

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کس قدر اخلاقی پستی میں مبتلا تھے۔ حتیٰ کہ ظہور اسلام کے بعد بھی بعض لوگ

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳ ص ۶۰۱

[2] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی (کچھ فرق کے ساتھ)

Marfat.com

ایسے کام جاری رکھے ہوئے تھے یہاں تک کہ اس آیت نے نازل ہو کر اس شرمناک کیفیت کو ختم کیا۔

لیکن ــــــ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے زمانے میں کہ جسے بعض بیسویں صدی کا زمانہ جاہلیت قرار دیتے ہیں ۔ بعض ممالک میں یہ کام بڑے شد و مد سے جاری ہے ان میں سے نام نہاد متمدن اور ترقی یافتہ ملک بھی ہیں اور وہ حقوق انسانی کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں۔ زمانہ طاغوت میں یہ کام ہمارے ملک میں بھی وحشت ناک صورت میں موجود تھا معصوم اور سیدھی سادھی لڑکیوں کو فریب دے کر بدکاری کے اڈوں میں لے جاتے تھے اور پھر انھیں بڑے شیطانی پھندوں میں جکڑ کر تن فروشی پر مجبور کرتے تھے۔ اور ان پھندوں سے نکل بھاگنے کے راستے ان پر ہر طرف سے بند کر دیتے تھے۔ اس طریقے سے وہ بے شمار دولت جمع کرتے تھے ــــــ اس داستان کی تفصیل بہت دردناک ہے اور ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔

اگرچہ ظاہراً غلامی کا پرانا نظام موجود نہیں ہے لیکن آج کی نام نہاد مہذب دنیا میں ایسے ایسے جرائم ہوتے ہیں کہ جو دورِ غلامی سے کہیں زیادہ وحشت ناک ہیں۔ خدا دنیا کے لوگوں کو ان نام نہاد مہذب انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد ہمارے ملک میں ان شرمناک اعمال کا خاتمہ ہو گیا ہے ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ " ان اردن تحصنا " (اگر وہ پاک رہنا چاہتی ہیں .....) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر خود وہ عورتیں اس کام کی طرف مائل ہوں تو پھر انھیں مجبور کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس طرح کی تعبیر " منتفی بہ انتفاء موضوع " کہلاتی ہے کیونکہ " اکراہ " (مجبور کرنا) عدم رضامندی کی صورت میں صادق آتا ہے ورنہ تن فروشی اور اس کے لیے ابھارنا ہر حالت میں گناہ عظیم ہے یہ تعبیر اس لیے ہے کہ اگر ان کنیزوں کے مالک تھوڑی سی بھی غیرت رکھتے ہوں تو انھیں ہوش آئے کہ یہ کنیزیں جنھیں ظاہراً کمتر سمجھا جاتا ہے جب وہ اس گناہ کی طرف مائل نہیں ہیں تو تم تو بہت کچھ بنتے ہو ــــــ پھر اس پستی کو کیوں قبول کرتے ہو۔

قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ گناہگاروں کے لیے لوٹ آنے کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور توبہ و اصلاح کی ترغیب دیتا ہے اس سلسلے میں آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور جس کسی نے انھیں اس کام پر مجبور کیا (اور پھر وہ اس پر پشیمان ہوا) تو ان کے جبر کے بعد اللہ غفور و رحیم ہے (و من یکرھھن فان اللہ من بعد اکراھھن غفور رحیم)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہو سکتا ہے یہ جملہ کنیزوں کے مالکوں کی کیفیت کی طرف اشارہ ہو کہ جو اپنے تاریک اور شرمناک ماضی پر پشیمان ہیں اور اب توبہ و اصلاح پر آمادہ ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان عورتوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو جبر کی وجہ سے مجبوراً یہ کام کرواتی تھیں ۔

قرآن اپنی روش کے مطابق زیر بحث آخری آیت میں گزشتہ مباحث کی طرف مجموعی طور پر اشارہ کرتا ہے ، ارشاد ہوتا ہے : ہم نے تم پر آیات نازل کیں کہ جو بہت سے حقائق واضح کرتی ہیں (ولقد انزلنا الیکم اٰیات مبینات)۔

نیز ہم نے تم سے گزشتہ لوگوں کی مثالیں اور خبریں بیان کی ہیں (و مثلاً من الذین خلوا من قبلکم) ، اور یہ سب پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہیں (و موعظۃ للمتقین)۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ شادی خدائی حکم ہے :۔ موجودہ زمانے میں شادی بیاہ میں اس قدر غلط رسمیں بلکہ خرافات داخل ہوگئی ہیں کہ نوجوانوں کے لیے یہ ایک نہایت پیچیدہ اور دشوار معاملہ بن کر رہ گیا ہے لیکن ان رسموں سے قطع نظر شادی ایک فطری اور قانونِ آفرینش سے ہم آہنگ تقاضا ہے ۔ انسانی نسل کی بقاء، جسم و روح کی تسکین اور زندگی کی بہت سی مشکلوں کے حل کے لیے صحیح طریقے سے شادی ناگزیر ہے ۔ اسلام کہ جو ہمیشہ فطرت سے ہم آہنگ قدم اٹھاتا ہے اس نے اس سلسلے میں جاذب اور مؤثر باتیں کی ہیں ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے :۔

تناکحوا وتناسلوا تکثروا فانی اباهی بکم الامم یوم القیامة ولو بالسقط

شادی کرو تاکہ تمھاری نسل بڑھے کیونکہ روزِ قیامت میں تمھاری تعداد کی کثرت پر فخر کروں گا ، یہاں تک کہ سقط شدہ بچوں پر بھی [۱]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :۔

من تزوج فقد احرز نصف دینه فلیتق الله فی النصف الباقی

جس شخص نے شادی کی اس نے اپنا آدھا دین محفوظ کر لیا جبکہ باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرے [۲]

یہ اس لیے کہ انسان میں جنسی قوت بہت قوی اور سرکش ہوتی ہے ۔ تنہا یہ قوت باقی قوتوں اور صلاحیتوں کا مقابلہ کرتی ہے اور اس حوالے سے انسان کا انحراف اس کے آدھے دین و ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے ۔

ایک اور حدیث میں رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں :۔

شرارکم عزابکم

تم میں سے بدترین افراد غیر شادی شدہ اور مجرد ہیں [۳]

اسی بنا پر زیرِ بحث آیات میں اور متعدد روایات میں مسلمانوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ افراد کی شادی کروانے میں ہر قسم کی ممکنہ مدد کریں ۔ خصوصاً اسلام نے اولاد کے بارے میں باپ پر سخت ذمہ داری عائد کی ہے اور جو باپ اس اہم مسئلے کی پرواہ نہیں کرتے انھیں اولاد کی کجروی کے جرم میں شریک شمار کیا ہے ۔ چنانچہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

---

[۱] سفینۃ البحار ، جلد اول ص ۵۶۱ (مادہ زوج)

[۲] ایضاً

[۳] مجمع البیان ، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

وآلہ وسلم سے منقول ہے :۔

من ادرک لہ ولد وعندہ ما یزوجہ فلم یزوجہ ، فاحدث فالاثم بینہما

جس کا بیٹا بالغ ہو جائے اور وہ اس کی شادی کے وسائل رکھتا ہو اور پھر بھی اس کے لیے اقدام نہ کرے اور اس کے نتیجے میں اس کا بیٹا کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو یہ گناہ دونوں کا لکھا جائیگا[۵۱]

اسی بناء پر تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ شادی کے اخراجات سادہ اور آسان ہونا چاہییں چاہے وہ حق مہر کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں تاکہ اخراجات شادی کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ عموماً زیادہ حق مہر کا مسئلہ کم آمدنی والے افراد کی شادی کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اس سلسلے میں رسول اللہؐ سے ایک حدیث مروی ہے کہ :۔

شوم المرأة غلاء مهرها

منحوس اور بدبخت ہے وہ عورت کہ جس کا حق مہر بھاری ہو[۵۲]

اسی ضمن میں ایک اور حدیث ہے :۔

من شومها شدة مؤنتها

اس کی نحوست کی ایک نشانی اس کی زندگی (یا شادی) کے اخراجات کا زیادہ ہونا ہے[۵۳]

بہت سے مرد اور عورتیں اس الٰہی اور انسانی ذمہ داری کو قبول نہ کرنے کے لیے ایک عذر مالی وسائل نہ ہونے کا پیش کرتے ہیں اس سلسلے میں زیر بحث آیات میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ غربت و افلاس شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا بلکہ بہت سی شادیاں خوشحالی کا باعث بن جاتی ہیں۔ غور کرنے سے اس کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک آدمی اکیلا اور مجرّد ہو اسے ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا اور وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور استعداد کو پوری طرح بروئے کار نہیں لاتا اور اگر کچھ کماتا ہے تو اسے سنبھال کر رکھنے کی کوشش نہیں کرتا اس لیے غیر شادی شدہ افراد عموماً تہی دست ہوتے ہیں لیکن شادی کے بعد انسان کی شخصیّت ایک اجتماعی شخصیت میں بدل جاتی ہے۔ شادی کے بعد مرد شدّت سے محسوس کرتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کی حفاظت کرے اور اس کا نان نفقہ پورا کرے۔ اس میں پھر خاندان کی آبرو کا احساس ہوتا ہے اور وہ ہونے والی اولاد کے لیئے وسائل زندگی مہیا کرنے کی تگ و دَو کرتا ہے اس لیے وہ پورے شعور سے اپنی صلاحیت اور استعداد بروئے کار لاتا ہے اور اپنی آمدنی کی حفاظت اور اس میں قناعت کی کوشش کرتا ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ افلاس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ بلاوجہ نہیں کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

---

[۵۱] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۵۲] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ باب ۵ - از ابواب المہور ص ۱۰

[۵۳] ایضاً

Marfat.com

الرزق مع النساء والعیال

روزی بیوی اور بچوں کے ساتھ ساتھ ہے[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ:۔

ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں آیا اس نے آپؐ سے اپنی تہی دستی کی شکایت کی، آپؐ نے فرمایا:۔

تزوج

شادی کرو

فتزوج فوسع لہ

اس نے شادی کی تو اس کے رزق میں فراخی آگئی[2]

اس میں شک نہیں کہ تائیدِ ایزدی اور مخفی روحانی قوتیں بھی ایسے افراد کی مدد کرتی ہیں کہ جو انسانی ذمہ داری پوری کرنے اور اپنی پاکدامنی کی حفاظت کے لیے شادی کرتے ہیں۔ ہر باایمان شخص اس خدائی وعدے پر بھروسہ کر سکتا ہے اس سے ولولہ حاصل کر سکتا ہے اور اس پر ایمان لا سکتا ہے۔

ایک اور حدیثِ پیغمبر اکرمؐ سے ان الفاظ میں مروی ہے:۔

من ترك التزويج مخافة العيلة فقد ساء ظنه بالله ان الله عز وجل يقول ان يكونوا فقراء يغنهم الله من فضله

جو شخص غربت کے خوف سے شادی نہ کرے اس نے اللہ کے بارے میں سوئے ظن کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"اگر وہ غریب ہوئے تو اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا"[3]

اسلامی کتب میں اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات ہیں اگر ہم ان سب کو نقل کرنے لگیں تو بات تفسیری حدود سے بڑھ جائے گی۔

۲۔ "والصالحین من عبادکم وامائکم" کی تفسیر:۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں جہاں غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کرنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے اور ایک عمومی حکم دیا گیا ہے وہاں جب غلاموں اور کنیزوں کی شادی کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ "صالح" ہونے کی شرط عائد کر دی جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۹۵

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ص ۲۵ (باب ۱۱۔ از ابواب عقد باب نکاح)

[3] 〃 〃 ص ۲۴ (باب ۱۰۔ از ابواب عقد باب نکاح)

Marfat.com

اس کی کیا وجہ ہے ؟

تفسیر المیزان کے مؤلفِ گرامی اور صاحب تفسیر صافی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے جو شادی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ——— لیکن اگر معاملہ یونہی ہو تو پھر یہ شرط آزاد عورتوں اور مردوں کے لیے بھی ضروری ہے ۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس سے مراد اخلاق و اعتقاد کے لحاظ سے صالح ہونا ہے کیونکہ اس سلسلے میں "صالحین" ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں ——— لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر غلاموں کے علاوہ دوسروں کے لیے یہ شرط کیوں عائد نہیں کی گئی ۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس سے ایک اور چیز مراد ہے اور وہ یہ کہ اس دور میں تمدنی ، ثقافتی اور اخلاقی لحاظ سے غلام اور کنیزیں بہت پست تھیں انھیں مشترک زندگی کی ذمہ داری کا کوئی احساس نہ تھا اگر ایسی صورتِ حال میں ان کی شادی کر دی جاتی تو وہ آسانی سے شریکِ حیات کو چھوڑ کر اسے پریشان و سرگرداں چھوڑ دیتے ان کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ اخلاقی صلاحیت رکھتے ہیں تو ان کی شادی کے لیے اقدام کیا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے ان کی تربیت کی جائے اور ان کا اخلاق صالح کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ازدواجی زندگی کے اہل ہو سکیں اور پھر ان کی شادی کی جائے ۔

۲۔ **عقد مکاتبہ** :۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام نے غلاموں کی تدریجی آزادی کا پروگرام دیا تھا ۔ لہٰذا اسلام نے ہر موقع سے ان کی آزادی کے لیے فائدہ اٹھانے کے لیے اقدام کیا ہے ان میں سے ایک " مکاتبت " کا طریقہ ہے زیرِ بحث آیت میں ایک حکم کے طور پر اس کا ذکر آیا ہے ۔

" مکاتبہ "، " کتابت " کے مادے سے ہے اور کتابت بنیادی طور پر " کتب " (بروزن " کسب ") کے مادے سے جمع کرنے کے معنی میں ہے اور یہ جو لکھنے کو " کتابت " کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حروف اور الفاظ کو ایک عبارت میں جمع کر دیتا ہے اور مکاتبت میں چونکہ آقا اور غلام کے درمیان قرارداد لکھی جاتی ہے لہٰذا اسے مکاتبت کہتے ہیں ۔

" عقدِ مکاتبہ " ایک قسم کی قرارداد ہے کہ جو دو افراد کے درمیان طے پاتی ہے اس میں غلام ذمہ دار ہوتا ہے کہ آزاد محنت مزدوری کے ذریعے مال مہیا کرے اور اسے قابلِ عمل قسطوں میں اپنے آقا کو ادا کرے اور آزاد ہو جائے ۔ آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ یہ ساری قسطیں مل کر غلام کی قیمت سے زیادہ نہیں ہونا چاہییں ۔

بعض وجوہ کی بناء پر غلام اگر قسطیں ادا کرنے سے قاصر ہو تو وہ قسطیں بیت المال سے یا زکوٰۃ کے ایک حصے سے ادا کی جائیں گی تاکہ وہ آزاد ہو جائے بعض فقہاء نے یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر زکوٰۃ خود آقا پر واجب الادا ہو تو وہ غلام کے ذمہ اقساط کا حساب زکوٰۃ سے کرے یہ معاہدہ عقدِ لازم ہے اور طرفین میں سے کوئی بھی اسے توڑنے کا حق نہیں رکھتا ۔ واضح ہے کہ اس پروگرام کے تحت بہت سے غلام آزادی حاصل کر سکیں گے اور جس مدت میں انھیں کام کر کے اقساط ادا کرنا ہے اس میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائیں گے اور ان مالکوں کا بھی کوئی نقصان نہیں ہو گا اور غلاموں کی کمی کی وجہ سے وہ کوئی منفی ردِ عمل بھی ظاہر نہیں کریں گے ۔

مکاتبت کے بارے میں بہت سے فروعی احکام بھی ہیں کہ جن کی تفصیل فقہی کتب میں متعلقہ باب میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

Marfat.com

۳۵۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا
مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ
دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ
وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی
نُوْرٍ ؕ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ
۳۶۔ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ
لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ
۳۷۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ
الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ
الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ
۳۸۔ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ
وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

ترجمہ

۳۵۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ نور خدا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی (روشن) چراغ کسی طاق میں رکھا ہو اور وہ چراغ فروزاں ستارے کی طرح کے شفاف اور درخشندہ فانوس میں ہو اور اس چراغ کو روشن کرنے کے لیے تیل زیتون کے ایسے مبارک درخت سے لیا گیا ہو کہ جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے (اس کا روغن ایسا صاف اور خالص ہو کہ) اگرچہ آگ اسے چھوئے بھی نہ لیکن وہ روشن ہو جاتا ہو۔ نور کے اوپر نور ہے اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے اور وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے اور

Marfat.com

وہ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے ۔

۳۶۔ (یہ روشن چراغ) ایسے گھروں میں ہے کہ جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کی دیواریں بلند کی جائیں (تاکہ وہ شیطانوں اور ہوس پرستوں سے امان میں ہوں)۔ ایسے گھر کہ جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور جن میں صبح وشام اس کی پاکیزگی بیان ہوتی ہے ۔

۳۷۔ ایسے جوانمرد کہ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت یادِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرسکتا وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جب دل اور آنکھیں زیر وزبر ہوجائیں گی ۔

۳۸۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ انھیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے اس پر اضافہ بھی کردے ، اور اللہ جسے چاہتا ہے رزقِ بے حساب دیتا ہے (اور اپنی بے انتہا نعمات سے نوازتا ہے)

تفسیر
آیتِ نور

زیرِ نظر آیات کی تفسیر کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے ۔ مسلمان مفسرین، فلاسفہ اور عرفاء میں سے ہر ایک نے اپنے انداز سے بات کی ہے گزشتہ آیات سے ان کا تعلق یہ ہے کہ قبل ازیں عفت وپاکدامنی کے بارے میں مختلف انداز سے مختلف حوالوں سے بات ہوئی ہے ۔ فحاشی اور بدکاری کی روک تھام کے لیے احکام دیئے گئے ہیں اور تمام احکام الٰہی کے اجراء کا ضامن ایمان ہے ۔ ایمان ہی سرکش خواہشات پر کنٹرول کرسکتا ہے ۔ انسانی جذبات میں سے قوی ترین جنسی جذبات ہیں اور ان پر کنٹرول ایمان کے بغیر ممکن ہی نہیں ۔ لہٰذا آخرکار زیرِ نظر آیات میں بحث کا رُخ ایمان اور اس کے قوی اثرات کی طرف موڑ دیا گیا ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : ۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (اللہ نور السماوات والارض)۔

کیسا پیارا، حسین اور جاذب اور قیمتی جملہ ہے ——— جی ہاں ! اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے وہ خود نور ہے اور نور رساں بھی ہے ۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ نور سے یہاں مراد ہے " ہدایت کرنے والا "۔

بعض نے اس کا معنی کیا ہے " روشن کرنے والا "۔

بعض نے مراد لیا ہے " زینت بخشنے والا "۔

یہ سب معانی صحیح ہیں لیکن آیت کا مفہوم ان سے بھی وسیع تر ہے اس کی وضاحت یوں ہے : ۔

Marfat.com

قرآن مجید اور روایات میں لفظ "نور" کا اطلاق مختلف حوالے سے ہوا ہے مثلاً :۔

۱۔ قرآن مجید: سورۂ مائدہ کی آیت ۱۵ میں قرآن مجید کو نور قرار دیا گیا ہے۔

قد جاءکم من الله نور وکتاب مبین

اللہ کی طرف سے تمھارے لیے نور اور کتاب مبین آئی ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں ہے :۔

واتبعوا النور الذی انزل معه اولئك هم المفلحون

جو لوگ پیغمبر کے ساتھ نازل ہونے والے نور کی پیروی کرتے ہیں وہی فلاح یافتہ ہیں۔

۲۔ ایمان :۔ بعض مقامات پر "ایمان" کے لیے لفظ "نور" آیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۷ میں ہے :۔

الله ولی الذین اٰمنوا یخرجهم من الظلمات الی النور

اللہ ان کا ولی ہے کہ جو ایمان لائے ہیں انھیں (کفر و شرک) کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کے) نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

۳۔ ہدایت الٰہی :۔ ہدایت اور روشن بینی کو بھی نور کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۲۲ میں آیا ہے۔

او من کان میتًا فاحیینا وجعلنا له نورًا یمشی به فی الناس کمن مثله فی الظلمات لیس بخارج منها

جو شخص مر چکا تھا اور ہم نے اسے زندہ کیا اس کے لیے نور ہدایت قرار دیا کہ جس کے باعث وہ لوگوں کے درمیان چل پھر سکتا ہے۔ کیا ایسا شخص اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے کہ جو تاریکی میں ہو اور اس سے کبھی نکل نہ سکے۔

۴۔ دین اسلام :۔ دین اسلام کو بھی نور قرار دیا گیا ہے سورۂ توبہ کی آیت ۳۲ میں ہے :۔

ویأبی الله الا ان یتم نوره ولو کره الکافرون

اور اللہ سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتا کہ اپنے نور کو تکمیل تک پہنچائے۔ چاہے کافروں کو ناگوار ہی گزرے۔

۵۔ پیغمبر اکرمؐ :۔ سورۂ احزاب کی آیت ۴۶ میں رسولِ اکرمؐ کے بارے میں فرمایا گیا ہے :۔

وداعیًا الی الله باذنه وسراجًا منیرًا

ہم نے تجھے اذنِ الٰہی سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ قرار دیا ہے۔

۶۔ آئمہ معصومین علیہم السلام :۔ زیارت جامعہ میں آیا ہے :۔

خلقکم الله انوارًا فجعلکم بعرشه محدقین

Marfat.com

اللہ نے آپ کو انوار خلق کیا اور آپ اس کے عرش کے گرد حلقہ ڈالے ہوئے تھے۔

نیز اسی زیارت میں :۔

وانتم نور الاخیار و ھداۃ الابرار

آپ بہترین لوگوں کے لیے نور ہیں اور نیک انسانوں کے لیے ہدایت ہیں۔

۷۔ علم و دانش : مشہور حدیث ہے :۔

العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء

علم نور ہے اللہ جسے چاہتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

ایک طرف تو نور کے یہ مصادیق ہیں اور دوسری طرف نور کے امتیازات جن کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اجمالی مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ نور کے یہ امتیازات ہیں۔

۱۔ مادی دنیا میں نور لطیف ترین اور حسین ترین موجودات میں سے ہے۔ اور یہ تمام زیبائیوں اور لطافتوں کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ ماہرین میں یہ بات مشہور ہے کہ عالم مادہ میں نور اور روشنی کی رفتار سب سے زیادہ ہے اس کی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے گویا نور پلک جھپکنے میں کرۂ زمین کے سات چکر لگا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ عظیم ستاروں کی مسافت روشنی کی رفتار کے ساتھ ناپی جاسکتی ہے اس کا ایک پیمانہ نوری سال ہے یعنی وہ مسافت جسے نور ایک سال میں طے کرتا ہے۔

۳۔ نور اس جہان میں اجسام کی پہچان کا ذریعہ ہے اسی سے دنیا کے مختلف موجودات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اس کے بغیر کسی چیز کو دیکھا نہیں جاسکتا۔ لہٰذا "نور" ظاہر بھی ہے "مظہر" بھی۔ (یعنی دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والا بھی ہے)

۴۔ سورج کی روشنی ہماری دنیا کی اہم ترین روشنی ہے یہی روشنی پھولوں، پھلوں، کھیتوں اور سبزہ زاروں کی پرورش اور نشوونما کا ذریعہ ہے بلکہ تمام زندہ موجودات کی بقاء اسی روشنی سے ہے اور ممکن نہیں ہے کہ کوئی موجود روشنی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیے بغیر زندہ رہ سکے۔

۵۔ دورِ حاضر میں ثابت ہوچکا کہ تمام رنگ نورِ آفتاب یا اس سے مشابہ روشنیوں کا نتیجہ ہیں۔ روشنی کے بغیر سب تاریکی ہی ہے اور مطلق تاریکی میں کسی رنگ کا کوئی تصور ہی نہیں۔

۶۔ تمام توانائیاں (جو ہمارے گرد و پیش میں موجود ہیں ایٹمی توانائی کے سوا ـــــــ سب کا سرچشمہ سورج کی روشنی ہے۔ ہواؤں کی رفتار، بارش کی برسات، نہروں کی روانی آبشاروں کا گرنا ـــــــ خلاصہ یہ کہ ـــــــ تمام موجودات کی حرکت ـــــــ اگر غور کیا جائے تو روشنی کے دم سے ہے۔

Marfat.com

حرارت کا سرچشمہ سورج کی روشنی ہے اسی کے سبب موجودات کا بستر گرم ہے، درختوں کی لکڑی، پتھر کے کوئلے یا پٹرول وغیرہ سے حاصل ہونے والی تمام حرکات کا اصل ماٰخذ سورج کی تپش ہے کیونکہ سائنسی تحقیقات کے مطابق یہ تمام چیزیں نباتات اور حیوانات سے حاصل ہوتی ہیں اور نباتات وحیوانات کی بقا کا دارومدار سورج کی روشنی اور تپش پر ہے ——— لہٰذا گاڑیوں اور مشینوں کی روانی بھی اسی کی برکت سے ہے۔

۷۔ سورج کی روشنی طرح طرح کے جراثیم اور موذی موجودات کو ختم کرتی ہے اگر سورج کی بابرکت شعاعیں نہ ہوتیں تو کرہ زمین ایک بہت بڑے "بیمارستان" میں بدل جاتا اور اس کے تمام باسی ہمیشہ موت وحیات کی کشمکش میں رہتے۔

خلاصہ یہ کہ اس عالمِ خلقت کی اس عجیب چیز ——— یعنی نور ——— پر جتنا بھی غوروفکر کریں اتنا ہی اس کے گراں بہا آثار اور عظیم برکات ظاہر ہوں گی۔

اس تمہید کو پیش نظر رکھیے اور اب سوچیے کہ اس عالم کے حسی موجودات میں سے اگر کوئی چیز تشبیہ وتمثیل کے لیے انتخاب کریں (اگرچہ اس کا مقام باعظمت ہر شبیہ ونظیر سے برتر ہے) تو کیا لفظ "نور" کے علاوہ کسی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

وہ خدا کہ جو تمام عالم ہستی کو عالمِ ظہور میں لانے والا ہے۔

جو عالمِ آفرینش کو روشنی عطا کرتا ہے۔

تمام موجودات جس کے فرمان کی برکت سے زندہ ہیں

اور تمام مخلوقات جس کے خوانِ نعمت پر پلتی ہیں۔

وہی خدا ——— کہ اگر لمحہ بھر کے لیے ان موجودات سے اپنی چشم الطاف پھیرلے تو سب فنا کی تاریکی میں ڈوب جائیں۔ اور یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ موجود اس سے جس قدر ربط رکھتا ہے۔ اسی قدر اس سے نورانیت اور روشنی حاصل کرتا ہے ——— اسی لیے:

قرآن نور ہے چونکہ اس کا کلام ہے

دین اسلام نور ہے چونکہ اس کا آئین ہے

انبیاء ورسل نور ہیں چونکہ اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔

آئمہ معصومین نور ہیں چونکہ انبیاء کے بعد اس کے دین کے نگہبان ہیں۔

ایمان نور ہے چونکہ اس سے رشتہ جوڑدیتا ہے۔

علم نور ہے چونکہ اس کی معرفت کا باعث ہے۔

لہٰذا ——— اللہ نور السماوات والارض ——— ہے

اور اگر لفظ نور کو اس کے وسیع معنی میں لیں تو پھر اللہ کے لیے اس کا استعمال تشبیہ بھی نہیں ہوگا کیونکہ "نور" کا معنی ہے "ایسا وجود جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرنے والا ہو" اس لیے کہ عالمِ خلقت میں کوئی چیز اس سے زیادہ آشکار نہیں اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ اس کے وجود کی برکت سے ظاہر ہے۔

Marfat.com

کتاب " توحید" میں ہے کہ کسی نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے " اللہ نور السماوات و الارض " کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا :-

ھاد لاھل السماوات وھاد لاھل الارض

وہ ہادی ہے اہلِ آسمان کا اور وہ ہادی ہے اہلِ زمین کا۔

درحقیقت ——— ہدایت ——— نورِ الٰہی کی ایک خصوصیت ہے لیکن اس کی فقط یہی خصوصیت نہیں، اسی طرح وہ تمام تفاسیر کہ جو اس آیت کے سلسلے میں مذکور ہیں انھیں ہماری مذکورہ بالا تفسیر میں جمع کیا جا سکتا ہے کیونکہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اس بے نظیر نور اور بے مثل روشنی کا ایک رُخ ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ دعائے جوشنِ کبیر کے سینتالیسویں حصّے میں صفاتِ الٰہی یوں بیان ہوئی ہیں۔

یا نور النور، یا منور النور، یا خالق النور، یا مدبر النور، یا مقدر النور، یا نور کل نور، یا نورًا قبل کل نور، یا نورًا بعد کل نور، یا نورًا فوق کل نور، یا نورًا لیس کمثلہ نور

اے نور کی روشنی، اے روشنیوں کو نور عطا کرنے والے، اے نور کے خالق، اے نور کے ناظم، اے نور کے نظامِ تقدیر چلانے والے، اے سب روشنیوں کے نور، اے نور کہ جو سب روشنیوں سے پہلے ہے، اے نور کہ جو سب روشنیوں کے بعد بھی ہے، اے نور جو سب روشنیوں سے بالا ہے، اے نور کہ جس کی مثال کوئی نور نہیں ہے۔

اس طرح سے تمام عالمِ ہستی کا مرکز وہی ہے اور سب نور اس کی ذاتِ پاک کے نور تک جا پہنچتے ہیں۔

اس بات کے بعد قرآن نورِ الٰہی کیفیت بیان کرنے کے لیے ایک عمدہ اور دقیق مثال پیش کرتا ہے فرماتا ہے: نورِ خدا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی چراغ طاق میں رکھا ہو اور وہ چراغ ایک فانوس میں ہو اور وہ فانوس فروزاں ستارے کی مانند شفاف و درخشاں ہوں (مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانھا کوکب دری)۔

اور یہ چراغ زیتون کے اس مبارک اور بابرکت درخت کے تیل سے جلایا جاتا ہو کہ جو نہ شرقی ہے نہ غربی (یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ و لا غربیۃ)۔

اس کا تیل ایسا صاف اور خالص ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر شعلہ زن ہو جاتا ہو (یکاد زیتھا یضیئ ولو لم تمسسہ نار)۔

ایک نور ہے کہ جو نور کے اوپر ہے (نور علی نور)۔

اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے (یھدی اللہ لنورہ من یشاء)۔

اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے (ویضرب اللہ الامثال للناس)۔

Marfat.com

اور اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے (واللہ بکل شیء علیم)۔

اس مثال کی وضاحت کے لیے ذیل کے چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے۔

"مشکوٰۃ" دراصل دیوار میں بنائے گئے سوراخ، طاق اور چھوٹی سی جگہ کے معنی میں ہے کہ جو دیوار میں چراغ رکھنے کے لیے بناتے ہیں تاکہ ہوا اور طوفان سے چراغ محفوظ رہیں بھی کمرے کے اندر بھی چھوٹا سا طاقچہ بنایا جاتا ہے یہ طاقچہ گھر کے صحن کی جانب بناکر آگے شیشہ لگا دیتے ہیں اس طرح سے کمرے میں بھی روشنی آتی ہے اور صحن میں بھی اور ساتھ ہی آندھی وغیرہ سے بھی محفوظ رہتا ہے اسی طرح شیشے کے بنے ہوئے ایسے مکعب مستطیل کو بھی مشکوٰۃ کہتے ہیں جس کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور اس کے اوپر ہوا کے نکلنے کے لیے سوراخ بھی ہوتا ہے اور اس میں چراغ رکھا جاتا ہے مختصر یہ کہ مشکوٰۃ چراغ کی حفاظت کے لیے بنائی گئی جگہ یا چیز کو کہتے ہیں کہ جو اسے ہوا اور طوفان کے تھپیڑوں سے بچاتی ہے اور چونکہ عام طور پر اسے دیوار میں بناتے ہیں لہٰذا یہ چراغ کی روشنی کو مرکوز اور منعکس کرتی ہے۔

"زجاجۃ" شیشے کو کہتے ہیں دراصل یہ لفظ صاف و شفاف پتھروں کے معنی میں ہے اور شیشہ بھی چونکہ پتھر ہی سے بنایا جاتا ہے اور صاف و شفاف بھی ہوتا ہے لہٰذا اسے بھی "زجاجۃ" کہتے ہیں یہاں یہ لفظ گلاب اور فانوس کے معنی میں ہے کہ جو چراغ کے سامنے یا اوپر رکھتے ہیں تاکہ اس کے شعلے کی بھی حفاظت کرے۔ ہوا کی گردش کو بھی نیچے سے اوپر کی طرف منظم رکھے اور اس کی روشنی میں بھی اضافہ کرے۔

"مصباح" چراغ کو کہتے ہیں۔

"یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لاشرقیۃ ولا غربیۃ" یہ جملہ خالص اور توانائی کے حامل روغن کی طرف اشارہ ہے کہ جو زیتون کے پُر برکت درخت سے اس چراغ کے لیے لیا جاتا ہے اور جلانے کے لیے ایک بہترین روغن ہے جبکہ اسے ایسے درخت سے حاصل کیا گیا ہے کہ جو نور آفتاب میں ہر طرف برابر سے پھلا پھولا اور بڑھا پھیلا ہو۔ یہ درخت نہ باغ کی مشرقی جانب دیوار کے ساتھ ہے اور نہ مغربی جانب کیونکہ اگر اس پر صرف ایک طرف سے روشنی پڑے تو اس کا پھل بھی نیم پکا اور نیم کچا ہوگا لہٰذا اس کا روغن بھی اچھا اور صاف نہیں ہوگا۔

اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صحیح اور اچھی روشنی کے حصول کے چار عوامل ہیں۔

۱۔ ایسا چراغدان یا طاق کہ جو اس کی ہر طرف سے حفاظت کرے۔ اس کی روشنی میں کمی نہ کرے بلکہ اسے زیادہ متمرکز کرنے میں مدد دے۔

۲۔ ایسا گلاب یا فانوس کہ جو گردش ہوا کو شعلے کے گرد منظم کرے لیکن ایسا شفاف ہو کہ روشنی کے گزرنے میں حائل نہ ہو۔

۲۔ چراغ کہ جس کی روشنی کا مرکز اس کا فتیلہ یا فیتا ہے۔

۴۔ صاف، خالص، عمدہ اور توانائی کا حامل روغن اور تیل کہ جو جلنے کے لیے ایسا تیار ہو کہ گویا شعلے سے مس ہوئے بغیر ہی بھڑک اُٹھے۔

Marfat.com

یہ سب کچھ ان الفاظ کے ظاہری پہلو کا بیان تھا دوسری طرف بزرگ مفسرین نے نور کے لیے بیان کی گئی اس تشبیہ کا باطنی مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں مختلف تفسیریں ہیں ۔ مثلاً

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نورِ ہدایت ہے کہ جسے اللہ نے مومنین کے دلوں میں روشن کیا ہے یعنی وہ ایمان ہے کہ جو اللہ نے مومنین کے دلوں میں جاگزیں کر دیا ہے ۔

بعض نے خیال کیا ہے کہ اس سے مراد قرآن کا معنیٰ ہے کہ جو انسان کے دل کے اندر نور افگن ہوتا ہے ۔

بعض نے اس تشبیہ کو ذاتِ پیغمبرؐ کی طرف اشارہ سمجھا ہے

بعض نے توحید و عدلِ الٰہی کی طرف اشارہ جانا ہے ۔

بعض نے سمجھا ہے کہ اس سے مراد روحِ اطاعت و تقویٰ ہے کہ جو ہر خیر و سعادت کا سرچشمہ ہے ۔

درحقیقت قرآن اور حدیث میں باطنی نور کے جتنے مصادیق آئے ہیں انھیں تفسیر کے طور پر ذکر کر دیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان سب کی روح ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے نورِ ہدایت کہ جس کا سرچشمہ قرآن وحی اور وجودِ انبیاءؑ ہے ۔ دلائلِ توحید سے جس کی حفاظت و تقویت ہوتی ہے جس کا نتیجہ حکمِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور تقویٰ ہے ۔

نورِ ایمان جو مومنین کے دل میں ہے انھی چار عوامل کا حامل ہے کہ جو ایک روشن چراغ میں موجود ہیں ۔

" مصباح " ——— ایمان کا وہ شعلہ ہے کہ جو مومن کے دل میں بھڑکتا ہے اور نورِ ہدایت اس سے ضوفشاں ہوتا ہے ۔

" زجاجۃ " ——— فانوس مومن کا دل ہے کہ جو ایمان کو اپنے وجود میں منظم کرتا ہے ۔

" مشکوٰۃ " ——— طاق مومن کا سینہ ہے ——— یا دوسرے لفظوں میں اس کا علم، فکر اور آگہی ہے کہ جو اس کے ایمان کو طوفان اور ہوائے تند سے بچاتی ہے ۔

" شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ " وحی الٰہی ہے کہ جس کا نچوڑ اور روغن انتہائی صاف و پاک ہے اور اس کے ذریعے مومنین کا ایمان شعلہ ور اور بابرکت ہوتا ہے ۔

درحقیقت یہ نور خدا ہی نور ہے کہ جو آسمانوں اور زمین کو منور کرتا ہے یہ نور قلبِ مومنین سے ضوفشاں ہوتا ہے اور ان کے سارے وجود کو روشن کر دیتا ہے اور جو دلائل انھوں نے عقل و بصیرت سے حاصل کیے ہیں وہ نورِ الٰہی کی آمیزش سے " نور علیٰ نور " کا مصداق بن جاتے ہیں اور یہی وہ منزل ہے کہ جہاں اہل اور تیار دل نورِ الٰہی سے ہدایت پاتے ہیں اور " یھدی اللہ لنورہ من یشاء " اپنی عملی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

لہٰذا نورِ الٰہی کی ہدایت اور نورِ ہدایت و ایمان کے لیے معارف ، آگاہی ، خود سازی اور اخلاقِ حسنہ کی ضرورت ہے کہ جو مشکوٰۃ کی طرح اس کی حفاظت کرے اور اس کے لیے دلِ آمادہ کی ضرورت ہے کہ جو " زجاجہ " کی طرح اس پروگرام کو منظم کرے اور وحی کی امداد کی بھی ضرورت ہے کہ جو " شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ " کی طرح اسے توانائی بخشے اور یہ نور وحی شرقی و غربی مادی انحراف اور آلودگی سے دور رہے ورنہ یہ روشنی گہنا جائے گی یہ روغن ایسا صاف اور ہر ملاوٹ اور

Marfat.com

خرابی سے پاک ہو کر کسی دوسری چیز کی احتیاج کے بغیر تمام انسانی صلاحیتوں کو جمع کرلے اور " یکاد زیتها یضیء ولو لم تمسسه نار " کا مصداق بنے ۔

ہر قسم کی تفسیر بالرائے، پہلے سے خود کردہ فیصلے، ذاتی پسند و ناپسند، ٹھونسے گئے عقیدے، دائیں بائیں طرف میلان اور ہر قسم کے خرافات کہ جو اس مبارک شجر کے روغن کو آلودہ کریں اس چراغ کی روشنی کم کر دیتے ہیں اور کبھی اسے بالکل ہی بے نور کر دیتے ہیں ۔

یہ ہے وہ مثال کہ جو اللہ نے اس آیت میں اپنے نور کے لیے بیان کی ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے ۔

جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ آئمہ معصومینؑ کی روایات میں اس آیت کی جو تفسیر بیان ہوئی ہے وہ اس کے واضح مصادیق کا بیان ہے نہ کہ مفہوم آیت اس میں منحصر ہے مثلاً روایات آئمہؑ میں " مشکوٰۃ " سے مراد پیغمبر اسلامؐ کا دل، " مصباح " سے نورِ علم، " زجاجہ " سے آپؐ کے وصی حضرت علیؑ اور " شجرہ مبارکہ " سے اس خاندان کے جدِ بزرگوار حضرت ابراہیم خلیل اللہ مراد لیے گئے ہیں۔ اسی طرح " لا شرقیة ولا غربیة " سے یہود و نصاریٰ کی طرف ان کے میلان کی نفی کی گئی ہے ۔ یہ تفسیر بھی درحقیقت اسی نورِ ہدایت و ایمان کا ایک رُخ پیش کرتی ہے اور اس کا ایک واضح مصداق پیش کرتی ہے ۔

اسی طرح بعض مفسرین نے اس نورِ الٰہی سے قرآن ، دلائلِ عقلی یا ذاتِ پیغمبر اسلام مراد لی ہے۔ یہ تفسیر بھی مندرجہ بالا تفسیر سے ہم آہنگ ہے ۔

* * *

یہاں تک تو اس نورِ الٰہی اور نورِ ہدایت و ایمان کی خوبیاں اور امتیازات بیان ہو رہے تھے اسے ایک روشن چراغ کی تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ روشن چراغ کہاں ہے اور اس کا مقام کون سا ہے ۔

اس کے لیے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : یہ مشکوٰۃ ایسے گھروں میں ہے کہ جن کی دیواریں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے (تاکہ دشمنوں، شیطانوں اور ہوس باز نگاہوں سے امان میں ہوں) ۔ (فی بیوت اذن الله ان ترفع) ۔

" وہ گھر کہ جن میں نامِ خدا کا تذکرہ ہوتا ہے (جن گھروں میں آیاتِ قرآنی کی تلاوت ہوتی ہے اور حقائقِ وحی بیان ہوتے ہیں) ۔ (ویذکر فیها اسمه) ۔

جیسا کہ ہم نے بھی تفسیر کی ہے بہت سے مفسرین نے اس آیت کو گزشتہ آیت سے مربوط جانا ہے [1] لیکن بعض نے

---

۱ آیت کی تقدیر دراصل یوں تھی :

هٰذا المشکوٰة فی بیوت ------

یا ـــ هٰذه المصباح فی بیوت ------

یا ـــ هٰذه الشجرة المبارکة فی بیوت ------

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اسے بعد والے جملے سے مربوط سمجھا ہے کہ جو ہرگز صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

رہا یہ سوال جو بعض نے کیا ہے کہ یہ روشن چراغ ان گھروں میں ہوں کہ جن کی خصوصیات اس آیت میں بیان ہوئی ہیں تو اس کا کیا فائدہ ہے تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ اگر گھر کی دیواریں بلند ہوں اور مضبوط دل، بیدار اور ہوشیار مرد اس کی پاسداری کرتے ہوں تو ایسا گھر اس روشن چراغ کی حفاظت کا ضامن ہے۔ علاوہ ازیں جنھیں ایسے نور کی جستجو ہو گی وہ اس گھر سے آگاہ ہو کر جلدی اس کی جانب لپکیں گے۔

رہا یہ سوال کہ ان گھروں سے کون سے گھر مراد ہیں تو اس کا جواب آیت میں موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے: (صبح و شام ان گھروں میں تسبیح الٰہی ہوتی ہے)[۱] (یسبح له فیها بالغدو والاٰصال)۔

ایسے جوانمرد کہ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت یادِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں رکھ سکتی (رجال لا تلهیهم تجارة ولا بیع عن ذکر الله واقام الصلٰوة وایتاء الزکٰوة)۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جب دل اور آنکھیں زیر و زبر ہو جائیں گی (یخافون یومًا تتقلب فیه القلوب والابصار)

یہ خصوصیات نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ "بیوت" وہی مراکز ہیں کہ جنھوں نے حکمِ خدا سے استحکام پایا ہے اور یادِ الٰہی کا مرکز بنے ہیں اور وہاں سے حقائقِ اسلام اور احکامِ الٰہی کی نشر و اشاعت ہوتی ہے اس وسیع معنی کا مصداق مساجد اور انبیاءؑ و اولیاء کے گھر ہیں۔ بالخصوص پیغمبرِ اکرمؐ اور امیر المومنین حضرت علیؑ کا گھر ان گھروں میں شامل ہیں۔

یہ جو بعض نے انھیں مساجد اور انبیاءؑ کے گھر اور ایسے ہی دوسرے گھروں میں منحصر کیا ہے ان کے پاس اس کی دلیل نہیں ہے البتہ بعض ایسی روایات ہیں کہ جن میں سے بعض خاص گھروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً

امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

هی بیوت الانبیاء وبیت علی منها

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) یا — نور الله فی بیوت ۔۔۔۔

جبکہ دوسری تفسیر کے مطابق "فی بیوت" کے بعد کو "یسبح" کے متعلق جانتے ہیں کہ جس سے آیت کا مفہوم یوں ہو گا۔

ایسے گھروں میں کہ جن کی دیواریں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، جوانمرد صبح شام اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔

لیکن لفظ "فیها" کی موجودگی میں یہ تفسیر مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ تکرار شمار ہو گا۔ علاوہ ازیں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جو روایات مروی ہیں یہ ان سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے (غور کیجیے گا)

[۱] "غدو" (بروزن "علو" صبح کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ "غدو" دن کے ابتدائی حصے کو کہا جاتا ہے اور قرآن میں یہ لفظ "آصال" کے مقابلے میں آیا ہے جبکہ "غداة" "عشی" کے مقابلے میں آیا ہے

"آصال" "اصل" (بروزن "زحل") کی جمع ہے جبکہ "اصل" بھی "اصیل" کی جمع ہے کہ جس کا معنی ہے "عصر"۔

رہا یہ سوال کہ "غدو" مفرد کی شکل میں اور "آصال" جمع کی صورت میں کیوں ہے تو فخر رازی کے مطابق "غدو" مصدری پہلو رکھتا ہے اور مصدر کی کبھی جمع نہیں لائی جاتی

Marfat.com

یہ انبیاءؑ کے گھروں کی طرف اشارہ ہے اور علیؑ کا گھر بھی اس زمرے میں آتا ہے [1]

اسی طرح ایک اور حدیث میں پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ:۔

اس آیت کی تلاوت کے وقت آنحضرتؐ سے پوچھا گیا: ان سے کون سے گھر مراد ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:

بیوت الانبیاء

نبیوں کے گھر

ابوبکرؓ نے (علیؑ و فاطمہؑ کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پوچھا: کیا یہ گھر بھی ان میں شامل ہے؟

رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

نعم من افاضلها

ہاں یہ تو اس گھر کے افضل ترین گھروں میں سے ہے [2]

یہ سب روشن اور واضح مصادیق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روایات کا معمول یہ ہے کہ تفسیر کے موقع پر روشن اور واضح مصادیق کی نشاندہی کرتی ہے۔

جی ہاں جو مرکز حکمِ خدا سے قائم ہوا ہے اور اس میں ذکر خدا ہوتا ہے اور اس میں ایسے باایمان جوانمرد ہیں کہ جنھیں مادّی زندگی یادِ خدا سے غافل نہیں کر دیتی اور وہ اس گھر میں اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں ایسے گھر انوارِ الٰہی کے چراغدان اور ایمان و ہدایت کے فانوس ہیں درحقیقت ان گھروں کی یہ خصوصیات ہیں:۔

۱۔ ان کی بنیاد حکمِ خدا سے رکھی گئی ہے۔

۲۔ ان کی بنیاد مستحکم اور دیواریں ایسی بلند ہیں ———— کہ شیطان اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

۳۔ وہ یادِ الٰہی کا مرکز ہیں۔

۴۔ ان کی نگہبانی ایسے جواں مرد کرتے ہیں کہ جو صبح و شام تسبیحِ خدا میں مشغول رہتے ہیں اور پُر فریب دنیا کی کشش انھیں حق سے غافل نہیں کرتی۔

ان خصوصیات کے باعث یہ گھر ہدایت و ایمان کا سرچشمہ ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس آیت میں "تجارت" کا ذکر بھی آیا ہے اور "بیع" کا بھی۔ جبکہ ظاہراً دونوں کا معنی ایک ہی ہونا چاہیے لیکن ممکن ہے کہ ان کا فرق اس لحاظ سے ہو کہ تجارت ایک مسلسل کام ہے جبکہ "بیع" ایک وقتی کام ہے۔ اس امر کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ ایسے مرد ہیں کہ جو تجارت اور بیع کی طرف نہیں جاتے بلکہ یہ فرمایا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۰۷

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

گیا ہے کہ تجارت اور بیع انھیں یادِ خدا، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کردیتی وہ ہمیشہ قیامت اور عدالتِ الٰہی کے خیال سے ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ قیامت کا دن وہ ہے کہ جب دل اور آنکھیں زیر و زبر ہوجائیں گی (توجہ رہے کہ "یخافون" فعل مضارع ہے اور روزِ قیامت سے ان کے مسلسل خوف پر دلالت کرتا ہے۔ ایسا خوف کہ جو انھیں ذمہ داریوں کا احساس دلائے رکھتا ہے)۔

زیرِ بحث آخری آیت میں نورِ ہدایت کے ان پاسداروں اور عاشقانِ حق کا اجر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ اللہ انھیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے ان کے اجر میں اضافہ بھی کرے (لیجزیھم اللہ احسن ما عملوا و یزیدھم من فضلہ)۔

اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ جو لوگ فیضانِ الٰہی کے لائق ہیں ان کے لیے اللہ کا فیضان محدود نہیں ہے اور خدا جسے چاہتا ہے رزقِ بے حساب دیتا ہے اور اسے اپنی لامتناہی نعمات سے بہرہ مند کرتا ہے (واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب)۔

اس آیت میں احسن ما عملوا سے کیا مراد ہے؟: ۔ اس سلسلے میں:

بعض نے کہا ہے کہ نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ واجبات ہوں یا مستحبات اور چھوٹے ہوں یا بڑے۔

بعض دوسرے معتقد ہیں کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کارِ خیر کا اجر کبھی دس گنا عطا فرماتا ہے کبھی سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ ——— جیسا کہ سورۂ انعام کی آیہ ۱۶۰ میں ہے۔

من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا

جو شخص نیک کام کے ساتھ بارگاہِ خدا میں پیش ہوگا اسے اس کا دس گنا اجر ملے گا۔

نیز سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۱ میں راہِ خدا میں خرچ کرنے کا اجر سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ ذکر ہوا ہے۔

اس جملے کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ اللہ ان کے تمام اعمال کی جزاء ان کے بہترین اعمال کے معیار کے مطابق دے گا یہاں تک کہ ان کے کم اہم اور درمیانے درجے کے اعمال بھی اجر کے حساب سے ان کے بہترین اعمال کے ہم پلہ ہوں گے اور یہ فضلِ الٰہی سے بعید بھی نہیں کیونکہ عدل اور اجر میں برابری ضروری نہیں ہے لیکن جس وقت اللہ اپنا فضل کرنے پر آتا ہے تو پھر عنایات بے حساب ہیں کیونکہ اس کی ذات پاک غیر محدود ہے اس کی نعمتیں بھی لامتناہی ہیں اور اس کا کرم بھی بے پایاں ہے۔

چند روایات

اس آیت سے متعلقہ ضروری نکاتِ تفسیری بحث میں آچکے ہیں البتہ کچھ روایات ایسی ہیں کہ جن کا ذکر تکمیلِ گفتگو کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انھیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ کتاب روضۃ الکافی میں ہے کہ آیتِ نور کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: ۔

ان المشکوٰۃ قلب محمد (ص)، والمصباح النور الذی فیہ العلم، والزجاجۃ

Marfat.com

قلب علی او نفسہ

"مشکوٰۃ" قلب محمد (ص) ہے، "مصباح" نور علم و ہدایت ہے اور "زجاجۃ" خود علیؑ ہیں یا ان کا دل کہ رحلت رسولؐ کے بعد وہ "مصباح" قرار پایا۔[1]

۲۔ ایک حدیث "توحید صدوق" میں امام باقر علیہ السّلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:۔

ان المشکوٰۃ نور العلم فی صدر النبی (ص) والزجاجۃ صدر علی ------ ونور علی نور امام موید بنور العلم والحکمۃ فی اثر الامام من اٰل محمد، و ذٰلک من لدن آدم الی ان تقوم الساعۃ، فھٰؤلاء الاوصیاء الذین جعلھم اللّٰہ عزوجل خلفاء فی ارضہ وحججہ علی خلقہ، لا تخلوا الارض فی کل عصر من واحد منھم

"مشکوٰۃ" رسول اللہؐ کے سینے میں نورِ علم ہے۔ "زجاجہ" علیؑ کا سینہ ہے اور "نور علیٰ نور" آلِ محمدؐ میں سے آئمہ اطہارؑ ہیں کہ جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور نورِ علم سے ان کی تائید کی گئی ہے اور یہ سلسلہ خلقتِ آدم سے اختتامِ عالم تک جاری ہے یہ وہی اوصیاء ہیں کہ جنھیں اللہ نے زمین میں خلفاء قرار دیا ہے اور بندوں پر انھیں اپنی حجت بنایا ہے اور زمین نہ کبھی ان کے وجود سے خالی تھی اور نہ کبھی خالی ہوگی۔[2]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السّلام نے "مشکوٰۃ" جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا، "مصباح" امام حسن علیہ السلام اور "زجاجہ" امام حسین علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔[3]

البتہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ آیات وسیع مفہوم رکھتی ہیں اور مندرجہ بالا روایات میں سے ہر ایک میں اس کے کسی نہ کسی واضح مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان روایات سے آیت کی عمومیت ختم نہیں ہوتی لہٰذا ان روایات میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے۔

۴۔ ایک روایت میں ہے کہ:۔

امام باقر علیہ السلام بصرہ کے ایک مشہور فقیہ سے بات کر رہے تھے دورانِ گفتگو اس نے اظہارِ تعجب کیا کہ مجلس میں ایک خاص رعب اور دبدبے کی کیفیت ہے۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا:۔

کیا تم جانتے ہو کہ کہاں بیٹھے ہو؟ جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے۔

فی بیوت اذن اللّٰہ ان ترفع ویذکر فیھا اسمہ یسبح لہ فیھا بالغدو

---

[1] نور الثقلین، زیر بحث آیت کے ذیل میں، ج ۳ ص ۶۰۲ (کچھ تلخیص کے ساتھ)
[2]، [3] ایضاً جلد ۳ ص ۶۰۲، ۶۰۳ (کچھ اختصار کے ساتھ)

Marfat.com

والاصال رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ

اس کے بعد فرمایا :۔

فانت ثم ونحن اولئک

تو وہی ہے کہ جو تو نے کہا ہے (یعنی بصرہ کا ایک فقیہ) اور ہم یہ ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے یہ کہا ہے ۔

قتادہ نے جواب میں کہا :۔

صدقت واللہ ، جعلنی اللہ فداک ، و اللہ ماھی بیوت حجارۃ ولا طین

واللہ آپ نے سچ فرمایا ، میں آپ پر قربان جاؤں ، بخدا اس آیت میں پتھر اور مٹی کے گھر مراد نہیں ہیں (بلکہ وحی ، ایمان اور ہدایت کے گھر مراد ہیں) [1]

۵۔ وہ مردانِ خدا کہ جو وحی و ہدایت کے پاسدار ہیں ، ان کے بارے میں ایک حدیث میں ہے :۔

ھم التجار الذین لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ ، اذا دخل موا قیت الصلوٰۃ ادوا الی اللہ حقہ فیھا

یہ وہ تاجر ہیں کہ جنھیں یادِ خدا سے تجارت اور خرید و فروخت غافل نہیں کرتی جب نماز کا وقت آ پہنچتا ہے تو اس کا حق ادا کرتے ہیں [2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اصلاحی اور مثبت اقتصادی امور سرانجام دیتے ہیں لیکن ان کے سارے کام نامِ خدا کے تابع ہیں اور کسی چیز کو اس پر مقدم نہیں کرتے ۔

چند نکات

۱۔ زیتون کا درخت :۔ زیرِ بحث آیات میں زیتون کے درخت کو "شجرۃ مبارکہ" یعنی مبارک درخت قرار دیا گیا ہے جس وقت قرآن نازل ہوا تھا ہو سکتا ہے اس وقت قرآن کی اس بات کی اہمیت لوگوں پر واضح نہ ہو لیکن آج ہمارے لیے یہ بہت واضح ہے کیونکہ عظیم سائنس دانوں اور ماہرین کہ جنھوں نے اپنی عمر کے سالہا سال نباتات کے خواص کے مطالعے میں صرف کیے ہیں ان کے بقول اس بابرکت درخت سے حاصل ہونے والی سب سے اہم چیز روغنِ زیتون ہی ہے یہ تیل بدن کی سلامتی کے لیے بہت مؤثر ہے ۔

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ اس درخت کے تمام اجزاء مفید اور نفع بخش ہیں یہاں تک کہ اس کی راکھ بھی مفید ہے اور طوفانِ نوح کے

---

[1] ، [2] نور الثقلین ، جلد ۳ ص ۶۰۹

Marfat.com

بعد سب سے پہلے اگنے والا درخت یہی ہے اور اس درخت کے حق میں انبیاء نے دعائیں کی ہیں ۔

۷۔ " نور علیٰ نور " کی تفسیر : ۔ بزرگ مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں مختلف باتیں کی ہیں :

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں : ۔

یہ ایسے انبیاء کی طرف اشارہ ہے کہ جو یکے بعد دیگرے ایک ہی نسل سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اور راہِ ہدایت کو دوام بخشتے ہیں ۔

فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ نور کی شعاعوں ، روشنی کی تہوں اور شعاعوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ مومن کے بارے میں منقول ہے کہ مومن چار حالتوں میں ہوتا ہے اسے نعمت ملے تو شکرِ خدا بجالاتا ہے مصیبت آن پڑے تو صابر و با استقامت ہوتا ہے ۔ بات کرتا ہے تو سچ بولتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے تو عدالت کی جستجو کرتا ہے وہ جاہل لوگوں میں ایسے ہوتا ہے جیسے مُردوں میں ایک زندہ ۔ وہ پانچ انوار کے درمیان چلتا پھرتا ہے ۔ اس کی گفتگو نور ہے ، اس کا عمل نور ہے اس کے آنے کا مقام نور ہے اس کے جانے کی جگہ نور ہے اور اس کا ہدف روزِ قیامت نورِ خدا ہے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ قرآن میں پہلے نُور سے مراد وحی الٰہی کے ذریعے ہدایتِ الٰہی کا نور ہو اور دوسرے نور سے مراد عقل کے ذریعے ہدایتِ الٰہی کا نور ہو ۔

یا پہلا نور ہدایتِ تشریعی کا نور ہو اور دوسرا ہدایتِ تکوینی کا نُور ہو ۔

اس بنا پر نور ہے نور کے اوپر ۔

اسی طرح یہ جملہ کبھی نور کے مختلف سرچشموں (انبیاء) سے تفسیر ہوا ہے اور کبھی نور کی مختلف قسموں سے اور کبھی اس کے مختلف مراحل سے ۔

تاہم ممکن ہے کہ یہ سب مفاہیم آیت میں جمع ہوں کہ جس کا مفہوم بہت وسیع ہے (غور کیجیے گا)

Marfat.com

۳۹۔ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَةٍ یَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ
مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ یَجِدۡهُ شَیۡـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰهُ
حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ۙ﴿﴾
۴۰۔ اَوۡ کَظُلُمٰتٍ فِیۡ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ یَّغۡشٰهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ
فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ یَدَهٗ
لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿﴾

ترجمہ

۳۹۔ اور جو لوگ کافر ہوگئے ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں سراب۔ جسے پیاسا شخص دور سے پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو اسے کچھ نہیں ملتا اور اللہ کو وہاں موجود پاتا ہے اور اللہ اس کا حساب چکا دیتا ہے اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔

۴۰۔ یا جیسے کسی گہرے سمندر میں تاریکی ہو، اسے ایک موج نے چھپا رکھا ہو اور اس کے اوپر ایک اور موج ہو۔ اور اس کے اوپر تاریک بادل۔ تاریکیوں کے اوپر تاریکیوں ہیں۔ ایسی تاریکیاں کہ اگر کوئی اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے دیکھ نہ سکے۔ جسے اللہ نور عطا نہ کرے اس کے لیے کوئی نہیں۔

تفسیر

سراب کی طرح کے اعمال

گزشتہ آیات میں نورِ الٰہی اور نورِ ایمان و ہدایت کے بارے میں گفتگو تھی اب زیرِ نظر آیات میں کفر، جہالت، بے ایمانی گمراہی اور منافقت کی تاریکی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ مومنین کی زندگی اور ان کے افکار تو "نور علیٰ نور" تھے جبکہ منافقوں اور کافروں کا وجود "ظلمات بعضها فوق بعض" ہے۔ اب ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جو زندگی کے خشک، بے آب اور آگ برساتے صحراء میں پانی کی بجائے سراب کے پیچھے دوڑتے ہیں اور شدتِ پیاس سے

Marfat.com

جان دے دیتے ہیں جبکہ مومنین کے سر پر ایمان کا سایہ ہے اور وہ ہدایت کے میٹھے اور شفاف چشمے کے کنارے راحت و آرام سے بیٹھے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے : جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اعمال بے آب صحرا میں سراب کی طرح ہیں پیاسا آدمی اسے دُور سے پانی سمجھتا ہے (والذین کفروا اعمالهم کسراب بقیعة یحسبه الظمان ماءً)۔ لیکن جب اس کے قریب جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا (حتیٰ اذا جاءه لم یجده شیئًا)۔ البتہ اللہ کو اپنے اعمال کے پاس پاتا ہے اور اللہ اس کا حساب چکا دیتا ہے (ووجد الله عنده فوفاه حسابه)۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی (والله سریع الحساب)۔

"سراب" بنیادی طور پر "سرب" (بروزن "شرف") کے مادے سے اوپر کی طرف جانے کے معنی میں ہے ، اور "سرب" (بروزن "حرب") اوپر جانے والے راستے کے معنی میں ہے۔ اسی مناسبت سے "سراب" بیابانوں میں دُور سے نظر آنے والی چمک کو کہتے ہیں کہ جو پانی معلوم ہوتی ہے جبکہ سورج کی روشنی کے انعکاس کے سوا وہاں کچھ نہیں ہوتا۔[1]

"قیعه" بعض کے نظریئے کے مطابق "قاعه" کی جمع ہے اور وسیع و عریض بے آب و گیاہ زمین کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں ایسے چٹیل میدان کو "قاعة" کہتے ہیں کہ جس میں عام طور پر سراب نظر آتا ہے۔

لیکن بعض مفسرین اور اہلِ لغت "قیعة" کو مفرد سمجھتے ہیں کہ جس کی جمع "قیعان" یا "قیعات" ہے۔[2] البتہ معنی کے لحاظ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن آیت کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ یہ لفظ مفرد ہو کیونکر لفظ "سراب" مفرد صورت میں آیا ہے اور ظاہر ہے اس قسم کا سراب ایک ہی بیابان میں ہوگا نہ کہ کئی بیابانوں میں (غور کیجیے گا)

اس کے بعد دوسری مثال بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وسیع سمندر پر چھائے ہوئے اندھیرے۔ جیسے سمندر ہے اس پر ایک موج چھائی ہوئی ہے اور اس موج کے اوپر ایک اور موج ہے اور اس کے اوپر ایک تاریک بادل ہے (او کظلمات فی بحر لجی یغشاه موج من فوقه موج من فوقه سحاب)۔ اور اندھیرے ایک دوسرے کے اوپر چھائے ہوئے ہیں (ظلمات بعضها فوق بعض)۔ حالت یہ ہے کہ اگر ایسے میں کوئی شخص ہو اور وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اسے ہاتھ سجھائی نہ دیگا (اذا اخرج یده لم یکد یراها)۔

جی ہاں! انسانوں کی زندگی میں نورِ حقیقی صرف نورِ ایمان ہے اور اس کے بغیر فضائے حیات تیرہ و تار ہے، لیکن یہ نورِ ایمان صرف اللہ کی طرف سے ہے اور جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے (ومن لم یجعل الله له نورًا فما له من نور)۔

---

[1] آج کے ماہرین طبیعات کہتے ہیں کہ جب ہوا بہت گرم ہو جاتی ہے تو زمین سے ملحق ہوا کا طبقہ شدت گرمی کی وجہ سے بہت پھیل جاتا ہے اور اپنے ملحق حصے سے جدا ہو جاتا ہے۔ روشنی کی لہریں بھی اس میں ٹوٹ جاتی ہیں اور سراب روشنی کی لہروں کے اسی ٹوٹ جانے کا نام ہے۔

[2] تفسیر مجمع البیان ، تفسیر روح المعانی ، تفسیر قرطبی ، تفسیر فخر رازی اور مفردات راغب کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

اس مثال کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظ "لجی" کے معنیٰ کی طرف توجہ کی جائے۔ "لجی" (بروزن "کجی") گہرے اور وسیع سمندر کے معنیٰ میں ہے یہ لفظ بنیادی طور پر "لجاج" کے مادہ سے کسی کام کے پیچھے پڑ جانے کے معنی میں ہے (اور عام طور پر غلط کاموں کے پیچھے لگ جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) رفتہ رفتہ یہ لفظ سمندر کی لہروں کے ایک دوسرے کے پیچھے جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور چونکہ سمندر جتنا زیادہ گہرا اور وسیع ہو گا اس کی موجیں اتنی ہی زیادہ ہوں گی لہٰذا یہ لفظ ہوتے ہوتے وسیع سمندروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔

اب آپ عمیق، گہرے اور وسیع ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو ذہن میں رکھیں اور ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی کہ جو قوی ترین روشنی ہے اس کی شعاعیں ایک حد تک پانی کے اندر جا سکتی ہیں اس کی تیز ترین شعاعیں تقریباً سات سو میٹر گہرائی میں جا کر محو ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی گہرائیوں میں دائمی تاریکی اور شب جاوداں ہے وہاں روشنی کا بالکل گزر نہیں۔

یہ بات بھی ہم جانتے ہیں کہ اگر پانی بالکل صاف وشفاف ہو اور ٹھہرا ہوا ہو تو وہ روشنی کو بہتر منعکس کر سکتا ہے لیکن تلاطم خیز موجیں روشنی کی شعاعوں کو درہم برہم کر دیتی ہیں اور روشنی کی بہت ہی کم مقدار پانی کی گہرائیوں میں منتقل ہو پاتی ہے اب اگر ان ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کے اوپر سیاہ بادل بھی چھائے ہوں تو اس سے پیدا ہونے والی تاریکی کس قدر تہ بہ تہ ہو گی [1]

ایک طرف پانی کی گہرائیوں کی تاریکی، دوسری طرف چیختی چنگھاڑتی ہوئی تیز موجوں کی تاریکی اور تیسری طرف سیاہ بادلوں کے اندھیرے۔ یہ سب تہ بہ تہ ظلمتیں ہیں۔ واضح ہے کہ تاریکی کے ایسے عالم میں نزدیک ترین چیز بھی سجھائی نہ دے گی۔ یہاں تک کہ اگر انسان اپنا ہاتھ بھی اپنی آنکھوں کے پاس لے جائے تو نظر نہیں آئے گا۔

وہ کافر کہ جو نورِ ایمان سے بے بہرے ہیں ایسے شخص کی مانند ہیں کہ جو اس سے کئی گنا تاریکی میں گرفتار ہو جب کہ ان کے برعکس روشن ضمیر "مومنین" "نورٌ علیٰ نور" کے مصداق ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ تین قسم کی تاریکیاں کہ جن میں یہ بے ایمان غوطہ زن ہیں یہ ہیں۔

۱۔ غلط اعتقاد کی ظلمت

۲۔ غلط گفتار کی ظلمت اور

۳۔ غلط کردار کی ظلمت

بعض دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ تین قسم کی ظلمتیں ان کی جہالت کے تین مرحلے ہیں۔

پہلا یہ کہ وہ نہیں جانتے

دوسرا یہ کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے

تیسرا یہ کہ اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔

---

[1] جیسا کہ "لسان العرب" میں آیا ہے "سحاب" بارش والے بادل کے معنی میں ہے اور برسنے والے بادل عام طور پر تہ بہ تہ ہوتے ہیں لہٰذا زیادہ سیاہ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

اور اسی کو جہل مرکب اور کئی گنا جہالت کہتے ہیں ۔
بعض دوسروں نے کہا کہ معرفت کے بنیادی عامل دل، آنکھ اور کان ہیں (دل سے یہاں مراد عقل ہے) جیسا کہ سورۂ نحل کی آیہ ۷۸ میں ہے ۔

واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئًا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ

اللہ نے تمھیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسی حالت میں پیدا کیا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور پھر تمھیں کان، آنکھیں اور دل دیئے ۔

لیکن کافر دل کا نور بھی گنوا بیٹھے ہیں اور سماعت و بصارت کی روشنی بھی اور تاریکیوں میں غوطہ زن ہیں[1]

واضح ہے کہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے آیت کے مقصود میں سب ہی شامل ہوں
بہرحال زیربحث دو آیات کے مضمون سے آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پہلے بے ایمان افراد کے اعمال کو جھوٹی روشنی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو خشک اور آگ برساتے بیابان میں ایک سراب کی حیثیت رکھتی ہے۔ سراب کہ جو نہ صرف تشنہ لبوں کی پیاس نہیں بجھا سکتا بلکہ اس کے پیچھے زیادہ دوڑنے کے باعث شدت پیاس میں اضافہ بھی ہوجاتا ہے ۔
یہ جھوٹی روشنی بے ایمان منافقین کے نظر فریب اعمال ہیں اس کے بعد ان اعمال کی باطنی حیثیت کو بیان کیا گیا ہے ان کا باطن ایسا ہولناک ہے کہ وہاں تمام انسانی حواس معطل ہو کر رہ جاتے ہیں ۔
اور گرد و پیش کی قریب ترین چیزیں بھی اس میں پنہاں ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ آدمی اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا چہ جائیکہ دوسروں کو دیکھے ۔ واضح ہے کہ ایسی ہول انگیز تاریکی میں آدمی بالکل تنہا ہو کر رہ جاتا ہے اور مکمل جہالت و بے خبری میں ڈوب جاتا ہے نہ راستہ سجھائی دیتا ہے اور نہ کوئی ہم سفر دکھائی دیتا ہے نہ اسے اپنی جگہ نظر آتی ہے اور نہ یہاں سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اس کے پاس ہوتا ہے کیونکہ اس نے منبع نور یعنی اللہ سے روشنی حاصل نہیں کی اور خود پرستی و جہالت کے پردوں میں جا پڑا ہے ۔
شاید آپ کو یاد ہو کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ نور تمام زیبائیوں، رنگوں، زندگی اور حرکت کا سرچشمہ ہے جبکہ اس کے برعکس تاریکی برائیوں موت اور خاموشی کا منبع ہے ۔ وحشت و نفرت کا مرکز تاریکی ہے سرد مہری اور افسردگی ظلمت کے ساتھ ہیں جو لوگ نور ایمان کھو کر کفر کی ظلمت میں ڈوب جاتے ہیں ان کی یہی حالت ہوتی ہے ۔

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی ، زیربحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

۴۱- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○

۴۲- وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۴۱- کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ سب کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور پرندے بھی جب آسمانوں پر اپنے پر پھیلائے ہوتے ہیں ان میں سے ہر کوئی اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے۔

۴۲- آسمانوں اور زمین کی حکومت اور مالکیت اللہ کے لیے ہے اور تمام موجودات کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

تفسیر

سب اس کی تسبیح کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں نورِ خدا یعنی نورِ ہدایت و ایمان اور کفر و ضلالت کی تہ در تہ تاریکیوں کے بارے میں گفتگو تھی زیر بحث آیات میں توحید کے دلائل پیش کیے گئے ہیں یہ دلائل انوارِ الٰہی کی نشانیاں اور ہدایت کے اسباب ہیں۔

پہلے روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے، ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے (الم تران الله يسبح له من في السماوات والارض)۔ اور پرندے بھی کہ جب آسمان پر اپنے پر پھیلائے ہوتے ہیں اس کی تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں (والطير صافات)۔

وہ سب کے سب اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتے ہیں۔ (کل قد علم صلاته و تسبيحه)۔

اور وہ جو کام بھی کرتے ہیں اللہ ان سے آگاہ ہے (والله عليم بما يفعلون)۔

موجودات کی یہ عمومی تسبیح الٰہی اس کی خالقیت کی دلیل ہے اور اس کی خالقیت تمام عالمِ ہستی پر اس کی مالکیت کی دلیل ہے

Marfat.com

نیز اس بات کی بھی دلیل ہے کہ تمام موجودات لوٹ کر اسی کی طرف جائیں گے۔ اس لیے مزید فرمایا گیا ہے: اور آسمانوں اور زمین کی مالکیت خدا کے لیے ہے اور تمام موجودات کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (و للہ ملک السماوات و الارض و الی اللہ المصیر)۔

گزشتہ سے اس آیت کا تعلق یہی ہو سکتا ہے کہ گزشتہ آیت کے آخری جملے میں ہے کہ تمام انسانوں اور تسبیح کرنے والوں کے اعمال علم خدا میں ہیں اور اس آیت میں دوسرے جہان میں اس کی عدالت، تمام آسمانوں اور زمین پر اس کی مالکیت اور اس کے حقِ عدالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "الم تر" کا مفہوم:۔ اس کا لفظی معنیٰ ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا" بہت سے مفسرین کے بقول اس کا مفہوم ہے "الم تعلم" (کیا تجھے علم نہیں) کیونکہ موجوداتِ عالم کی تسبیح عمومی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو آنکھ سے دیکھی جائے بلکہ یہ حس معنیٰ میں بھی ہو اس کا ادراک دل اور عقل کے ذریعے ہوتا ہے لیکن یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ گویا آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا یہاں "الم تر" فرمایا گیا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں اگرچہ مخاطب پیغمبر اسلامؐ ہیں لیکن بعض مفسرین کے بقول اس سے مراد عام لوگ ہیں اور اس کی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔

لیکن بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس کا مشاہدہ پیغمبر اکرمؐ سے مخصوص ہے اس لیے آپ ہی سے خطاب ہے کیونکہ اللہ نے آپ کو ایسی نظر دے رکھی تھی کہ آپ اس عالم کے تمام موجودات کی تسبیح و حمد کا مشاہدہ کرتے تھے اسی طرح اللہ کے خاص بندے کہ جو آنحضرتؐ کے مکتب کے پیرو ہیں وہ بھی شہودِ عینی کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں لیکن عام لوگوں کے لیے شہودِ علمی اور شہودِ عقلی ہے نہ کہ شہودِ عینی[1]

۲۔ موجوداتِ عالم کی تسبیح:۔ قرآن کی مختلف آیتوں میں اس عظیم کائنات کے تمام موجودات کی چار عبادتیں بیان ہوئی ہیں:۔

۱۔ تسبیح

۲۔ حمد

۳۔ سجدہ

۴۔ نماز

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

زیر بحث آیت میں نماز اور تسبیح کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

سورۂ رعد کی آیت ۱۵ میں عمومی سجدے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

و للّٰه یسجد من فی السماوات و الارض

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ میں تمام موجوداتِ کائنات کی تسبیح اور حمد کا ذکر ہے۔

و ان من شیءٍ الا یسبح بحمده

موجوداتِ عالم کی عمومی تسبیح کی حقیقت اور اس سلسلے میں مختلف تفاسیر کے بارے میں ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں یہاں ہم اس کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ بات کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں دو تفاسیر قابلِ توجہ ہیں۔

(ا) اس عالم کے تمام ذرات چاہے ہم انھیں عاقل شمار کریں چاہے وہ بے جان و بے عقل سب ایک طرح کا شعور و ادراک رکھتے ہیں وہ اپنے انداز سے اللہ کی تسبیح و حمد کرتے ہیں اگرچہ ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے اس سلسلے میں آیاتِ قرآن سے بھی شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

(اا) تسبیح و حمد سے مراد وہی ہے جسے ہم "زبانِ حال" کہتے ہیں۔ جہانِ ہستی کا نظام اور تمام موجودات میں پنہاں کائنات کے حیرت انگیز اسرار زبانِ بے زبانی سے صراحت کے ساتھ اپنے خالق کی قدرت و عظمت اور لامتناہی علم و حکمت بیان کرتے ہیں کیونکہ کائنات کا ہر موجود بدیع، عمدہ اور تعجب خیز ہے۔

مصوری کا نفیس مرقع اور ایک عمدہ خوبصورت شعر بھی اپنے بنانے والے کی حمد و تسبیح کرتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اس کی عمدہ صفات بیان کرتا ہے (حمد) اور دوسری طرف اس سے عیب و نقص کی نفی کرتا ہے (تسبیح)۔

تو پھر یہ باعظمت جہان، اس کے یہ سب عجائبات اور اس کی بے پایاں تعجب خیز چیزیں ——— کیا اپنے مصور و خالق کی حمد و تسبیح نہیں کرتیں۔

البتہ اگر "یسبح له من فی السماوات و الارض" کو آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کی تسبیح کرنے کے معنی میں لیں اور "من" کو ذوی العقول کے لیے محدود رکھیں تو پھر یہاں تسبیح پہلے معنیٰ میں ہو گی کہ جو شعوری اور اختیاری ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم پرندوں کے لیے بھی اس قسم کا شعور تسلیم کریں۔ مندرجہ بالا آیت میں "من فی السماوات" سے مراد پرندے ہیں۔

البتہ ایسا ہونا کوئی عجیب و غریب نہیں ہے کیونکہ بعض دوسری آیات میں بعض پرندوں کے ایسے شعور کی طرف اشارہ موجود ہے۔

(اس بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد پنجم میں سورۂ انعام کی آیت ۳۸ کے ذیل میں گفتگو کی ہے)

۲۔ پرندوں کی مخصوص تسبیح :۔ زیر بحث آیت میں تمام موجوداتِ عالم میں سے بالخصوص پرندوں کی تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی اس عالم میں کہ جبکہ وہ آسمان پر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہوں۔

Marfat.com

اس میں ایک نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ انتہائی زیادہ تنوع کے علاوہ پرندوں میں بہت سی ایسی خصوصیات موجود ہیں کہ جو ہر عاقل کی آنکھ اور دل کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

کشش ثقل کے قانون کے برخلاف پرندوں کے بھاری جسم آسمانوں پر بڑی تیز رفتاری سے پرواز کرتے ہیں خصوصاً جب انھوں نے اپنے پروں کو پھیلایا ہوتا ہے اور ہوا کی موجوں پر سوار ہوتے ہیں اور بغیر اپنے آپ کو ہلائے جس طرف چاہیں تیزی کے ساتھ پھر جاتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ہوا شناسی کے امور میں پرندے گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ زمین کے جغرافیائی حالات سے بہت باخبر ہوتے ہیں۔ ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض پرندے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک جا پہنچتے ہیں۔ عجیب و غریب اور پر اسرار نظام انھیں اس طویل سفر میں راہنمائی کرتا ہے یہاں تک کہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہو تب بھی وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ ان کی یہ آگاہی توحید کے حیران کن اور روشن ترین دلائل میں سے ہے۔

چمگادڑوں کے اندر ایک خاص قسم کا راڈار نصب ہوتا ہے اس راڈار کے ذریعے وہ رات کی تاریکی میں اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ یہاں تک وہ کبھی پانی کی موجوں کے اندر مچھلی کا نشانہ باندھتی ہیں اور انھیں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچک لیتی ہیں۔

بہر حال پرندوں کے اندر بہت سے عجائبات چھپے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے قرآن نے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ "کل قد علم صلاته و تسبیحه" کی تفسیر :۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "علم" کی ضمیر "کل" کی طرف لوٹتی ہے۔ اس کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔

آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے۔ اور پرندے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح سے آگاہ ہے۔

لیکن بعض دیگر مفسرین کے مطابق "علم" کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی خدا ان میں سے ہر ایک کی نماز اور تسبیح سے آگاہ ہے۔

البتہ پہلی تفسیر آیت کے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ گویا تسبیح کرنے والا ہر کوئی اپنی "تسبیح" اور اپنی "نماز" کی شرائط و خصوصیات جانتا ہے۔

اگر اس سے مراد شعور کے ساتھ تسبیح ہو تو اس کا مطلب تو واضح ہے۔ لیکن اگر زبان حال کے ساتھ ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ایک کا اپنا خاص نظام ہے کہ جو ایک خاص طریقے سے عظمت پروردگار کا ترجمان ہے اور ہر ایک اس کی قدرت و عظمت کا مظہر ہے۔

۵۔ "صلاۃ" سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین مثلاً طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اور آلوسی نے روح البیان میں

Marfat.com

اس مقام پر " صلاۃ" کا معنی " دعا " کیا ہے جو کہ اس کا اصل لغوی معنٰی ہے ۔ اس معنٰی کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کے موجودات زبانِ حال یا زبانِ مقال سے بارگاہِ خدا میں دعا کرتے ہیں اور اس سے فیض کا تقاضا کرتے ہیں اور وہ بھی چونکہ فیاضِ مطلق ہے انھیں ان کی استعداد کے مطابق عطا کرتا ہے اور نوازنے میں دریغ نہیں کرتا۔ البتہ ان میں سے ہر کوئی اپنے آپ میں جانتا ہے کہ اسے کس چیز کی احتیاج ہے اور اسے کیا مانگنا چاہیے ، اور کیا دعا کرنا چاہیے ۔

علاوہ ازیں ان آیات کے مطابق کہ جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اس کی بارگاہِ عظمت اور قوانینِ آفرینش کے سامنے وہ سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اپنے تمام وجود کے ساتھ اللہ کی صفاتِ کمال بیان کرتے ہیں اور اس سے ہر قسم کے نقص کی نفی کرتے ہیں اور اس طرح ان کی چاروں عبادات حمد، تسبیح ، دعا اور سجود کی تکمیل ہوتی ہے ۔

Marfat.com

۴۳۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ
بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ
فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَ
يَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ ۖ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ
يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ۝
۴۴۔ يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً
لِأُولِي الْأَبْصَارِ ۝
۴۵۔ وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَاءٍ ۖ فَمِنْهُمْ
مَنْ يَمْشِي عَلَىٰ بَطْنِهِ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَىٰ
رِجْلَيْنِ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَىٰ أَرْبَعٍ ۚ يَخْلُقُ
اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۴۳۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر انھیں
باہم جوڑ دیتا ہے، پھر انھیں تہ دار بنا دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے
کہ اُس سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور آسمانوں میں جو

Marfat.com

پہاڑ ہیں، خدا ان سے اولے نازل کرتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے اُن کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اُن کے نقصان سے بچالیتا ہے۔ قریب ہے کہ ان (بادلوں کی) بجلی کی چمک آنکھوں (کی بینائی ہی) کو لے جائے۔

۴۴۔ اللہ رات اور دن کو الٹ پھیر کرلاتا ہے اور اس میں صاحبان بصیرت کے لیے عبرت ہے۔

۴۵۔ اور اللہ نے ہر حرکت کرنے والے کو پانی سے پیدا کیا ہے۔ ان جانداروں میں سے بعض پیٹ کے بل چلتے ہیں، بعض دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعض چار پیروں پر۔ خدا جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اُسے پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

کچھ اور عجائبات خلقت

ان آیات میں بھی عجائبات خلقت اور ان میں پوشیدہ علم وحکمت وعظمت کا ایک گوشہ بیان کیا گیا ہے اور ان میں بھی سب اُس کی ذاتِ پاک کی توحید کے دلائل ہیں۔

ایک دفعہ پھر رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر انہیں ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے اور انھیں تہ در تہ کر دیتا ہے (الم تر ان اللہ یزجی سحابا ثم یؤلف بینہ ثم یجعلہ رکاما)۔

"پھر تو دیکھتا ہے کہ ان بادلوں میں سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔ اور کوہ و دشت اور باغ و صحرا پر برستے ہیں۔ (فتری الودق یخرج من خلالہ)۔

Marfat.com

"یزجی" "ازجاء" کے مادے سے ہے۔ آہستہ آہستہ اور نرمی کے ساتھ منتشر چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لا کر چلانے کے معنی میں ہے۔ بادلوں کے بارے میں یہ لفظ پوری طرح سے صادق آتا ہے۔ کیونکہ ان کے مختلف ٹکڑے سمندروں کے مختلف گوشوں سے اُٹھتے ہیں۔ پھر اللہ کا دستِ قدرت انہیں ایک دوسرے کی طرف چلاتا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے اور تہ دار بنا دیتا ہے۔

"رُکام" (بروزن "غلام") ایسی چیزوں کے معنی میں ہے کہ جو ایک دوسرے کے اُوپر چڑھی ہوئی اور تہ در تہ ہوں۔

"ودق" "شرق" کے وزن پر ہے۔ بہت سے مفسرین کے مطابق یہ بارش کے قطروں کے معنی میں ہے کہ جو بادلوں سے برستے ہیں۔ مفردات میں راغب کے بقول اس کا ایک اور معنی بھی ہے ——— اور وہ ہے "پانی کے بہت ہی چھوٹے ذرات کہ جو غبار کی صورت میں بارش کے برستے وقت فضا میں بکھر جاتے ہیں۔" یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو چیز عظمت پروردگار کی زیادہ اہم نشانی ہے۔ وہ بارش ہی کے حیات بخش قطرات ہیں۔ نہ کہ پانی کے وہ قطرات کہ جو غبار کی مانند ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن نے جہاں کہیں بھی بادلوں اور آسمانوں سے نزولِ برکات کا ذکر کیا ہے۔ وہاں بارش کی طرف ہی اشارہ ہے۔ جی ہاں! بارش ہی ہے جو مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے، نباتات کو لباسِ حیات پہناتی ہے اور انسانوں اور حیوانوں کو سیراب کرتی ہے۔

اس کے بعد آسمان اور بادلوں سے پیدا ہونے والی ایک اور عجیب و غریب چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

اور آسمانوں سے موجود پہاڑوں سے اولے برساتا ہے (وینزل من السماء من جبال فیھا من برد)۔

"اور جسے چاہے ان کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے" درخت، پھل، کھیت اور بعض اوقات انسان حیوان بھی ان سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ (فیصیب بہ من یشاء)۔ اور جسے چاہتا ہے اس کے نقصان سے بچا لیتا ہے (ویصرفہ عن من یشاء)۔

جی ہاں! وہی تو ہے جو کبھی بادل سے حیات بخش بارش برساتا ہے اور کبھی اسے نقصان رساں ژالہ باری میں بدل دیتا ہے اور ژالہ باری جو کبھی ہلاکت آمیز بھی ہوتی ہے اور یہ امر اللہ کی انتہائی قدرت و عظمت کا غماز ہے اس لئے انسان کا سود و زیاں اور موت و حیات ایک ہی مقام پر جمع کر دی ہے۔ بلکہ ان چیزوں کو گویا ایک دوسرے کے دل میں رکھ دیا ہے۔

آیت کے آخر میں آسمان پر اُبھرنے والی توحید کی ایک اور نشانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قریب ہے کہ بادلوں سے کوندنے والی بجلی انسان کی آنکھیں اچک لے (یکاد سنا برقہ یذھب بالابصار)۔

وہ بادل کہ جو در حقیقت پانی کے ذرات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب وہ برقی توانائی کے حامل ہو جاتے ہیں۔ تو اس کے اندر سے آگ اس طرح لپکتی ہے کہ آنکھیں خیرہ کر دیتی ہے اور اس کی گرج کانوں کو گویا پھاڑے دیتی ہے۔ اور کبھی زمین بھی ہل کر رہ جاتی ہے۔ پانی کے لطیف بخارات کے اجتماع میں ایسی چیز کا پیدا ہونا سچ مچ تعجب انگیز ہے۔

Marfat.com

ایک سوال کا جواب

سوال یہ ہے کہ آسمان میں کونسا پہاڑ ہے کہ جس سے ژالہ باری ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں، مثلاً:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ "جبال" (متعدد پہاڑ) کنائے کے طور پر ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں۔ اناج کا پہاڑ یا علم کا پہاڑ لہٰذا یہاں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان بادلوں میں پہاڑ کی مانند برف کا عظیم تودہ معرض وجود میں آتا ہے۔ اولے گویا اُس پہاڑ کے ٹکڑے اور سنگریزے ہیں۔ کچھ کسی شہر میں جا گرتے ہیں۔ کچھ بیابان میں جا پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں کو اُن سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ پہاڑوں سے مراد بادل کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں۔ جو پہاڑوں کی طرح عظیم ہوتے ہیں۔

۳۔ تفسیر "فی ظلال" کے مؤلف نے اس سلسلے میں ایک بات کی ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آسمان پر بادل کے ٹکڑے سچ مچ پہاڑ کی طرح کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ نیچے زمین سے ہم دیکھیں تو ہموار دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں کے اُوپر سے سفر کیا، انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بادل بالکل پہاڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں درے، بلندیاں اور پستیاں ہو بہو زمین پر پہاڑوں جیسی ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے بادل پر پہاڑ کا اطلاق بالکل مناسب ہے[1]

اس گفتگو کے ساتھ ہم اس نکتے کا اضافہ کر سکتے ہیں کہ سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق اولے یوں پیدا ہوتے ہیں کہ بارش کے قطرے بادل سے الگ ہوتے ہیں۔ وہ ہوا کے بالائی حصے میں سردی کی شدید لہروں سے ٹکرا کر برف کی گولیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس حصے میں موجودہ تباہ کن طوفان اور جھکڑ کے باعث بعض اوقات یہ اولے پھر اُوپر کی طرف اچھل کر بادل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس اثناء میں پانی کی ایک اور تہ ان پر چڑھ جاتی ہے۔ بادلوں سے جدا ہوتے وقت وہ پھر برف کی گولیاں بن جاتے ہیں۔ کبھی تو ان گولیوں کے گرنے اور طوفانوں سے ٹکرا کر اوپر بادلوں کی طرف اچھلنے کا عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا ہے اور ہر بار ان پر ایک نئی تہہ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ اولے اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ طوفان اور جھکڑ انھیں اب اُوپر نہیں اچھال سکتے۔ لہٰذا وہ زمین پر آ پڑتے ہیں۔ یا پھر طوفان رُک جانے کے باعث وہ کسی رکاوٹ کے بغیر زمین پر آ پڑتے ہیں۔[2]

اس بات کی طرف توجہ کرنے سے لفظ "جبال" میں جو سائنسی نکتہ پوشیدہ ہے۔ زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بھاری اولے تبھی وجود میں آ سکتے ہیں۔ جب بادل تہ دار ہو جائیں تاکہ جس وقت طوفان برف کی گولیوں کو ان کے اندر کی

---

[1] "فی ظلال القرآن" ج ۶ ص ۱۰۹

[2] دائرۃ المعارف فرہنگ نامہ، مادہ "تگرگ"۔

Marfat.com

طرف اچھالیں تو یہ پانی کی زیادہ مقدار جذب کر سکیں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب اوپر کی طرف بادل کے ٹکڑے مرتفع اور بلند پہاڑوں کی طرح ہوں۔ (غور کیجئے گا) [۱]

بعض مؤلفین نے اس موقع پر ایک اور بحث بھی کی ہے۔ جس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

" زیر بحث آیات میں بلند بادل صریحاً برف کے پہاڑوں کی طرف اشارہ ہے اور یا دوسرے الفاظ میں ان سے وہ پہاڑ مراد ہیں کہ جن میں ایک طرح کی برف ہوتی ہے۔ اور یہ بہت جاذب نظر ہے۔ کیونکہ ہوائی جہازوں کے وجود میں آنے کے بعد اور بلند پروازوں کے ممکن ہو جانے کے بعد انسانی علم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ سائنسدانوں نے ایسے بادل دریافت کیے ہیں۔ کہ جو برف کے ذرات سے بنے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ کہ جن پر برف' موسلادھار طوفانی بارشوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے بار بار برف کے پہاڑ یا برف سے بنے ہوئے پہاڑ کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ واقعاً آسمان میں برف کے پہاڑ موجود ہیں۔ [۲]

اگلی آیت میں رات اور دن کی خلقت اور ان کی خصوصیات کے حوالے سے عظمتِ الٰہی کی ایک اور نشانی بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اللہ رات اور دن کو اُلٹ پھیر کراتا ہے۔ اور اس میں اہل بصیرت کے لیے عبرت ہے۔
(یقلب اللہ اللیل والنھار ان فی ذٰلک لعبرۃ لاولی الابصار)۔

یہ کہ اس تغیر اور اُلٹ پھیر سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں علماء نے مختلف تفسیریں کی ہیں، مثلاً:

بعض نے کہا کہ اس سے مراد رات اور دن کی آمد و رفت ہے۔ کیونکہ رات آتی ہے تو دن کو محو کر دیتی ہے۔ اور دن آتا ہے۔ تو رات کو محو کر دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے ایک تدریجی طور پر چھوٹا ہوتا ہے تو دوسرا بڑھ جاتا ہے۔ اور اسی سے مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں۔

بعض نے اسے رات اور دن میں پیدا ہونے والے مختلف تغیرات، مثلاً گرمی اور سردی وغیرہ کے معنیٰ میں

---

[۱] "وینزل من السماء من جبال من برد" میں تین مرتبہ لفظ "من" آیا ہے۔ عربی ادب کے لحاظ سے ان میں سے پہلا "من" "ابتدائیہ" ہے، دوسرا بھی "ابتدائیہ" کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ البتہ تیسرے "من" کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ "بیانیہ" ہے اور اس لحاظ سے جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ "اللہ آسمان سے اولوں کے پہاڑوں سے اولے بھیجتا ہے" اس قول کی بنا پر "ینزل" کا مفعول محذوف ہے "البرد" کہ جو قرینۂ کلام سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری اور تیسری تفسیر کہ جسے ہم نے انتخاب کیا ہے، کی بنا پر یہ "من" "زائدہ" ہوگا، جیسا کہ زمخشری نے رُوح المعانی میں لکھا ہے۔ یا پھر یہ "تبعیضیہ" ہے۔ (غور کیجئے گا)

[۲] بادو باراں در قرآن ص۱۴۰ و ص۱۴۱ (مزید توضیح کے لیے مذکورہ کتاب کا مطالعہ فرمائیں)۔

Marfat.com

لیا ہے۔ ؎۱

لیکن بتغیر کہے واضح ہے کہ یہ تفسیریں باہم ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ اور ہو سکتا ہے یہ سب "یقلب" کے مفہوم میں جمع ہوں۔

بلاشبہ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ رات اور دن کا آنا جانا اور ان کے تدریجی تغیرات انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور "اولی الابصار" اور اہل نظر کے لیے درس عبرت ہیں۔ اگر سورج ایک ہی طرح چمکتا رہے اور دھوپ مسلسل پڑتی رہے تو ہوا کا درجہ حرارت بہت بڑھ جائے اور جاندار چیزیں جل جائیں اور اعصاب بہت تھک جائیں۔ لیکن اس تپش اور چمک کے درمیان اگر رات کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو ان چیزوں کو اعتدال میں رکھتے ہیں۔

شب و روز میں پیدا ہونے والی تدریجی تبدیلیاں چار موسموں کی پیدائش کا باعث بنتی ہے اور یہ نباتات کے بار آور ہونے کے لیے بہت ہی مؤثر ہیں۔ اسی طرح یہ تبدیلیاں جانداروں کی زندگی، بارش برسنے اور زمینوں میں پانی کے ذخائر جمع ہونے کے لیے بھی بہت مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ ؎۲

زیر نظر آخری آیت چہرۂ آفرینش کے ایک اور رُخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ بھی توحید الٰہی کے لیے ایک واضح دلیل ہے اور یہ ہے مختلف صورتوں میں زندگی کا وجود۔ ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے ہر چلنے پھرنے والے کو پانی سے پیدا کیا ہے (واللہ خلق کل دابۃ من ماء)۔

اگرچہ ان سب کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی عجیب مختلف قسم کے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔ "کچھ ان میں سے پیٹ کے بل چلتے ہیں (فمنھم من یمشی علی بطنہ)۔

اور کچھ ہیں کہ جو دو پاؤں پر چلتے ہیں (انسان اور پرندے) اور کچھ ہیں کہ جو چار پاؤں پر چلتے ہیں (چوپائے) (ومنھم من یمشی علی رجلین ومنھم من یمشی علی اربع)۔

اور پھر یہی نہیں۔ زندگی کے اور بھی مظاہر ہیں۔ ان میں سے وہ بھی جاندار ہیں کہ جو پانی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح حشرات الارض بھی ہزاروں قسم کے ہیں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے پیدا کرتا ہے (یخلق اللہ ما یشاء)۔ کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر)۔

چند اہم نکات

۱۔ آیت میں "ماء" سے کیا مراد ہے؟

لفظ "ماء" (پانی) سے یہاں کون سے پانی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ ان آراء کو تین

؎۱ تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر روح المعانی

؎۲ اس سلسلے میں تفسیر نمونہ ج ۸ میں سورۂ یونس کی آیت ۶ کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

تفسیروں میں جمع کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اس سے مراد نطفے کا پانی ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس تفسیر کو انتخاب کیا ہے۔ بعض روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس تفسیر میں یہ مشکل درپیش ہے کہ تمام چلنے پھرنے والے جاندار نطفے سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایسے بھی جاندار ہیں کہ جو ایک خلیے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے بھی رینگنے والے جاندار ہیں کہ جو "دابۃ" کا مصداق ہیں اور خلیوں کی تقسیم سے وجود میں آتے ہیں۔ نہ کہ نطفے سے۔

ہاں البتہ یہ کہا جائے کہ آیت نوعی پہلو رکھتی ہے۔ کلی نہیں، پھر بات ٹھیک ہو سکتی ہے

۲۔ اس سے مراد پہلے موجود کی پیدائش ہے۔ کیونکہ بعض روایات کے مطابق سب سے پہلے اللہ نے پانی پیدا کیا اور اس کے بعد انسانوں کو پانی سے پیدا کیا۔ جدید سائنسی مفروضے کی بنا پر بھی زندگی کی پہلی کونپل دریاؤں میں ظاہر اور پانیوں میں پیدا ہونے والا یہ پہلا موجود سب سے پہلے انہی پانیوں کی گہرائیوں پر یا ان کے کناروں پر حکمران ہوا۔ البتہ وہ قوت کہ جس نے ان تمام پیچیدگیوں کے ساتھ پہلے مرحلے میں موجودِ زندہ کو وجود بخشا اور پھر بعد کے مراحل میں میں ہدایت کی وہ ایک مافوقِ طبیعیات قوت تھی — یعنی ارادۂ الٰہی۔

۳۔ اس سے مراد یہ ہے کہ موجودہ حالت میں موجودات کی بقا کا دارومدار پانی پر ہی ہے اور ان کی ساخت کا اہم حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ اور کوئی جاندار پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہ تفاسیر ایک دوسرے کے منافی تو نہیں۔ لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔[۱]

۲۔ ایک سوال کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہاں جانوروں کو ان تین قسموں ہی میں کیوں تقسیم کیا گیا ہے،

۱۔ پیٹ کے بل رینگنے والے۔

۲۔ دو پاؤں والے

۳۔ چوپائے

جبکہ چلنے پھرنے والے جانور بہت سے ایسے ہیں کہ جو چار سے زیادہ ٹانگیں رکھتے ہیں۔

اس سوال کا جواب خود آیت میں پوشیدہ ہے کیونکہ۔ اس جملے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

---

[۱] تکامل انواع کے بعض طرفداروں نے اپنے مفروضے کے اثبات کے لیے اس آیت کا سہارا لیا ہے۔ لیکن ہم نے جلد نمبر ۱۱ میں سورۂ حجر کی آیت نمبر ۲۸ کے ذیل میں اس مفروضے کے ثابت نہ ہونے کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اصولاً آیاتِ قرآن کو مفروضوں پر منطبق نہیں کرنا چاہیئے: کیونکہ آیات قرآنی حقیقت ثابت رکھتی ہیں۔ جبکہ مفروضے بدلتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

"یخلق اللہ ما یشاء"

"خدا جو کچھ چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔"

علاوہ ازیں وہ اہم ترین جانور کہ جن سے زیادہ تر انسان کا واسطہ ہے۔ وہ انہی تین گروہوں پر مشتمل ہیں۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ جن جانوروں کی ٹانگیں چار سے زیادہ ہیں۔ ان کا بھی اصل دارومدار چار ٹانگوں پر ہی ہے اور باقی ٹانگیں معاون ٹانگیں شمار ہوتی ہیں۔

۳۔ زندگی مختلف صورتوں میں: اس میں شک نہیں کہ کائنات میں ظاہر ہونے والی عجیب ترین چیز زندگی ہے۔ زندگی وہ معمہ ہے جو ابھی تک دانشور اور سائنسدان حل نہیں کر سکے سب کہتے ہیں کہ یہ جاندار اس کائنات کے بے جان مادے سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ حتماً کن شرائط اور حالات کے تحت زندگی وجود میں آجاتی ہے۔ کیونکہ ابھی تک مشاہدے اور تجربے میں نہیں آسکا کہ کسی لیبارٹری میں کسی بے جان چیز سے زندگی وجود میں آگئی ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہزارہا ماہرین اور سائنس دان سالہا سال سے غور و فکر اور تجربات کر رہے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں سائنس دانوں کے سامنے ——— ایک دھندلی سی تصویر ابھری ہے۔ لیکن یہ تصوّر ابھی بہت خام ہے۔ جو کچھ مسلّم ہے وہ یہ کہ زندگی کے اسرار اس قدر پیچیدہ ہیں۔ کہ انسانی علوم اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود ابھی تک اسے سمجھنے سے عاجز ہے۔

عالم کے موجودہ حالات میں جاندار صرف جاندار ہی سے وجود میں آتے ہیں۔ اور کوئی جاندار کسی بے جان سے وجود نہیں پاتا۔ لیکن مسلّماً، آغاز حیات میں یوں نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں کرۂ زمین پر حیات کی پیدائش ایک تاریخ رکھتی ہے۔ لیکن وہ تاریخ ابھی تک ایک ایسا معمّہ ہے۔ جو کسی پر واضح نہیں ہے۔ اور اس سے بھی عجیب تر زندگی کا تنوع اور اختلاف۔ مختلف جانداروں میں زندگی کی صورت مختلف ہے۔ صرف مائیکروسکوپ سے نظر آنے والے ایک سیل سے پیدا ہونے والے جاندار بھی ہیں۔ اور کوہ پیکر ویل مچھلی بھی کہ جس کی لمبائی بعض اوقات تیس گز سے زیادہ ہوتی ہے اور جو گوشت کا تیرنے والا ایک پہاڑ ہے۔ حشرات الارض کی لاکھوں قسمیں ہیں۔ اور ہزاروں طرح کے پرندے ہیں۔ اور پھر ان میں سے بھی ہر کسی کے اسرار کی اپنی دُنیا ہے۔

بیالوجی کی کتب آج کے دور میں کتب خانوں کا ایک عظیم حصّہ ہیں۔ یہ کتابیں جانداروں کے اسرار کا صرف ایک گوشہ بیان کرتی ہیں۔

۱؎ تفسیر قرطبی اور تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲؎ ادبی لحاظ سے اس نقطے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "منھم" کی ضمیر عموماً جمع کے لیے اور ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ تاہم اس آیت میں غیر ذوی العقول کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ اور اسی طرح لفظ "من" بھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ الفاظ غیر ذوی العقول کے لیے بھی استعمال ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

ان جانداروں میں دریائی جانور تو خصوصاً عجائبات کی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں آج بھی بہت معلومات کے باوجود انسان بہت ہی کم جانتا ہے۔

واقعاً کتنا عظیم ہے وہ اللہ کہ جس نے ان جانداروں کو اس وسیع تنوع کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور ہر ایک کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ اسے عطا کی ہے اور کتنا عظیم ہے اُس کا علم اور کتنی عظیم ہے اس کی قدرت کہ اُس نے ہر ایک کو اُس کے حالات اور ضروریات کے مطابق رکھا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سب کی ابتدا ایک ہی ہے اور وہ ہے پانی — زمین کا کچھ مادہ۔

Marfat.com

۴۶۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ يَهۡدِىۡ
مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ○
۴۷۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوۡلِ وَاَطَعۡنَا
ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ
اُولٰٓـئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○
۴۸۔ وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ
اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ○
۴۹۔ وَاِنۡ يَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَـقُّ يَاۡتُوۡۤا اِلَيۡهِ مُذۡعِنِيۡنَ ؕ○
۵۰۔ اَفِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ يَخَافُوۡنَ اَنۡ
يَّحِيۡفَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓـئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوۡنَ ○ؑ

ترجمہ

۴۶۔ ہم نے حقیقت واضح کرنے والی آیات نازل کیں اور اللہ جسے چاہتا صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

۴۷۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے ہیں اور اطاعت گزار ہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے ایک گروہ روگردانی

Marfat.com

کرتا ہے (درحقیقت) وہ مومن ہی نہیں ہیں۔

۴۸۔ اور جب انھیں پکارا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آئیں، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے۔

۴۹۔ لیکن اگر (فیصلہ ان کے فائدے میں ہو اور) حق انہیں مل جائے، تو بڑی عاجزی سے رسول کے پاس آجاتے ہیں۔

۵۰۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک میں مبتلا ہیں یا انھیں خوف ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ خود ظالم ہیں۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کے کچھ حصّے کے لیے دو شان نزول ذکر کی ہیں، جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ کسی منافق کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا۔ یہودی نے مسلمان نما منافق سے کہا چلو پیغمبر اسلام کے پاس چلتے ہیں۔ اور ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ لیکن منافق نے یہ بات نہ مانی۔ اُس نے کہا کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں۔ کعب یہودی تھا۔ (بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ اس نے کہا، ہوسکتا ہے محمد ہمارے ساتھ انصاف نہ کرے۔)

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور ایسے شخص کی سخت مذمت کی گئی۔

۲۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ اور حضرت عثمان کے درمیان ایک مسئلہ پیدا ہوگیا (ایک روایت میں، حضرت عثمان کی بجائے مغیرہ بن وائل کا نام لکھا ہے) مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے حضرت علیؑ سے کچھ زمین خریدی تھی۔ اس زمین میں کچھ پتھر نکل آئے۔ خریدار نے چاہا کہ اس زمین کو معیوب قرار دے کر سودا منسوخ کر دیا جائے۔ اس پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا چلو رسول اللہ کے پاس چلتے ہیں اور اُن سے فیصلہ لیتے ہیں۔ لیکن حکم بن العاص کہ جو منافقین میں سے تھا، اُس نے خریدار سے کہا ایسا نہ کرنا

Marfat.com

کیونکہ اگر تو اس کے چچا زاد بھائی (یعنی رسول اللہؐ) کے پاس فیصلہ لے گیا تو یقیناً وہ اس کے حق میں فیصلہ دیں گے۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اور اس کی سخت مذمت کی گئی۔[1]

تفسیر

ایمان اور خدا کے فیصلے پر سر تسلیم خم

گذشتہ آیات میں اللہ پر ایمان لانے کے بارے میں گفت گو تھی، توحیدِ الٰہی دلائل پیش کیے گئے تھے۔ اور اللہ کی نشانیوں کا ذکر تھا۔ اب زیرِ نظر آیات میں ایمان کے آثار کے بارے میں بات کی گئی ہے، توحید پر ایمان کے تقاضوں کا بیان ہے اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ـــــ واضح کرنے والی آیات نازل کیں (لقد انزلنا اٰیات مبینات)۔

ایسی آیات کہ جو دلوں کو نورِ ایمان و توحید سے منور کرتی ہیں، افکارِ انسانی کو جلا بخشتی ہیں اور زندگی کے تاریک ماحول کو بدل دیتی ہیں۔ یہ آیاتِ بینات ایمان کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں لیکن حقیقی تاثیر تو ہدایت الٰہی سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ "اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔" (واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم)۔

اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ کا ارادہ اور اس کی مشیت بے بنیاد نہیں ہے۔ نورِ ایمان سے وہ ایسے دلوں کو روشن کرتا ہے جو اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں اور اس کے اہل ہوں۔ یعنی جنھوں نے خود مجاہدہ کی ابتدا کی ہو اس کی طرف قدم بڑھائے ہوں۔

اس کے بعد منافقین کی مذمت کی گئی ہے کہ جو ایمان کا دم تو بھرتے ہیں، لیکن ایمان اُن کے دلوں میں نہیں اُترا۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ان کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے۔ درحقیقت وہ مومنین ہی نہیں ہیں۔ (ویقولون اٰمنا باللہ و بالرسول واطعنا ثم یتولیٰ فریق منھم من بعد ذٰلک وما اولٰئک بالمؤمنین)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، رُوح المعانی، تبیان، تفسیر قرطبی، تفسیر فخر رازی، تفسیر صافی اور نور الثقلین۔ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

Marfat.com

یہ کیسا ایمان ہے کہ جو فقط ان کی زبانوں تک محدود ہے۔ اور ان کے اعمال میں ظاہر نہیں ہوتا؟

اس کے بعد اُن کی بے ایمانی کی دلیل کے طور پر فرمایا گیا ہے: جب انھیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف آئیں تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ رُخ موڑ لیتا ہے (واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون)۔

مزید تاکید کے لیے اور ان کے شرک اور دُنیا پرستی کو مزید واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: لیکن اگر یہ فیصلہ ان کے فائدے میں جاتا ہو تو بڑی عاجزی کے ساتھ رسول کی طرف آجاتے ہیں۔ (وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عبارت میں اللہ اور رسول دونوں کی طرف دعوت کا ذکر ہے۔ لیکن بعد والی عبارت میں "لیحکم" مفرد کی شکل میں آیا ہے کہ جو صرف رسول اللہ کے فیصلے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ رسول اللہ کا فیصلہ اللہ کے فیصلے سے جدا نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ "الیہ" کی ضمیر رسول اللہ یا ان کے فیصلے کی طرف لوٹتی ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے کہ مندرجہ بالا آیات میں رسول اللہ کے فیصلے سے اعراض اور مُنہ پھیرنے کا ذکر منافقین کے صرف ایک گروہ کے لیے ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دوسرا گروہ اس حد تک بے حیا اور جسارت کرنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ نفاق بھی ایمان کی طرح مختلف درجات رکھتا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں رسول اللہ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے اصل اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے (افی قلوبھم مرض)۔

منافقین کی ایک صفت اور ہے کہ وہ اظہارِ ایمان تو کرتے ہیں۔ لیکن اللہ اور رسولؐ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے کیونکہ ان کے دل توحید سے منحرف ہیں۔

اور اگر ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری نہیں ہے تو پھر یہ وہ "شک میں مبتلا ہیں" (ام ارتابوا)۔

اور فطری بات ہے کہ جو شخص کسی دین کو قبول کرنے میں متردد ہو وہ اس کے لوازم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔

اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں اور وہ مومن ہیں" تو کیا وہ واقعاً ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا" (ام یخافون ان یحیف اللہ علیھم ورسولہ)۔

حالانکہ یہ واضح تضاد ہے۔ جو شخص رسول اسلامؐ کو اللہ کا بھیجا ہوا رسول اور اُس کا پیغام بر سمجھتا ہے اور اُس کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتا ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ اُسے احتمال ہو کہ وہ ظلم کریں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ کسی پر ظلم کرے؟ کیا ظلم، جہالت، احتیاج یا خود غرضی کی پیداوار نہیں؟ جب کہ ذاتِ مقدس پروردگار ان سب چیزوں سے پاک ہے۔" بات دراصل یہ ہے کہ وہ خود ظالم ہے۔ (بل اُولٰٓئک ھم الظالمون)۔

Marfat.com

وہ نہیں چاہتے کہ اپنے حق پر قناعت کریں اور چونکہ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ ایسی کوئی چیز انہیں نہیں دیں گے کہ جس پر کسی دوسرے کا حق ہو۔ لہٰذا وہ آپ کا فیصلہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

تفسیر" فی ظلال القرآن" کے مؤلف کے بقول ان تینوں تعبیروں میں سے ہر ایک ایک خاص پہلو کی حامل ہے۔

پہلی اثبات کے لیے ہے۔

دوسری تعجب کے لیے ہے۔

تیسری انکار کے لیے ہے۔

پہلے جملے میں قرآن حقیقی وجہ بیان کرنا چاہتا ہے اور وہ ہے نفاق کی بیماری۔

دوسرے جملے میں عدالتِ رسولؐ میں ان کے شک پر تعجب کا اظہار مقصود ہے۔ نیز رسول اللہؐ کے فیصلے کی صحت کا اعلان ہے۔ جبکہ وہ ایمان کا دعوے کرتے ہیں۔

تیسرے جملے میں اُن کے واضح تضاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے ایمان کے دعوے سے ان کا عمل ہم آہنگ نہیں ہے۔[1]

مفسرِ مذکور کی بات پر صرف یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ انہوں نے" ام ارتابوا "کو عدالت رسولؐ اور فیصلے کی صحت پر شک کے معنیٰ میں لیا ہے۔ حالانکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ خود نبوت میں شک کو بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ بہت سے مفسرین نے اس امر کو قبول کیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **نفاق کی بیماری:** یہ وہ مقام نہیں کہ جہاں قرآن مجید نے نفاق کو ایک " مرض" قرار دیا ہے۔ بلکہ اس سے پہلے سورۂ بقرہ کی ابتدا میں منافقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا۔

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور اللہ ان کی بیماری بڑھا دیتا ہے۔

جیساکہ پہلی جلد میں ہم اس آیت کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ نفاق درحقیقت ایک بیماری اور انحراف ہے۔ جو انسان صحیح اور صحت مند ہو اُس کا ایک ہی چہرہ ہوتا ہے۔ اس کی رُوح اُس کا جسم آپس میں ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اگر وہ مومن ہے تو اس کے تمام وجود سے ایمان کی صدا بلند ہوتی ہے اور اگر وہ منحرف ہے تو اس کا ظاہر و باطن انحراف کا مظہر ہے۔ لیکن جس کا ظاہر ایمان ہے اور باطن کُفر کی لو دیتا ہے۔ یہ تو ایک قسم کی بیماری ہے اور ایسے لوگ چونکہ اپنی ہٹ دھرمی

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن، ج ۶ ص ۱۱۵

Marfat.com

اور ڈھٹائی کی وجہ سے لطف و ہدایتِ الٰہی کے مستحق نہیں ہیں۔ لہٰذا خداوندِ عالم انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ ان کی بیماری میں اضافہ ہو۔

واقعاً کسی معاشرے کے خطرناک ترین افراد یہی منافقین ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بارے میں انسان پر اپنی شرعی ذمہ داری واضح نہیں ہوتی۔ نہ وہ حقیقی دوست ہوتے ہیں اور نہ ظاہراً دشمن۔ مومنین کے وسائل سے استفادہ کرتے ہیں اور کفار کے عقاب سے بھی مامون ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اعمال کفار سے بدتر ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ ظاہر و باطن کی ناہم آہنگی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی۔ آخر کار پردے ہٹ جاتے ہیں اور ان کی بد باطنی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم زیرِ بحث آیات اور ان کی شانِ نزول میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ ایک مسئلہ پیش آنے سے ان کی قلعی کھل گئی اور اُن کا خبثِ باطن ظاہر ہو گیا۔ لہ

۲۔ عادلانہ فیصلہ صرف خدا کا ہوتا ہے: اس میں شک نہیں کہ انسان کو اپنے آپ کو محبت و نفرت، خود خواہی اور ذاتی اغراض سے الگ کرنا چاہیئے جو لاشعوری طور پر ان امور کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ معصوم ہو اور پروردگار کی طرف سے محفوظ ہو۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ حقیقی قانون گزار صرف خدا ہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بے پایاں علم کی وجہ سے انسان کی تمام ضروریات کو بھی جانتا ہے اور ان ضروریات کو پورا کرنے کا راستہ بھی جانتا ہے۔ خود اس کی اپنی کوئی احتیاجات بھی نہیں اور محبت و نفرت کی بنا پر وہ کبھی انحراف اور کجی کا بھی شکار نہیں ہوتا۔ لہٰذا عادلانہ ترین فیصلہ خدا، نبی اور امام معصوم ہی کا ہو سکتا ہے اور ان کے بعد ایسے افراد کا کہ جو ان کی راہ پر چلتے ہیں، اور ان سے شباہت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ خود غرض انسان ایسے عادلانہ فیصلوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور عادلانہ قوانین کے توسیع اور نفاذ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایسے قانون اور فیصلے کا متمنی ہوتا ہے کہ جو اس کی خواہش اور حرص کو زیادہ سے زیادہ پورا کرے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

حقیقی ظالم یہی لوگ ہیں۔

نیز حقیقی عادلانہ فیصلے ہر انسان کے معیارِ ایمان کی بھی کسوٹی ہوتی ہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ قرآن ایک مقام پر کہتا ہے کہ اے رسول! حقیقی مومنین نہ صرف تیرے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، بلکہ دل میں بھی تیرے فیصلوں پر بوجھ اور ناراحتی محسوس نہیں کرتے۔ اگرچہ ظاہراً اُن کے نقصان میں ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

لہ منافقین کی صفات کے متعلق مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۱ میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۸ کے ذیل میں رجوع کریں۔

Marfat.com

ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً۔

تیرے رب کی قسم اکوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا۔ جب تک اپنے جھگڑوں میں تجھے قاضی اور فیصل قرار نہ دے۔ نیز تیرے فیصلے کے بعد ضروری ہے کہ اپنے دل میں کوئی بوجھ اور ناراحتی بھی محسوس نہ کرے اور ظاہر و باطن میں حق کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔

(نساء - ۶۵)

لیکن وہ لوگ کہ جو اللہ اور رسول کا حکم اس صورت میں مانتے ہیں کہ جب اُن کا فائدہ ہو۔ حقیقت میں وہ مشرک ہیں کہ اپنے مفادات کے بندے ہیں۔ اگرچہ وہ ایمان کا دم بھرتے ہوں اور مومنین کی صفوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہوں

Marfat.com

۵۱۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ
بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ○
۵۲۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○
۵۳۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ
قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ○
۵۴۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ
تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

ترجمہ

۵۱۔ جب مومنین کو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔

۵۲۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں، اللہ سے ڈریں اور اُس کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کریں ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

۵۳۔ اُنھوں نے بڑی بڑی قسمیں کھا کر کہا کہ اگر تو انہیں حکم دے تو وہ (اپنے گھر اور مال کو)

Marfat.com

چھوڑدیں گے (اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ ہوں گے)۔ ان سے کہہ دے: قسمیں نہ کھاؤ۔ صدق وخلوص سے اطاعت کرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

۵۴۔ کہہ دے: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر تم نے نافرمانی کی تو رسول اپنے اعمال کا مسئول ہے اور تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو لیکن اگر تم نے اطاعت کی تو ہدایت پاؤ گے اور پیغمبر کے ذمہ تو صرف کھلی تبلیغ کرنا ہے۔

تفسیر

حق پر ایمان اور تسلیمِ کامل

گزشتہ آیات میں سیاہ دل منافقین کا حال بتایا گیا تھا کہ جو تہ در تہ اندھیروں میں ہیں اور "بعضھا فوق بعض" کا مصداق ہیں اور ہم نے دیکھا کہ اللہ اور اس کے رسول کے منصفانہ فیصلے سے کیسے روگردانی کرتے ہیں گویا انہیں خوف ہے کہ اللہ اور رسول ان کے حق کو پامال کردیں گے۔

زیرِ نظر آیات منافقین کے مقابلے میں مومنین کی کیفیت بیان کررہی ہیں کہ خدائی فیصلے پر اُن کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے، جب مومنین کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ صرف ایک ہی بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی (انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی الله ورسوله لیحکم بینهم ان یقولوا سمعنا واطعنا)۔

کیا عمدہ بات ہے ــــ "سمعنا واطعنا" (ہم نے سُنا اور اطاعت کی)۔ مختصر اور معنی خیز انداز ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ یہاں لفظ "انما" استعمال ہوا ہے کہ جو حصر کے لیے ہے۔ یعنی اس کے علاوہ ان کی کوئی بات ہی نہیں اور سرتاپا اُن کی یہی کیفیت ہے اور سچ پوچھ حقیقتِ ایمان یہی ہے کہ "سمعنا واطعنا"۔

جو شخص یہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ ہر چیز کا عالم ہے، وہ ہر شخص سے بے نیاز ہے اور تمام بندوں کے لیے رحیم اور مہربان ہے تو وہ اللہ کے فیصلے پر کسی اور کے فیصلے کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے اور کیونکر ممکن ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر اس کے سوا کچھ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ یہ کیسی عظیم آزمائش اور مومنین کی کامیابی کا کیا ہی عمدہ راستہ ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے "حقیقتاً" فلاح یافتہ اور کامیاب یہی لوگ ہیں (واولئك هم المفلحون)۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنی باگ ڈور اللہ کے حوالے کردے، اسے حاکم اور جج مان لے وہ ہر چیز میں کامیاب ہے

Marfat.com

مادی زندگی میں بھی اور روحانی زندگی میں بھی۔

دوسری آیت میں اسی حقیقت کو عمومی شکل دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، اللہ سے ڈریں اور تقوٰی کو اپنا کر اپنا شعار بنائیں وہی نجات پانے والے اور کامیاب ہیں (ومن یطع اللہ ورسولہ ویخش اللہ ویتقہ فاولئک ھم الفائزون)۔[1]

اِس آیت میں فرماں بردار اور پرہیزگار افراد کو "فائزون" کہا گیا ہے جبکہ گزشتہ آیت میں اللہ اور رسول کا فیصلہ ماننے والوں کو "مفلحون" کہا گیا ہے۔ لغت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "فوز" اور "فلاح" تقریباً ہم معنٰی ہیں مفردات میں راغب نے کہا ہے:

"فوز" کا معنٰی ہے سلامتی کے ساتھ کامیابی اور اچھے انجام تک پہنچنا اور "فلاح" کا معنٰی ہے کامیابی اور مقصود تک پہنچنا۔

البتہ بنیادی طور پر "فلاح" "چیرنے" کے معنٰی میں ہے۔ کامیاب افراد چونکہ رکاوٹوں کو چیر کر آگے بڑھ جاتے ہیں لہٰذا "فلاح" کامیابی کے معنٰی میں بھی استعمال ہونے لگا۔

بعد والی آیت میں مطلق فرماں برداری کے بارے میں بات کی گئی ہے اور پہلی آیت میں خدائی فیصلے کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے ایک لفظ عمومی اور کلّی مفہوم کا حامل ہے جبکہ دوسرا لفظ مخصوص معنٰی کے لیے اس لحاظ سے دونوں کا نتیجہ بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ بعد والی آیت میں "فائزون" کے تین اوصاف ذکر ہوئے ہیں:

(۱) اللہ اور رسول کی اطاعت

(۲) خوفِ خدا

(۳) تقوٰی

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اطاعت کلّی مفہوم میں ہے، خوفِ خدا اس کی داخلی کیفیت ہے اور تقوٰی اس کا خارجی مظہر ہے اس لیے پہلے مجموعی طور پر اطاعت کا ذکر ہے اور بعد میں اُس کی اندرونی و بیرونی کیفیت کی بات ہوئی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ایک روایت میں "واولئک ھم المفلحون" کی تفسیر کے بارے میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

ان المعنی بالأیۃ امیرالمؤمنین

اس آیت کے مصداق امیرالمؤمنین علیؑ ہیں[2]

---

[1] "یتقہ" میں قاف ساکن ہے اور "ھ" کے نیچے زیر ہے۔ یہ دراصل "یتقیہ" تھا۔ شرط کا کردار ادا کرنے کی وجہ سے اس کی "ی" حذف ہو گئی ہے۔ چونکہ یکے بعد دیگرے دو "زیریں" ثقیل تھیں، اس لیے اُن میں سے ایک حذف ہو گئی ہے اور لفظ نے یہ شکل اختیار کر لی ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۶۱۶

Marfat.com

اس میں شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اس آیت کے واضح ترین مصداق ہیں اور مذکورہ روایت کی مراد بھی یہی ہے اور اس سے آیت کی عمومیت ہرگز ختم نہیں ہوتی۔

اس سے اگلی آیت کا لب ولہجہ ظاہر کرتا ہے اور بعض تفاسیر میں مذکور اس کی شانِ نزول بھی نشاندہی کرتی ہے کہ گزشتہ آیات کہ جن میں منافقین کی شدید مذمت کی گئی ہے کے نزول کے بعد کچھ منافقین اپنی حالت پر سخت پریشان تھے۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ ہم آپ کے فرماں بردار ہیں۔ قرآن نے اس کا نوٹس لیا اور بڑے فیصلہ کن انداز میں فرمایا انہوں نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیں گے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں گے۔ ان سے کہیے قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اطاعت اختیار کرکے عملی طور پر اپنے صدق وخلوص کا ثبوت دو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن امرتھم لیخرجن قل لا تقسموا طاعۃ معروفۃ ان اللہ خبیر بما تعملون)۔

بہت سے مفسرین نے "لیخرجن" میں "خروج" سے مراد جہاد کے لیے نکلنا لیا ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے گھر بار سے نکلنے یا پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ہر جگہ جانے اور ان کی خدمت میں رہنا مراد لیا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں لفظ "خروج" اور اس کے مشتقات میدانِ جہاد کے طرف جانے کے معنیٰ میں بھی آئے ہیں۔ اور گھر بار اور وطن چھوڑنے کے معنیٰ میں بھی۔ لیکن گزشتہ آیات میں اختلافی مسائل کے لیے پیغمبر اکرمؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے اُس کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ ہم دوسری تفسیر کو قبول کریں اور اس سے یہ مراد لیں کہ وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قسم کھا کر کہا کہ مال کا ایک حصہ تو معمولی سی بات ہے آپ حکم کریں تو ہم اپنا سب کچھ چھوڑ دیں۔ تاہم اس کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ دونوں باتیں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں یعنی ہم اس کے لیے بھی حاضر ہیں کہ آپ کے حکم پر مال ومنال اور گھر بار چھوڑ دیں اور اس کے لیے بھی تیار ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جہاد کی طرف چلے جائیں۔

لیکن منافق لوگ کبھی حالات نامساعد ہوں تو اپنا چہرہ بدل لیتے ہیں اور بڑی بڑی قسمیں کھانے لگتے ہیں اور کبھی اُن کی قسمیں خود اُن کے جھوٹ کی دلیل ہوتی ہیں اس لیے قرآن صراحت کے ساتھ اُنہیں جواب دیتا ہے کہ قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں، عمل سے اپنی بات کا ثبوت پیش کرو لیکن اللہ تمہارے دل کی گہرائیوں سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ تم جھوٹی قسمیں کھا رہے ہو یا واقعاً اپنا طرزِ عمل بدلنے کا ارادہ رکھتے ہو۔

اس لیے زیرِ بحث آخری آیت میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ان سے کہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں (قل اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ اس فرمان پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں "اگر تم منہ موڑ لو اور منحرف ہو جاؤ تو رسول اپنے اعمال کا جواب دہ ہے (اور اُس نے اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے) اور تم بھی اپنے اعمال کے جواب دہ ہو (فان تولوا فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم)۔ لیکن اگر تم اس کی فرماں برداری کرو تو ہدایت پاؤ گے (و ان تطیعوہ تھتدوا) کیونکہ وہ ایسا رہبر ہے کہ جو اللہ اور حق کے راستے کے علاوہ کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔ بہرحال رسول پر کھلی تبلیغ کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں (وما علی الرسول

Marfat.com

الا البلاغ المبین)۔ اُس کی ذمہ داری ہے کہ سب تک واضح طور پر حکمِ خدا پہنچا دے چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ اور اس دعوت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فائدہ یا نقصان بھی انہی کو ہوگا جو قبول کریں یا نہ کریں۔ رسول کی یہ ہرگز ذمہ داری نہیں کہ وہ لوگوں کو ہدایت اور دعوت قبول کرنے پر مجبور کرے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس آیت میں ذمہ داری اور مسئولیت کو بوجھ سے تعبیر کیا گیا ہے اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی۔ رسول اللہؐ کی رسالت بھی اور اُن کی دعوت پر صدق وخلوص سے اطاعت بھی دوش پر ایک بوجھ ہے کہ جسے منزل تک پہنچانا چاہیئے اور سوائے مخلص لوگوں کے کوئی اسے اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی لیے ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

یامعاشر قراء القرآن اتقوا اللہ عزوجل فیما حملکم من کتابہ فانی مسئول وانتم مسئولون: انی مسئول عن تبلیغ الرسالۃ. واما انتم فتسئلون عما حملتم من کتاب اللہ و سنتی

اے قرآن پڑھنے والو! خدائے عظیم سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو اُس کی کتاب کے بارے میں کہ جس کا بوجھ اُس نے تمہارے کندھوں پر ڈال دیا ہے کیونکہ میں جواب دہ ہوں اور تم بھی جواب دہ ہو۔ میں تبلیغ رسالت کے بارے میں جواب دہ ہوں اور تم کتابِ خدا اور میری سنّت کے بارے میں جواب دہ ہو کہ جس کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔

Marfat.com

۵۵۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي
ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ
بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

ترجمہ

۵۵۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمال صالح انجام دیتے ہیں اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناً اُنہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسے اُس نے اُن سے پہلے لوگوں کو خلافت بخشی تھی اور اُس نے جو دین ان کے لیے پسند کیا ہے اُسے مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دے گا اس طرح سے کہ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک قرار نہیں دیں گے اور اس کے بعد جو لوگ کافر ہو جائیں وہ فاسق ہیں۔

شانِ نزول

سیوطی نے اسباب النزول میں، طبرسی نے مجمع البیان میں، سید قطب نے فی ظلال میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح دیگر کئی ایک مفسرین نے (تھوڑے سے فرق کے ساتھ) اس آیت کی یہ شانِ نزول نقل کی ہے:

جب رسول اللہؐ اور مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی، اور انصار نے خندہ پیشانی سے اُنہیں خوش آمدید کہا تو تمام عرب اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ مسلمان مجبور ہو گئے کہ ہر وقت اسلحہ اپنے ساتھ رکھیں رات کو اسلحہ پاس رکھ کر سوئیں، صبح اُٹھیں تو اسلحہ ساتھ لے کر اُٹھیں

Marfat.com

اور ہر وقت مستعد رہیں۔ اس حالت کو جاری رکھنا مسلمانوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ بعض نے تو کھلے بندوں اس بات کا اظہار کیا کہ آخر یہ کیفیت کب تک باقی رہے گی کیا ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم رات ہی کو چین کا سانس لے سکیں اور اللہ کے علاوہ ہم کسی سے نہ ڈریں۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں بشارت دی گئی کہ ہاں ایسا زمانہ آئے گا۔[1]

تفسیر

مستضعفین کی عالمی حکومت

گزشتہ آیات میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیرِ بحث آیت میں بھی وہی موضوعِ سخن جاری رکھتے ہوئے اس اطاعت کا نتیجہ عالمی حکومت کا قیام بیان کیا گیا ہے۔ آیت زور دیتے ہوئے کہتی ہے: جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں اللہ کا اُن سے وعدہ ہے کہ یقیناً انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلافت بخشی ہے (وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم)۔ اور جو دین اُن کے لیے پسند کیا ہے اُسے مضبوط بنیادوں زمین پر قائم کرے گا (ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم)۔ اور ان کے خوف کو امن وسکون میں بدل دے گا (ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا)۔ اور یہ عالم ہو جائے گا کہ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک قرار نہیں دیں گے (یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا)۔

مسلم ہے کہ حکومتِ توحید کے قیام، دینِ الٰہی کے استحکام اور ہر قسم کے اضطراب، بدامنی اور شرک کے خاتمے کے بعد بھی "جو لوگ پھر کافر ہو جائیں گے وہ فاسق ہیں" (و من کفر بعد ذٰلک فاولٰئک ھم الفاسقون)۔

بہر حال اس آیت سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا اُن مسلمانوں کو تین خوشخبریاں دیتا ہے کہ جو صاحبِ ایمان ہیں اور اعمالِ صالح بجا لاتے ہیں۔ خوش خبریاں یہ ہیں:

(۱) روئے زمین پر حکمرانی۔

(۲) ہر جگہ مستحکم بنیادوں پر دینِ حق کی اشاعت (یہ بات لفظ "تمکین" سے ظاہر ہوتی ہے)۔

(۳) تمام اسبابِ خوف و بدامنی کا خاتمہ۔

ان امور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بڑی آزادی سے اللہ کی پرستش کر سکیں، اس کے احکام بجا لائیں گے اور اس کے لیے کسی شریک کے قائل نہ ہوں اور توحیدِ خالص کو ہر جگہ پھیلا دیں۔

---

[1] اسباب النزول ص۱۹۳، مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر فی ظلال، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

یہ وعدۂ الٰہی پورا ہوا یا نہیں ــــــ اس سلسلے میں ہم ذیل کے نکات میں بحث کریں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ ”کما استخلف الذین من قبلھم “ کی تفسیر: مسلمانوں سے پہلے جن لوگوں کو خلافت ملی وہ کون تھے ــــــ اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں، مثلاً:

بعض نے اسے حضرت آدمؑ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ قرآن سورہ بقرہ آیت ۳۰ میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

انی جاعل فی الارض خلیفۃ

میں زمین میں اُسے خلیفہ بنانا چاہتا ہوں

سورہ ص کی آیت ۲۶ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ہے:

یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔

اسی طرح سورہ نمل کی آیت ۱۶ کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام حکومتِ داؤدؑ کے وارث تھے لہٰذا وہ بھی خلیفہ ہوئے۔

بعض دوسرے حضرات مثلاً مفسرِ عالی قدر علامہ طباطبائی نے ”المیزان“ میں اس معنیٰ کو بعید قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے ”الذین من قبلھم “ کے الفاظ کو انبیاء کے شایانِ شان نہیں سمجھا کیونکہ اس طرح کے الفاظ قرآن میں انبیاء کے بارے میں استعمال نہیں ہوئے۔ لہٰذا علامہ طباطبائی اسے گزشتہ اُمتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو ایمان و عمل صالح کی حامل تھیں اور اُنہیں زمین پر حکمرانی حاصل ہوئی۔

لیکن بعض دیگر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے اقتدار کی تباہی کے بعد وہ حکمران ہوئے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں فرمایا گیا ہے:

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا التی بارکنا فیھا

ہم نے (مومنینِ بنی اسرائیل کے) کمزور کردہ لوگوں کو اس زمین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا کہ جسے ہم نے پُر برکت بنایا ہے۔

نیز اُنہی کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

ونمکن لھم فی الارض

ہم نے ارادہ کیا کہ اس مستضعف قوم کو زمین پر اقتدار دیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بھی غلط اور فاسق بلکہ بعض اوقات کافر لوگ بھی تھے لیکن حکومت بہرحال صالح مومنین کے ہاتھ میں تھی (اس لحاظ سے اس تفسیر کے بارے میں بعض مفسرین نے جو اعتراض کیا ہے وہ دُور ہو جاتا ہے)

Marfat.com

یہ تیسری تفسیر ہمیں مفہوم کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ اللہ کا یہ وعدہ کن سے ہے ؟ آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے زمین پر حکمرانی، دینی اقتدار اور مکمل امن و سکون کا وعدہ اُن سے کیا ہے جو ایمان اور عمل صالح کے حامل ہیں۔ اس کے مصداق کون لوگ ہیں اس سلسلے میں مفسرین کے نظریات مختلف ہیں:

★ بعض نے اسے اصحابِ رسولؐ کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے کہ اسلام کی کامیابی کے باعث وہ زمانہ رسولؐ میں صاحب حکومت ہو گئے (البتہ اس تفسیر کے مطابق زمین سے مراد تمام روئے زمین نہیں بلکہ زمین کا ایک خطہ مراد ہے)۔

★ بعض نے پہلے چار خلفاء کی حکومت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔

★ بعض نے اس کے مفہوم کو اتنا وسیع لیا ہے کہ سب ایسے مسلمانوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے کہ جن میں یہ صفات موجود ہوں۔

★ بعض نے اسے حکومت حضرت مہدی علیہ السلام کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ عالم کے مشرق و مغرب جن کے زیر نگین ہوں گے دین حق ہر جگہ حکم فرما ہوگا، بدامنی، خوف و ہراس اور جنگ جدل کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام لوگ شرک سے پاک عبادت بجالائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ آیت ابتدائی مسلمانوں کے بارے میں ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت بھی اس آیت کا مصداقِ کامل ہے۔ تمام مسلمان چاہے شیعہ ہوں یا سُنی اس بات کے معتقد ہیں کہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت جب دنیا ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی اُسے عدل و انصاف سے معمور کردے گی۔ تاہم اس کے باوجود اس میں کوئی مانع نہیں کہ آیت عمومیت کی حامل ہو۔

مختصر یہ کہ جس زمانے میں بھی مسلمانوں کے درمیان ایمان اور عمل صالح کی بنیادیں مستحکم ہوں گی وہ ایک موثر حکومت کے مالک بن جائیں گے۔

بعض کہتے ہیں کہ لفظ "ارض" مطلق ہے اور اس سے ساری زمین مراد ہے اور یہ امر منحصراً حضرت مہدی علیہ السلام (ارواحنا لہ الفداء) کی حکومت سے مربوط ہے۔ یہ دعویٰ "کما استخلف ....." کے جملے سے مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ گزشتہ مومنین کی حکومت مسلماً ساری دنیا پر محیط نہ تھی۔ علاوہ ازیں آیت کی شانِ نزول بھی نشاندہی کرتی ہے کہ چاہے رسول اللہؐ کی عمر کے آخری زمانے میں ہی سہی مسلمانوں کے لیے اس حکومت کا ایک نمونہ معرضِ وجود میں ضرور آیا ہے۔

بہر حال ہم اس بات کی تکرار کرتے ہیں کہ انبیاء کی تمام زحمتوں اور مسلسل تبلیغات کا ماحصل اور کامل نمونہ ایک عالمی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوگا جس میں توحید کی حاکمیت ہوگی، ہر طرف امن و سکون ہوگا اور شرک سے پاک عبادت ہوگی۔ یہ حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ ہوگا۔ وہی مہدیؑ کہ جو سلالۂ انبیاءؑ اور فرزند رسولِ اسلامؐ ہیں۔ اس زمانے کے بارے میں تمام مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے:

لو لم یبق من الدنیا الا یوم لطول اللّٰہ ذٰلک الیوم حتی یلی رجل من عترتی، اسمہ اسمی، یملا الارض عدلًا و قسطًا کما ملئت ظلمًا و جورًا

اگر دنیا کی زندگی کا صرف ایک دن بھی رہ جائے گا تو اللہ اسے اتنا طویل کر دے گا کہ اس میں میری عترت میں سے ایک فرد زمین پر حاکم ہوگا۔ اُس کا نام میرا نام ہوگا۔ جیسے زمین ظلم و جور

Marfat.com

سے بھر چکی ہوگی وہ ایسے ہی اسے عدل و انصاف سے معمور کر دے گا۔[1]

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس آیت کے ذیل میں مرحوم طبرسی کہتے ہیں کہ اہل بیت رسولؐ سے یہ حدیث منقول ہے:

انہا فی المھدی من آل محمد

یہ آیت مہدیؑ کے بارے میں ہے کہ جو آل محمدؐ میں سے ہوں گے۔[2]

تفسیر روح المعانی اور بہت سی شیعہ تفاسیر میں امام سجاد علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

ھم واللہ شیعتنا اھل البیت. یفعل اللہ ذٰلک بھم علی ید ی رجل منا. وھو مھدی ھٰذہ الامۃ. یملأ الارض عدلا و قسطا کما ملئت ظلما و جورا. وھو الذی قال رسول اللہ (ص) لولم یبق من الدنیا الا یوم.....

اللہ کی قسم وہ ہمارے شیعہ ہیں۔ اللہ ان کے لیے یہ حکومت ہم میں سے ایک مرد کے ہاتھ سے قائم کریگا کہ جو اس اُمت کا مہدی ہے۔ وہ زمین کو اس طرح سے عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ یہ بزرگوار وہی ہیں کہ جن کے بارے میں رسول اللہ (ص) نے فرمایا ہے کہ اگر دنیا کی زندگی کا ایک دن بھی باقی رہ گیا.....

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ان تفاسیر کا یہ مطلب نہیں کہ مفہوم آیت انہی میں منحصر ہے بلکہ یہ مصداق کامل کا بیان ہے۔ البتہ روح المعانی کے مفسر آلوسی اور چند دیگر مفسرین کہ جنہوں نے اس نکتے کی طرف توجہ نہیں کی ان احادیث کو مشکوک قرار دیا ہے۔

اہل سنّت کے مشہور مفسر قرطبی نے مقداد بن اسود سے نقل کیا ہے،

میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا:

ما علی ظھر الارض بیت حجر ولا مدر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام

روئے زمین پر پتھر یا مٹی کا کوئی ایسا گھر نہیں رہے گا کہ جس میں اسلام داخل نہ ہوگا (اور ساری دنیا پر ایمان اور توحید پرستی کی حکومت ہوگی)۔[3]

حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت کے سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ ج ۷، میں سورہ توبہ کی آیت ۳۳ کے ذیل میں رجوع کیجئے۔ وہاں ہم نے شیعہ اور سنی علماء کی کتب سے مفصل مدارک اور دلائل درج کیے ہیں۔

۳۔ اصلی ہدف ـــــ شرک سے پاک عبادت: "یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا" یہ جملہ ادبی لحاظ

---

[1] کتاب "منتخب الاثر" میں اس مضمون کی ایک سو تینتیس احادیث نقل کی گئی ہیں۔ یہ احادیث زیادہ تر اہل سنّت کی کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ قارئین اس کتاب کے ص۲۴۷ سے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] قرطبی، ج ۷، ص۴۶۹۲

Marfat.com

سے حال ہو یا غایت[1] اس کا مفہوم یہ ہے حکومتِ عدل کے قیام، دینِ حق کے استحکام اور امن وامان کے حصول کا اصلی مقصد عبادت اور توحید پرستی کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے۔ قرآن کی ایک اور آیت میں مقصدِ تخلیق بھی یہی بیان ہوا ہے:

وما خلقت الجن والانس الالیعبدون

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے　(ذاریات - ۵۶)

وہ عبادت جو انسانوں کی تربیت کرتی ہے اور اُن کی پرورشِ روح کے لیے بہت اعلیٰ مکتب ہے۔ وہ عبادت جس سے اللہ بے نیاز ہے اور بندے کمال اور ارتقاء کے لیے جس کے بہت محتاج ہیں۔

یہ اسلامی نظریہ ہے جبکہ مادی نظریے اس کے برخلاف ہیں۔ ان کا ہدف خوشحالی کے لحاظ سے بلند سطح کی مادی زندگی ہے جبکہ اسلام کبھی ایسی چیز کو اپنا ہدف قرار نہیں دے سکتا اس کی نظر میں تو مادی زندگی کی تبھی کوئی اہمیت ہے جب وہ ایسے روحانی ہدف کے حصول کا ذریعہ ہو۔

البتہ اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ شرک سے پاک عبادت، غیر الٰہی قانون کی نفی اور ذاتیات وخواہشات کی حکمرانی کا خاتمہ ایک حکومتِ عدل کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ حکومت کے بغیر مسلسل تعلیم، تربیت اور تبلیغ کے ذریعے کچھ لوگوں کو حق کی طرف متوجہ کیا جائے لیکن معاشرے میں اسے رواج دینا یا ایمان صالحین کی حکومت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے انبیاء سب سے زیادہ کوشش ومحنت اسی قسم کی حکومت کے قیام کے لیے کرتے تھے۔ خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کو جونہی موقع ملا ہجرتِ مدینہ کے موقع پر نمونے کے طور پر ——— ایسی حکومت قائم کردی۔

یہاں سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی حکومت صلح کرے یا جنگ، نیز تعلیم، ثقافت، اقتصاد اور فوج غرض اس کے تمام شعبوں کے پروگرام اور سرگرمیاں اللہ کی عبادت کے راستے میں ہوتی ہیں — ایسی عبادت کہ جو ہر قسم کے شرک سے خالی ہو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صالحین کی حکومت کے قیام، دینِ حق کے استحکام اور شرک سے پاک عبادت کی ترویج کا یہ معنیٰ نہیں کہ اس قسم کے معاشرے میں کوئی گنہ گار اور منحرف نہیں ہوگا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ حکومت صالح مومنین کے ہاتھ میں ہے اور معاشرہ مجموعی اور عمومی طور پر شرک سے پاک ہے ورنہ جب تک انسان ارادے کی آزادی کا حامل ہے بہترین الٰہی اور انسانی معاشروں میں بھی منحرف افراد کا وجود ممکن ہے (غور کیجیے گا)۔

---

[1] پہلی صورت میں گزشتہ آیات میں آنے والی ضمیر "ہم" سے ہم آہنگ ہو کر حالیہ ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت میں لام مقدر ہے اور اصل میں "لیعبدوننی" ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے یہ جملہ استینافیہ ہے لیکن یہ بہت کمزور احتمال ہے۔

Marfat.com

۵۶۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ
لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ○
۵۷۔ لَاتَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ج وَ
مَاْوٰھُمُ النَّارُ ط وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ○

ترجمہ

۵۶۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور (اللہ کے) رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر (اُس کی) رحمت ہو۔

۵۷۔ یہ گمان نہ کرو کہ کافر عذابِ الٰہی سے زمین میں کہیں بھاگ سکتے ہیں اُن کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے۔

تفسیر

عذابِ الٰہی سے فرار ممکن نہیں

گزشتہ آیت میں صالح مومنین سے زمین پر حکمرانی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر دو آیتوں میں اس حکومت کی بنیادیں رکھنے کے لیے لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عظیم رکاوٹیں دُور کرنے کی ذمہ داری بھی خدا خود لے رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: نماز قائم کرو (واقیموا الصلوٰۃ)۔

وہی نماز جو مخلوق کا خالق سے رشتہ قائم کردیتی ہے، اللہ سے بندوں کے مسلسل ارتباط کی ضامن ہے اور انسانوں کو برائیوں اور نافرمانیوں سے بچا لیتی ہے۔

اور زکوٰۃ ادا کرو (وآتوا الزکوٰۃ)۔

وہی زکوٰۃ کہ جو انسانوں کو مخلوقِ خدا سے مربوط کردیتی ہے، ان کے باہمی فاصلوں کو کم کرنے کے لیے نہایت مؤثر ہے اور جذبات و احساسات کے رشتوں کو مستحکم کرتی ہے۔

اور مجموعی طور پر "ہر چیز میں حکم رسول کے فرماں بردار رہو" (واطیعوا الرسول)

Marfat.com

وہ اطاعت کہ جو تمہیں صالح مومنین کے راستے پر لے جائے گی اور زمین پر حکمرانی کے اہل افراد میں شامل کردے گی۔

"تاکہ تم ان احکام پر عمل پیرا ہو کر رحمتِ خدا کے زیر سایہ آجاؤ (لعلکم ترحمون)۔ اور حق و عدالت کی حکومت کے علمبرداری کے لائق ہو جاؤ۔

اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ طاقتور ہٹ دھرم دشمن اس راستے میں روڑے اٹکائیں اور وعدۂ الٰہی کی تکمیل میں رکاوٹ بنیں گے تو ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے کیونکہ اللہ کی قدرت کے سامنے اُن کی طاقت کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا "یہ گمان نہ کرو کہ کافر لوگ اللہ کی سزا سے بھاگ کر اس وسیع زمین میں کہیں فرار کرجائیں گے (لاتحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض)۔ یہ لوگ نہ صرف اس دنیا میں خدائی سزا سے محفوظ نہیں ہیں بلکہ آخرت میں" اُن کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے" (وماواھم النار ولبئس المصیر)۔

"معجزین" "معجز" کی جمع ہے جو "اعجاز" کے مادے سے عاجز کرنے کے معنیٰ میں ہے بعض اوقات انسان کسی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس سے بھاگ نکلتا ہے۔ یہ جتنی بھی کوشش کرتا ہے وہ ہاتھ نہیں لگتا یہاں تک کہ وہ اس کی دسترس سے باہر نکل جاتا ہے۔ زیر نظر آیت کا یہی مفہوم ہے کہ تم اللہ کے اقتدارِ قدرت سے باہر نہیں جاسکتے۔

Marfat.com

۵۸۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ
قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ
الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۫ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ
لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ ۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ
الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○
۵۹۔ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا
اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○
۶۰۔ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ
عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ ۢ
بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۵۸۔ اے ایمان والو! جو تمہارے مملوک ہیں اور تمہارے وہ بچے جو ابھی سن بلوغت تک نہیں

Marfat.com

پہنچے انہیں تین وقت تمہارے پاس اجازت لے کر آنا چاہیئے۔ نماز فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جب تم اپنا (معمول کا) لباس اُتار دیتے ہو اور نمازِ عشاء کے بعد۔ یہ تین تمہارے خصوصی اوقات ہیں لیکن ان تین اوقات کے علاوہ تمہارے لیے اور ان کے لیے کوئی ہرج نہیں کہ (بلا اجازت آجائیں اور) ایک دوسرے کے گرد جمع ہوں (اور خلوص و محبت سے ایک دوسرے کی خدمت کریں) اللہ اپنی آیات اسی طرح تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

۵۹۔ اور جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو انہیں اجازت لینا چاہیئے جیسے اُن سے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں اور اللہ اپنی آیات اسی طرح تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

۶۰۔ اور جو عورتیں جوانی گزار بیٹھی ہوں اور اب نکاح کی امیدوار نہ ہوں اگر وہ اپنی چادریں اُتار رکھیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ لوگوں کے سامنے خود آرائی نہ کریں لیکن اگر وہ پردہ ہی کریں تو اُن کے لیے بہتر ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

والدین کے کمرے میں آنے کے آداب

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں سب سے زیادہ زور عفت و پاکدامنی پر دیا گیا ہے اور ہر قسم کی بدکاری اور بے حیائی سے روکا گیا ہے۔ اس موضوع پر مختلف حوالوں اور پہلوؤں سے بات کی گئی ہے۔ زیر بحث آیات کا بھی عنوانِ گفتگو یہی ہے۔ ان آیات میں میاں بیوی کے خصوصی کمرے یا خلوت گاہ میں بالغ اور نابالغ بچوں کے داخلے کے آداب بیان کیے گئے ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان لانے والو! جو تمہارے مملوک (اور غلام) ہیں اور اسی طرح تمہارے وہ بچے جو ابھی حدِ بلوغ کو نہیں پہنچے انہیں چاہیئے کہ تین اوقات میں تم سے اجازت لیا کریں (یاایھا الذین اٰمنوا لیستأذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین

Marfat.com

لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات)۔

نمازِ فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جبکہ تم اپنا معمول کا لباس اُتار دیتے ہو اور نمازِ عشاء کے بعد (من قبل صلٰوۃ الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظهیرۃ ومن بعد صلٰوۃ العشاء)۔

" ظهیرۃ " جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور فیروز آبادی نے قاموس میں کہا ہے، دوپہر اور حدودِ ظہر کے معنیٰ میں ہے جس وقت عموماً لوگ اپنے اُوپر والے لباس اُتار دیتے ہیں اور بعض اوقات میاں بیوی آپس میں خلوت کرتے ہیں۔

یہ تین اوقات تمہارے لیے پردے کے اور خصوصیت کے اوقات ہیں (ثلاث عورات لکم)۔

"عورہ" "عار" کے مادے "عیب" کے معنی میں ہے اور آلہ جنسی کا ظاہر ہونا چونکہ عیب، شرم اور عار کا باعث ہے اس لیے عربی زبان میں اسے "عورۃ" کہتے ہیں۔

لفظ "عورۃ" بعض اوقات دیوار یا لباس وغیرہ کے سوراخ کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کبھی مطلق عیب کے معنیٰ ہیں۔

بہرحال ان تین اوقات پر اس لفظ کا اطلاق اس لیے ہوا کہ لوگ ان اوقات میں اپنے آپ کو چھپاتے کا باقی اوقات کی طرح اہتمام نہیں کرتے اور ایک خاص حالت میں ہوتے ہیں۔

واضح ہے کہ یہ حکم بچوں کے سرپرستوں کے لیے ہے کہ وہ انہیں ایسا کرنے کے لیے کہیں کیونکہ وہ ابھی بالغ ہی نہیں ہوئے لہٰذا اُن پر شرعی اور الٰہی ذمہ داریاں ابھی عاید نہیں ہوتیں لہٰذا یہاں اُن کے والدین اور سرپرستوں سے خطاب ہے۔

ضمناً واضح رہے کہ آیت کا اطلاق لڑکوں اور لڑکیوں دونوں پر ہوتا ہے۔ آیت میں جمع مذکر کا صیغہ "الذین" آیت کے مفہوم کی عمومیت میں مانع نہیں ہے کیونکہ بہت سے مواقع پر تغلیب کی وجہ سے یہ لفظ سب کے لیے یکساں بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ وجوبِ روزہ والی آیت میں لفظ "الذین" استعمال ہوا ہے جس سے سب مسلمان مراد ہیں (بقرہ - ۸۳)

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیت ان بچوں کے بارے میں بات کر رہی ہے جو حدِ تمیز کو پہنچ گئے ہوں اور جنسی امور اور شرم گاہ کے بارے میں کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہوں کیونکہ اجازت لینے کا حکم خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس قدر سمجھتے ہیں کہ اجازت لینے کے کیا معنیٰ ہیں اور "ثلاث عورات" کی تعبیر بھی اس مفہوم کے لیے ایک شاہد ہے۔

اب ہم مملوک اور غلاموں کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ کیا یہ حکم اُن میں سے مردوں کے لیے مخصوص ہے یا کنیزوں کے لیے بھی ہے؟ اس سلسلے میں مختلف روایات وارد ہوئی ہیں۔ آیت کا ظاہری مفہوم تو عام ہے اور اس میں دونوں شامل ہیں لہٰذا ہم اُن روایات کو ترجیح دے سکتے ہیں کہ جو ظاہرِ آیت سے مطابقت رکھتی ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تم پر اور اُن پر کوئی گناہ نہیں کہ ان اوقات کے بعد اجازت لیے بغیر آئیں، ایک دوسرے کی خدمت کریں اور (خلوص و محبت کے ساتھ) ایک دوسرے کے پاس جمع ہوں۔ (لیس علیکم ولا علیهم جناح بعد هن طوافون علیکم بعضکم علٰی بعض)۔

جی ہاں! اللہ اسی طرح اپنی آیتیں تمہارے لیے بیان کرتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے (کذٰلک یبین اللہ لکم الاٰیات و اللہ علیم حکیم)۔

Marfat.com

لفظ "طوافون" اصل میں "طواف" کے مادے سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کا گردش کرنا۔ یہاں یہ لفظ چونکہ مبالغے کے صیغے میں آیا ہے اس لیے اس میں کثرت سے گردش کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد "بعضکم علی بعض" آیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے عبارت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان تین اوقات کے علاوہ تمہیں اجازت ہے کہ ایک دوسرے کے گرد پھرو، آؤ جاؤ اور ایک دوسرے کی خدمت بجا لاؤ۔

"کنز العمال" میں فاضل مقداد کے بقول یہ تعبیر درحقیقت باقی اوقات میں اجازت نہ لینے کی دلیل بیان کر رہی ہے کیونکہ اگر ہر وقت آنا جانا ہو اور ہر وقت اجازت لینے کا مسئلہ درپیش ہو تو معاملہ بہت مشکل ہو جائے۔[1]

اگلی آیت میں بالغوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو ہر وقت اجازت لیا کریں جیسے کہ ان سے بڑے لوگ اجازت لیا کرتے تھے (واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلهم)۔

لفظ "حلم" (بروزن "کُتُب") عقل کے معنیٰ میں آیا ہے اور بلوغ کے لیے کنایہ ہے کیونکہ بلوغت کے ساتھ عموماً انسان کو عقلی اور فکری تحرک بھی ملتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "حلم" خواب دیکھنے کے معنیٰ میں ہے اور چونکہ نوجوان بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ جو ان کے احتلام کا سبب بنتے ہیں لہٰذا یہ لفظ کنائے کے طور پر بلوغ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

بہرحال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بالغوں کا حکم نابالغوں سے مختلف ہے کیونکہ گزشتہ آیت کے مطابق نابالغ بچوں کے ذمہ صرف تین اوقات میں اجازت لینا ہے کیونکہ ان کی زندگی اور بود و باش ہی ایسی ہوتی ہے کہ ان کا ماں باپ کے پاس بہت آنا جانا ہوتا ہے اگر ہر وقت وہ اجازت لیں تو مشکل ہو جائے۔ علاوہ ازیں ان کے جنسی احساسات ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوئے ہوتے لیکن اس سے بعد والی آیت میں بالغ بچوں کے لیے مطلق طور پر اجازت لینا واجب قرار دیا گیا ہے۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر حالت میں ماں باپ کے پاس آنے وقت اجازت لیں۔

یہ حکم اس جگہ اور کمرے کے لیے مخصوص ہے کہ جس میں ماں باپ آرام کر رہے ہوں ورنہ عمومی کمرے میں جہاں دوسرے لوگ بھی ہوں اور کوئی رکاوٹ یا ممانعت بھی نہ ہو اجازت لینا ضروری نہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "کما استأذن الذین من قبلهم" کا جملہ ان بڑے افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر وقت ماں باپ کے پاس ان کے کمرے میں جاتے ہوئے اجازت لینے کے ذمہ دار ہیں۔ اس آیت میں جو ابھی نئے سن بلوغ میں داخل ہوئے انہیں ان بڑوں کی طرح اجازت لینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت کے آخر میں بطور تاکید اور مزید توجہ دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے: اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں واضح کرتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے (کذٰلک یبین اللہ لکم اٰیاته واللہ علیم حکیم)۔

یہ تقریباً وہی جملہ ہے جو گزشتہ آیت کے آخر میں بھی آیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں "الآیات" تھا اور اس میں

---

[1] کنز العرفان، ج ۲ ص ۲۲۵

Marfat.com

"ایاته" آیا ہے کہ معنی کے لحاظ سے جس میں کوئی خاص فرق نہیں۔

اس حکم کی خصوصیات اور اس کے فلسفے کے بارے میں ہم "چند اہم نکات" کے ذیل میں بات کریں گے۔

زیر بحث آخری آیت میں عورتوں کے لیے پردے کے حکم میں ایک استثناء بیان کیا گیا ہے عمر رسیدہ بوڑھی عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو عورتیں جوانی گزار بیٹھی ہیں اور شادی کی امیدوار نہیں ہیں ان کے لیے کوئی گناہ نہیں اگر چادر اُتار رکھیں جبکہ لوگوں کے سامنے خود آرائی نہ کریں (والقواعد من النساء اللاتی لا یرجون نکاحًا فلیس علیهن جناح ان یضعن ثیابهن غیر متبرجات بزینة)۔

اس استثناء کے لیے درحقیقت دو شرطیں ہیں:

پہلی یہ کہ وہ اس عمر کو پہنچ جائیں گے اب شادی بیاہ کی امید اور آرزو نہ رکھتی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے جنسی جذبات بالکل ختم ہو چکے ہوں۔

دوسرا یہ کہ پردہ اُٹھا رکھنے کے بعد بناؤ سنگھار نہ کریں۔

واضح ہے کہ ان دو شرطوں کی موجودگی میں اگر پردہ نہ ہو تو اس میں کوئی برائی نہیں اسی لیے اسلام نے ایسی خواتین کے لیے یہ گنجائش رکھی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ یہاں مراد یہ نہیں کہ انہیں عریاں ہونے کی اجازت مل گئی ہے اور وہ سارا لباس اُتار سکتی ہیں بلکہ صرف اُوپر کا لباس مراد ہے جسے بعض روایات میں بُرقعے، چادر اور دوپٹے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ روایت کے الفاظ میں:

الجلباب والخمار

یعنی۔ چادر اور دوپٹہ

ایک حدیث میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الخمار والجلباب، قلت بین یدی من کان؟

قال: بین یدی من کان غیر متبرجة بزینة

مراد دوپٹہ اور برقعہ ہے۔

راوی کہتا ہے: میں نے پوچھا جس شخص کے سامنے بھی ہو؟

فرمایا: جس کسی کے بھی سامنے ہو البتہ خود نمائی اور بناؤ سنگھار نہ کرے[1]

اس مضمون کی اور اس سے ملتی جلتی متعدد روایات ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں[2]

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اس سب کے باوجود اگر پاکدامنی اختیار کریں اور پردہ کیے رہیں تو اُن کے لیے زیادہ بہتر

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۴، کتاب النکاح، صفحہ ۱۴۷، باب ۱۱۰

[2] روایات کے تفصیلی مطالعے کے لیے وسائل الشیعہ کے محررہ بالا باب کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

ہے (وان یستعففن خیر لھن) کیونکہ عورت جس قدر بھی عفت و حجاب کو ملحوظ رکھے اسلام کی نظر میں اسی قدر پسندیدہ ہے اور تقویٰ سے اسی قدر قریب ہے۔

ممکن ہے بعض سن رسیدہ عورتیں اس سوچی سمجھی اور جائز آزادی سے غلط فائدہ اٹھائیں اور بعض اوقات مردوں سے غیر مناسب باتوں میں مشغول ہو جائیں یا طرفین کے دل میں گندے خیالات پیدا ہوں لہٰذا آیت کے آخر میں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے (واللہ سمیع علیم)۔ جو کچھ تم کہتے ہو وہ سنتا ہے اور جو کچھ تمہارے دل میں یا دماغ میں ہے اسے جانتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ اجازت لینے کا فلسفہ: برائی اور بدکاری کی روک تھام اور خاتمے کے لیے صرف مجرموں کو کوڑے لگانا کافی نہیں ہے۔ کسی بھی معاشرتی مسئلے میں اس قسم کا طریقہ کار مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ فکری تربیت کا اہتمام ہو، اچھی ثقافت کی تعلیم ہو، اخلاقی آداب سکھائے جائیں، صحیح اسلامی تعلیمات عام کی جائیں اور ایک پاک صاف صحت مند معاشرہ اور ماحول پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد سزا، حدود اور تعزیرات کو ان عوامل کے ساتھ ایک عامل کی حیثیت سے انتخاب کیا جائے۔

سورہ نور میں اسی لیے یہی روش اختیار کی گئی ہے۔ پہلے تو اس میں زانی عورتوں اور مردوں کی سزا کا ذکر ہے اور پھر اس کے بعد صحیح طریقے سے شادی کے وسائل فراہم کرنے کا حکم ہے، پردے کا بیان ہے، نظر بازی سے منع کیا گیا ہے، تہمت کی ممانعت کی گئی ہے اور آخر میں ماں باپ کی خلوت میں جاتے وقت اولاد کے لیے اجازت لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے مجموعی طور پر یہ عفت و پاکدامنی کی سورت ہے۔

اس قدر تفصیلات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام نے اس مسئلے سے مربوط چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھی غفلت نہیں برتی۔

خدمت گاروں کی ذمہ داری ہے کہ جس کمرے میں بیوی اور شوہر موجود ہیں اُس میں داخل ہوتے وقت اجازت لیں۔

بالغ بچوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بلا اجازت اندر نہ جائیں یہاں تک کہ نابالغ بچے بھی کہ جو ہمیشہ ماں باپ کے پاس ہوتے ہیں کم از کم تین اوقات میں ان سے اجازت لیے بغیر اُن کے کمرے میں نہ جائیں (نماز صبح سے پہلے، نماز عشاء سے بعد اور دوپہر کے وقت کہ جب ماں باپ آرام کر رہے ہوں)۔

یہ اسلامی آداب ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں ان کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا ہے حالانکہ قرآن نے اس سلسلے میں بڑی صراحت سے کام لیا ہے۔

تحریروں، تقریروں اور بیان احکام کے وقت بھی بہت کم دیکھا گیا ہے کہ اس اسلامی حکم اور اس کے فلسفے کے بارے میں بات ہوتی ہو۔ معلوم نہیں کہ اس قطعی قرآنی حکم سے کس وجہ سے غفلت برتی جا رہی ہے۔ اگرچہ آیت ظاہراً اعتبار سے اس حکم کا واجب ہونا ظاہر کر رہی ہے لیکن بالفرض اسے مستحب بھی سمجھا جائے تب بھی اس کے بارے میں گفتگو ہونا چاہیئے اور اس کی تفصیلات پر بات ہونا چاہیئے۔

Marfat.com

اس کے برخلاف یہ ہے کہ بعض سادہ لوح افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ چھوٹے بچے ایسے مسائل کی طرف توجہ نہیں دیتے اور خادم وغیرہ بھی ان امور میں نہیں پڑتے لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ چھوٹے بچے (چہ جائیکہ بڑے) اس مسئلے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ماں باپ غفلت برتتے ہیں اور سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور بچوں کے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ جو نہیں کرنا چاہئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بعض اوقات اخلاقی بے راہ روی کا یا نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم خود ایسے افراد سے ملے ہیں کہ جنہوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس امر سے ماں باپ کی بے توجہی کی وجہ سے اور ماں باپ کو حالتِ خلوت میں مشغول دیکھنے کی بناء پر بچوں میں جنسی جذبات بھڑک اُٹھے یا پھر اُن کے اندر اس قدر شدید نفسیاتی کیفیت اور ماں باپ سے نفرت پیدا ہوئی کہ وہ انہیں قتل کرنے تک پر تُل گئے اور بعض اوقات خود بھی خودکشی تک جا پہنچے۔

ایسے ہی مقامات پر اس حکم اسلامی کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔ وہ مسائل کہ جن تک آج ماہرین اور دانشور پہنچے ہیں اسلام چودہ سو سال پہلے اپنے احکام میں ان کے بارے میں اپنا مؤقف واضح کر چکا ہے۔

اس مقام پر ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو نصیحت کریں کہ ان آداب و احکام کو سنجیدگی سے اپنائیں اور اپنی اولاد کو اپنے کمرے میں آنے کے لیے اجازت لینے کا عادی بنائیں۔

ہاں یہ بھی خیال رہے کہ دوسرے امور کے علاوہ عورت اور مرد کا اس کمرے میں سونا بھی بچوں میں تحریک کا سبب بنتا ہے جس میں ممیز بچے سوئے ہوئے ہوں۔

اس سلسلے میں جتنا ممکن ہو پرہیز کرنا چاہیئے اور یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیئے کہ تربیتی امور میں ان احکام و آداب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

ایاکم وان یجامع الرجل امرئته والصبی فی المھد ینظر الیھما

جب بچہ گھوارے میں پڑا دیکھ رہا ہو اُس وقت مباشرت نہ کرو[1]

۲۔ سن رسیدہ عورتوں کے لیے پردے کا حکم : علماء اسلام کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ عمر رسیدہ عورتیں پردے کے حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ قرآن نے اس سلسلے میں واضح حکم دیا ہے۔ البتہ اس استثنیٰ کی تفصیلات میں اختلاف موجود ہے مثلاً :

ان عورتوں کی عمر کیا ہے اور یہ کہ کس حد تک پہنچ جائیں تو "قواعد" کا لفظ اُن پر صادق آتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔

بعض اسلامی روایات میں ان کے لیے لفظ "مسنه" (سن رسیدہ) استعمال ہوا ہے[2]

جبکہ بعض دوسری روایات میں "قعود از نکاح" کی تعبیر آئی ہے یعنی وہ شادی کے قابل نہ رہی ہوں[3]

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۰۳، صفحہ ۲۹۵

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۴ کتاب النکاح باب ۱۱۰، حدیث ۴

[3] وسائل الشیعہ ج ۱۴ کتاب النکاح باب ۱۱۰ حدیث ۵

Marfat.com

لیکن بعض فقہاء اور مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ماہواری کا خاتمہ، بچہ جننے کے قابل نہ رہنا اور کسی کا اس سے نکاح کی خواہش نہ کرنا ہے [1]

لیکن ظاہراً یہ سب تعبیرات ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور وہ یہ کہ عورتیں اس عمر کو پہنچ جائیں کہ جس میں عموماً کوئی عورت شادی نہیں کرتی اگرچہ ممکن ہے شاذ و نادر ایسا ہو جائے۔

ایسی عورتوں کے لیے کس قدر بدن ظاہر کرنا جائز ہے اس سلسلے میں بھی روایات مختلف ہیں جبکہ قرآن میں اجمالی طور پر فرمایا گیا ہے کہ کوئی حرج نہیں کہ وہ اپنا لباس اُتار دیں البتہ یہ بات واضح ہے کہ اس سے اوپر والا لباس مراد ہے۔

بعض روایات میں اس سوال کے جواب میں کہ وہ کونسا لباس اُتار سکتی ہیں، امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجلباب

چادر اور برقعہ۔ [2]

جبکہ ایک اور روایت میں "جلباب وخمار" [3] کے الفاظ ہیں (" خمار" دوپٹے کو یا اس رومال کو کہتے ہیں جو عورتیں سر پر باندھتی ہیں)۔

ظاہراً ایسی احادیث ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنا سر کھلا رکھیں اور اپنے بال، گردن اور چہرہ نہ چھپائیں۔ بعض احادیث اور کلماتِ فقہاء میں ان کی کلائی کو بھی مستثنٰی قرار دیا گیا ہے لیکن اس سے زیادہ کے بارے میں استثناء کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

بہرحال یہ سب اس صورت میں ہے کہ وہ خود آرائی نہ کریں (غیر متبرجات بزینة) اور اپنی پنہاں زینتوں کو دوسری عورتوں کی طرح چھپائیں اسی طرح زیب و زینت کے لباس بھی نہ پہنیں۔

دوسرے لفظوں میں اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ چادر اور دوپٹے کے بغیر سادہ لباس میں بغیر آرائش کے گھر سے باہر آئیں۔

لیکن اس کے باوجود ایسا کرنا اُن کے لیے ضروری نہیں بلکہ اگر وہ دوسری عورتوں کی طرح پردے کی پابندی کریں تو یہ بہتر ہے جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں بھی اس سلسلے میں صراحت موجود ہے کیونکہ اگرچہ شاذ و نادر ہی ہو لغزش کا امکان یہاں بھی موجود ہے۔

---

[1] جواہر ج ۲۹ ص ۸۵ اور کنز العرفان ج ۲ ص ۲۲۶

[2] وسائل الشیعہ کتاب النکاح باب ۱۱۰ حدیث ۱

[3] وسائل الشیعہ کتاب النکاح باب ۱۱۰ حدیث ۲ و ۴

Marfat.com

۶۱۔ لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا
عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْۢ
بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّھٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ
اِخْوَانِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِکُمْ اَوْ
بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِکُمْ
اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَہٗٓ اَوْ صَدِیْقِکُمْ ط لَیْسَ عَلَیْکُمْ
جُنَاحٌ اَنْ تَاْکُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ط فَاِذَا دَخَلْتُمْ
بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّۃً مِّنْ عِنْدِ اللہِ
مُبٰرَکَۃً طَیِّبَۃً ط کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ
تَعْقِلُوْنَ ع ○

ترجمہ

۶۱۔ اندھے، لنگڑے اور بیمار شخص کے لیے کوئی حرج نہیں ہے (کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھائے) اور تمہارے لیے بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے گھروں سے (کہ جن میں تمہاری اولاد یا بیویاں رہتی ہیں اور جو تمہارے گھر شمار ہوتے ہیں بغیر خصوصی اجازت کے) کھانا کھالو، اسی طرح تم اپنے باپ دادا یا اپنی ماؤں یا اپنے بھائیوں یا اپنی بہنوں یا اپنے چچاؤں یا اپنی پھوپھیوں یا اپنے ماموؤں یا اپنی خالاؤں کے گھر سے یا اُن گھروں سے کہ جن کی چابی تمہارے پاس ہے

Marfat.com

یا اپنے دوستوں کے گھر سے کھا سکتے ہو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم مل جل کر کھاؤ یا علیحدہ علیحدہ اور جب کسی کے گھر میں جاؤ تو اپنے اوپر سلام کرو۔ اللہ کی طرف سے سلام و تحیّت، سلام و تحیّت کہ جو مبارک پاک و پاکیزہ ہے۔ اللہ تم سے اپنی آیات اس طرح سے بیان کرتا ہے۔ شاید تم سمجھو اور غور و فکر کرو۔

تفسیر

جن گھروں میں جا کر کھانا کھانا جائز ہے

گزشتہ آیات میں معین اوقات میں یا مطلق طور پر ماں باپ کے خصوصی کمرے میں داخل ہوتے وقت اجازت لینے کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں درحقیقت ایک استثنائی پہلو پر بات کی گئی ہے۔ اس میں ان رشتے داروں اور دیگر لوگوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جن کے ہاں خاص حالات میں جایا جا سکتا ہے اور اجازت لیے بغیر کھانا کھایا جا سکتا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: اندھے، لنگڑے اور بیمار اشخاص کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر کھا پی لیں (لیس علی الاعمٰی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج)۔

بعض روایات میں ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے اہلِ مدینہ اندھے، لنگڑے اور بیمار افراد کو اپنے دستر خوان پر بیٹھنے سے منع کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ انہیں اس کام سے نفرت تھی۔ ظہورِ اسلام کے بعد کچھ لوگ ایسے افراد کو الگ کھانا کھلاتے تھے البتہ اس بنا پر نہیں کہ ان کے ساتھ کھانا کھانے سے نفرت کرتے تھے بلکہ اس بنا پر کہ شاید نابینا شخص کھانے کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے اور یہ خود تو کھا لیں مگر وہ نہ کھا سکے اور اسے وہ خلافِ اخلاق و مروّت سمجھتے تھے۔ اسی طرح لنگڑے اور بیمار افراد کے بارے میں اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے وہ کھانا کھانے میں پیچھے رہ جائیں اور جو لوگ صحیح سالم ہیں وہ کھا پی لیں بہرحال جو بھی وجہ تھی اُن کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس بنا پر اندھے، لنگڑے اور بیمار افراد بھی اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھتے تھے اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے وہ دوسروں کے لیے باعثِ زحمت ہوں اور اس زحمت دینے کو وہ اپنے لیے گناہ تصور کرتے تھے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ سے سوال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور یہ واضح کیا گیا کہ اگر یہ افراد تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھائیں تو کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] تفسیر در المنثور، تفسیر نور الثقلین زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ ان کے علاوہ بھی بعض مفسرین نے اپنی تفسیر میں یہ روایت درج کی ہے مثلاً طبری نے مجمع البیان میں، مرحوم فیض نے تفسیر صافی میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں شیخ طوسی نے تبیان میں اسے درج کیا ہے۔

Marfat.com

البتہ اس جملے کی تفسیر میں مفسرین نے دیگر تفسیریں بھی ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ افراد حکم جہاد سے مستثنیٰ ہیں۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ تمہیں اجازت ہے کہ ایسے معذور اور ناتواں افراد کو اپنے ساتھ ان گیارہ گھروں میں سے جاؤ کہ جن کا ذکر آیت میں آیا ہے اور یہ کہ وہ بھی وہاں سے کھانا کھائیں۔

لیکن یہ دونوں تفسیریں بہت بعید معلوم ہوتی ہیں اور آیت کے ظاہری مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

اس کے بعد قرآن مجید مزید کہتا ہے: تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اپنے گھروں سے جہاں تمہاری اولاد یا بیویاں رہتی ہیں کہ جو تمہارے اپنے گھر شمار ہوتے ہیں کھا پی لو (ولا علیٰ انفسکم ان تأکلوا من بیوتکم)۔

یا اپنے باپ دادا کے گھر سے (او بیوت اٰبائکم)۔

یا اپنی ماؤں کے گھر سے (او بیوت امھاتکم)۔

یا اپنے بھائیوں کے گھر سے (او بیوت اخوانکم)۔

یا اپنی بہنوں کے گھر سے (او بیوت اخواتکم)۔

یا اپنے چچوں کے گھر سے (او بیوت اعمامکم)۔

یا اپنی پھوپھیوں کے گھر سے (او بیوت عماتکم)۔

یا اپنے ماموؤں کے گھر سے (او بیوت اخوالکم)۔

یا اپنی خالاؤں کے گھر سے (او بیوت خالاتکم)۔

یا اُن گھروں سے جن کی چابی تمہارے پاس ہے (او ما ملکتم مفاتحه)

یا اپنے دوستوں کے گھر سے (او صدیقکم)۔

البتہ اس حکم کی کچھ شرائط اور توضیحات ہیں جنہیں ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارے لیے کوئی مضائقہ نہیں کہ مل کر کھاؤ یا الگ سے (لیس علیکم جناح ان تأکلوا جمیعًا او اشتاتًا)۔

گویا بعض مسلمان ابتدائے اسلام میں علیحدہ کھانا کھانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اگر انہیں کوئی ساتھ مل کر کھانا کھانے والا نہ ملتا تو بعض اوقات عرصے تک بھوکے رہتے۔ قرآن انہیں تعلیم دیتا ہے کہ اجتماعی صورت میں بھی اور الگ سے بھی ہر دو طرح سے کھانا کھانا جائز ہے[1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بعض عربوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ وہ مہمان کا کھانا احترام کے طور پر الگ لے کر جاتے تھے اور خود اس کے ساتھ مل کر نہیں کھاتے تھے (تاکہ کہیں وہ شرمندگی محسوس نہ کرے اور آزادی سے نہ کھا سکے)۔ آیت نے ان پابندیوں کو

---

[1] تفسیر تبیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

ختم کردیا اور انہیں تعلیم دی کہ یہ کوئی اچھی رسم نہیں ہے[1]

بعض نے کہا ہے کہ کچھ مالدار ایسے تھے کہ جو غریب لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے اور طبقاتی فاصلہ دسترخوان تک پر ملحوظ رکھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں اس ظالمانہ روش کی نفی کی ہے[2]

لیکن کوئی حرج نہیں کہ آیت کے پیش نظر یہ تمام امور ہوں۔

اس کے بعد معاشرتی اخلاق کے بارے میں ایک اور حکم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو اپنے اوپر سلام کرو۔ اللہ کی طرف سے مبارک پاک و پاکیزہ سلام و تحیت (فاذا دخلتم بیوتًا فسلموا علٰی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ)۔

آیت اس جملے پر ختم ہوتی ہے: تمہارے لیے اللہ اس طرح سے اپنی آیات واضح کرتا ہے شاید تم عقل و فکر سے کام لو۔ (کذٰلک یبین اللہ لکم الاٰیات لعلکم تعقلون)۔

ان "بیوت" سے کون سے گھر مراد ہیں؟ بعض مفسرین مذکورہ بالا گیارہ گھروں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین نے "بیوت" سے مسجدیں مراد لیا ہے۔

لیکن واضح ہے کہ آیت مطلق ہے اور اس سے تمام گھر مراد ہو سکتے ہیں چاہے وہ مذکورہ گیارہ گھر ہوں کہ جن میں آدمی کھانے کے لیے جاتا ہے یا دیگر رشتے داروں اور دوستوں کے گھر کیونکہ آیت کے وسیع مفہوم کو محدود کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ اپنے اوپر سلام کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بھی متعدد تفاسیر نظر آتی ہیں:

★ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کچھ افراد کا دوسروں کو سلام کرنا مراد ہے جیسا کہ سورہ بقرہ آیت ۵۴ کے مطابق بنی اسرائیل کے واقعے میں ہے:

فاقتلوا انفسکم

تم ایک دوسرے کو سزا کے طور پر قتل کرو۔

★ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بیوی بچوں اور اہل خانہ کو سلام کرنا ہے کیونکہ وہ انسان کی اپنی ذات ہی کی طرح ہیں اس لیے انہیں "انفس" کہا گیا ہے آیت مباہلہ (کہ جو آل عمران کی اکسٹھویں آیت ہے) میں بھی یہ تعبیر دکھائی دیتی ہے اور اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ بعض اوقات ایک شخص دوسرے سے اس قدر نزدیک ہو جاتا ہے گویا خود اُس کا نفس ہو گیا یعنی وہی ہو گیا جیسے حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے انتہائی قریب تھے اور ان کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا۔

★ بعض نے کہا ہے اس سے مراد وہ گھر ہیں کہ جن میں کوئی نہیں رہتا تو انسان کو چاہیئے کہ اُن میں داخل ہوتے وقت اپنے آپ کو ان الفاظ میں سلام کرے:

السلام علینا من قبل ربنا

ہم پر ہمارے پروردگار کی طرف سے سلام ہو۔

---

[1] و [2] تفسیر تبیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

یا ان الفاظ میں سلام کرے :

السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین

ہم پر سلام ہو اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ان تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ ہر گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا چاہیئے۔ اہل خانہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ مومنین ایک دوسرے کو سلام کریں اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو پھر اپنے اوپر سلام کریں۔ کیونکہ ہر سلام کا نتیجہ درحقیقت اپنے اوپر ہی سلام ہے۔

اسی لیے امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے کہ اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا گیا تو فرمایا:

ھو تسلیم الرجل علی اھل البیت حین یدخل ثم یردون علیه فھو سلامکم علی انفسکم

اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی گھر میں داخل ہو تو اہلِ خانہ کو سلام کرے۔ وہ جواب سلام دیں گے اور اس پر سلام کریں گے اور یہ گویا تمہارا خود اپنے اوپر سلام کرنا ہے[1]

امام باقر علیہ السلام ہی سے مروی ہے کہ فرمایا

اذا دخل الرجل منکم بیته فان کان فیه احد یسلم علیه، وان لم یکن فیه احد فلیقل السلام علینا من عند ربنا یقول الله عزوجل تحیة من عند الله مبارکة طیبة

تم میں سے جب کوئی اپنے گھر میں داخل ہو، اگر اس میں کوئی موجود ہے تو اس پر سلام کرے اور اگر کوئی نہ ہو تو کہے: ہم پر ہمارے پروردگار کی طرف سے سلام۔ جیسا کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: اللہ کی طرف سے مبارک و پاکیزہ تحیت و سلام[2]

چند اہم نکات

۱۔ کیا کسی کے ہاں سے کھانا کھانے کے لیے اجازت شرط نہیں؟ زیر بحث آیت میں ہم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اجازت دی ہے کہ وہ نزدیکی رشتے داروں اور بعض دوستوں کے ہاں سے کھا پی لے۔ ایسے گیارہ قسم کے گھر گنوائے گئے ہیں۔ آیت میں ان سے اجازت حاصل کرنے کی شرط بھی عائد نہیں کی۔ ویسے بھی یہ بات مسلم ہے کہ یہ اجازت کے ساتھ مشروط نہیں ہے کیونکہ اجازت سے تو پھر کسی کے ہاں سے بھی کھایا جا سکتا ہے اس میں پھر ان گیارہ گھروں کی کیا خصوصیت رہ جائے گی۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا باطنی رضامندی بھی ضروری نہیں کیونکہ ظاہراً معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحب خانہ دل سے راضی ہے

---

[1] و [2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۶۲۷

Marfat.com

یا نہیں کیونکہ آدمی کو اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

آیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے جس طرح سے مطلق ہے اس سے تو اس شرط کی بھی نفی ہوتی ہے۔ یہی احتمال کافی ہے کہ صاحب خانہ راضی ہے۔

لیکن اگر طرفین کے باہمی تعلقات یا کیفیت اس طرح کی ہے کہ راضی نہ ہونے کا یقین ہو تو پھر بعید نہیں کہ ایسے موقع پر حکم میں گنجائش ہو خصوصاً جبکہ ایسے مواقع شاذ و نادر ہوتے ہیں اور عموماً مطلق حکم میں ایسے شاذ و نادر امور کا استثنیٰ ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ آیت ایک خاص حد تک ان آیات و روایات کی تخصیص کرتی ہے کہ جن میں دوسروں کے مال میں تصرف کرنے کو اُن کی رضامندی سے مشروط قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہم پھر یہ کہیں کہ اس اجازت کی بھی ایک معین حد ہے یعنی ضرورت کے مطابق کھانا کھانا اور اسے ضائع نہ کرنا اور اسراف سے پرہیز کرنا

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے وہ ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور ہے۔ اس کا کچھ حصّہ صراحت کے ساتھ روایات میں بھی آیا ہے۔ ایک معتبر روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام سے "او صدیقکم" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

هو والله الرجل يدخل بيت صديقه فيأكل بغير اذنه

واللہ مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے دوست کے گھر داخل ہو اور بغیر اجازت کے کھانا کھائے[1]

اس سلسلے میں اور بھی متعدد روایات ہیں کہ جن میں فرمایا گیا ہے کہ اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

البتہ فقہاء کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر صراحت سے منع کر دیا جائے یا ناپسندیدگی اور عدم رضامندی کا علم اور یقین ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور ایسے مواقع پر حکم آیت لاگو نہیں ہوتا۔

کھانا کھاتے ہوئے ضائع، خراب اور اسراف نہ کرنے کے بارے میں بعض روایات میں تصریح موجود ہے[2]

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ خاص قسم کی غذا کھانے کی اجازت ہے نہ کہ ہر غذا کو کھایا پیا جا سکتا ہے۔ لیکن فقہاء نے اس روایت سے اعراض کیا ہے اس لیے اس سے استناد معتبر نہیں ہے۔

بعض فقہاء نے اُن اچھے اور بڑھیا کھانوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ جو صاحب خانہ نے کسی خاص مہمان کے لیے یا خاص موقع کے لیے رکھے ہوں اور آیت کے حکم میں یہ استثنیٰ بعید نہیں ہے[3]

۲- اس حکم اسلامی کا فلسفہ: یہ ہو سکتا ہے غصب کے بارے میں اسلام کے واضح اور شدید احکام سے اس حکم موازنہ کیا جائے تو سوال پیدا ہو کہ اسلام نے دوسروں کے مال میں تصرف کے بارے میں اتنا سخت مؤقف اختیار کرنے کے باوجود اس امر کو کیسے جائز شمار کیا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۶ صفحہ ۴۳۴ کتاب الاطعمہ و اشربہ، ابواب آداب المائدۃ باب ۲۴ حدیث ۱

[2] ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ حدیث ۴

[3] مزید وضاحت کے لیے جواہر الکلام ج ۳۶ صفحہ ۴۰۶ (کتاب الاطعمہ والاشربہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

ہمارا خیال ہے کہ یہ سوال سو فی صد مادی امور پر نظر رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا۔ یہ سوال اس معاشرے سے متعلق ہے جو آج کے مغربی ممالک کے ماحول کی طرح ہوں کہ جہاں اپنی حقیقی اولاد کو کچھ بڑا ہو جانے پر گھر سے نکال دیا جاتا ہے اور اُن کے کسی حق کا احترام نہیں کیا جاتا اور نہ اُن سے کوئی اظہارِ محبت کیا جاتا ہے کیونکہ وہاں تمام مسائل مادی اور اقتصادی محور کے گرد چکر لگاتے ہیں اور انسانی احساسات کا وہاں نام و نشان تک نہیں ہے لیکن مغربی تہذیب کی جو صورتِ حال ہے اس کے پیش نظر ایسا ہونا کوئی باعث تعجب نہیں لیکن اسلامی تہذیب اور سماجی نظام میں انسانی احساسات کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ خاص طور پر قریبی رشتہ داروں اور خاص دوستوں کے بارے میں اسلام بہت حساس ہے اسلام کی نظر میں قرابت داری اور دوستی کے رشتے ان مادی حوالوں سے بہت بلند ہیں یہ رشتے اسلام کی نظر میں بہت مقدس ہیں۔ اسلام تنگ نظری، خود غرضی اور خود پرستی سے معاشرے کو پاک کر دینا چاہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غصب کے بارے میں اسلامی احکام ان حدود سے باہر ہیں۔ اسلام نے ان خاص حالات میں انسانی رشتوں اور احساسات کو غصب کے احکام پر مقدم شمار کیا ہے۔

۳۔ "صدیق" سے کون مراد ہے؟ اس میں شک نہیں کہ دوستی کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ یہاں "صدیق" سے مراد خاص اور قریبی دوست ہیں۔ جن کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہے۔ جن کے درمیان قریبی تعلقات اور روابط کا تقاضا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہاں آئیں جائیں اور ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھائیں۔ یہاں تک کہ اس میں اجازت شرط نہیں ہے صرف اتنا کافی ہے کہ یقین ہو کہ اس پر ان کی عدم رضامندی نہیں ہے۔

اسی لیے اس جملے کے ذیل میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد ایسا دوست ہے کہ جو اپنی دوستی میں مخلص اور سچا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا دوست ہے کہ جو آپ سے ظاہر و باطن میں ایک جیسا ہو۔

ظاہراً ان سب تفسیروں کا ایک ہی مفہوم نکلتا ہے۔

مناسب ہے کہ اس مقام پر دوستی کے مفہوم اور اس کی مکمل شرائط امام صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

لا تکون الصداقة الا بحدودها، فمن کانت فیه هذه الحدود او شیء منها فانسبه الی الصداقة ومن لم یکن فیه شیء منها فلا تنسبه الی شیء من الصداقة.

فاولها ان تکون سریرته وعلانیته لك واحدة

والثانی ان یری زینك زینه و شینك شینه

والثالثة ان لا تغیره علیك ولایة ولا مال

والرابعة ان لا تمنعك شیئاً تناله مقدرته

والخامسة وهی تجمع هذه الخصال ان لا یسلمك عند النکبات.

دوستی کی کچھ حدود و شرائط ہیں جن کے بغیر دوستی کا کوئی مفہوم نہیں۔ جس شخص میں یہ شرائط یا ان کا کچھ حصہ ہو اُسے دوست سمجھو اور جس میں ان شرائط اور خصوصیات میں سے کوئی بھی نہ ہو اُس میں دوستی والی کوئی

Marfat.com

کوئی بات نہیں۔

دوستی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تیرے وقار اور آبرو کو اپنا وقار اور آبرو سمجھے۔ اور تیری برائی اور نقصان کو اپنی برائی اور نقصان سمجھے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ مقام و منصب اور مال و دولت کی وجہ سے وہ تجھ سے برتاؤ میں تبدیلی نہ کرے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جو کچھ اُس کے اختیار میں اُس میں تیرے لیے دریغ نہ کرے۔

اور پانچویں شرط کہ جس میں یہ تمام شرطیں جمع ہیں یہ ہے کہ جب زمانہ تجھ سے منہ موڑلے وہ تجھے تنہا نہ چھوڑے۔[۱]

۴۔ **ماملکتم مفاتحہ کی تفسیر:** متعدد شان ہائے نزول میں آیا ہے کہ صدرِ اسلام میں جب مسلمان جہاد پر جاتے تھے تو کبھی کبھار اپنے گھر کی چابی ایسے افراد کو سونپ جاتے ہیں جو معذور ہونے کے باعث جہاد پر نہیں جا سکتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنہیں یہ اجازت بھی دے جاتے کہ گھر میں موجود غذا بھی وہ کھا سکتے ہیں اور لیکن وہ کبھی اس خوف سے کہ کہیں گناہ نہ ہو کھانے اجتناب کرتے تھے۔

ان روایات کے مطابق "ماملکتم مفاتحہ" (وہ گھر کہ جن کی چابیوں کے تم مالک ہوئے ہو) سے یہی مراد ہے۔[۲]

ابن عباس سے بھی منقول ہے کہ اس سے مراد انسان کا وکیل اور نمائندہ ہے اور یہ وکالت باغ، جائداد، زراعت اور پالتو جانوروں میں ہوتی ہے۔ اس نمائندے کو اجازت دی گئی ہے کہ باغ کے پھلوں میں سے ضرورت کے مطابق کھائے اور جانوروں کا دودھ پی لے۔

بعض نے اس سے گودام کا نگران مراد لیا ہے کہ جو حق رکھتا ہے کہ وہ غذا میں سے کھائے۔

لیکن جن لوگوں کے نام اس آیت میں لیے گئے ہیں انہیں نظر میں رکھیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں کہ جنہیں ان کے قریبی عزیز اعتماد اور تعلق کی بنا پر اپنے گھر کی چابی سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ قریبی ربط و تعلق اس بات کا سبب بنا کہ رشتہ داروں اور دوستوں کی فہرست میں انہیں بھی شمار کیا جائے۔

بعض روایات کے مطابق اس سے مراد وہ وکیل ہے کہ جسے اموال کی سرپرستی سونپی جاتی ہے۔ یہ تفسیر درحقیقت اس جملے کا ایک مصداق ہے۔

۵۔ **سلام و تحیت:** جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "تحیۃ" بنیادی طور پر "حیات" کے مادہ سے ہے۔ یہ لفظ

---

[۱] اصول کافی، ج ۲ ص ۶۳۹

[۲] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں (وسائل الشیعہ ج ۱۶ ص ۴۳۶ باب ۲۴ از ابواب مائدہ میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث موجود ہے)۔

Marfat.com

سلامتی کے لیے اور دوسری زندگی کے لیے دُعا کرنے کا مفہوم رکھتا ہے۔ چاہے یہ دعا "سلام علیکم" یا "السلام علینا" کی شکل میں ہو چاہے "حیاک اللہ" کی صورت میں لیکن عام طور پر ہر قسم کے اس اظہار محبت کو "تحیت" کہتے ہیں کہ جو ابتدائے ملاقات میں لوگ ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

"تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ" سے مراد یہ ہے کہ "تحیۃ" کا ایک طرح سے اللہ سے رابطہ ہونا چاہیئے یعنی "سلام علیکم" سے مراد یہ کہ "اللہ کا تم پر سلام ہو"، "اللہ تمہیں سلامت رکھے" کیونکہ کوئی مؤحد اور خدا پرست جب بھی کوئی دُعا مانگتا ہے تو آخر کار وہ اللہ ہی سے ہوتی ہے اور اسی سے درخواست ہوتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جو دعا ایسی ہو وہ مبارک بھی ہے اور پاک وطیب بھی۔

(سلام اور اس کی اہمیت اور ہر قسم کے سلام وتحیت کے جواب کے وجوب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم میں سورہ نساء کی آیت ۸۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں)۔

Marfat.com

۶۲۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا
كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى
يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ
شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
۶۳۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ
بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ
لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ
تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝
۶۴۔ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ
مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ
فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۶۲۔ حقیقی مومن وہ ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہوں اور جس وقت کسی اہم
کام میں اُس کے ساتھ ہوں تو اس کی اجازت کے بغیر کہیں نہ جائیں۔ (اے رسول!) جو

Marfat.com

لوگ تجھ سے اجازت لیتے ہیں وہ سچ مچ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔ لہٰذا اس صورت میں جب وہ تجھ سے اپنے بعض کاموں کے لیے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے تو چاہے (اور مصلحت دیکھے) اجازت دے دے اور ان کے لیے استغفار کر کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

۶۳۔ اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کی طرح نہ سمجھو۔ اللہ تم میں سے ان افراد کو جانتا ہے کہ جو ایک دوسرے کی آڑ لے کر یکے بعد دیگرے بھاگ جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیئے کہ کہیں انہیں کوئی فتنہ نہ آئے یا انہیں دردناک عذاب نہ آپہنچے۔

۶۴۔ آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کے لیے ہیں۔ وہ تمہاری ہر روش کو جانتا ہے۔ جس روز وہ اللہ کی طرف لوٹ کر جائیں گے وہ انہیں ان کے انجام کردہ افعال بتائے گا اور اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول :

زیر نظر پہلی آیت کے بارے میں مفسرین نے مختلف شان ہائے نزول نقل کی ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت حنظلہ بن ابی عیاش کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس رات شادی کرنا چاہتے تھے اُس سے اگلے دن جنگ اُحد برپا ہوئی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے جنگ کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے کہ وہ آپؐ کے پاس آئے اور عرض کی کہ اگر رسول اللہ اجازت دیں یہ رات میں اپنی بیوی کے ساتھ گزار لوں۔ آنحضرتؐ نے انہیں اجازت دے دی۔

صبح کے وقت انہیں جہاد میں شرکت کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ غسل بھی نہ کر سکے۔ اسی حالت میں معرکۂ کارزار میں شریک ہو گئے اور بالآخر جامِ شہادت نوش کیا۔

رسول اللہؐ نے اُن کے بارے میں ارشاد فرمایا:

Marfat.com

میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔

اسی لیے انہیں حنظلۃ "غسل الملائکہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[1]

ایک اور شان نزول میں ہے کہ یہ آیت جنگ خندق کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پیغمبر اکرمؐ تمام مسلمانوں کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ مدینے کے اطراف میں خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ کچھ منافقین کہ جو ظاہراً مسلمانوں کی صف میں تھے بہت آہستہ آہستہ کام کر رہے تھے۔ وہ لوگ جب دیکھتے کہ مسلمان متوجہ نہیں ہیں تو رسول اللہؐ سے اجازت لیے بغیر چپکے سے اپنے گھروں کو چلے جاتے لیکن اگر حقیقی مسلمانوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں آکر اجازت لیتے اور کام انجام دے کر فوراً واپس آجاتے اور خندق کھودنے میں مشغول ہو جاتے تاکہ اس کارِ خیر میں وہ پیچھے نہ رہ جائیں۔

یہ آیت پہلے گروہ کی مذمت اور دوسرے کی تعریف کر رہی ہے[2]

تفسیر

رسول اللہؐ کو تنہا نہ چھوڑو

ان آیات کا گزشتہ آیات سے کیا ربط ہے؟ اس سلسلے میں طبرسی نے مجمع البیان میں اور سید قطب نے تفسیر فی ظلال میں اور بعض دیگر مفسرین نے کہا کہ گزشتہ آیات میں دوستوں اور رشتے داروں سے معاشرت کے بارے میں احکام تھے اور ان آیات میں رسول اکرمؐ سے مسلمانوں کی معاشرت کے بارے میں احکام ہیں۔ ان میں مسلمانوں کو اس سلسلے میں نظم و ضبط کی پابندی کرنے کے لیے کہا گیا ہے تاکہ وہ تمام امور میں رسول اللہؐ کی طرف توجہ رکھیں اور اہم کاموں میں ضرورت اور اجازت کے بغیر الگ نہ ہوں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ چند پہلی آیتوں میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے لازمی ہونے کے بارے میں گفتگو تھی اور اطاعت کے تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی اجازت اور حکم کے بغیر کوئی کام نہ کیا جائے لہٰذا زیر بحث آیات میں اس کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

بہر حال زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، حقیقی مومن تو وہ ہیں کہ جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور جب کسی اہم کام میں ان کے ساتھ ہوں تو اجازت لیے بغیر کہیں نہیں جاتے (انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ و رسولہ و اذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتّٰی یستأذنوہ)۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم کے حوالے سے نور الثقلین ج ۳ ص ۶۲۸ پر یہ شان نزول نقل کی گئی ہے۔

[2] تفسیر فی ظلال، ج ۶ ص ۱۲۶، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

" امرِ جامع " سے مراد ایسا اہم کام ہے کہ جس میں لوگوں کا جمع ہونا ضروری ہو اور اس میں تعاون اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کی ضرورت ہو۔ چاہے کسی اہم مسئلے پر غور و خوض اور مشاورت کا مسئلہ ہو چاہے جہاد اور دشمنوں سے جنگ کا مسئلہ ہو یا اہم حالات میں نماز جمعہ کا اجتماع ہو یا ایسا ہی کوئی اور اہم کام۔ لہٰذا یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے اس سے مراد کوئی اہم مشورہ لیا ہے بعض نے جہاد، بعض نے نماز جمعہ اور بعض نے نماز عید تو یہ سب آیت کا ایک مصداق ہیں اور مذکورہ بالا شان ہائے نزول بھی اس کلی حکم کا مصداق ہیں۔

درحقیقت یہ نظم و ضبط اور ڈسپلن کے بارے میں ایک حکم ہے اس سے کوئی منظم جماعت بے اعتنائی نہیں کر سکتی کیونکہ ایسے مواقع پر بعض اوقات ایک فرد کا بھی غائب ہو جانا بہت گراں اور نقصان دہ ہوتا ہے اور اصل مقصد کو نقصان پہنچتا ہے خصوصاً اگر جماعت کا رہبر فرستادۂ خدا اور اللہ کا رسول اور روحانی رہبر ہو کہ جس کا حکم واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اجازت لینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ جس شخص کو بھی کوئی کام ہو وہ بس ایک ظاہری سی اجازت لے لے اور اپنے کام کے پیچھے چل پڑے بلکہ مراد یہ ہے کہ واقعاً اجازت لے یعنی اگر رہبر اس کی عدم موجودگی کو نقصان دہ نہ سمجھے اور اسے اجازت دے تو وہ جائے ورنہ وہیں رہے اپنے ذاتی کام کو بڑے مقصد پر قربان کر دے۔

لہٰذا اس جملے کے بعد فوراً فرمایا گیا ہے: "جو لوگ تجھ سے اجازت چاہتے ہیں اور سچ مچ اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں" اور ان کا ایمان صرف زبانی نہیں ہے بلکہ دل و جان سے تیرے فرماں بردار ہیں (ان الذین یستأذنونك اولٰئك الذین یؤمنون باللہ و رسولہ)۔ تو اس صورت میں اُن میں سے تو جس شخص کو چاہے (اور مصلحت دیکھے) اجازت دے دے (فاذا استأذنوك لبعض شأنهم فاذن لمن شئت منهم)۔

واضح ہے کہ ایسے باایمان افراد اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ وہ ایک اہم کام کے لیے جمع ہوئے ہیں لہٰذا وہ کسی معمولی سے کام کے لیے اجازت طلب نہیں کرتے اور "شأنهم" سے مراد ضروری اور اہم کام ہی ہے۔

دوسری طرف رسولؐ کے چاہنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ حالات کو تمام پہلوؤں سے مدِنظر رکھے بغیر لوگوں کی موجودگی اور عدم موجودگی کے اثرات کو دیکھے بغیر اجازت دے دیں بلکہ یہ لفظ اس بات کا غماز ہے کہ رہبر کو اختیار ہے کہ جب وہ محسوس کرے کہ لوگوں کا حاضر رہنا ضروری ہے تو وہ انہیں اجازت نہ دے۔

اس بات کی گواہ سورہ توبہ کی آیت ۴۳ ہے جس میں بعض افراد کو اجازت دینے پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

عفا اللہ عنك لم اذنت لهم حتّٰی یتبین لك الذین صدقوا و تعلم الکاذبین

اللہ نے اس بات سے صرف نظر کیا ہے کہ تو نے انہیں بغیر سچوں اور جھوٹوں میں تمیز کیے ہوئے کیوں اجازت دی۔

یہ آیت نشان دہی کرتی ہے کہ رسول کو بھی لوگوں کو اجازت دیتے وقت غور و خوض کرنا چاہیئے اور معاملے کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیئے اور اس سلسلے میں اُن پر اللہ کی طرف سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جب تو انہیں اجازت دیتا ہے تو "ان کے لیے استغفار کر کہ اللہ غفور و رحیم ہے"

Marfat.com

(واستغفر لھم اللہ ان اللہ غفور رحیم)۔
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ استغفار کس لیے ہے؟ کیا وہ پیغمبر اکرمؐ سے اجازت لینے کے باوجود گنہ گار ہیں کہ جس کی وجہ سے استغفار کے محتاج ہیں؟
اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے۔
(۱) اگرچہ وہ چلے جانے کے مجاز ہیں پھر بھی انھوں نے اپنے ذاتی کام کو مسلمانوں کے اجتماعی کام پر ترجیح دی ہے اور ایسا کرنا ترک اولیٰ تو ضرور ہے[1] اسی لیے وہ استغفار کے محتاج ہیں (جیسے ایک مکروہ کام پر استغفار کی جاتی ہے)۔
ضمناً یہ تعبیر نشان دہی کرتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اجازت طلب کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے اور ایثار و قربانی سے کام لینا چاہیئے اور انہیں ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اجازت لینے کے بعد بھی ان کا عمل ترک اولیٰ ہے اور یہ امر اس لیے بھی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جزوی اور ذاتی امور میں لوگ اہم کاموں کو ترک کرنے کے لیے اجازت کو بہانہ ہی بنا لیں۔
(۲) وہ اپنے رہبر کے حضور آداب کو ملحوظ رکھنے کی بناء پر لطف الٰہی کے حق دار ہیں اور رسول اللہ کا ان کے لیے استغفار کرنا ایک طرح سے اظہار تحسین و تشکر ہے[2]
البتہ یہ دونوں جواب آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں مراد ہوں۔
یہ بات بھی واضح رہے کہ نظم و ضبط کے بارے میں یہ اہم حکم صرف رسول اکرمؐ اور ان کے اصحاب کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام ہادیانِ الٰہی کے بارے میں یہی حکم ہے۔ چاہے وہ نبی ہوں، امام ہوں یا ایسے علماء کہ جو اُن کے جانشین ہیں۔ کیونکہ اس حکم میں اسلامی معاشرے کے نظام کا تحفظ مضمر ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید کے حکم کے علاوہ عقل و منطق کا بھی یہی تقاضا ہے کیونکہ اصولی طور پر کوئی بھی نظام اس اصول کے احترام کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور صحیح نظام اور ادارہ سازی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
تعجب کی بات ہے کہ بعض مشہور علماء اہل سنت نے اس آیت کو جوازِ اجتہاد اور حکم کو مجتہد کی رائے پر چھوڑنے کی دلیل سمجھا ہے لیکن کہے بغیر واضح ہے کہ اصول و فقہ میں جو اجتہاد کیا جاتا ہے وہ احکام شریعت کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ موضوعات کے ساتھ۔ موضوعات میں اجتہاد کرنا قابلِ انکار نہیں ہے۔ ہر لشکر کا کمانڈر، ہر ادارے کا سربراہ اور ہر گروہ کا سرپرست احکام کے اجراء کے موقع پر اور موضوعاتِ خارجی میں رائے دے سکتا ہے اور اس کی یہ رائے محترم ہے لیکن یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ شریعت کے کلی احکام میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ مصلحت کے نام پر حکم وضعی یا حکم تکلیفی کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد اتباع پیغمبرؐ سے مربوط ایک اور حکم دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے پیغمبر کی پکار اور بلانے کو تم ایسا نہ سمجھو جیسے

---

[1] تفسیر فخر رازی، روح المعانی اور تفسیر قرطبی۔ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔
[2] تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو (لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً) - وہ کسی مسئلے میں جب تمہیں پکاریں تو یقیناً یہ ایک اہم الٰہی اور دینی مسئلہ ہے لہٰذا اسے اہمیت دو اور سنجیدگی سے اُن کے حکم پر ڈٹ جاؤ۔ ان کی پکار کو معمولی نہ سمجھو کیونکہ ان کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اور ان کی دعوت پروردگار کی دعوت ہے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: جو لوگ رسول کے اہم کاموں سے الگ ہو کر ایک دوسرے کی اوٹ لے کر یکے بعد دیگرے بھاگ جاتے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے اور انہیں دیکھتا ہے (قد یعلم اللہ الذین یتسللون منکم لو اذاً)۔ لیکن جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں فتنے میں گرفتار ہو جائیں یا دردناک عذاب انہیں آلے (فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبہم فتنۃ او یصیبہم عذاب الیم)۔

"یتسللون" "تسلل" کے مادے سے ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو اس کی جگہ سے الگ کرنا مثلاً کہا جاتا ہے:

سل السیف من الغمد

اس نے تلوار نیام سے نکالی

جو لوگ چپکے سے کسی جگہ سے بھاگ جائیں عموماً انہیں "متسللون" کہا جاتا ہے۔

"لو اذاً" "ملاوذہ" سے چھپنے کے معنی میں ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کے عمل کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے پیچھے یا کسی دیوار کی اوٹ میں چھپتے ہیں۔ گویا دوسرے کو غفلت میں پا کر بھاگ جاتے ہیں۔ یہ وہ کام تھا کہ جو منافقین انجام دیتے تھے جبکہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں کو جہاد یا کسی اور اہم کام کے لیے بلاتے تھے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ تمہارا یہ قبیح اور منافقانہ عمل اگر لوگوں کی نظر سے چھپا بھی رہ جائے تو خدا سے مخفی نہیں رہتا اور پیغمبر خدا کے حکم سے تمہاری ان سرتابیوں کی دنیا و آخرت میں دردناک سزا ہے۔

یہ کہ یہاں "فتنۃ" سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین اسے قتل کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض گمراہی کے اور بعض ظالم و جابر حکمران کے تسلط کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد نفاق کی مصیبت ہے کہ جو آدمی کے دل میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فتنۃ" سے مراد اجتماعی فتنے، مصیبتیں، شکستیں اور آفتیں ہوں کہ جو حکم رہبر کی مخالفت کے باعث معاشرے کو دامن گیر ہوتی ہیں۔

بہرحال "فتنۃ" کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ جس میں یہ تمام امور بھی شامل ہیں اور ان کے علاوہ بھی۔

اسی طرح "عذاب الیم" ممکن ہے عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو یا عذاب آخرت کی طرف یا دونوں کی طرف۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ زیر بحث آیت کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے علاوہ بھی دو احتمال ذکر ہوئے ہیں:

پہلا یہ کہ "لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً" سے مراد یہ ہے کہ جس وقت تم رسول کو پکارتے ہو تو ادب و احترام کے ساتھ اور اُن کے شایانِ شان انداز سے پکارو نہ کہ اس طرح جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یہ اس لیے فرمایا گیا کیونکہ بعض ایسے لوگ جو اسلامی آداب سے ناآشنا تھے وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں آتے تو لوگوں کے سامنے یا تنہائی میں "یا محمد"! "یا محمد" کہتے اور یہ اندازِ تخاطب ایک عظیم الٰہی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھا۔

Marfat.com

مقصد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو "یا رسول اللہ" اور "یا نبی اللہ" جیسے الفاظ کے ساتھ اور مئودبانہ لہجے میں پکارنا چاہیئے۔
بعض روایات میں بھی یہ تفسیر موجود ہے لیکن گزشتہ آیت اور خود اس آیت میں ایسی تعبیرات ہیں کہ جو دعوت پیغمبرؐ کو قبول کرنے اور اُن کے پاس سے بلا اجازت غائب نہ ہوجانے کی بابت گفتگو کرتی ہیں، اس لحاظ سے یہ تفسیر ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہاں البتہ یہ تفسیر جب ممکن ہے کہ ہم کہیں کہ یہ دونوں مطالب آیت کے مفہوم میں جمع ہیں۔

دوسرا احتمال بھی ہے کہ جو بہت ضعیف معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ کی دعا یا بددعا کو آپس میں ایک دوسرے کی دعا اور بددعا کی طرح نہ سمجھو[1] کیونکہ آپؐ کی دعا اور بددعا بہت سوچی سمجھی اور کسی صحیح بنیاد پر ہوگی اور خدائی پروگرام کے مطابق ہوگی اور مسلماً پوری بھی ہوگی۔

لیکن یہ تفسیر آیت کے مطالب و معانی سے مطابقت نہیں رکھتی اور اس کے بارے میں کوئی روایت بھی نہیں ——— لہٰذا قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ علماء اصول نے "فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ..." سے یہ بھی استفادہ کیا ہے کہ رسول اللہؐ کے اوامر اور احکام واجب ہیں۔

لیکن اس استدلال پر بہت سے اشکالات ہوتے ہیں کہ جن کی طرف علم اصول میں اشارہ ہوا ہے۔

زیر بحث آخری آیت سورۂ نور کی بھی آخری آیت ہے۔ یہ آیت مبداء اور معاد کی طرف ایک لطیف اور معنی خیز اشارہ ہے کہ جو تمام الٰہی احکام کی بنیاد ہیں۔ یہی عقائد درحقیقت تمام اوامر و نواہی کے اجراء کے ضامن ہیں اور ان میں وہ اوامر و نواہی بھی شامل ہیں کہ جو اس سورہ میں اوّل تا آخر آئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: آگاہ رہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کچھ اللہ کے لیے ہے (الا ان للہ ما فی السماوٰت والارض)۔
وہ خدا کہ جس کا علم پورے عالم پر محیط ہے اور "جس میں تم ہو وہ اسے جانتا ہے" (تمہاری روش، تمہارے اعمال تمہارے عقیدے اور تمہاری نیتیں سب اس پر آشکار ہیں) (قد یعلم ما انتم علیہ)۔

اور جو کام بھی تم انجام دیتے ہو اس کے صفحۂ علم پر ثبت ہیں" اور جس روز سب انسان اس کی طرف لوٹ جائیں گے اُس روز وہ انہیں ان کے انجام دیے ہوئے اعمال سے آگاہ کرے گا" اور ان کا نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ انہیں دے گا (و یوم یرجعون الیہ فینبئھم بما عملوا)۔ اور اللہ ہر چیز کا عالم اور ہر امر سے آگاہ ہے (و اللہ بکل شیء علیم)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں تین مرتبہ یہ بات آئی ہے کہ انسانوں کے اعمال خدا کے علم میں ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ جب انسان کو احساس ہو کہ ہر وقت کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ اُس سے مخفی نہیں ہے

---

[1] لفظ "دعاء" کے بعد اگر لفظ "لام" ہو تو کسی کے حق میں دعا کے معنی میں ہے اور اگر "علیٰ" ہو تو نفرین اور بددعا کے معنی میں ہے اور اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو پھر دونوں کا احتمال ہے۔

Marfat.com

تو یہ اعتقاد اُس کی تربیت کے لیے بہت پُرتاثیر ہوگا اور اسے گناہوں سے بچائے رکھے گا۔

بارالٰہا! ہمارے دلوں کو چراغ علم وایمان کے نور سے منور فرما دے اور ہمارے وجود کی "مشکوٰۃ" کو حفظِ ایمان کے لیے تقویت دے تاکہ تیرے انبیاء کے "صراطِ مستقیم" پر چلتے ہوئے ہم تیری رضا کی طرف روانہ ہوں اور "لا شرقیة و لا غربیة" کا مصداق بن کر ہم تیرے لطف وکرم کے زیرِ سایہ ہر قسم کے انحراف اور کج روی سے محفوظ رہیں۔

پروردگارا! ہماری آنکھ کو نورِ عفت سے، ہمارے دل کو نورِ معرفت سے، ہماری روح کو نورِ تقوٰی سے اور ہمارے سارے وجود کو نورِ ہدایت سے منور فرما دے اور ہمیں بے راہ روی، غفلت اور شیطانی وسوسوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے محفوظ رکھ۔

خداوندا! اپنے احکام کے اجراء کے لیے حکومتِ عدلِ اسلامی کی بنیادوں کو مستحکم کردے اور ہمارے معاشرے کو بُرائیوں اور غلاظتوں کے گڑھے میں گرنے سے محفوظ رکھ۔

انك علی كل شیٔ قدیر

سورہ نور کی تفسیر اور تفسیر نمونہ کی
چودھویں جلد کا اختتام

۲۷ ربیع الاوّل ۱۴۰۳ھ

حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر گارسٹنگ روڈ پرسٹن لنکا شائر انگلستان کے دفتر میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ کا ترجمہ ۸ شعبان المعظم ۱۴۰۵ ہجری بمطابق ۹ مئی ۱۹۸۵ء جمعرات کو صبح آٹھ بجے ختم ہوا

البتہ ترجمہ کا زیادہ حصّہ سیٹھ نوازش علی کے مکان ۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور میں مکمل ہوا اور کچھ حصّہ ایڈنبرا یو کے کے نواح میں موصوف ہی کے فارم پر اس حقیرِ پُرتقصیر سید صفدر حسین فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوا۔

والحمد للّٰه اوّلاً و اٰخراً والصلوٰة علی محمد و اٰله سرمداً دائماً

سید صفدر حسین

Marfat.com

مدینۃ العلم دار العلوم
نور آباد - فتح گڑھ - سیالکوٹ

مدینۃ العلم دار العلوم
نور آباد - فتح گڑھ - سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۴)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مینیجر
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ - لاہور

Marfat.com